لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُوْلِ اللهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ
سِیرۃُ الرَّسُول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
جلد چہارم
شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ

سِیْرَةُ الرَّسُوْل صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

جلد چہارم

(فلسفۂ ہجرت)

شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری

تحقیق و تدوین

محمد سہیل احمد صدیقی، ریاض حسین چودھری

منہاج القرآن پبلی کیشنز لاہور

۳۶۵/ ایم ماڈل ٹاؤن لاہور

نام کتاب	:	سیرۃُ الرّسول ﷺ (جلد چہارم)	
تصنیف	:	شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری	
تحقیق و تدوین	:	سہیل احمد صدیقی، ریاض حسین چودھری	
معاونت	:	محمد علی قادری، محمد افضل قادری	
زیرِ اِہتمام	:	فریدِ ملّتؒ ریسرچ اِنسٹی ٹیوٹ	Research.com.pk
مطبع	:	منہاجُ القرآن پرنٹرز، لاہور	
اِشاعت نمبر ۱	:	جولائی 1997ء	(1,100)
اِشاعت نمبر 2	:	اپریل 1998ء	(2,000)
اِشاعت نمبر 3 تا 8	:	فروری 1999ء تا اکتوبر 2007ء	(6,600)
اِشاعت نمبر 9	:	جون 2009ء	(1100)
اِشاعت نمبر 10	:	اگست 2011ء	(1,200)
اِشاعت نمبر 11	:	اپریل 2013ء	(1, 200)
اِشاعت نمبر 12	:	دسمبر 2015ء	
تعداد	:	11 00	
قیمت	:	-/570 روپے	

❀❀❀

نوٹ: شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری کی تصانیف اور ریکارڈڈ خطبات و لیکچرز کی کیسٹس، CDs اور DVDs سے حاصل ہونے والی جملہ آمدنی اُن کی طرف سے ہمیشہ کے لیے تحریکِ منہاجُ القرآن کے لیے وقف ہے۔

fmri@research.com.pk
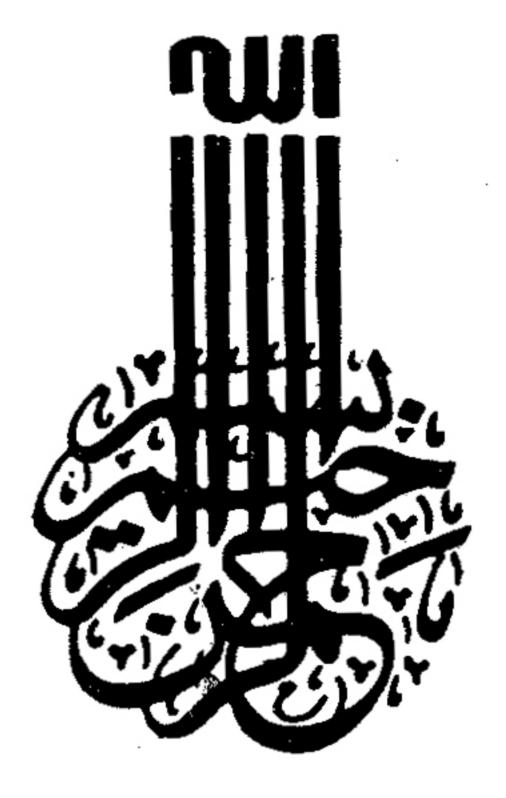
مَوْلَایَ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا أَبَدًا

عَلٰی حَبِیْبِکَ خَیْرِ الْخَلْقِ کُلِّهِمِ

مُحَمَّدٌ سَیِّدُ الْکَوْنَیْنِ وَالثَّقَلَیْنِ

وَالْفَرِیْقَیْنِ مِنْ عُرْبٍ وَّمِنْ عَجَمِ

صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ

گورنمنٹ آف پنجاب کے نوٹیفیکیشن نمبر ایس او (پی۔۱) ۴۔۱/۸۰ پی آئی وی مؤرخہ ۳۱ جولائی ۱۹۸۴ء، گورنمنٹ آف بلوچستان کی چٹھی نمبر ۸۷۔۴۔۲۰ جنرل وایم ۴/۹۷۰۔۳۷ مؤرخہ ۲۶ دسمبر ۱۹۸۷ء شمال مغربی سرحدی صوبہ کی حکومت کی چٹھی نمبر ۱۱۴۴۲۔۷۶ این۔۱/اے ڈی (لائبریری) مؤرخہ ۲۰ اگست ۱۹۸۶ء اور آزاد حکومت ریاست جموں و کشمیر مظفر آباد کی چٹھی نمبر س ت / انتظامیہ ۶۳۔۸۰۶۱/۹۲ مؤرخہ ۲ جون ۱۹۹۲ء کے تحت پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری کی تصنیف کردہ کتب ان صوبوں میں تمام کالجز اور سکولوں کی لائبریریوں کے لئے منظور شدہ ہیں۔

فہرست

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
	○ غفور و رحیم کے معانی و مطالب	۳۲۶
	۳- مہاجرین: خصوصی ثواب کے حاملین	۳۲۶
	۴- مہاجرین: دوستی کے حقدار	۳۲۸
	۵- مہاجرین کا امتیازی مقام	۳۲۹
	۶- مہاجرین بہتر ٹھکانوں کے سزاوار	۳۳۳
	اکیسویں صدی اسلام کی صدی	۳۳۵
	۷- مہاجرین: سزاوار مغفرت	۳۳۷
	۸- مہاجرین کے لئے اچھی برزخی زندگی کی بشارت	۳۳۹
	۹- دامن احترام و پناہ بھی مہاجرین کے لئے	۳۴۱
	مشکوک عورتوں کے ایمان کے پرکھ	۳۴۳
	۱۰- اہل ہجرت اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کے حقدار	۳۴۴
	۱۱- مہاجرین اللہ کی رحمتوں کا مرکز توجہ	۳۴۷
	۱۲- مال و متاع مہاجرین کے قدموں پر	۳۴۹
	۱۳- ،اجرین: بحراجور کے غواص	۳۵۲
	۱۴- مہاجرین: سفرائے امن	۳۵۴
	۱۵- کشادگی اور فراخی مہاجر کا مقدر	۳۵۷
	۱۶- مہاجرین: نجات اخروی کے حامل	۳۵۸
	() قوم نوح کے مہاجرین	۳۵۸
	() قوم موسیٰ کے مہاجرین	۳۶۰
	۱۷- مہاجرین: فضل ربی کے متلاشی	۳۶۳
۲۵	**باب - ۲: فضائل مہاجرین حدیث رسول کی روشنی میں**	۶۵

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ

حصّہ اوّل

سفر انقلاب میں ہجرت کا معنی و مقام

باب ۔ ۱

اسلامی تمدن کی خشتِ اول

فلسفہ ہجرت مدینہ اسلامی تمدن کی وہ خشت اول ہے جس پر اسلامی تہذیب و ثقافت کے عظیم الشان قصر کی بنیادیں اٹھائی گئی ہیں' تاجدار کائنات ﷺ کا جانب طیبہ اٹھنے والا پہلا قدم تاریخ کے اوراق میں اس بے مثال ثقافتی اور سماجی نظام کا عنوان بن کر آج بھی جگمگا رہا ہے جس نظام رحمت کی بدولت ابن آدم کو باطن کے سفر سے لے کر تسخیر کائنات تک ذات اور کائنات کا ادراک اور اللہ کی بندگی کا شعور عطا ہوا اور وہ خلا کی وسعتوں کو چیرتا ہوا عملاً بھی ستاروں پر کمندیں پھینکنے لگا' فرزند زمین ہونے کے گمراہ کن فلسفے کی نفی کرکے اپنے آبائی وطن کو چھوڑنا' فکری اور روحانی رشتوں کا پرچم بلند کرکے اپنی خاندانی شناخت سے وقتی طور پر ہی سہی کنارہ کشی اختیار کرلینا اور اپنے عظیم نصب العین کے حصول کے لئے جغرافیائی حدبندیوں کو توڑ کر کائنات کی بے انت وسعتوں کو اپنا مستقر ٹھہرا لینا نہ صرف ایثار و قربانی' عزم و استقلال اور قوت استدلال کی فیصلہ کن اکائی پر مکمل گرفت کی ایک لازوال مثال ہے بلکہ وطنیت کے محدود تصور سے نکل کر فکر و نظر کی پہنائیوں میں قول و عمل کے نئے چراغ جلانے کی ایک شعوری کوشش بھی ہے' ہجرت مدینہ' حیات طیبہ کے مکی دور اور مدنی دور کے درمیان ایک ایسے نفسیاتی رابطے کی حیثیت رکھتی ہے جس رابطے کے بغیر مسلمان عظمت و شوکت کے اس سفر پر روانہ نہیں ہو سکتے تھے جو سفر حضور ﷺ کی انقلابی جدوجہد کا منطقی نتیجہ تھا۔ ہجرت کو اہل دانش نے کفر اور اسلام کے درمیان ایک مینارہ نور سے تعبیر کیا ہے۔ فلسفہ ہجرت مدینہ اسلامی تشخص کا وہ بلیغ استعارہ ہے جو آج بھی سیاسی اور اقتصادی انتشار کا شکار امت مسلمہ کی درست سمت میں رہنمائی کا فریضہ سرانجام دے سکتا ہے اور اس حوالے سے آج بھی اسلامیان عالم کے فکری اور روحانی طور پر منتشر اذہان میں یہ قانون فطرت اپنے مفہوم کی تمام تر جزئیات کے ساتھ پختہ کیا جاسکتا ہے کہ ابتلاء و آزمائش کے مراحل سے گزرے بغیر گوہر مقصود نہ آج تک کسی کے ہاتھ آیا ہے اور نہ کبھی آئے گا۔

ہجرت مدینہ جہاں اتحاد اسلامی کا عملی نمونہ پیش کرنے والی تھی وہاں اس عظیم ہجرت سے ایک نظریاتی مملکت کے خدوخال کی نشاندہی بھی ہو رہی تھی اور مجوزہ اسلامی ریاست کے تہذیبی اور ثقافتی نقوش بتدریج اجاگر ہو رہے تھے' بالکل انہی خطوط پر پاکستان کا قیام عمل میں آیا تھا' یہ سفر ہجرت آج بھی جاری ہے' برہمن کی نفرت کا نشانہ بننے والے بھارتی مسلمان لاشعوری طور پر شمالی ہند میں جمع ہو رہے ہیں' بابری مسجد کی شہادت کے بعد اپنی ثقافتی اکائی کے تحفظ کا شعور ایک تحریک کی صورت اختیار کرتا جارہا ہے' یہ تحریک ایک نئے پاکستان کی آزادی کی دستاویز کا ابتدائیہ رقم کر رہی ہے' ہجرت کا یہ عمل فرد کے اندر بھی جاری رہتا ہے' اس تخلیقی عمل میں اسے اسباب کی ضرورت نہیں ہوتی' صرف عزم جواں ہی اس سفر ہجرت میں زاد راہ بنتا ہے اور درست سمت میں سوچ کے سفر کی رہنمائی کرتا ہے' ہجرت مدینہ مادی وسائل کی نفی اور اللہ کی مدد و نصرت پر کامل یقین کی درخشندہ مثال ہے' قیامت تک مسافران راہ حق اس رخشندگی سے اپنا دامن آرزو بھرتے رہیں گے اور اپنے عہد کا منظر نامہ روشنیوں سے تحریر کرتے رہیں گے۔

صبح انقلاب کے دروازوں پر پہلی باضابطہ دستک

ہجرت مدینہ تحریک اسلامی کے سفر کا سنگ میل' ایک فیصلہ کن موڑ' کتاب عظمت کا دیباچہ' ایک آزمائش' ایک امتحان تھا' سرزمین مکہ کی سماجی زندگی کی طنابیں کھینچ لی گئی تھیں' خوف کی سیاہ رات' زنجیر بن کر اسلامیان مکہ کے گرد اپنا گھیرا تنگ کر رہی تھی' پانی اب سر سے اونچا ہو چکا تھا' مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ کر دیا گیا تھا' وہ وطن میں بے وطن ہو کر رہ گئے تھے۔ یقیناً اس لئے کہ قومیں اوطان سے نہیں بنا کرتیں بلکہ قوم رسول ہاشمی اپنا جداگانہ تشخص رکھتی ہے جس پر مغرب کے وضع کردہ اصول کسی صورت میں بھی منطبق نہیں ہوتے' کفار و مشرکین نے مکہ کی وادیٔ کرم کو اہل حق کے لئے وادیٔ جبر میں تبدیل کر رکھا تھا' مکہ میں اسلامی تحریک کے مزید نتیجہ خیز ہونے کا جب

کوئی امکان باقی نہ بچا تو تضیع اوقات سے بچنے کے لئے مسلمانوں کو ہجرت مدینہ کا حکم ملا' ہجرت کا یہ مرحلہ باطل استحصالی قوتوں کے خلاف اسلامی تحریک کی طویل منصوبہ بندی کا ایک حصہ تھا' محض اتفاقی عمل نہ تھا ایک شدید عمل کا شدید ردعمل' باطل کی چیرہ دستیوں کا ہدف بننے والے مسلمان ظلم کے خلاف تلوار اٹھانے اور اہل شرک کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر انہیں للکارنے کے لئے پیغمبر انقلاب ﷺ کی عظیم قیادت میں مرحلہ وار آگے بڑھ رہے تھے' حضور ﷺ کی حکمت عملی یہ تھی کہ یثرب کی سرزمین کو اپنا ہیڈ کوارٹر بنا کر مسلمانوں کی قوت کو مجتمع کیا جائے اور جہادی جماعت کو منظم کر کے صبح انقلاب کی ساعت دلنواز کی پذیرائی کا اہتمام کیا جائے۔ دو تہذیبوں اور دو ثقافتوں کے درمیان جو سرد جنگ گذشتہ تیرہ برس سے جاری تھی اب اسے جذبہ جہاد کی حرارت عطا ہونے والی تھی اس لئے ضروری تھا کہ پہلے مسلم معاشرے کی بنیادیں رکھی جائیں اور پھر ان نئی سماجی اقدار کے پس منظر میں باطل تہذیب کے خاتمے کے لئے عملی جدوجہد کو تیز تر کیا جائے۔ اس لئے ہجرت مدینہ صبح انقلاب کے مقفل دروازوں پر پہلی باضابطہ دستک ہے۔

حیات انسانی میں "انقلاب" کی ناگزیریت

"انقلاب" جمود' تعطل' سکوت اور فرسودگی کی ضد ہے۔ "انقلاب" رجائیت سے بھرپور روشنی کے اس سفر کا نام ہے جس سفر میں نہ صرف باطن کے درودیوار پر جمی کائی کا پیرہن تار تار ہوتا ہے بلکہ ظاہر کا میل بھی دھل کر نئی صبحوں کے اجالوں میں خوشگوار تبدیلیوں کا باعث بنتا ہے۔ انقلاب کبھی داخل سے خارج تک اور کبھی خارج سے داخل تک کا سفر اختیار کرتا ہے' ہر شعبہ زندگی کے بند دروازوں کے قفل ٹوٹتے ہیں' ذہنوں کا زنگ اترتا ہے' نئے آفاق کی تسخیر کا عزم سینوں میں اضطراب کی موجوں کو جنم دیتا ہے اور کاروان حیات ایک نئی شان سے اپنی منزل کی طرف رواں دواں رہتا ہے۔ انقلاب ایک ناگزیر عمل ہے اور فطرت کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔

رات صدیوں پر محیط ہی کیوں نہ ہو آخر رات ہوتی ہے' اسے بہرحال گزر جانا ہوتا ہے۔ قانون فطرت ہے کہ ظلمت شب جتنی بھی گہری ہو گی اس کے بطن سے جنم لینے والا سورج اتنا ہی روشن اور چمکدار ہو گا۔ اگر شعوری یا لاشعوری سطح پر انقلاب کا عمل جاری نہ رہے تو تہذیب و تمدن کا ارتقاء رک جائے گا اور تاریخ اپنا سفر بھول جائے گی لیکن ابتدائے آفرینش سے لے کر آج تک نہ ایسا ہوا ہے نہ روز ابد تک ایسا ہو گا کیونکہ فطرت اپنے اٹل اصولوں سے انحراف نہیں کرتی۔

"انقلاب" ایک عظیم الشان عالمگیر آفاقیت کی امتیازی شان کا حامل انقلاب! ایک عملی انقلاب' جو تاریخ کے دھاروں کو موڑ دے' جو انسانیت کو دائمی معراج عطا کر دے' جو فکر انسانی کو فطرت کے تقاضوں سے ہمکنار کر دے' وہ انقلاب رحمت جو انسان کو ہمہ جہت یکسوئی کی دولت سے نوازے' جو انسان کے جمیع قویٰ اور تمام صلاحیتوں کو ایک مرکز توجہ اور ایک منبع فیض پر موتکز کر دے' جو انسانی فکر و فلسفہ' عمل و کردار اور جذب و وجدان کو ایک ہی سمت محو سفر کر دے' جو انسان کی عقل' اس کے ارادہ و عمل اور اس کے جذبہ روحانی کو بیک وقت ایک ہی منزل کی طرف رواں دواں کر دے' ایک ایسا انقلاب جو فطرت کا مقتضی ہو' جو رحمت کا مبتدا ہو' جو انسانی کمال کا منتہیٰ ہو' جو قول و فعل کے تضاد کو رفع کر کے حیات انسانی کو آسودگی اور طمانیت عطا کر دے' جس کی حرکت پذیری مطالبہ حقوق کے ذریعہ انسانوں کے متصادم مفادات میں ٹکراؤ پیدا کر کے معاشرے میں برائی اور بے سکونی پیدا کرنے کا باعث نہ ہو بلکہ وہ ہر شخص کے حق کو دوسرے کی ذمہ داری قرار دے کر ایفائے حقوق اور ادائیگی فرائض کی طرف متحرک ہو تاکہ انسانی معاشرہ جو قوت برداشت سے محروم ہو چکا ہے کو ایک بار پھر روشن دنوں کا امین بنا کر محبت و مودت' رحمت و راحت' فواد و ترحم اور عوامی مفادات کے تحفظ کے ساتھ امن و آشتی کا گہوارہ بنایا جا سکے۔ اس حوالے سے بپا کیا جانے والا انقلاب تخلیق و تقسیم دولت کے لئے ایسے عمرانی تعاون کو جنم دے گا جس سے معاشی ناہمواری اور سماجی بے انصافی کا خاتمہ ہو جائے گا۔ نہ کوئی فرد حاجت مندی میں مبتلا

رہے گا اور نہ معاشی ناہمواریوں کی وجہ سے کسی کی تخلیقی و ارتقائی جدوجہد کسی تعطل کا شکار ہوگی اور نہ یہ جدوجہد بے ثمر رہے گی' زندہ اور مہذب معاشروں کے قیام کے لئے ضروری ہے کہ ان عظیم مقاصد کے حصول کے لئے پوری معاشرتی زندگی کو ایک وحدت (اکائی) تصور کیا جائے۔ معاشی انقلاب کے بغیر سیاسی انقلاب بے وقعت ہو کر رہ جاتا ہے اس لئے انقلاب کے علمبرداروں کو ہر قدم پر یہ دیکھنا ہوگا کہ پیداوار کی تقسیم سے معاشی توازن و استحکام پیدا کرنے کے نام پر نہ تو انفرادیت اور سرمایہ داریت کے ذریعہ قوم کا اجتماعی استحصال کر کے طبقاتی کشمکش کو ہوا دی جائے نہ اجتماعیت اور اشتراکیت کے نام پر فرد کے انفرادی حقوق اور مفادات کے استحصال کی اجازت ہو بلکہ دیوار شب کو روکنے کے لئے اور شدید تر مزاحمت پیدا کرنے کے لئے ہمہ گیر اقدامات اٹھائے جائیں' وسائل پیداوار کی تقسیم کو بنیاد بنایا جائے' وہ مطلوبہ انقلاب اپنی نوعیت کا منفرد انقلاب ہو جس میں حاکم اور محکوم کا کوئی تصور نہ ہو بلکہ مملکت کے تمام شہری قانون کے یکساں تابع ہو کر معاشرے میں اقدار حیات کے عادلانہ قیام' تحفظ اور فروغ کے لئے جدوجہد کریں۔ آمریت اور ملوکیت کے ہر نشان کو مٹا دیا جائے۔ انسان پر انسان کی "خدائی" کے ہر امکان کو ختم کر دیا جائے۔ انسان کی گردن میں انسان نہیں خدائے بزرگ و برتر کی غلامی کا پٹکا ہو۔ اس بات پر بھی کڑی نظر رکھی جائے کہ مغربی طرز جمہوریت کے ذریعہ شہریوں کو کسی خاص گروہ کا "پابند عبادت" نہ بنا دیا جائے۔ ایک ایسا انقلاب برپا کیا جائے جس میں فرد کی بحیثیت فرد بھی تکمیل شخصیت ہو جبکہ وہ معاشرے کو بطور معاشرہ بھی نقطہ کمال کی طرف رواں دواں کرنے کے لئے سرگرم عمل ہو۔ ایسے افراد کی انقلابی بنیادوں پر تربیت کی جائے اور ایسے ہر نقش کہن کو مٹا دیا جائے جو انسانی ذہن کو کسی قسم کی جکڑ بندیوں میں مقید کرنے کا باعث بنے۔ خود غرضی' مفاد پرستی اور لالچ کو جڑ سے کاٹا جائے۔ یہ انقلاب مستقل اور کامل اقدار (Permanent perpetual and perfect values) پر ایک نئے سماج کی تعمیر کا کارنامہ سرانجام دے نہ کہ معاشرے پر تشکیل اقدار کا بار ڈال کر اس کی کمال کی طرف

راہنمائی کرنے کی بجائے اسے تشنہ کام اور دشت بے اماں میں بھٹکنے کے لئے چھوڑ دے جس کے نتیجے میں نہ کوئی قدر آخری قدر بن سکے اور نہ کوئی تصور کامل تصور کہلا سکے۔ ایک ایسا انقلاب جو بنی نوع انسان کو تمام جغرافیائی، لسانی، نسلی یا کسی بھی دوسری محدود وفاداری کے دائرے تاریک کنوئیں یا بند گلی سے نکال کر ایک ایسا مرکز وحدت عطا کرے جو ہر باشعور شخص کے دل کی دھڑکن بن جانے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ وہ انقلاب تمام انسانوں کو ایک مرکز وفا پر جمع کرے اور یہ کہ وہ انقلاب ایک عالمگیر معاشرہ بپا کرنے کی توانائی رکھتا ہو۔ وہ انقلاب جو تجرباتی توثیق (Experimental Varification) کے ذریعہ عملی کسوٹی (Practical Criterian) پر نتیجہ خیزی کا ضامن ہو، ناقابل عمل افکار اور غیر عملی فلسفیانہ موشگافیوں کا آئینہ دار نہ ہو بلکہ وہ ابن آدم کو دائمی فلاح، حقیقی خوشحالی اور تہذیب و تمدن کے ارتقاء کی راہ پر چلائے، ایک ایسا انقلاب جس کا مرکز و محور مادیت ہی نہ ہو وہ فرد کی فکری تشنگی کا بھی مداوا کرے۔ وہ انقلاب جو دنیا میں بھی انسان کی کامیابی کا ضامن ہو اور آخرت میں بھی اس کی کامیابی کی ضمانت دے، وہ انقلاب جو فرد کی باطنی زندگی کا منظرنامہ ایمان کی روشنی سے تحریر کرنے کی اہلیت رکھتا ہے، جو اس کی ذات کے روحانی سفر میں بھی اس کی راہنمائی کا فریضہ سرانجام دے، وہ انقلاب ایک جہت پر ہی انحصار نہ کرے اور نہ کثیرالجہتی (Multi Dimentional) ہی ہو بلکہ حقیقی معنوں میں ہمہ جہت اور ہمہ گیر ہو۔ آج کے انسان کی طلب ایک ایسا انقلاب ہے جو انتہائے کائنات اور ابد زیست تک کے لئے انسانیت کو سکون اور طمانیت کے زمزموں سے ہمکنار کرے نہ کہ ایک ایسا انقلاب جو ساٹھ ستر سال بعد ہی ہانپنے لگے اور اپنی عمر کی ایک صدی مکمل کرنے سے پہلے ہی دم توڑ دے۔ وہ انقلابی عالمی ہمہ جہت نظام جس کے لئے آدمیت ترستی تھی اور ترستی ہے ایک ایسا آفاقی نظام ہے جو قیامت تک کے ہر دور کے جملہ تقاضوں کو نہ صرف پورا کرتا ہے بلکہ ہر لحظہ بدلتی کائنات میں اس کی فکری اور روحانی راہنمائی کر کے کاروان حیات کو آگے بھی بڑھاتا ہے اور تعطل اور جمود کی ہر شکل کی نفی کر کے

شاہراہ حیات پر زندگی کے قافلے کی راہ کے کانٹے چنتا ہے۔ ماہ و سال کی گرد اس نظام کے چہرے پر ایک بھی خراش نہیں ڈالتی' دھند کتنی بھی گہری ہو اس نظام کے باطن سے پھوٹنے والی شعاعیں مسلسل سفر کرنے کی قدرت رکھتی ہیں۔

یہ انقلابی اور مثالی نظام حیات کون دے گا؟

انقلاب کی ناگزیریت سے بحث کرنے کے بعد ذہن میں جس انقلابی اور مثالی نظام حیات کے خدوخال اجاگر ہوتے ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ انقلابی اور مثالی نظام حیات جو انسان کے ظاہر و باطن اور قلب و روح کو نور عطا فرمائے اور اس کی مادی اور روحانی دونوں قوتوں کو کمال تک پہنچائے وہ نظام حیات ہمیں کون دے گا؟ کس نظریاتی اکائی میں اتنی توانائی ہے اور وہ کون سی عظیم ہستی ہے جو اس نظام حیات کے عملی نفاذ کا بیڑا اٹھا سکتی ہے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب ہر عہد کے انسان کو درکار ہے کیونکہ اس سوال کے جواب میں ہی انسانی فلاح و بہبود کا راز مضمر ہے۔ کسی بھی حوالے سے بات کی جائے' فلسفیانہ مباحث کا کوئی سا بھی راستہ اختیار کیا جائے' زاویہ نگاہ کی کوئی سی بھی جہت دریافت کی جائے' منطق کی کوئی سی بھی قندیل روشن کی جائے' علم' حکمت اور دانائی کا کوئی سا بھی معیار مقرر کیا جائے اور عظمت کا کوئی سا بھی پیمانہ تخلیق کیا جائے' نگاہ انتخاب ایک ہی دہلیز پر آکر مودب کھڑی ہو جاتی ہے۔ ہر عہد کی دانش ایک ہی مرکز وحدت پر کشکول گدائی لئے نظر آتی ہے اور نسل انسانی کی تمام تمنائیں ایک ہی چوکھٹ کو چومتی دکھائی دیتی ہے۔ وہ دہلیز اور چوکھٹ در یتیم آمنہؓ کے لال ﷺ کی دہلیز ہے تاجدار کون و مکاں ﷺ کی چوکھٹ ہے جہاں سے خیر و برکت کے تمام سرچشمے پھوٹتے ہیں اور انسانیت کو دائمی امن کی خیرات عطا ہوتی ہے۔ اگر کوئی انقلاب حقیقی نفع بخش انقلاب کہلا سکتا ہے تو وہ صرف اور صرف پیغمبر انقلاب ﷺ کا لایا ہوا انقلاب رحمت ہے۔ ہم یہ بات پورے اعتماد اور یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ دین اسلام ہی ایک ایسا انقلاب ہے جو بنی نوع انسان کی مادی اور روحانی ضرورتوں کی کفالت

کا اسی طرح صد فیصد ضامن ہے جس طرح آج سے چودہ صدیاں قبل اس نے ذہن انسانی میں علم و عمل کے چراغ روشن کئے تھے اور اس کے ظاہر و باطن کو اسلام کی آفاقی تعلیمات کے نور سے منور کر کے اسے دنیا کے گوشے گوشے میں یہ روشنیاں تقسیم کرنے کا منصب عطا فرمایا تھا۔

باب ـ ۲

ہجرت مدینہ: انقلاب مصطفوی کا نقطۂ آغاز

اعلان نبوت کے ساتھ روشنی کے اس سفر کا باقاعدہ آغاز ہو چکا تھا جس سفر کے آغاز سے پہلے غار حرا کی مقدس اور معطر خلوتوں میں ایمان کی قندیل لفظ اقرأ سے روشن ہوئی تھی۔ ہجرت مدینہ انقلابِ مصطفوی کے مرحلہ تحریک میں داخل ہونے کا نقطہ آغاز ثابت ہوئی۔ فاران کی چوٹیوں پر آفتاب رشد وہدایت چمکا تو نور حق کی کرنیں اکناف عالم میں پھیل گئیں۔ ایک ہمہ گیر' ہمہ جہت اور عالمگیر انقلاب برپا ہوا۔ انسان کو انسانیت آشنا کرنے اور آدمی کو آدمیت شناسا بنانے کے لئے کائنات پست و بالا کی ازل تا ابد جمیع تحریکات روحانیہ و مادیہ کے مابین عظیم ترین انقلابی تحریک کے اولین مرحلہ' مرحلہ دعوت کا آغاز جبل بو قیس پر اپنی صداقت' امانت' دیانت اور عظمت و بلندی' فکر و کردار کی ہر طرف سے گواہی لے کر ہوا۔ اسلام کا یہ پیغام کوئی نیا پیغام نہ تھا اس سے پہلے بھی اللہ کے برگزیدہ پیغمبر آفاقی ہدایت کے ساتھ انسانوں کی طرف مبعوث ہوتے رہے۔ مسلمین' ازل سے اہل حق کا نام ہے۔ امت مسلمہ' ہر نبی کی امت کو یہی نام دیا گیا' یہ توحیدی مشن کبھی ابراہیمی تحریک کی شکل میں سامنے آیا' کبھی یہ مشن موسوی تحریک انقلاب کے طور پر کامیابی و کامرانی کے جھنڈے گاڑتا رہا' یہ "صبغۃ اللہ" کبھی یعقوبی و یوسفی پیرہن میں دکھائی دیا اور برنگ عیسوی ظہور پذیر ہوا۔ الغرض یہ عظیم انقلابی مشن سیدنا ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام سے حالات کے مختلف سانچوں میں ڈھلتا' مختلف ادوار میں اپنے غیر متبدل روح کے ساتھ انسانی عقل و شعور کو کمال کی طرف پہنچاتا رہا۔ تاریخ کا یہ سفر جاری رہا' گردش لیل و نہار نے کئی صدیوں کی رونمائی کا فریضہ سرانجام دیا تا آنکہ یہ عظیم اور بے مثال مشن منظم اور ہمہ جہت سائنسی فکر کے دائرے میں داخل ہوا اور اللہ کے آخری رسول ﷺ مسند رشد وہدایت پر رونق افروز ہوئے۔ غرض جب تحریک انقلاب اسلامی کو آخری و کامل بلکہ اکمل شکل میں دکھانے کی ضرورت ہوئی تو عقل و شعور انسانی نے دین اسلام کے قیامت تک کے لئے مکمل صورت میں نفاذ کا تقاضا کیا تو مشیت ایزدی نے اس طلب فطرت سلیمہ پر بکمال

حکمت مصطفوی انقلاب کے ظہور کو مکمل فرمایا۔ مصطفوی انقلاب کی تحریک پانچ مراحل کی شکل میں منظم ہو کر سامنے آئی۔ اس تحریک کا آغاز جبل ابو قبیس پر مرحلہ دعوت سے ہوا تھا۔ ہجرت مدینہ اس انقلابی تحریک کا مرحلہ تحریک تھا۔ نہایت اہم اور فیصلہ کن حصہ جس کے بعد مصطفوی انقلاب کی تحریک باقاعدہ دور انقلاب میں داخل ہوئی گویا یہ ہجرت عملی انقلاب بپا ہو جانے کا نقطہ آغاز تھی۔

قرآنی فلسفہ انقلاب کہیں یا مصطفوی منہاج انقلاب' دونوں اصلاً ایک ہی چیز کے دو مختلف نام ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ اول الذکر موخر الذکر کی فکری بنیاد ہے اور مؤخر الذکر کو اول الذکر کی عملی تفسیر کا درجہ حاصل ہے۔ منہاج القرآن (قرآن کا راستہ) وہی راستہ ہے جس پر چل کر مصطفوی انقلاب کی منزل کا حصول ممکن ہے۔ تاجدار کائنات ﷺ کا بپا کردہ انقلاب ایک عظیم آفاقی انقلاب ہے جو ہر دور اور ہر عہد میں انسانی فلاح و بہبود کا ضامن ہے۔ یہی فکری اجتہاد کی راہ ہے اور یہی عملی انقلاب کی منزل ہے کیونکہ یہی سنت و اتباع رسول ہے۔ ہجرت کا لفظ ان گنت مفاہیم کے پیرہن میں ملبوس ہے۔ ان مفاہیم کی کئی کئی جہتیں ہیں مگر ہجرت کا بنیادی نکتہ اس کا سیاسی اور انقلابی پہلو ہے۔ اصحاب رسول کا عظیم کردار اسی نکتے کی عملی تفسیر ہے اور یہ تفسیر تاریخ کے اوراق پر آج بھی جگمگا رہی ہے۔

باب ۔ ۳

ہجرت کا لغوی مفہوم

ہجرت کا لفظ "**ھجر**" سے ہے۔ **ھجر یھجر** کے ساتھ مختلف مصادر آتے ہیں مثلاً **ھَجْرًا ھِجْرَانًا ھُجُوْرًا** وغیرہ

اسی سے **ھَجَّرَ تَھْجِیْرًا، اَھْجَرَ اِھْجَارًا** اور **ھَاجَرَ مُھَاجَرَۃً و ھِجْرَۃ** وغیرہ بھی آتے ہیں۔

اب ہم اس کے تحت لکھے گئے مختلف معانی اور ان کے ممکنہ انطباقات پر غور کریں گے مثلاً

(۱) **تباعد** دور ہوا (دور ہونا)

(۲) **ای ھذی یقال ھجر فی مرضہ و نومہ** بے معنی و بے ارادہ بغیر سوچے سمجھے بولنا، اس میں بالعموم ھذیانی کیفیت پائی جاتی ہے۔ کبھی بیماری سے نیم بیہوشی کی کیفیت وغیرہ بالخصوص بخار وغیرہ کی قسم میں انسان کے منہ سے غیر ارادی طور پر چند ایک کلمات ادا ہو جاتے ہیں جن کی خود اسے بھی خبر نہیں ہوتی۔ کبھی اسکی نوعیت نیند میں بڑبڑانے کی بھی ہوتی ہے۔

(۲) **ای ترکہ و اعرض عنہ** چھوڑ دیا اور منہ پھیر لیا۔ اس میں کسی شئے سے کلیتاً منہ پھیر لینے کا مفہوم پایا جاتا ہے اسی طرح چھوڑ دینے کا بھی معنی پایا جاتا ہے۔

(۳) (**زوجہ**)...... **ای اعتزل عنھا و لم یطلقھا** (اپنی بیوی کو) یعنی اس سے واصل نہ ہوا مگر طلاق بھی نہ دی۔ گویا کہ شدت سے ناراضی یا ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔

(۴) (**الدابہ**)...... **ای او ثقھا بالھجار** یعنی اسے رسی سے مضبوط باندھ دیا۔ گویا کہ اسے چلنے پھرنے یا بھاگنے سے روک دیا یا پابند و مجبور کر دیا اور ایک جگہ (Stick) کر دیا یعنی اس میں مانوسیت اور مضبوط تعلق کا مفہوم پایا گیا۔

(۵) (**اھجر**) **بلغ حدہ فی التمام** اتمام و کمال میں آخری حدوں کو چھو لینا یعنی اپنے میدان میں کامل ہونا۔ سب سے بڑھ کر لائق تحسین ہونا۔

(۶) **ھجر**...... **بکر و بادر الیہ** صبح سویرے یا جلدی کرنا اور کسی شئے کی طرف تیزی

سے بڑھنا یا لپکنا۔

(۷) **هاجر** ۔ ترک وطنہ ترک وطن کرنا۔

(۸) **(القوم) هجرهم و انتقل الی اخرین** قوم کو چھوڑ دینا اور دوسری قوم کے ساتھ جا ملنا۔

(۹) **سار فی الهاجرة** بیچ دوپہر کے چلنا۔

(۱۰) **المهجر و الهاجر ۔ الفائق الفاضل من کل شئی' جید حسن' المهجر** اور **الهاجر** یعنی ہر شئے پر فائق و صاحب فضیلت' اچھا و عمدہ اور خوبصورت

(۱۱) **هذا اهجر من ذلک ای احسن و اکرم** ۔ یہ اس سے **اهجر** یعنی زیادہ حسن والا اور زیادہ بزرگی کا حامل ہے۔

(۱۲) **شئی هجر ای لا نظیر له** یعنی ایسی شئے جس کی کوئی نظیر نہ ہو اور بے مثال ہوئے

(۱۳) **القول الهجر ای القبیح** بری گفتگو

(۱۴) **القول الهجر ای الفحش** بے حجابانہ و بے حیائی والا کلام

(۱۵) **القول الهجر ای الهذیانی** اول فول بک بک

(۱۶) **القول الهجر ای السب** گالی دینا۔

(۱۷) **المهجور ای الفحل یشد راسه الی رجله** ایسا بیل جس کا سر اس کی ٹانگ کے ساتھ باندھا گیا ہو یعنی اسے چلنے پھرنے اور بھاگنے سے روک دیا گیا ہو۔

(۱۸) **المهجور ای قیل فیه غیر الحق** جس کے بارے میں ناحق گفتگو ہوئی ہو۔

(۱۹) **الهجراء الکفایه** کافی ہونا۔

مجموعی تاثر کیا ہے

مختصر یہ کہ **هجر** اور اس کے مختلف مشتقات سے جو ایک مجموعی تاثر ابھرتا ہے وہ مندرجہ ذیل نکات کی شکل میں بیان ہو سکتا ہے۔

۱۔ اس میں دور ہونے کا معنی پایا جاتا ہے۔

۲۔ اس میں ترک کردینے اور چھوڑ دینے کا مفہوم پایا جاتا ہے۔
۳۔ اس میں شدید ناپسندیدگی اور سخت ناراضگی کے اظہار کا معنی پایا جاتا ہے۔
۴۔ اس میں کسی مضبوط تعلق میں بندھے جانے اور ایک ہی مرکز سے معلق ہو جانے کا معنی پایا گیا۔ بالفاظ دیگر ہم اسے انطباقاً اس قلبی تعلق پر بھی محمول کر سکتے ہیں جو کسی کو اپنے مرکز محبت کے ساتھ ایسا باندھ ڈالے کہ وہ خود بھی چاہے تو بھاگ نہ سکے۔

عشق پر زور نہیں، ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

(۵) کمال حاصل کرنا۔ تکمیل کے درجے تک پہنچنا، ظاہراً یا باطناً لائق تحسین و تقلید ہونا۔
(۶) بے اختیار ہو کر کسی شئے کی طرف لپکنا، تیزی سے اس کی طرف بڑھنا، اس میں بھی اولاً والہانہ پن کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے۔ ثانیاً اشتیاق کی کیفیت اور ثالثاً کسی شئے کی اہمیت کا احساس اور اس پر شدت و کثرت سے عمل کرنا پایا گیا۔
(۷) بیچ دوپہر کے چلنا۔ یعنی سختیاں اٹھانا اور تکالیف برداشت کرنا، حالات کی گرمی سردی اور شدت کو دیکھ کر رک نہ جانا بلکہ سوئے منزل رواں دواں رہنا۔
(۸) فوقیت اور فضیلت اور حسن و جمال کا معنی بھی پایا جاتا ہے۔ اس میں عمدگی اور خوبصورتی پائی جاتی ہے۔
(۹) اس میں بزرگی و افضلیت کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے۔ خواہ کمال و بزرگی عطا کرے یا خود اس میں ہی پایا جائے یا یہ دونوں باتیں ہوں۔
(۱۰) اس میں بے مثال ہونے کا معنی بھی پایا جاتا ہے۔
(۱۱) اس میں یاوہ گوئی، ہرزہ سرائی، فحش کلامی، گالی گلوچ، اول فول بکنے، جھوٹ بولنے، غلط بیانی کرنے، بہتان تراشی وغیرہ کے معانی بھی پائے جاتے ہیں۔
(۱۲) اس میں کفایت یعنی کافی وافی ہونے اور ضروریات و حاجات کی مکمل کفالت کا معنی پایا جاتا ہے۔

چھ ضروری نکات

اگر ہم "ھ۔ج۔ر" کے مرکب و مشتقات کے مختلف معانی کا انطباق مزید مختصر الفاظ میں معرکہ حق و باطل کے اعتبار سے سمجھنا چاہیں تو ہم ان الفاظ میں سمجھ سکتے ہیں۔

(۱) پہلے تین نکات میں اہل حق کی باطل سے نفرت' اس پر غضب و ناراضی اور ایک مستقل غیر مصالحانہ مخاصمت کا رویہ پایا جاتا ہے۔ ساتھ ہی باطل سے ہر سطح اور ہر ہر اعتبار سے مکمل بائیکاٹ بھی مشار الیہ ہے۔

(۲) دوسرے تین نکات میں اہل حق کا حق سے والہانہ' عشقی و حبی' مستقل' غیر متزلزل' دائمی اور اٹوٹ رشتہ اور اس پر ہر اعتبار اور ہر جہت سے مضبوط' مکمل اور بھرپور عملی و اتباعی تعلق معلوم ہوتا ہے۔

(۳) ساتویں نکتہ میں حق کی خاطر شدائد جھیلنا اور سختیاں اٹھانا واضح و بین ہے۔

(۴) آٹھویں سے دسویں تک کے تین نکات میں اہل حق کے اس رویئے کی فضیلت و فوقیت' عمدگی' حسن و خوبی' عدیم النظیریت اور بے مثالی بیان ہوتی ہے۔

(۵) بارہواں نکتہ اس کے کافی ہونے' مقاصد میں کامیابی کے حصول' نصب العین کی باریابی' جدوجہد میں نتیجہ خیزی اور کفالت از بارگاہ خداوندی پر واضح دلیل ہے۔

(۶) گیارہواں نکتہ باطل کے رویئے' طرز عمل' طریق کار اور مزاحمت حق میں اخلاقی گراوٹ' گھٹیا پن' سوقیانہ طرز کلام و فکر' پیچ سے پیچ حرکت کے صدور کا امکان۔ غرض ہر فتنہ و شر کی انگیخت کی طرف مشیر ہے۔

لفظ ہجرت کا اصل

ھ۔ج۔ر کے معانی' خلاصہ اور پھر مندرجہ بالا تلخیص سے واضح ہوا کہ!

(۱) یہ لفظ حق اور باطل کے مابین واضح' دوٹوک اور فیصلہ کن ٹکر کی طرف مشیر ہے۔

(۲) تلخیص کے چھٹے نکتے میں واضح ہوا کہ باطل' اپنے طریق کار سے' حق کے خلاف

مزاحمت کرتا ہے۔

(۳) تلخیص کے تیسرے نکتے سے معلوم ہوا کہ اہل حق اس مزاحمت کی بھرپور مزاحمت کرتے ہیں جو انتہائی آلام و شدائد پر مشتمل ہونے کے باعث نہایت درجہ تکلیف دہ اور صبر آزما حوصلہ ہے۔

یہ تین نکات بلاشبہ واضح کرتے ہیں کہ لفظ ہجرت کا اصل "ھ۔ج۔ر" حروف کا ایک ایسا مجموعہ ہے جو کسی بھی انقلابی تحریک کے مرحلہ تحریک یا تحریکی مرحلے میں داخل ہونے کو خود بخود واضح کرتا ہے۔ گویا آقائے دوجہاں ﷺ کی ہجرت خود بخود بالخصوص مدینہ کی ہجرت فی نفسہ حضور ﷺ کی عظیم تحریک انقلاب مصطفوی ﷺ کے چوتھے مرحلے، یعنی تحریکی مرحلے میں داخل ہو جانے کی کھلی دلیل ہے۔

(۴) تلخیص کے چوتھے اور پانچویں نکتے سے واضح ہوا کہ اس طریق کار سے (مزاحمت کی مزاحمت) کی تحسین، توثیق اور تفصیل لازم و امر بین ہے اور یہی وہ راستہ ہے جو کامیابی و کامرانی سے ہمکنار کر کے بالآخر انقلاب برپا کر دینے کی مکمل ضمانت فراہم کر سکتا ہے اور کرتا ہے بلکہ نتیجہ دو جمع دو چار کی طرح دنیا میں ہی دکھا دیتا ہے۔

غرضیکہ کلمہ ہجرت جس کا مصدر ہے یا جس سے مصدر ہے اس کے اپنے اندر انقلاب آفرینی، حق و باطل کی ٹکر، آخرکار حق کی بھرپور کامیابی اور باطل کی بدترین شکست کی ضمانت پر دلالت کا واضح معنوی پہلو رکھتا ہے۔

باب ۔ ۴

ہجرت کا معنی

اب تک ہم نے ہجرت کے اصل مادے (ھ ۔ ج ۔ ر) کے مختلف مشتقات کے معانی کتب لغت سے لے کر ان کے بعض فکری منطبقات کا بیان کیا ہے اب ہم خود لفظ ہجرت کا معنی لغوی بیان کرنا چاہیں گے۔

الھجر ۃ الخروج من ارض الی اخری و انتقال الافراد من مکان الی اخر سعیا وراء الرزق

ایک زمین سے دوسری کی طرف نکلنا اور رزق کے پیچھے کوشاں افراد کا ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونا ہجرت کہلاتا ہے۔

واصل الھجر ۃ عند العرب خروج البدوی من بادیتہ الی المدن

عربوں کے یہاں کسی دیہاتی شخص کا اپنے گاؤں سے کسی شہر کی جانب نکلنا ہجرت کی اصل ہے۔

وکذلک کل مخل بمسکنہ منتقل الی قوم اخرین بسکناہ۔

اسی طرح ہر وہ شخص جو اپنی جائے سکونت میں خلل ڈال کر دوسرے لوگوں کی طرف اپنی رہائش گاہ منتقل کرلے۔ (وہ مہاجر ہے)

الھجر ۃ مفارقۃ بلد الی غیرہ فان کانت قربۃ للہ فھی الھجر ۃ الشرعیہ

ہجرت (کا معنی) ایک شہر سے دوسرے شہر کی طرف چھوڑ (کر جانا) ہے اگر (یہ عمل) اللہ کے قرب کے حصول کے لئے ہو تو یہ ہجرت شرعیہ (کہلائے گی)

وسمی المھاجرون مھاجرین لانھم ترکوا دیارھم و مساکنھم التی نشوا بھاللہ و لحقوا بدار لیس لھم بھا اھل ولہ مال حین ھاجروا الی المدینہ.......

اور مہاجرین کا نام مہاجرین اس لئے رکھا گیا کہ انہوں نے اللہ کی خاطر اپنے شہروں گھروں اور رہائش گاہوں کو چھوڑ دیا تھا جن میں پیدا ہوئے اور پلے بڑھے تھے اور جب انہوں نے مدینہ کی طرف

ہجرت کی تو ایک ایسے ملک / شہر میں چلے گئے جہاں (پہلے سے) نہ تو انکا کوئی اہل خانہ تھا اور نہ کوئی مال ہی تھا۔

المهاجر الذی هاجر مع النبی ﷺ او الیہ

مہاجر وہ ہے جس نے نبی اکرم ﷺ کے ساتھ ہجرت کی یا آپ ﷺ کی طرف (آپکی سنگت حاصل کرنے کی خاطر) ہجرت کی۔

فکل من فارق بلدہ من بدوی او حضری او سکن بلدا اخر فھو مہاجر و الاسم منہ الھجرۃ

پس ہر وہ شخص خواہ دیہاتی ہو یا شہری جو اپنا شہر چھوڑے یا دوسرے شہر میں سکونت اختیار کرلے تو وہ مہاجر ہے اور اس سے اسم "ہجرت" ہے۔

و کل من اقام من البوادی بمبادیھم ومحاضرھم فی القیظ ولم یلحقوا بالنبی ﷺ ولم یتحولوا الی امصار المسلمین التی احدثت فی الاسلام وان کانوا مسلمین فھم غیر مہاجرین۔

اور تمام وہ لوگ جو جنگلی / صحرائی دیہاتوں میں اپنی حاجات وسامان سمیت ٹھہریں اور نہ تو نبی اکرم ﷺ سے آملے نہ مسلمانوں کے شہروں کی طرف ہی گئے جو اسلام (کی فتوحات) میں آگئے تھے وہ اگرچہ مسلمان ہی کیوں نہ ہوں، مہاجرین نہیں ہیں۔

نوٹ:۔ ان معانی لغویہ کو ہم نے مختلف کتب لغت سے لیکر یہاں بغیر کسی ترتیب کے بیان کیا ہے۔ مثلاً: **اللسان العرب، المعجم الوسیط، المنجد، القاموس المحیط، اقرب الموارد فی فصح العربیہ والشوارد، المصباح المنیر فی غریب الشرح الکبیر للرافعی اور الصحاح**........وغیرہ

ہجرت کے معانی ---- قرآن مجید میں

قرآن مجید میں لفظ ہجرت کئی مشتقات کی شکل میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً **تھاجروا۔ ھاجروا۔ مھاجر۔ ھاجرن**...... وغیرہ ان کا ایک خاکہ ہم ان شاء اللہ آخر باب میں بیان کریں گے۔ سردست ہمارے پیش نظر ہجرت کے وہ معانی ہیں جن میں اسے یا (ہ۔ ج۔ ر) کو قرآن مجید نے استعمال فرمایا ہے۔ ہم ترتیب کے ساتھ اس کا ذکر کرتے ہیں اور ان آیات کی تفسیر / معانی مختلف مفسرین کرام کی تصریحات سے عرض کریں گے۔

۱۔ سورۃ النساء ۴: ۳۴

اللہ جل شانہ نے ارشاد فرمایا۔

وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَھُنَّ فَعِظُوْھُنَّ وَاھْجُرُوْھُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْھُنَّ

اور تمہیں جن عورتوں کی نافرمانی و سرکشی کا اندیشہ ہو تو انہیں نصیحت کرو اور (اگر نہ سمجھیں تو) انہیں خوابگاہوں میں (خود سے) علیحدہ کر دو اور (اگر پھر بھی اصلاح پذیر نہ ہوں تو) انہیں (تادیباً ہلکا سا) مارو۔

اس آیہ کریمہ میں اللہ عزوجل نے کلمہ "**واھجروھن**" استعمال کیا ہے۔ مفسرین کرام کی چند تصریحات درج کی جا رہی ہیں۔

الجلالین

ای اعتزلوا الی فراش اخر او برقد معها ولکن یولیها ظهره ولا یجامعها۔ روایتان عن ابن عباس رضی اللہ عنہما

یعنی کسی اور بستر پر علیحدگی اختیار کرلو یا اس کے ساتھ ہی لیٹے لیکن اس کی طرف سے پشت پھیرلے اور اس سے جماع نہ کرے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے دونوں روایتیں آئی ہیں۔

تفسیر ابن عباس

واھجروھن فی المضاجع ای حولوا عنھن وجوھکم فی الفراش

یعنی بستروں میں (رہو اور) ان سے اپنے چہروں کو پھیرلو (یعنی انکی طرف پشت کرکے لیٹو)

الدر المنثور

حضرت امام جلال الدین سیوطیؒ اس لفظ کی تفسیر ماثورا کرتے ہیں۔

قال حماد یعنی النکاح۔ عن مجاہد واھجروھن فی المضاجع قال لا یقربھا عن ابن عباس لا تضاجعھا فی فراشک عن عکرمہ ----- قال الکلام والحدیث لیس بالجماع۔ عن السدی: یرقد عندھا ویولیھا ظھرہ ویطوھا ولا یکلمھا۔

امام حمادؒ نے فرمایا اس سے مراد وطی ہے (یعنی جماع نہ کرے) امام مجاہدؒ سے مروی ہے کہ "انہیں بستروں میں چھوڑ دو" یعنی اس کی قربت اختیار نہ کرو۔ حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے اپنے بستر میں اس کے ساتھ نہ لیٹو / اسے نہ لیٹاؤ۔ حضرت عکرمہؒ سے مروی ہے کہ بات چیت اور گفتگو، نہ کہ جماع (یعنی کلام ترک کرے نہ کہ مجامعت) امام السدیؒ سے مروی ہے اس کے ساتھ لیٹے اور پشت اس کی طرف پھیرلے اور وطی کرے اور گفتگو نہ کرے۔

الجامع لاحکام القرآن

وقال مجاھد جنبوا مضاجعھن ----- (واھجروھن) من الھجران وھو

امام مجاہد نے فرمایا (کہ معنی یہ ہے کہ) انکے بستروں سے اجتناب کرو ......

البعد یقال ھجرہ ای تباعدو نای عنہ ولا یمکن بعدھا الا بترک مضاجعتھا

واھجروھن ھجران سے ہے اور وہ دوری ہے (یعنی اس کا معنی دور ہونا ہے) کہا جاتا ہے۔ ھجرۃ یعنی اس سے دور ہوا اور دور ہونا ایک ساتھ لیٹنا ترک کیئے بغیر ممکن نہیں۔

روح المعانی

والمراد اترکوھن منفردات فی مضاجعھن فلا تدخلوھن تحت اللحف ولا تباشروھن فیکون الکلام کنایہ عن ترک جماعھن و الی ذلک ذھب ابن جبیر --------

اور مراد یہ ہے کہ انہیں ان کے بستروں میں تنہا چھوڑ دو۔ لہٰذا انہیں نہ تو اپنے لحافوں کے نیچے داخل ہونے دو اور نہ ان سے مباشرت ہی کرو۔ پس یہ کلام انکے جماع ترک کرنے سے کنایہ ہو گا۔ ابن جبیر بھی اسی معنی کی طرف گئے ہیں۔

درج بالا حوالہ جات اس آیت کے معنی سے متعلق دو آراء سامنے آئی ہیں۔

۱۔ نہ مجامعت نہ کلام---- دونوں کا ترک شدید ناراضی کا اظہار ہے۔

۲۔ مباشرت کرے مگر پھر بھی کلام ہرگز نہ کرے۔ یہ اس سے بھی زیادہ شدید غضب اور ناراضی کا اظہار ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرآن مجید کی اس آیت میں بیویوں کو انکے بستروں میں تنہا چھوڑ دینے سے مراد اپنی نہایت درجے کی ناراضی کا اظہار ہے۔

(ب) بمعنی ترک کلام: مفسرین کرام کی تصریحات کے مطابق اس جگہ پر یہ کلمہ "ترک کلام" کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے۔ کیونکہ انہوں نے اس سے مراد عدم کلام بھی لیا ہے۔

(ج) بمعنی ترک تعلقات: مفسرین کرام کی تصریحات کے مطابق ایک ممکنہ معنی اور بھی ہے اور وہ ہے ترک تعلقات خاص طور پر ان مفسرین کے قول پر جو ترک

مباشرت بھی مراد لیتے ہیں مکمل بائیکاٹ کی کیفیت کا اظہار ہوتا ہے یعنی اھجروھن اس سے مکمل ترک تعلقات اور بائیکاٹ کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے۔

۲۔ سورہ مریم '۱۹:۴۶

قرآن مجید کا یہ مقام حضرت سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی اپنے چچا آزر سے گفتگو کو بیان فرما رہا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت حق اس کے کانوں کو ناگوار گزرنے لگی تو اس نے تنگ کر اپنے غم و غصے کا اظہار کیا اور یہ الفاظ کہے۔ اگر تو باز نہ آیا تو میں تجھے سخت آلام و مصائب میں مبتلا کر دوں گا--- دوران گفتگو یہ کہنے لگا۔

وَاهْجُرْنِىْ مَلِيًّا اور ایک طویل عرصہ کے لئے تم مجھ سے الگ ہو جاؤ۔

مفسرین کرام نے اس جگہ بھی کلمہ "**واھجرنی**" کا معنی بیان کیا ہے۔ جلالین شریف میں ہے۔

(فاحذرنی) واھجرنی ملیا (دھرا طویلا) (مجھ سے بچ کر دور رہ) اور مجھے کچھ وقت (یعنی طویل مدت کے لئے چھوڑ دے)۔

اس میں کسی سے بچنے اور اپنی حفاظت کے لئے دور ہو جانے یا چھوڑ دینے کا معنی اختیار کیا گیا ہے۔

تفسیر روح المعانی

صاحب روح المعانی حضرت علامہ آلوسیؒ اس لفظ کا معنی بیان فرماتے ہیں:

ای فاحذرنی واترکنی ---- ای اھجرنی بالھجران والذھاب عنی ---- یعنی مجھ سے بچ اور دور رہ اور مجھے چھوڑ دے---- یعنی مجھ سے قطع تعلقات کر، مجھ سے دور چلا جا۔

انہوں نے بھی اس معنی "حذر" کو متضمن قرار دیا ہے یعنی اپنا بچاؤ کرنا۔

الدر المنثور

امام جلال الدین سیوطیؒ اس آیت میں لفظ "واھجرنی" کا معنی بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

عن ابن عباس فی قولہ واھجرنی ملیا اجتنبنی سالما

حضرت ابن عباسؓ سے اس قول کے معنی کے حوالے سے مروی ہے کہ **اھجرنی ملیا** یعنی سلامتی کے ساتھ مجھ سے پہلوتہی / کنارہ کشی کر جا۔

اس میں بھی اپنی سلامتی کی خاطر اجتناب یعنی پہلوتہی اور کنارہ کشی کا معنی پیش نظر ہے۔

تفسیر ابن عباس

تفسیر ابن عباسؓ میں اس مقام کی تفسیر یوں لکھی ہے۔

واعتزلنی مادمت حیا و یقال اترکنی و لاتکلمنی طویلا و تقال دھرا

اور جب تک میں زندہ ہوں مجھ سے کنارہ کش اور لاتعلق رہو اور کہا جاتا ہے کہ (معنی یہ ہے کہ) مجھے چھوڑ دو اور طویل زمانے تک کے لئے مجھ سے کلام (بھی) نہ کرو۔ اور کہا جاتا ہے کہ (معنی یہ ہے کہ) مجھ سے ہمیشہ کے لئے (قطع کلامی کرلو)

اس میں بھی کنارہ کشی لاتعلقی اور قطع کلامی کے معانی کا لحاظ رکھا گیا ہے۔
مختصر یہ کہ اس آیہ کریمہ میں اللہ تعالٰی نے یہ لفظ کسی سے اپنی سلامتی اور حفظ جان کے لئے اس سے کنارہ کشی، پہلوتہی، قطع کلامی اور ترک تعلقات نیز اسے یکسر مکمل طور پر چھوڑ دینے کے معنی میں استعمال فرمایا ہے۔

۳۔ سورہ مومنون ۲۳:۶۷

قرآن مجید کفار کے اس رویے کو بیان فرما رہا ہے جو انھوں نے آقائے دو جہاں ﷺ، آپ ﷺ کے صحابہ کرامؓ اور قرآن مجید کے حق میں اختیار کر رکھا تھا۔ ارشاد ہوتا ہے:۔

مُسْتَكْبِرِينَ بِهِ سَامِرًا تَهْجُرُونَ

ان سے سرکشی کرتے تھے (یہی) نہیں بلکہ) رات کو (حرم میں بیٹھ کر پیغمبر ﷺ اور قرآن کے متعلق طرح طرح کے) قصے گھڑتے اور بیہودہ بکواس کرتے تھے۔

ابن کثیر

اس آیہ کریمہ کا معنی بیان کرتے ہوئے تفسیر ابن کثیر میں یوں رقم ہے۔

الضمير للقران كانوا يذكرون القران بالهجر من الكلام انه سحر انه شعر انه كهانة الى غير ذالك من الاقوال الباطلة وقيل انه محمد ﷺ كانوا يذكرونه في سمرهم بالاقوال الفاسدة ويضربون له مثال الباطلة من انه شاعر او كاهن او ساحر او كذاب او مجنون

ضمیر قرآن کی طرف راجع ہے وہ قرآن مجید کا ذکر ناحق اور باطل کلام سے کیا کرتے تھے کہ یہ (معاذ اللہ) جادو ہے، یہ شعر ہے، یہ کہانت ہے وغیرہ دیگر اقوال باطلہ اور یہ قول (بھی) کہا گیا ہے کہ یہ (ضمیر کا راجع الیہ) حضرت محمد ﷺ ہیں۔ وہ (کفار) اپنی رات کی مجلس میں آپکا تذکرہ فاسد باتوں سے کرتے تھے اور آپکے لئے باطل مثالیں دیتے تھے کہ آپ شاعر ہیں یا کاہن ہیں یا جادوگر ہیں یا کذاب ہیں یا مجنون ہیں۔ **(نعوذ باللہ من ذالک)**

اس تفسیر میں مراد کلمہ فاسد کلام، باطل مثالیں، بہتان تراشی، کذب بیانی اور

اپنے اندر کا غبار نکالنے کے لئے بیہودہ کلامی اور یاوہ گوئی وغیرہ ہوئے۔

تفسیر ابن عباس رضی اللہ عنہ

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی تفسیر میں ہے:۔

تھجرون ای تسبون محمدا ﷺ واصحابہ والقران

تھجرون یعنی تم جناب محمد ﷺ کو گالیاں دیتے تھے اور (ساتھ ہی) آپکے اصحاب رضی اللہ عنہم اور قرآن کو بھی۔

انہوں نے اس سے مراد صراحتاً گالی گلوچ لیا ہے۔

جلالین

جلالین میں اس کلمہ کا معنی لکھا ہے۔

تھجرون من الثلاثی تترکون القران و من الرباعی ای تقولون غیر الحق فی النبی ﷺ والقران۔

تھجرون ثلاثی سے (ہو تو معنی ہے) تم قرآن کو چھوڑ دیتے ہو اور رباعی سے یعنی نبی ﷺ کے حق میں اور قرآن مجید کے بارے میں ناحق، باطل اور بعید از حقیقت بات کرتے ہو۔

اس میں بھی **تجھرون** کو غیر حق، باطل اور کذب کلام پر محمول کیا گیا ہے۔

روح المعانی

امام آلوسی بغدادی رحمہ اللہ اس آیت کی مختلف تفاسیر بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

وجوز ان یکون المعنی علیہ ان تھذون فی شان القران او النبی علیہ الصلوۃ والسلام او اصحابہ ...... وجوز ان یکون من الھجر بضم فسکون و ھو الکلام القبیح .....

اس بنا پر یہ معنی بھی درست ہوا کہ تم قرآن مجید اور نبی علیہ السلام یا اصحاب رضی اللہ عنہم کی شان میں اول فول بے معنی بکتے ہو یا ان سب کے حق میں بلا سمجھے بکواس کرتے ہو ..... اور یہ بھی درست ہوا کہ

فالمعنى تقطعون او تهذون او تفحشون كثيرا۔

یہ تهجرون هجر سے ہو اور وہ کلام قبیح ہے۔ یعنی اس کا معنی گندی گفتگو کرنا ہے...... پس معنی یہ ہوا کہ تم قطع کرتے ہو (کلام و تعلق) یا ہذیانی کیفیت میں اول فول بکتے ہو یا کثرت سے بیہودہ، گھٹیا اور فحش گفتگو کرتے ہو۔

انھوں نے اسے فحش کلامی، گالی گلوچ، ھذیانی کیفیت میں منہ سے جھاگ اڑانے اول فول بکنے اور فحش کلامی کے معنی میں لیا ہے۔

الدر المنثور

حضرت امام جلال الدین سیوطی "الدر المنثور میں اس کے مختلف معانی بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں۔

عن ابن عباس ..... قال تسمرون حول البيت و تقولون هجرا..... عن قتاده يتكلمون بالشرک و البهتان ..... وكان الحسن يقول .... تهجرون كتاب الله و نبی الله ايضا ..... تهجرون القران و ذكرى و رسولی۔

حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ فرمایا "رات کو کعبہ کے گرداگرد بیٹھ کر باتوں کی مجلس کرتے ہو اور بیہودہ گوئی کرتے ہو" حضرت قتادہؒ سے مروی ہے "شرک اور بہتان کی باتیں کرتے ہیں" حضرت حسنؒ فرمایا کرتے تھے (کہ معنی ہے) "اللہ کی کتاب اور اس کے نبی علیہ السلام کو چھوڑتے ہو"۔ آپؒ نے یہ بھی فرمایا "تم قرآن، میرے ذکر اور میرے رسول کو چھوڑتے ہو۔

عن مجاهد تهجرون بالقول السيئ فی القران

حضرت مجاہدؒ سے مروی ہے کہ "تم قرآن کے بارے میں گندی بات کرتے

ہو۔"

عن ابن عباس کان المشرکون یھجرون رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم فی القول فی سمرھم۔

حضرت ابن عباسؓ سے ایک روایت ہے "مشرک لوگ رات کی (مجلسوں کی) گفتگو میں رسول اللہ ﷺ کی شان اقدس میں نازیبا کلمات استعمال کرتے تھے۔ (نعوذ باللہ)

عن عکرمہ کانوا اذا سمروا ھجروا فی القول۔ ایضا قال تھجرون الحق

حضرت عکرمہؒ سے مروی ہے کہ جب وہ رات کو بیٹھ کر باتیں کرتے تھے تو بیہودہ گوئی پر اتر آتے تھے۔ آپؒ نے یہ بھی فرمایا کہ معنی ہے کہ تم لوگ حق کو چھوڑے دیتے ہو۔

امام سیوطیؒ نے اس عبارت میں **تھجرون** کے درج ذیل معانی بیان فرمائے ہیں۔

(۱) بیہودہ گوئی اور فحش کلامی

(۲) قرآن مجید، اللہ اور رسول ﷺ کو چھوڑنا اور اللہ کا ذکر ترک کرنا۔

(۳) شرک اور بہتان طرازی سے بھرپور کلام / بہتان تراشی

(۴) گالی گلوچ (نازیبا کلمات استعمال کرنا)

اس کے علاوہ، اس کے درج بالا تفاسیر میں مزید معانی بھی بیان کئے گئے ہیں مثلاً:۔

(۵) باطل اور غیر حق کلام کرنا۔

(۶) کذب بیانی۔

(۷) هذیانی کیفیت میں اول فول بکنا وغیرہ۔

اس آیت کریمہ کے اندر جو لفظ **تھجرون** استعمال ہوا ہے اس کے علاوہ اور بھی کئی مقامات ایسے ہیں جہاں اس لفظ کے کثیر استعمالات ہیں۔ سردست ہم صرف چار اور مقامات کا تذکرہ کریں گے۔

۴۔ الفرقان ۲۵: ۳۰

قرآن نے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے بارے میں فرمایا کہ آپ بارگاہِ الوہیت میں روز قیامت یہ کلمات عرض کریں گے۔

اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا — بے شک میری قوم نے اس قرآن کو "مھجور" بنالیا ہے۔

مھجورا یعنی ترک شدہ..... کا معنی کیا ہے۔ آیئے دیکھتے ہیں۔

جلالین

صاحب جلالین کی تفسیر میں یہ کلمات یوں آتے ہیں۔

مھجوراای مسبوبا متروکا (معرضا عنہ) — مھجور یعنی متروک مراد ہے اعراض کردہ شدہ یا جس سے منہ پھیرلیا گیا ہو۔

ابن عباسؓ

اسی طرح تفسیر ابن عباس کے الفاظ اس طرح ہیں۔

مھجورا ای مسبوبا متروکا لم یقروا بہ ولم یعملوا بما فیہ — مجور یعنی گالی دیا گیا، ترک کردیا گیا۔ نہ انہوں نے اس (کے حق ہونے) کا اقرار کیا اور نہ اس (تعلیم) پر عمل ہی کیا جو اس میں ہے۔

تفسیر ابن کثیر

امام ابن کثیرؒ اس کا معنی بیان فرماتے ہوئے لکھتے ہیں۔

وذالک ان المشرکین کانوا لا یصغون للقران و لا یستمعونہ کما قال تعالی (وقال الذین کفروا لا — اور (مجور ہونا) یہ ہے کہ مشرکین قرآن کو سنتے نہیں تھے اور نہ اس پر توجہ سے کان ہی دھرتے تھے۔ جیساکہ قرآن میں

تسمعوا هذا القران و الغوا فيه) فكانوا اذاتلى عليهم القران اكثروا والكلام حتى لايسمعونه فهذا من هجرانه وترك الايمان به من هجرانه و ترك تدبره و تفهمه من هجرانه و ترك العمل به من هجرانه والعدول عنه الى غيره من شعر او غناء او لهو من هجرانه۔

ہے اللہ تعالی نے فرمایا (اور کہا کفر کرنے والوں نے کہ اس قرآن کو نہ سنو اور بلکہ اسمیں زبان کو ٹیڑھا کرو) پس جب ان پر قرآن پڑھا جاتا تھا شور و غوغہ اور (اونچی آواز سے) گفتگو شروع کر دیتے تاآنکہ اسے سنتے ہی نہیں / سن ہی نہیں پاتے۔ پس یہ قرآن کا ترک کرنا ہے اور اس پر ایمان نہ لانا بھی اس کا ترک اور اسمیں غور خوض اور فہم و تدبر چھوڑ دینا بھی اس کا ترک ہے اور اس پر عمل نہ کرنا بھی / چھوڑ دینا بھی اس کا ترک ہے اور اس سے منہ پھیر کر کسی اور شئے۔ مثلاً شعر' گانا اور کھیل کود کی طرف دھیان دینا بھی اس کا ترک و ہجران ہے۔

اس میں ہے کہ عدم سماع' عدم تدبر و تفکر' اس پر ترک عمل اور اس کی طرف عدم توجہ کے علاوہ بالمقابل کسی اور شے کی طرف توجہ بھی ہجران کے معنی میں ہی آتا ہے۔

الدر المنثور

حضرت امام جلال الدین السیوطیؒ ارشاد فرماتے ہیں کہ اس آیت کا معنی ماثور یہ ہے۔

عن مجاهد ---- يهجرون فيه بالقول السئى ويقولون هذا سحر -----

ابراھیم النخعی کا فرمان ہے۔ وہ (کافر) اس (قرآن) کے حق میں غلط قسم کی بات

ابراہیم النخعی --- قالوا فیہ ھجیرا غیرالحق الم تروا المریض اذا ھذی قبل ھجر ای قال غیرالحق۔

کرتے تھے جو حق نہیں تھی کیا تم نے نہیں دیکھا کہ جب ایک مریض ہوش وبیہوشی کے مابین بے دھیانی میں اول فول بکتا ہے تو کہا جاتا ہے **ھجر**، یعنی وہ بات کی جو حق نہیں۔

اس میں بھی دروغ گوئی، کذب بیانی اور غیر حق گفتگو کا معنی لیا گیا ہے۔

تفسیر روح المعانی

علامہ آلوسی البغدادی" فرماتے ہیں۔

ای متروکا بالکلیۃ و لم یومنوا بہ ولم یرفعوا الیہ راسا ولم یتاثروا بوعیدہ و وعدہ فمھجور من الھجر بفتح الھاء بمعنی الترک و ھوالظاھر و روی ذلک عن مجاھد والنخعی و غیرھما

یعنی کلی طور پر چھوڑ دیا گیا اور نہ اس پر ایمان لائے نہ اس کی طرف کوئی توجہ ہی دی، نہ اس کے وعدہ و وعید سے کوئی اثر ہی لیتے۔ پس مھجور، **ھجر** سے ہے جو ترک کے معنی میں ہے اور یہی ظاہر ہے۔ یہ معنی امام مجاھد" اور امام" نخعی وغیرہ سے مروی ہے۔

وقیل...... ای جعلوہ مھجورا منہ اما علی زعمھم الباطل فھو ما قالوا انہ اساطیرالاولین اکتتبھا و اما ان ھجروا فیہ ورفعوا اصواتھم بالھذیان لما قری لئلا یسمع کما قالوا الا تسمعوا لھذا القران الغوافیہ..........

اور کہا گیا ہے..... یعنی انھوں نے اسے متروک بنا لیا یا تو اپنے زعم باطل پر (یعنی اسے باطل سمجھتے ہوئے) جیسا کہ انہوں نے کہا "یہ پرانے لوگوں کے قصے ہیں" جو اس (آقا علیہ السلام) نے لکھ لئے ہیں۔ یا پھر یہ کہ اس کے بارے میں ناحق کلام کے ذریعے اپنی آوازیں ھذیانی کیفیت میں بلند کرتے جبکہ قرآن

پڑھا جارہا ہوتا تاکہ اسے سنا نہ جاسکے جیساکہ انہوں نے خود کہا اس قرآن کو توجہ سے نہ سنو اور اپنی زبان کو ٹیڑھا کر کے پڑھو۔

وجوز ان یکون مصدر من الهجر بالضم کالعقول بمعنی العقل و المجلود بمعنی جلادۃ ای اتخذوہ نفس الهجر و الهذیان

اور یہ بھی جائز ہے کہ ھجر سے مصدر ہو جیسے معقول بمعنی عقل مجلود بمعنی جلادۃ یعنی انہوں نے قرآن ہی کو (اپنی کم عقلی کج فہمی اور بدبختی کی بنا پر) لغو و حذیانی کلام سمجھ لیا ہے۔

تصریحات درج بالا سے معلوم ہوا کہ اس آیت میں (ھجر) کا کلمہ ترک کرنے' اعراض کرنے' توجہ نہ دینے' عدم سماع' عدم تدبر و تفکر' کذب بیانی' دروغ گوئی' غیر حق کلام باطل وغیرہ کے معانی میں مستعمل ہے۔ امام قرطبیؒ نے بھی اس کے دو معنی بیان کئے ہیں۔

(۱) اس کے بارے میں غلط بیانی کرنا یعنی کہنا کہ یہ شعر جادو وغیرہ ہے۔

(۲) **مھجور** بمعنی متروک ہے یعنی چھوڑ دینا اور ترک کر دینا بھی ایک معنی ہے۔

۵۔ سورہ المزمل' ۷۳:۱۰

اللہ تبارک و تعالیٰ قرآن مجید میں کفار و مشرکین کی شدید مزاحمت حق کی مزاحمت کے ابتدائی مرحلے پر جبکہ ابھی مراحل دعوت و تربیت جاری تھے اور تحریک کی باقاعدہ تنظیم سازی اور تحریکی مرحلے میں داخل کرنے کا ابھی مناسب وقت نہیں آیا تھا نہایت عمدہ طریق پر اپنے حبیب علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تربیت بھی فرماتا ہے اور مختلف ہدایات بھی فرماتا ہے کہ بیک وقت کردار سازی بھی ہو اور تحریک انقلاب مصطفوی اپنی منزل کی طرف قدم بھی بڑھاتی رہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ اور جو کچھ وہ کہتے ہیں اس پر صبر کیجئے

هَجْرًا جَمِيْلًا — جائیے اور وضع داری کے ساتھ ان سے الگ رہتے۔

امام ابن کثیر اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:۔

يقول تعالى امرا رسوله صلى الله عليه و سلم بالصبر على ما يقوله سفهاء قومه و ان يهجرهم هجرا جميلا اى لا عتاب معه

اللہ تعالیٰ اپنے نبی ﷺ کو اپنی قوم کے نادان لوگوں کے باطل کلام (طعن و تشنیع وغیرہ) پر صبر فرمانے کی تلقین فرما رہے ہیں اور یہ بھی کہ ان کو اچھے طریقے سے چھوڑ دو یعنی ایسے کہ جس کے ساتھ ناراضی یا سزا نہ دی جائے۔

واضح رہے کہ اس مقام پر لفظ **هجر** محض چھوڑ دینے کے معنی میں نہیں بلکہ سزا کے حقدار کو سزا نہ دینا اور اس سے صرف نظر کر کے اسکو اس کے حال پر چھوڑ دینے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

تفسیر ابن عباس ؓ کے الفاظ یوں ہیں:۔

واصبر (يامحمد) على مايقولون (من الشتم و التكذيب) واهجرهم هجرا جميلا (اعتزلهم اعتزالا جميلا بلا جزع و لا فحش)۔

اور (اے محمد ﷺ!) وہ (کفار) جو (شتم و تکذیب) کہتے ہیں (گالی گلوچ وغیرہ کرتے ہیں) تم اس پر صبر کرو اور انھیں اچھے طریقے سے چھوڑ دو (یعنی ان سے ایسے اچھے طریق پر پہلو تہی، کنارہ کشی، اجتناب اور صرف نظر کر جاؤ کہ نہ ان کے لئے باعث جزع و خوف و ملامت ہو اور نہ ہی بدکلامی)۔

اس مقام پر تفسیر ابن عباس ؓ کے مطابق بھی معنی صرف نظر کرنا، اہمیت نہ دینا یا معاف کر دینا ہوا کیونکہ علیحدگی اختیار کر لینا۔ (اور پھر اس خاص مخاصمت کے ماحول میں

جبکہ دشمن کو مزید زچ کرنے' پر پرزے نکالنے کی دعوت بھی دینا ہو کہ اس سے اپنے تحریکی وفاداروں اور انقلابی کارکنوں کی فکری' نظریاتی اور عملی تشکیل سیرت اور کردار سازی کرنے جیسے عظیم فوائد حاصل ہوتے ہیں) دشمن کو تمام تر کاوشوں کے باوجود اہمیت نہ دینے اور (مشکلات کے بڑھتے ہوئے انبار اور کانٹوں بھری راہ میں اپنی مثبت کاوشوں میں کسی طرح کی کوئی کمی نہ کرنا اور نہ ہی مایوسی کا اشارہ بھی دینا) اسے اپنے ہی غیظ وغضب میں جل مرنے کی کھلی دعوت کے مترادف ہے۔ یہ ایک ایسی حکمت عملی ہے جس کو ایک انقلاب آشنا بہتر سمجھ سکتا ہے اور ایک ایسی صورت حال ہے جس سے انقلابات کے مزاج وطبع فطری کو سمجھنے والا شخص ہی لطف اندوز ہو سکتا ہے۔

الدر المنثور

حضرت امام سیوطیؒ اسکا معنی بیان کرتے ہیں:۔

عن ابن جریج..... اصفح و قل سلام ابن جریجؒ سے مروی ہے کہ ..... (معنیٰ یہ ہے کہ) صرف نظر کرو اور کہو "سلام"۔

یہ معنی نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ خاص طور پر ایک انقلاب اور انقلابی نقطہ ہائے نگاہ میں ایک نہایت اہم سنگ میل ہے اور تاریخ انقلاب میں ایک دینی اور لادینی انقلاب کے بنیادی اسباب محرکات اور طبع ومزاج اور اساسی فکر نیز اساس فکر کے مابین ایک فرق اور حد فاصل قائم کر رہا ہے۔

باب-۵

دینی اور لادینی انقلاب میں فرق

دینی اور لادینی انقلاب میں فرق بہت بڑا اور نہایت واضح ہے بنیادی فکر کا یہی فرق ہے جو ایک دینی انقلاب کو ہی حقیقی نفع بخش اور دائم وپائیدار انقلاب بناتا ہے جبکہ ایک لادینی (Secular) انقلاب کو عارضی' ناپائیدار اور غیرنافع انقلاب کی شکل عطا کرتا ہے۔ یہ فرق بھی ان بنیادی فروق میں سے ایک ہے جن کی بنا پر ہم بجاطور پر کہہ سکتے ہیں کہ انسانیت کو جو انقلاب درکار تھا' ہے اور ہمیشہ رہے گا وہ ایک خالص دینی انقلاب ہے اور اس کا ایسے افراد کے ہاتھ پر آنا جو خود خالص دینی اور بالخصوص "زبر دست روحانی" انسان ہوں۔ دین کی مادی تشریح کے دلدادہ تجدد پسند اور خودساختہ مجتہدین بن کر دین سے روحانیت کو خارج کر کے اسے محض مادیت (Materialism) اور لادینیت (Secularism) نہ بنا کر رکھدیں۔ تاریخ کا مشاہدہ ہے کہ ایسے تجدد پسند جو روحانیت اور روحانیت کی چاشنی سے عاری ہوں بالاخر تجدد پسند سے تشدد پسند بن جاتے ہیں۔ دیگر بہت سارے فروق کی طرح ایک فرق وہ بھی ہے جس پر یہ معنیٰ دلالت کرتا ہے۔ اور وہ فرق ہم ذیل میں بیان کرتے ہیں۔

ردعمل اور اصلاحی تحریک

اگر ہم انقلابات کی تاریخ اٹھائیں تو سرسری مطالعہ ہی سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انقلاب جو کہ ایک تبدیلی کا نام ہے کسی نہ کسی بگاڑ کی بنیاد پر آتا ہے۔ اگر بگاڑ نہ ہو تو یقیناً انقلاب کی ضرورت بھی نہ ہو اور نہ کوئی شخص قیامت تک کسی تبدیلی کے لئے ہی اٹھے۔

تبدیلی کی ضرورت کیوں

رہا یہ سوال کہ تبدیلی کی بنیاد کیا ہے اور اسکی ضرورت کس اساس پر محسوس کی جاتی ہے تو واضح ہے کہ اس دنیا میں ازل سے ابد تک کے لئے مفادات کی جنگ جاری ہے۔ ہمیشہ کچھ لوگوں کے مفادات چھینے جاتے ہیں جبکہ بعض لوگ مفادات کو

لوٹنے اور حق چھین لینے والے ہوتے ہیں جنکا حق چھینا جاتا ہے وہ مظلوم کہلاتے ہیں اور حق کے لوٹنے والے ظالم ہوتے ہیں۔ یہ بات مسلم ہے کہ ہوس اور ظلم کی آخری کوئی حد نہیں ہوتی

ہر ظلم کی توفیق ہے ظالم کی وراثت
مظلوم کے حصے میں تسلی نہ دلاسہ

مظلوم کی صفات

مظلوم کے اندر بالعموم چند صفات ایسی ہوتی ہیں جو اس پورے طبقے کو مظلوم بناتی ہیں۔ مثلاً

(۱) مجبوری و مقہوری
(۲) کمزوری
(۳) بزدلی
(۴) بے حسی
(۵) بے شعوری وغیرہ

غلامی یا محکومی اولاً انسان کو مجبور و مقہور بناتی ہے جس سے اس میں اپنے کمزور ہونے کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ یہ احساس اولاً اسے واقعتاً کمزور بناتا ہے پھر اس کے اندر بزدلی کے لئے راہ ہموار کرتا ہے۔ یہ بزدلی ابتداً صرف خوف کی حد تک رہتی ہے پھر عادت بن کر اسکو جذباتی طور پر بے حس بناتی ہے اگر اسے مسلسل دبایا جائے یا علم سے دور رکھدیا جائے تو آخر کار بے شعوری پر منتج ہوتی ہے۔

رد عمل

یہ بات اسی طرح چلتی رہتی ہے جس سے ظالم ظالم تر اور مظلوم مظلوم تر بنتا چلا جاتا ہے۔ حاکم رفتہ رفتہ اسے مجبور تر، کمزور تر، بزدل تر، بے حس تر اور مزید بے شعور بناتا چلا جاتا ہے۔ اور وہ لٹنا شروع ہوتا ہے۔ اس مقام پر قانون فطرت یہ ہے کہ

اللہ رب العزت ہر قوم میں کچھ باشعور اور جرأتمند افراد ضرور پیدا کرتا ہے جو قوم میں شعور پیدا کرنے کی جرأت کرتے ہیں اور اپنی جان ومال' عزت و آبرو سب کچھ داؤ پر لگا کر بھی قوم کی خدمت سے پیچھے نہیں ہٹتے۔ جب حقدار کو حق دینے کی بات ہوتی ہے تو مفاد پرست اس کے خلاف مزاحمت کرتے ہیں اور ظلم میں اضافہ کر دیتے ہیں۔ یہ عمل قوم کو ظلم کے خلاف کھڑا کرنے میں بہت مددگار ہوتا ہے اور جتنی شدت سے ظالم اور مستبد انہیں دباتا ہے اسی قدر شدت سے وہ ابھرتے اور حق لینے کی خاطر سر اٹھاتے ہیں۔ آخرکار اپنا حق لیکر چھوڑتے ہیں جبکہ ظالم کو نیست و نابود کر دیتے ہیں۔

اس گفتگو سے اتنا تو واضح اور اظہر من الشمس ہو گیا کہ انقلاب ایک رد عمل ہوتا ہے نیز یہ کہ ایک انتہا کا جواب انقلاب کہلاتا ہے۔

تفریقی مقام (Distinguishing Point)

یہ ایک امر مسلمہ ہے کہ ایک انتہا کا جواب بھی انتہا پر منتج ہوتا ہے اور یہ بات بھی ناقابل تردید حقیقت (Undeniable Fact) ہے کہ انقلاب خواہ دینی ہو یا دنیاوی۔ ایک رد عمل ہوتا ہے جو خود ایک انتہا (درجے کے بگاڑ) کا جواب ہوتا ہے۔

اب انقلاب دو طرح کا ہو سکتا ہے۔

(۱) یہ ایک انتہائی ظلم کے جواب میں خالص انتقامی کارروائی ہو۔

(۲) یہ ایک انتہائی ظلم کے جواب میں خالص اصلاحی کارروائی ہو۔

(۱) انتقامی کارروائی محض مادیت پرستی ہے۔ نہ یہ روحانی الذھن لوگوں کے ہاتھ سے آتا ہے اور نہ کسی بھی درجے میں نفع بخش ہی ہو سکتا ہے۔ بلکہ یہ خالص تخریبی عمل ہے جس کے نتیجے میں ملک کی مکمل تباہی اور قوم کی "بھرپور" قسم کی بربادی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔

(۲) اگر یہ اصلاحی کارروائی ہے تو اسکے برپا کرنے والے دو میں سے ایک ہونگے:۔

(۱) غیر روحانی الذھن (Non Spiritual Minded)

(ب) روحانی الذھن (Spiritual Minded)

(ا) اگر غیر روحانی الذھن لوگ اسے لیڈ (Lead) کر رہے ہوں تو وہ کسی بھی طرح خود کو انتقامی کارروائی سے نہیں بچا سکتے وہ ضرور بالضرور بھرپور کوشش کریں گے کہ سابقہ ظالم کو مظلوم بنا دیا جائے اور اسے خوب اچھی طرح مزہ چکھایا جائے اور کچھ نہ سہی تو اسی گراؤنڈ (Ground) پر انھیں ظلم کا نشانہ بنایا جائے کہ انہیں انکے کئے کی سزا دی جائے۔ اگر سزا کا انتخاب ایک ایسے انسان کے سپرد (یا ایسے انسانوں) کے سپرد کر دیا جائے جو ایک عرصہ تک مظلوم اور مضطرب (Frustrated) رہا ہو تو وہ کبھی بھی ہرگز ہرگز حد اعتدال پر نہیں رہ سکتا۔ وہ نفسیاتی طور پر ظالم کے ظلم اور مظلوم کی مظلومیت کے تصور ہی سے مجبور ہو گا اور انصاف کے نام پر ایک مرتبہ پھر ظلم کا آغاز کر دے گا۔ یہ انقلاب انسان کی مادی غیر روحانی اور غیر نظریاتی نفسیات کی بھینٹ چڑھ جائیگا لہٰذا نہ تو صحیح معنی میں نفع بخش ہو گا اور نہ یہ کسی بھی طرح سچے عدل وانصاف پر ہی مبنی ہو سکتا ہے۔ یہ آخر کار خالص مادی انقلاب ہی کی طرح نہ تو مستقل اور پائیدار ہو سکتا ہے۔ اور نہ خود کو طبقات سازی اور طبقاتی کشمکش سے ہی بچا سکتا ہے بلکہ محض مفادات کے ٹکراؤ اور اس کے نتیجے میں انتقامی کارروائی سے زیادہ حیثیت نہیں حاصل کر سکتا۔ اس کا تفصیلی ذکر آگے آئے گا۔ غیر روحانی الذھن راہنما کبھی بھی مکمل نفع بخش نہیں ہو سکتا اور بالاخر مفاد پرستی کا مظہر ثابت ہو کر اپنی ناپائیداری' عوامی مفادات کے نقصان اور طبقات کی تشکیل پر منتج ہو کر ناکامی کا منہ دیکھتا ہے۔ لہٰذا ایک اور تبدیلی کے لئے پیش خیمہ بنتا ہے۔ یعنی آخری نتیجہ تخریب ہوتا ہے۔

مندرجہ بالا اقسام انقلاب غیر مذہبی' غیر روحانی اور لادینی ہیں۔

(ب) اگر انقلاب بپا کرنے والے روحانی الذھن لوگ ہوں تو ان کا بپا کردہ انقلاب لادینی نہیں بلکہ مذہبی ہو گا۔ اور مذہبی میں خشک مادیت والا نہیں بلکہ خالص روحانیت والا ہو گا۔ اب یہ بات روحانیت کے مسلمات میں سے ہے کہ روحانیت کو کمال ہی دو باتوں سے ملتا ہے۔

(۱) اللہ کے ارادے اور مشیت میں گم ہو جانا۔ یہ چیز انہیں اپنے ارادے اور ذاتی خواہش اور جذبات سے یا کم از کم انکے غلبے سے پاک کر دیتی ہے جس کا معنی یہ ہے کہ وہ ظالم کو سزا دینے کے لئے انسانی خواہش اور نفسیات کے پابند نہیں ہوتے۔ لہٰذا جوابی ظلم سے نجات مل جاتی ہے اور مشیت الٰہی کے مطابق مخلوق کی ہمہ جہت نفع بخشی ہی ان کے پیش نظر رہ جاتی ہے۔

(۲) اس پر مزید رہی سہی کسر اللہ رب العزت کی بارگاہ سے اس روحانی کمال اور قرب کا وعدہ پورا کر دیتا ہے جو انہیں معاف کر دینے کے عمل سے نصیب ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ بات انہیں ہر طرح کی انتقامی کارروائی سے کلیتاً پاک کر دیتی ہے۔ لہٰذا انقلاب حقیقی ہوتا ہے یعنی کامیاب' نفع بخش' عدل و انصاف پر مبنی اور سراسر منفعت و تعمیر مسلسل ثابت ہو گا۔

یہ ایک کامیاب انقلاب کے لئے نہایت ناگزیر بات ہے کہ وہ اپنے دشمنوں اور مخالفوں سے صرف نظر کر کے انہیں وہ کلمات کہہ سکے جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فتح مکہ کے موقع پر انقلاب مصطفوی ﷺ کے دشمنوں کو ارشاد فرمائے تھے۔

لا تثریب علیکم الیوم اذھبوا و انتم الطلقاء آج تم سے باز پرس نہیں ہوگی اور تم آزاد ہو۔ (الزرقانی علی المواہب؛ ۲:۳۰۲)

یہ وہ عظیم انقلابی فکر تھی جس کی بنیاد پر اللہ جل مجدہ نے حضور علیہ الصلوۃ والسلام سے فرمایا۔

واھجرھم ھجرا جمیلا..... یعنی...... اصفح و قل سلام انہیں معاف کر دو اور کہو تم پر سلامتی ہو

اس معنی کے اعتبار سے معلوم ہوا کہ قرآں مجید نے لفظ ھجر کو قرآن کی انقلابی فکر کے ایک امتیازی اساسی جزو کو بیان کرنے کے لئے بھی استعمال فرمایا ہے۔ اور وہ اساس یہ ہے کہ انقلاب دینی' روحانی اور اصلاحی مبنی بر عفو و درگزر ہونا چاہیے۔

روح المعانی

علامہ آلوسیؒ اس کا معنی بیان فرماتے ہیں۔

واھجرھم ھجرا جمیلا بان تجانبھم تداربھم ولاتکافئھم و تکل امورھم

انہیں اچھے طریق پر چھوڑ دو۔ اس طرح کہ ان سے ایک طرف کو (کنارہ کش) ہو جاؤ اور ان کی خبر گیری (مدارات' یعنی مراد یہ کہ نفع بخشی) رکھو اور انہیں (انکے برے سلوک کا) بدلہ (بصورت برائی جیساکہ انہوں نے کی) نہ دیں اور انکے معاملات کو انکے رب کے سپرد کر دو۔

علامہ آلوسیؒ کے بیان کردہ معنی نے بھی اس بات ہی کی تائید کی کہ ایک دینی انقلابی قیادت کو ہرگز ہرگز اس بات سے غرض نہیں ہوتی کہ مخالف' رجعت پسند یا کافر نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا' اسے صرف اس بات سے غرض ہوتی ہے کہ "اسے کیا کرنا ہے؟" اور "اسکی ذمہ داری کیا ہے؟" دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہئے کہ انقلاب اگرچہ ایک رد عمل ہوتا ہے مگر انقلاب کی حکمت عملی اور دینی انقلابی قیادت کے وہم و گمان اور حاشیہ خیال میں بھی یہ بات نہیں ہونی چاہئے کہ اس نے اپنے عمل و کردار کی بنیاد مخالف کے عمل پر رکھنی ہے یعنی حکمت عملی انتقام والی نہیں بلکہ جذباتیت کے غلبے سے ہٹ کر حسن خلق اور جدال احسن والی ہونی چاہئے۔

وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ (النحل '۱۶:۱۲۵)

اور ان سے بحث (بھی) ایسے انداز سے کیجئے جو نہایت حسین ہو۔

مراد یہ ہے کہ اگر مخالف کے ساتھ جدال بھی ہو تو تمہارا کردار حسن خلق اور عمدہ حکمت عملی پر مبنی ہونا چاہئے۔

ایک بار پھر یہ بات دہرا دینی چاہئے کہ یہ خصوصیت دینی ذہن میں مطلقاً نہیں ہوتی بلکہ انہیں دینداروں میں پیدا ہوتی ہے جو صوفیاء کرام کے طریق پر چلے۔ بلکہ سچی فکری و عملی انقلابیت پیدا ہی صوفیاء کے ذریعہ سے ہوتی ہے۔ اسلام کی تاریخ میں خلفائے راشدینؓ، ائمہ اربعہ فقہ، ائمہ تصوف پھر امام غزالیؒ، حضرت شیخ مجددؒ سے آخر شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ تک سب صوفیاء ہی ہوئے ہیں اور ان کے بعد جو صوفیاء کی راہ سے ہٹا وہ نہ آج تک اصلاح احوال کر سکا ہے نہ مطلوبہ انقلاب لا سکا ہے اور نہ وہ قیامت تک کبھی ایسا کر سکتا ہے۔ کیونکہ سنت نبوی پر عمل کئے بغیر ہرگز ہرگز کوئی کامیاب نہیں اور سیرت مصطفےٰ ﷺ کا کامل ترین نمونہ تصوف ہی سے میسر آسکتا ہے۔

القرطبی

امام قرطبیؒ اپنی تفسیر میں اس آیت کے معانی بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

ای لا تتعرض لهم ولا تشتغل بمكافاتهم یعنی ان سے تعرض نہ کرو اور انہیں برابر کا بدلہ دینے میں مشغول نہ ہو۔

عدم اشتغال اور عدم تعرض مجموعی طور پر اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ امام قرطبیؒ کے نزدیک سرے سے ذاتی مخالفین سے بھرپور بدلہ لینے کی طرف دھیان بھی نہیں کرنا چاہئے اور اس کی وجہ ظاہر ہے کہ اس طرح انقلابی قیادت انقلاب سے انتقام تک آنے میں ذارسی دیر بھی نہیں لگاتی۔

غرض کہ قرآن مجید نے سورہ مزمل کی اس آیت میں کلمہ **"هجر"** کو ایک انقلاب عظیم الشان (جو حقیقی معنی میں واقعی نفع بخش انقلاب ہو) کی دینی اور روحانی الذهن ہونے کی خصوصیت کو بیان فرمایا ہے جب کہ یہی لفظ ایک دینی و لادینی انقلاب کے مابین مابہ الامتیاز امور میں سے ایک بنیادی خصوصیت کو بھی بیان کر رہا ہے۔

اگر ہم ایک نظر اور ڈالیں تو خلاصہ یہ سامنے آتا ہے کہ اس مقام پر **"هجر**

مختلف پس منظر کے حامل معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

(۱) سزا کے حقدار کو سزا نہ دینا اور اس کو اسکے حال پر چھوڑ دینا

(۲) باطل جب حق کی مزاحمت کرے تو اسکی پہاڑ جیسی شدائد انگیز کاوشوں کو بھی لایعنی، بے معنی اور غیر اہم سمجھنا اور کوئی نوٹس نہ لینا بظاہر اس سے صرف نظر کر کے اپنے کام میں مشغول رہنا۔

(۳) عفو و درگذر کو انقلابیوں کے لئے لازمی طور پر انکی طبائع کا حصہ بنانا تاکہ ایک طرف تو انقلاب کو انتقامی کارروائی بننے سے روکا جائے اور دوسری طرف تمام تر قوتوں کو محض تعمیر پر صرف کیا جائے۔

ہم نے ہجرت کے اصل "ھجر" کے مختلف معانی لغت اور پھر قرآن مجید میں سے بیان کئے ہیں تاکہ اندازہ ہو جائے کہ وہ کلمہ جس سے "ھجرۃ" بنا ہے اپنے ظاہر و باطن میں کس قدر انقلاب آفرین ہے۔ اور انقلاب کے حوالے سے لفظ ہجرت کے اندر کس قدر معنی آفرینی پائی جاتی ہے۔

جہاں لغتاً اس کے معنی میں انقلابیت کا مس پایا جاتا ہے وہاں خود قرآن مجید نے بھی اسے انقلابی پس منظر میں بیان و استعمال فرمایا ہے۔

اسی طرح یہ لفظ حدیث پاک میں بھی نہایت انقلابی معنی میں استعمال ہوا ہے۔

آقائے نامدار ﷺ ارشاد فرماتے ہیں جیسا کہ روایت سیدنا فاروق اعظمؓ میں ہے۔

انما الاعمال بالنیات و انما لامری ما نوی فمن کانت ھجرتہ الی الدنیا یصیبھا او الی امراہ ینکحھا فھجرتہ الی ما ھاجر الیہ

(صحیح البخاری، ۱:۲)

بے شک اعمال (کے نتائج اچھے یا برے) تو صرف نیتوں کے ساتھ ہیں اور ہر شخص کے لئے صرف وہی کچھ ہے جس کی اس نے نیت کی۔ تو جس کی ہجرت دنیا کی طرف ہو کہ اس کو پہنچے یا کسی عورت کی طرف ہو کہ اس سے نکاح کرے تو اس کی ہجرت اسی کی طرف ہے جس کی طرف اس نے ہجرت کی۔

حضور نبی اکرم ﷺ نے دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

المهاجر من هاجر مانهى الله عنه "مہاجر وہ ہے کہ جس نے وہ سب کچھ چھوڑ دیا جس سے اللہ تعالیٰ نے روک دیا۔"

(صحیح البخاری ۱، ۱:۶)

اس حدیث سے درج ذیل باتیں معلوم ہوئیں۔

ہجرت کا معنی حق اور باطل میں واضح تمیز کرنا اور باطل سے انفرادی سطح پر مکمل منہ موڑ لینا اور اجتماعی سطح پر اسے جلاوطن کر دینا یا دیس نکالا دے دینا ہے۔

باب-٦

ہجرت انقلاب کا اساسی رویہ

ہجرت انقلاب کے اساسی رویے ہی مرتب نہیں کرتی بلکہ ایک عظیم الشان انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔ ہجرت کی تعبیر روح انقلاب کے معنوں میں بھی کی جا سکتی ہے کیونکہ انقلاب کا رخ ہجرت کے حوالے سے متعین ہوتا ہے۔ حضور ﷺ کی سیرت طیبہ کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خود تاجدار کائنات ﷺ نے بھی ہجرت کو انقلاب کے معنوں میں لیا ہے اور لفظ مہاجر کو ایک انقلابی کے مفہوم اور تصور سے ہم آہنگ کیا ہے۔ ہجرت انقلاب ہے اور مہاجر ایک انقلابی' گویا مہاجرت کے عمل سے گزرے بغیر کسی انقلاب سے نظریاتی اور عملی وابستگی کا دعویٰ کیا ہی نہیں جا سکتا۔ "ما نهى الله" کے الفاظ نہ صرف انقلاب کی فطرت' اس کے مزاج اور اس کی حقیقی روح کے مفہوم کو اجاگر کر رہے ہیں بلکہ انقلاب کی مختلف سمتوں کا تعین بھی ہو رہا ہے اور اس کے مقاصد جلیلہ پر بھی روشنی پڑ رہی ہے۔

(۱) یہ انقلاب ایک نظریاتی انقلاب ہو' واضح اہداف اس کے سامنے ہوں اور پوری شرح و بسط کے ساتھ مقاصد کی نشاندہی کی گئی ہو۔

(۲) جس نظریئے پر انقلاب کی بنیادیں اٹھائی جائیں وہ انسان کے ذہن کی پیداوار نہ ہو بلکہ یہ نظریہ اور ضابطہ حیات اس کائنات رنگ و بو کے مالک حقیقی کا عطا کردہ ہو۔

(۳) انقلاب لانے والے روحانی پس منظر رکھتے ہوں۔

(۴) انقلاب من جانب اللہ ہو بالفاظ دیگر انقلاب مصطفوی ہو۔

(۵) سب سے اہم نکتہ یہ ہے کہ یہ ایک ایسا انقلاب ہو جو بندے کو اپنے رب کی دہلیز پر لے جائے۔ وہ ایک ہمہ جہت انقلاب ہو اور اس کا رخ کسی اور طرف نہ موڑا جا سکے۔

کامیابی کا انحصار جدوجہد کی نتیجہ خیزی پر ہوتا ہے۔ اگر مطلوبہ اہداف حاصل نہ ہوں تو ایسی جدوجہد کو تضیع اوقات کے سوا کوئی دوسرا نام نہیں دیا جا سکتا۔ یہ نہ صرف وسائل کا ضیاع ہوتا ہے بلکہ افرادی قوت کا بھی ناقابل تلافی نقصان ہوتا ہے۔ اس کار رائیگاں سے راہ انقلاب کے مسافروں کو مایوسی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

مایوسی جمود کو جنم دیتی ہے اور جمود ضد ہے تحریک کی۔ کسی انقلاب کے حقیقی انقلاب ہونے کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ وہ انقلاب افراد کو جسمانی اور روحانی نشاط و کیف ہی سے ہمکنار نہ کرے بلکہ فرد کے کردار کی تشکیل اور اس کی شخصیت کی تعمیر کا فریضہ بھی سرانجام دے۔ نری مادیت یا زاہد خشک والا معاملہ نہ ہو۔ اگر معاش و معاد اور دنیا و آخرت میں بگاڑ کی اصلاح نہ ہو تو جسم اور روح کے متضاد معاملات میں توازن پیدا نہیں ہو سکتا۔ اگر یہ توازن پیدا نہ ہو تو اس کے نتائج مطلوبہ نتائج سے بہت مختلف ہو سکتے ہیں۔ مثلاً

(الف) مادیت کا غلبہ ہوگا۔ انسانی معاشرہ حیوانی معاشرہ میں تبدیل ہو جائے گا، انسان مفادات کا قیدی بن کر رہ جائے گا، نتیجہ تخریب محض ہوگا۔

(ب) روحانیت، رہبانیت میں تبدیل ہو جائے گی۔ فرد سرے سے دنیاوی معاملات ہی سے کنارہ کشی اختیار کرلے گا۔

(ج) دو انتہاؤں کے مابین ایک سرد جنگ کا آغاز ہوگا۔ متضاد تقاضے ہائے زندگی میں ایک ایسی کشمکش جنم لے گی جس کے نتیجہ میں فکری انتشار اور ذہنی پراگندگی پیدا ہوگی۔ مستقل مزاجی کا خاتمہ ہو جائے گا اور فرد اندر سے ریزہ ریزہ ہو کر مختلف اکائیوں میں تقسیم ہو جائے گا اور تکمیل شخصیت تو کیا تعمیر شخصیت کا ابتدائی مرحلہ بھی طے نہیں ہو سکے گا۔

تشکیل کردار سے تعمیر شخصیت تک اور پھر تعمیر شخصیت سے تکمیل شخصیت تک کا سفر ایک ہی طریق سے طے ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ مادی امور کو روحانیت کا رنگ دے کر انہیں روحانیت کے تابع اس طرح سرانجام دیا جائے کہ متضاد اور ابہام کی ہر شکل رفع ہو جائے اور فطرت کی جمیع مقتضیات کو یکسوئی اور یک رخی نصیب ہو جائے۔ یاد رہے کہ جب تک انقلاب، تکمیل شخصیت بشری کا باعث نہ ہو اور فرد کی شخصیت ادھورے پن کا شکار رہے تو وہ انقلاب سرے سے انقلاب کہلانے کا حق دار ہی نہیں۔ انقلاب کسی نعرے کا نہیں فرد کے اندر حقیقی تبدیلی کا نام ہے، زاویہ نگاہ کے از سر نو

تعین کا نام ہے۔ زندگی کی ترجیحات کو نئے سرے سے مدون کرنے کا نام ہے۔ یوں انقلاب کی فکری راہ بھی استوار ہوتی ہے اور درست سمت میں اس کا رخ بھی متعین ہوتا ہے۔

خود لفظ ہجر کا مزاج بھی انقلابی ہے۔ ہجر کے مفہوم سے انقلاب کے معانی کو جدا نہیں کیا جا سکتا۔ اللہ کی آخری الہامی کتاب قرآن مجید فرقان حمید میں بھی ہجر کو انقلاب آفریں لفظ کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ اسی طرح حدیث رسول مقبول ﷺ میں بھی ہجرت کو انقلابی معنوں میں لیا گیا ہے۔

ہجرت بمعنی ترک وطن

کسی عظیم نصب العین کے حصول کی خاطر اپنے آبائی وطن کو خیرباد کہہ دینا اور اپنے مشن کی تکمیل کے لئے کسی دوسرے علاقے کو اپنا مستقر بنا لینا یا سماجی اور معاشرتی جبر میں جب سانس لینا بھی مشکل بنا دیا جائے اور قدم قدم پر ظلم واستبداد کی سولیاں گاڑ کر راہ حق کے مسافروں کو تلاش حق سے روک دیا جائے تو ظلم کے اس حصار بے اماں کو توڑ کر کھلی آزاد فضاؤں کا انتخاب ایک تحریکی ہی نہیں اخلاقی ضرورت بھی بن جاتا ہے۔ اپنے ثقافتی، مجلسی اور نسلی رشتوں کو توڑ کر فکری اور روحانی رشتوں کو استوار کرنا یقیناً تحریکی زندگی کا ایک غیر معمولی اقدام ہوتا ہے اور یہ انقلابی قدم اٹھائے بغیر عموماً تحریکوں کی پیش قدمی رک جاتی ہے اور بعض تحریکیں تو اس سماجی جبر کا مقابلہ کرنے کی ہمت نہ پا کر دم توڑ دیتی ہیں اور ہمیشہ کے لئے اپنی قیادت کے افکار و نظریات کے ملبے تلے دفن ہو جاتی ہیں لیکن تحریک اسلامی نے جبر کی ہر شکل کا دیوانہ وار مقابلہ کیا، قدم قدم پر صبر و تحمل کا مظاہرہ کیا، ہر مرحلے اور ہر سطح پر استقامت کے چراغ روشن کئے، حسن تدبر کے پھول کھلائے، حکمت و دانش کی شمعیں فروزاں کیں اور اپنے کارکنوں میں عزم و ہمت کے اوصاف نمایاں کرنے کے لئے ان کی عملی تربیت کا بھی اہتمام کیا۔

قرآن حکیم میں بھی لفظ ہجرت کو ترک وطن کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ ارشاد خداوندی ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَاجَرُوْا وَ جَاهَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ یَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ○ (البقرہ' ۲:۲۱۸)

بے شک جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے اللہ کے لئے وطن چھوڑا اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا' یہی لوگ اللہ کی رحمت کے امیدوار ہیں اور اللہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔

ایک دوسرے مقام پر قرآن کہتا ہے۔

یَا اَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّا اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ الّٰتِیْٓ اٰتَیْتَ اُجُوْرَهُنَّ وَ مَا مَلَكَتْ یَمِیْنُكَ مِمَّآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلَیْكَ وَ بَنَاتِ عَمِّكَ وَ بَنَاتِ عَمّٰتِكَ وَ بَنَاتِ خَالِكَ وَ بَنَاتِ خٰلٰتِكَ الّٰتِیْ هَاجَرْنَ مَعَكَ وَ امْرَاَةً مُّؤْمِنَةً اِنْ وَّهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِیِّ اِنْ اَرَادَ النَّبِیُّ اَنْ یَّسْتَنْكِحَهَا خَالِصَةً لَّكَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ (الاحزاب' ۳۳:۵۰)

اے نبی! ہم نے آپ کے لئے آپ کی بیویاں جن کو آپ مہر دے چکے ہیں حلال کر دی ہیں اور وہ عورتیں بھی جو آپ کی ملک ہیں جن کو اللہ نے آپ کو (کفار سے بطور مال غنیمت کے) دلوایا ہے اور آپ کے چچا کی بیٹیاں اور آپ کی پھوپھیوں کی بیٹیاں اور آپ کے ماموں کی بیٹیاں اور آپ کی خالاؤں کی بیٹیاں جنہوں نے آپکے ساتھ وطن چھوڑا اور کوئی مومن عورت (جو بلا کسی مہر کے) اپنے آپ کو پیغمبر کو دے دے بشرطیکہ نبی اسے نکاح میں لانا چاہئے (یہ سب آپ کے لئے حلال ہیں) لیکن یہ (آخری رعایت) خاص آپ کے لئے ہے سب مسلمانوں کے لئے نہیں۔

مذکورہ آیت میں لفظ **"ھاجرن"** (ان عورتوں نے وطن چھوڑا) ترک وطن اور نقل مکانی کے معنوں میں آیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِیْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِیْمَ كُنْتُمْ ۭ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِیْنَ فِی الْاَرْضِ ۭ قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِیْهَا ۭ فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ وَسَاۗءَتْ مَصِیْرًا ۝ (النساء ۴:۹۷)

بے شک جن لوگوں کی روح فرشتے اس حال میں قبض کرتے ہیں کہ وہ (اسلام دشمن ماحول میں رہ کر) اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے ہیں (تو) وہ ان سے دریافت کرتے ہیں کہ تم کس حال میں تھے؟ (تم نے اقامت دین کی جدوجہد کی نہ سرزمین کفر کو چھوڑا) وہ (معذرتاً) کہتے ہیں کہ ہم زمین میں کمزور و بے بس تھے۔ فرشتے (جواباً) کہتے ہیں کیا اللہ کی زمین فراخ نہ تھی کہ تم زمین میں (کہیں) ہجرت کر جاتے۔ سو یہی وہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ بہت ہی برا ٹھکانہ ہے۔

قرآن واضح ہدایات جاری کر رہا ہے کہ جس مقام اور جس جگہ پر مسلمان اتنے کمزور ہوں کہ دین پر عمل کرنے میں کوئی رکاوٹ محسوس کریں، عرصہ حیات ان پر تنگ کر دیا جائے تو وہ ظلم و ستم نہ سہتے رہیں بلکہ اللہ کی زمین بڑی وسیع اور کشادہ ہے۔ انہیں اس خطہ جبر سے ہجرت کر جانی چاہئے اور اس مقام اور جگہ کو چھوڑ کر کسی ایسے مقام اور جگہ کا انتخاب کرنا چاہئے جس مقام اور جگہ پر وہ اپنے دین پر عمل کرنے میں کوئی تنگی یا رکاوٹ محسوس نہ کریں۔ حبشہ کی ہجرت اور پھر ہجرت مدینہ عین منشائے ایزدی کے مطابق تھی۔ قرآن کہتا ہے۔

وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرَاغَمًا كَثِيْرًا وَّ سَعَةً ط وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ط وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا٥ (النساء،۴:۱۰۰)

اور جو کوئی اللہ کی راہ میں گھر بار چھوڑ کر نکلے گا وہ زمین میں (ہجرت کے لئے) بہت سی جگہیں اور (معاش کے لئے) کشائش پائے گا اور جو شخص بھی اپنے گھر سے اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہجرت کرتے ہوئے نکلے، پھر اسے (راستے میں ہی) موت آ پکڑے تو اس کا اجر اللہ کے ذمے ثابت ہو گیا اور اللہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔

اس آیت مبارکہ میں دو مقامات پر کلمات "مہاجر" (وہ ہجرت کرے) اور "مُهَاجِرًا" (نقل مکانی کے لئے ترک وطن کرتے ہوئے/ کرتا ہوا) استعمال ہوئے ہیں جو ترک وطن کے معانی میں مستعمل ہوئے ہیں۔ اسی سورہ میں ایک اور مقام پر ارشاد خداوندی ہے۔

وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ (النساء،۴:۸۹)

وہ (منافق تو) یہ تمنا کرتے ہی کہ تم بھی کفر کرو جیسے انہوں نے کفر کیا تا کہ تم سب برابر ہو جاؤ۔ سو تم ان میں سے (کسی کو) دوست نہ بناؤ۔ یہاں تک کہ وہ اللہ کی راہ میں ہجرت (کر کے اپنا ایمان اور اخلاص ثابت) کریں۔

مؤمنین کو ایک اور مقام پر یوں خبردار کیا گیا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا جَآءَكُمُ الْمُؤْمِنٰتُ مُهٰجِرٰتٍ فَامْتَحِنُوْهُنَّ (الممتحنه، ۶۰:۱۰)

اے ایمان والو! جب تمہارے پاس مسلمان عورتیں (جو اپنے آپ کو صاحب ایمان کہتی ہیں) ہجرت کر کے آئیں تو

انہیں جانچ لیا کرو۔

ہجرت کرنے والوں کے قافلوں میں اکثر دشمن کے جاسوس بھی شامل ہو جاتے ہیں تاکہ مہاجرین کی نقل و حمل اور ان کے عزائم سے آگاہی ہوتی رہے۔ فلسطین کے مہاجر کیمپوں میں اسرائیل کے گماشتے اپنے آقاؤں کو مجاہدین آزادی کی پل پل کی خبریں بھیجتے رہے ہیں' آزادی کی تحریکوں کو کچلنے کے لئے خفیہ ایجنسیوں کے ایجنٹوں کی سرگرمیوں سے کون واقف نہیں۔ عہد جدید میں یہ کام زیادہ تر خوبرو عورتوں سے لیا جاتا ہے۔ مؤمنین کو بھی آیت مذکورہ میں خبردار کیا گیا ہے کہ ایمان والوں کو راہ حق میں ہر لحہ چوکنا بھی رہنا ہے خصوصاً ترک وطن کر کے آنے والی عورتوں کو خوب جانچ لیا کرو اور ممکن حد تک احتیاطی تدابیر اختیار کر کے دشمن کی ہر سازش کو ناکام بنا دیا کرو۔

فہرست آیات ہجرت

آیات ہجرت یا وہ قرآنی آیات جن میں (ھ-ج-ر) سے مشتق کلمات استعمال ہوئے ہیں کی فہرست مستند لغت "المفردات فی غریب القرآن" سے من و عن نقل کی جا رہی ہے تاکہ مطلوبہ آیت کی تلاش میں قارئین کو کسی قسم کی دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

هجر: الهجران و الهجران مفارقة الانسان غيره اما بالبدن او باللسان او بالقلب' قال تعالى: (واهجروهن فى المضاجع) كنايه عن عدم قربهن' و قوله تعالى: (ان قومى اتخذوا هذا القران مهجورا) فهذا هجر بالقلب او بالقلب واللسان' و قوله: (واهجرهم هجرا جميلا) يحتمل الثلاثه و مدعو الى ان يتحرى اى الثلاثه ان امكنه مع تحرى المجامله' و كذا قوله تعالى: (واهجرنى مليا) و قوله تعالى: (والرجز فاهجر) فحث على المفارقه بالوجوه كلها' والمهاجره فى الاصل مصارمه الغير و متاركته' من قوله عز و جل: (والذين هاجروا و جاهدوا) و قوله: (للفقراء المهاجرين الذين اخرجوا من

دیارهم و اموالهم) و قوله: (و من یخرج من بیته مهاجرا الی الله- فلا تتخذوا منهم اولیاء حتی یهاجروا فی سبیل الله) فالظاهر منه الخروج من دار الکفر الی دار الایمان کمن هاجر من مکه الی المدینه' و قیل مقتضی ذلک هجران الشهوات و الاخلاق الذمیمه و الخطایا و ترکها و رفضها' و قوله: (انی مهاجر الی ربی) ای تارک لقومی و ذاهب الیه' و قوله: (الم تکن ارض الله واسعه فتهاجروا فیها) و کذا المجاهده تقتضی مع العدی مجاهده النفس کما روی فی الخبر "رجعتم من الجهاد الاصغر الی الجهاد الاکبر" و هو مجاهده النفس' و روی "هاجروا ولا تهجروا" ای کونوا من المهاجرین و لا تتشبهوا بهم فی القول دون الفعل' و الهجر الکلام القبیح المهجور لقبحه' و فی الحدیث "ولا تقولوا هجرا" واهجر فلان اذا اتی بهجر من الکلام عن قصد' و هجر المریض اذا اتی ذلک من غیر قصد و قری (مستکبرین به سامرا تهجرون) و قد یشبه المبالغ فی الهجر بالمهجر فیقال اهجر اذا قصد ذلک' قال الشاعر:

کما جده الاعراق قال ابن ضره
علیها کلاما جار فیه واهجرا

و رماه بهاجرات کلامه ای فضائح کلامه' و قوله فلان هجیراه کذا اذا اولع بذکره و هذی به هذیان المریض المهجر' و لا یکاد یستعمل الهجیر الا فی العاده الذمیمه اللهم الا ان یستعمله فی ضده من لا یراعی مورد هذه الکلمه عن العرب' و الهجیر و الهاجرۃ الساعه التی یمتنع فیها من السیر کالحر کانها هجرت الناس و هجرت لذلک' و الهجار حبل یشد به الفحل فیصیر سببا لهجرانه الابل' و جعل علی بناء العقال و الزمام' و فحل مهجور ای مشدود به' و هجار القوس و ترها و ذلک تشبیه بهجار الفحل

حصہ دوم

داستان سفر ہجرت

باب — ۱

تاریخ الانبیاء میں ہجرت

ہجرت کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی خود تاریخ انسانی' بلکہ سیدنا آدم علیہ اسلام کا جنت سے نکلنا اور زمین پر آباد ہونا بھی ایک عظیم ہجرت کا نتیجہ تھا گویا اس کرہ ارض پر انسانی تہذیب کا نقطہ آغاز ہی ہجرت تھی 'کتاب زندگی کے پہلے باب کا آغاز ہی لفظ ہجرت سے ہوتا ہے اس کائنات رنگ و بو کا مالک و خالق اپنے بندوں کے لئے اپنے نبیوں کے ذریعہ وقتاً فوقتاً اپنا کلام اتارتا رہا' اس آسمانی ہدایت کا تسلسل نبی آخر الزماں ﷺ کی حیات مبارکہ تک جاری رہا۔

ہجرت اور تاریخ انبیاء

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ تقریباً تحریک اسلامی ہر دور اور ہر عہد میں مرحلہ ہجرت سے گذری آدم علیہ السلام سے لیکر حضور ختمی مرتبت ﷺ تک تمام انبیاء نے مصائب ہجرت برداشت کئے' تحریک اسلامی کے فروغ کے لئے وطن سے بے وطن ہوئے اور اپنی مسلسل جدوجہد کی بدولت کامیابی و کامرانی حاصل کی' وقت کے فرعونوں سے ٹکرلی اور باطل قوتوں کو للکارا۔ اپنے عزم سے ان کے عزم کا پندار توڑا اور حق کا بول بالا کیا' نصرت خداوندی ہر قدم پر ان کی دستگیری کرتی رہی اور وہ اللہ کی توحید کا پیغام لے کر گھر سے نکل پڑے اگر یہ کہا جائے کہ ہجرت کے بغیر فروغ دین کا ہر تصور جامد ہو کر رہ جاتا ہے تو کچھ بے جانہ ہوگا بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ بہت سارے انبیاء کا ایک عظیم مجاہدہ ہجرت بھی رہا ہے اللہ کی راہ میں گھر سے نکلنا ایک ایسا عمل ہے جو روحانی کمال کے حصول کے لئے اکثر ناگزیر ہو جاتا ہے' حصول علم بھی ہجرت کے بغیر ممکن نہیں اہل تصوف اور کاملین اور جمیع افراد جو طبائع انسانیہ کے مزاج آشنا اور روحانی زندگی کے درجہ کمال پر فائز ہوتے ہیں وہ مستقبل میں پیش آنے والی مشکلات سے آگاہ ہونے کے ساتھ ساتھ ان رکاوٹوں کو دور کرنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں اور روحانیت کے سفر پر نکلنے اور مسافرت اختیار کرنے کی فضیلت سے بھی آگاہ ہوتے ہیں'

کتب تصوف میں مسافرت اور سفر کے عنوانات کے تحت مسافرت اور سفر کی فضیلت کا بیان کثرت سے آیا ہے-اللہ کی راہ میں مسافرت اختیار کرنے کے جہاں اور بہت سے فوائد ہیں وہاں ایک اہم فائدہ یہ بھی ہے کہ مسافرت کے اس عمل کے ذریعہ بندے کا دل غیر اللہ سے کٹ جاتا ہے۔ دنیاوی آلائشوں سے پاک ہو جاتا ہے اور روح تقویٰ و طہارت کے مدارج کی طرف محو پرواز ہوتی ہے' قلب کی صفائی ہوتی ہے۔ ذہنی آلودگی سے نجات ملتی ہے اور ہر لحہ یہ احساس زندہ رہتا ہے کہ مجھے میرا خدا دیکھ رہا ہے۔ بالعموم غیر اللہ کا مضبوط سے مضبوط تعلق بھی دل سے نکل جاتا ہے اور قلب حضوری کی کیفیات میں سرشار رہتا ہے' سفر میں اجنبیوں کی سنگت حاصل ہوتی ہے یہ محافل خلوت نہیں ہوتیں اس اعتبار سے مسافرت اختیار کرنے سے سفر کی دولت بھی نصیب ہوتی ہے' اور اگر کوئی شیخ کامل شریک سفر ہو تو دلوں کو سوز اور روح کو گداز ہی عطا نہیں ہوتا بلکہ نگاہ مرد مومن سے تقدیریں بدل جانے کا موقع بھی فراہم ہو جاتا ہے کاملین کے چشمہ فیض سے جی بھر کر سیراب ہونے کے مواقع زندگی میں کم کم ہی نصیب ہوتے ہیں۔

کاملین کا سفر ہجرت

تصوف کی زبان میں بات کریں تو کاملین کا سفر ہجرت اخذ فیض کی مد میں بالعموم نہیں ہوتا۔ یہ لوگ تو فیض بانٹنے والے ہوتے ہیں ان کے دست فیض سے تو قسمتیں سنورتی ہیں اور مقدر جاگتے ہیں اصلاً ان کا سفر اور ان کی ہجرت فیض دینے کا باعث ہوتی ہے-دنیا میں جس قدر بھی کاملین نے سفر اختیار کئے ہیں' مہاجرت کی صعوبتیں برداشت کی ہیں بظاہر یہ سب کچھ اخذ فیض کے لئے نہیں ہوا' کتب تصوف ان کی ان گنت مثالوں سے بھری پڑی ہیں۔ مثلاً حضرت سیدنا غوث الاعظم کا جیلان سے سفر کر کے بغداد آنا علمی و روحانی کمال کے حصول کے لئے تھا اور بغداد ان علمی' روحانی کمال کی تقسیم کا باعث بنا اور خلق خدا اس چشمہ فیض سے خوب خوب سیراب ہوئی تشنگان علم کی پیاس بجھی سینوں میں علم و عرفان کی قندیلیں فروزاں ہوئیں۔ ردائے جہالت تار تار ہوئی' اسی

طرح داتا گنج بخش علی ہجویری ؒ کا افغانستان سے لاہور تک کا سفر اگرچہ روحانی کمال کے حصول کا باعث بنا لیکن اصلاً یہ سفر بھی خدا کے بندوں میں روحانیت کی دولت تقسیم کرنے کا وسیلہ جلیلہ قرار پایا بالکل اسی طرح حضرت خواجہ اجمیر ؒ کا مختلف مقامات سے گزر کر اجمیر شریف تک پہنچنا۔ حضرت خواجہ غلام فرید ؒ کا اپنا وطن چھوڑنا اسی سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں۔ ان بزرگان دین کی ہجرت اور سفر فیض رسانی کا باعث بن کر اہل طلب کی روحانی تشنگی کا مداوا بنتا رہا۔

ہجرت انسانی معاشروں کا بنیادی پتھر

جیساکہ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ حیات انسانی کا آغاز ہی سفر ہجرت سے ہوا۔ حضرت سیدنا ابوالبشر آدم ؑ جب جنت سے زمین پر تشریف لائے تو ابتدًا کعبۃ اللہ کے قریب آپ حضرت حوا ؑ سے ملے۔ کعبۃ اللہ کی اولین تعمیر فرشتوں کے ہاتھوں مکمل ہوئی حضرت آدم علیہ السلام نے یہیں سکونت اختیار کی گویا نسل آدم کا آغاز روئے زمین پر اسی ایک مقام سے ہوا تھا پھر یہ نسل بڑھی اور ہجرت کر کے اکناف عالم میں پھیل گئی یوں ہجرت انسانی معاشروں کی خشت اول قرار پائی۔ زمانہ قدیم میں ہجرت اختیار کرنے کے دو بنیادی اسباب تھے۔

i۔ ہجرت جگہ کی تنگی کے باعث اختیار کی گئی' وسائل کی کمیابی بھی اسکے بنیادی محرکات میں شامل تھی۔

ii۔ معاشرے وجود میں آئے۔سماجی مسائل بڑھے' نفرتوں اور رقابتوں نے دل انساں میں جنم لیا اور انسان نے دور دور جاکر بستیاں آباد کرنا شروع کر دیں۔

ایسے علاقے دریافت کئے گئے جہاں وسائل قدرت کی فراوانی تھی' پھل' سبزہ پانی اور جانور وافر مقدار اور تعداد میں تھے جو انسان کی غذائی ضروریات کو پورا کر سکتے تھے' قبل از تاریخ بھی دریاؤں اور ساحلوں کے کناروں پر انسانی آبادیوں کے آثار ملتے ہیں۔ ابتدا میں انسان نے انفرادی طور پر ہجرت کی پھر خاندان اور خاندانوں کے بعد

قبائل کی ہجرت عمل میں آئی۔ آج بھی خانہ بدوش اپنے آبا کی سنت ہجرت پر عمل کرتے دکھائی دیتے ہیں' شاداب چراگاہوں کی تلاش میں انسان اپنے گھر سے نکلا۔ بے آب صحراؤں کی خاک چھانی قحط سالی نے بھی انسانی گروہوں کو ہجرت پر مجبور کیا' ہجرت کا ایک ممکنہ سبب آسمانی بلائیں اور آفات بھی تھا' ایک علاقے میں کوئی وبا پھوٹ پڑتی تو لوگوں کی اکثریت وہاں سے نقل مکانی کر کے محفوظ مقامات کی تلاش میں چل پڑتی۔ ہجرت کا یہ عمل مسلسل جاری رہتا' متمدن معاشروں میں سیاسی' سماجی عمرانی اور لسانی اختلافات بھی ہجرت کا باعث بنتے رہے' بادشاہوں کا جبر بھی انسانوں کو اپنے آبائی وطن کو خیرباد کہہ کر دیار غیر میں پناہ تلاش کرنے کا باعث بنتا رہا۔ دیگر ممالک میں سیاسی پناہ کی درخواست ہجرت کی ایک جدید صورت ہے۔

پوری تاریخ انسانی ہی مہاجرت کی تاریخ ہے

ہجرت کا بنیادی سبب عموماً معاشی خوشحالی کی تلاش ہے۔ آج روزگار کی تلاش میں تیسری دنیا کے لوگ ترقی یافتہ ممالک میں نقل مکانی پر مجبور ہوتے ہیں اور بعض قانونی رکاوٹوں کے دور ہونے کے منتظر رہتے ہیں۔ تارکین وطن کا مسئلہ پوری دنیا میں گھمبیر صورت اختیار کر گیا ہے' یہ اپنے آبائی وطن سے جذباتی وابستگیوں کے انقطاع کا معاملہ نہیں بلکہ یہ اپنے اور اپنے بچوں کے لئے آسودہ لمحوں کی تلاش کا مسئلہ ہے' آسودہ لمحوں کی تلاش کا یہ سفر آج بھی جاری ہے اور قیامت تک جاری رہے گا' پوری تاریخ انسانی ہی مہاجرت کی تاریخ ہے' ہجرت مدینہ اس تاریخ انسانی کے سر کا تاج ہے۔ آج کے دور کی بد ترین ہجرت یہودیوں کی ہجرت ہے جس کے نتیجے میں لاکھوں مسلمان شہید ہوئے اور لاکھوں کو وطن میں بے وطنی کے زخم سہنا پڑے اور ان کی کئی نسلیں مہاجر کیمپوں میں جوان ہوئیں اور اپنے حقوق کی جنگ لڑتے لڑتے عروس شہادت سے ہمکنار ہوئیں' یہودیوں کی یہ ہجرت عربوں کے علاقوں پر قبضہ اور پھر گریٹر اسرائیل کے خوفناک منصوبے کی تکمیل کے لئے تھی' آنجہانی سوویت روس وہ

ملک ہے جس نے اسرائیل کو افرادی قوت فراہم کرکے عرب دشمنی کا ثبوت دیا اور عربوں کا ہمدرد بن کر ان کے کاز سے مسلسل غداری کا ارتکاب کیا آج سوویت روس خود تاش کے پتوں کی طرح بکھر چکا ہے' آہنی پردے کے پیچھے بھی ہجرت کی آرزو مچلتی رہی' مقبوضہ علاقوں سے لاکھوں افراد ہجرت کر گئے' سینکڑوں نے دیوار برلن کو عبور کرنے کے لئے اپنی جان کی بازی لگادی' ہجرت کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ ہمیشہ ہجرت عظیم مقاصد کے حصول کے لئے کی جاتی رہی ہے' ارباب فکر و نظر نے کبھی بھی ہجرت کو فرار کا نام نہیں دیا بلکہ ہمیشہ عظیم مقاصد کے حصول کے لئے اسے ایک دروازے سے تعبیر کیا گیا ہے کہ اس دروازے سے گزر کر اپنے نصب العین کے حصول کو یقینی بنایا جا سکتا ہے' قیام پاکستان کے وقت کروڑوں افراد نے ہجرت کی صعوبتیں برداشت کیں۔ یہ نقل مکانی ایک عظیم نظریے کی تکمیل کے لئے عمل میں آئی' ہجرت کا یہ عمل آج بھی بھارت میں جاری ہے اور مسلمان اپنی ثقافتی اکائی کے تحفظ کے لئے شمالی ہندوستان میں جمع ہو رہے ہیں یہ ایک غیرارادی عمل ہے لیکن یہ ایک تاریخی عمل ہے اور تاریخ اپنے فیصلوں پر عمل درآمد کے لئے آزاد ہوتی ہے' بھارتی مسلمانوں کی لاشعوری سطح پر ہونے والی یہ ہجرت بھی ان عظیم مقاصد کے حصول کے لئے ہے جو عظیم مقاصد کارکنان تحریک پاکستان کے پیش نظر تھے اور جن کے حصول کے لئے ملت اسلامیہ نے کفرستان ہند میں صدیوں کا سفر طے کیا اور ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو ظہور پاکستان کی صورت میں اپنے اس اجتماعی نصب العین کو پورا ہوتے دیکھا' نو آبادیاتی نظام آج بھی کسی نہ کسی شکل میں دنیا میں موجود ہے تمام ہجرتوں میں انقلاب آفریں ہجرت' ہجرت مدینہ تھی جس سے پوری نسل انسانی پر خوشگوار اور مثبت اثرات مرتب ہوئے اور تاریخ ہی نہیں اقوام عالم کا جغرافیہ بھی تبدیل ہوا۔ فکر و نظر میں نئے چراغ روشن ہوئے اور نئے عالمی نظام سے اقوام عالم متعارف ہوئیں' ہجرت بنائے انقلاب ہے بلکہ ہر انقلاب کا عنوان ہے ہجرت مدینہ خود تاجدار کائنات ﷺ کی ہجرت ہے ان کے عظیم ساتھیوں کی ہجرت ہے۔ مختصر یہ کہ ہجرت کو انسانی معاشروں کی خشت اول سے تعبیر کیا گیا ہے۔

باب۔ ۲

سیدنا آدم علیہ السلام کی ہجرت

یہ زیب داستان کے لئے نہیں بلکہ ایک تاریخی سچائی ہے کہ سفر انسانی کا آغاز ہی سفر ہجرت سے ہوا! جنت سے زمین پر آدمؑ کی آمد کائنات انسانی کی پہلی ہجرت ہے ان کی اس ہجرت نے بنی نوع انسان کو وجود بخشا' یہ ہجرت حکم خداوندی کے تحت عمل میں آئی' گویا مشیت ایزدی بھی یہ تھی کہ دنیا کا پہلا انسان ہجرت کی صعوبتیں برداشت کرکے انسانی معاشرے کی بنیاد رکھے۔ حضرت آدم علیہ السلام نے مشیت ایزدی کے مطابق نقل مکانی کے تقاضے پورے کئے اور انسانی تمدن کی بنیاد رکھی' حضرت آدمؑ کی ہجرت کئی اعتبارات اور کئی حوالوں سے نہایت اہمیت کی حامل ہے' یہ ہجرت ایک ہمہ گیر انقلاب پر دلالت کرتی ہے وہ انقلاب جو ہر انقلاب کی تمہید بنا' یہ انقلاب انقلابات زمانہ کا پس منظر بھی ہے اور پیش منظر بھی' یہ عظیم ہجرت تاریخ انسانی کا ایک ناقابل فراموش واقعہ ہے' یہ ہجرت اپنے معانی کے لحاظ سے کثیر الجہات امر ہے یہ مشیت ایزدی کی تکمیل بھی ہے اور تصور بندگی کی تعمیر بھی یہ اپنے پہلو میں کمال بندگی کا نمونہ بھی رکھتی ہے اور کمال عبدیت کے حصول کا وسیلہ بھی ہے۔اس عظیم ہجرت کے ان گنت پہلو ہیں جو مباحث کے دروازے کھولتے ہیں اور فکر و نظر کو کشادگی عطا کرتے ہیں۔ ذہنوں کو جلا بخشتے ہیں اور انسان کو زندگی کا شعور عطا کرتے ہیں۔

زمینی رشتے اور تخلیق آدم

حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق' کائنات کا ایک اہم واقعہ ہے یہ امر مسلم ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق جنت کے لئے نہیں بلکہ اس کرہ ارض کے لئے ہوئی تھی' قرآن مجید کئی مقامات پر حضرت آدمؑ کی تخلیق کے بارے میں روشنی ڈالتا ہے لیکن کسی ایک مقام پر بھی اس بات کا عندیہ نہیں دیا گیا کہ ان کی تخلیق انہیں جنت میں آباد کرنے کے لئے ہوئی تھی' آدم علیہ السلام کو زمینی رشتوں سے جدا کرکے نہیں دیکھا جاسکتا کیونکہ ان رشتوں کی گرفت مضبوط ہی نہیں بلکہ مشیت ایزدی کے تقاضوں

کو بھی پورا کرتی ہے۔

آدمؑ کے عناصر تخلیق

حضرت آدم علیہ السلام کے عناصر تخلیق بھی ارضی تھے' قرآن مجید نے جن اجزاء کا ذکر کیا ہے ان کی تفصیل یہ ہے۔

۱۔ تراب ۲۔ ماء ۳۔ طین ۴۔ طین لازب ۵۔ سلالۃ من طین

۶۔ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ۷۔ صلصال کالفخار

۱۔ تراب (مٹی۔Dust)

حضرت آدم علیہ السلام مٹی سے پیدا کئے گئے' ارشاد خداوندی ہے۔

قَالَ لَهٗ صَاحِبُهٗ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗٓ اَكَفَرْتَ بِالَّذِيْ خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ
(الکھف ۱۸: ۳۷)

اس کے ساتھی نے (جس کی نظریں خالق کائنات پر تھیں) اس سے کہا اور وہ اس سے تبادلہ خیال کر رہا تھا کیا تو نے اس (رب) کا انکار کیا ہے جس نے تجھے (اولاً) مٹی سے پیدا کیا۔

اس مضمون کو تین دیگر مقامات پر بھی بیان کیا گیا ہے۔

(الحج' ۲۲: ۵/ فاطر' ۳۵: ۱۱/ مومن' ۴۰: ۶۷)

۲۔ ماء (پانی۔Water)

پانی زندگی کی علامت ہے قرآن مجید ہے۔

وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ مِنَ الْمَاۗءِ بَشَرًا
(الفرقان' ۲۵: ۵۴)

اور وہی (قادر مطلق) ہے جس نے انسان کو پانی (کی ایک بوند) سے پیدا کیا۔

۳۔ طین (گارا۔Mud/Clay)

پانی اور مٹی کے آمیزے کو گارا کہتے ہیں' اس گارے کے بارے میں قرآن

مجید میں ہے۔

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ طِيْنٍ ثُمَّ قَضٰى اَجَلًا ؕ وَاَجَلٌ مُّسَمًّى عِنْدَهٗ ثُمَّ اَنْتُمْ تَمْتَرُوْنَ (الانعام ۶:۲)

وہی ہے جس نے تمہیں مٹی کے گارے سے پیدا فرمایا (یعنی کرہ ارضی پر حیات انسانی کی کیمیائی ابتدا اس سے کی) پھر اس نے (تمہاری موت) میعاد مقرر فرما دی اور (انعقاد قیامت کا) معینہ وقت اسی کے پاس (مقرر) ہے پھر (بھی) شک کرتے ہو۔

آیہ مقدسہ میں بیان کیا جارہا ہے وہی اس کائنات رنگ و بو کا خالق ہے جس نے تمہیں گارے سے پیدا کیا اس گارے پر ایک مدت گزرنے کا بھی ذکر ہے۔ یہ تخلیقی عمل کی طرف واضح اشارہ ہے' یہ مضمون قرآن حکیم میں کئی مقامات پر آیا ہے۔ مثلاً (الاعراف ۷: ۱۲/ الاسراء ۱۷:۶۱/ السجدہ ۳۲: ۷/ ص ۳۸: ۷۱'۷۶) وغیرہ۔

۴۔ طین لازب (چمکتا ہوا گارا-Sticky Clay)

گارے اور مدت کا ذکر ساتھ ساتھ ہے۔ یعنی جب گارے پر ایک مدت گزر جاتی ہے تو وہ چمکنے لگتا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد خداوندی ہے۔

اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّنْ طِيْنٍ لَّازِبٍ (الصافات ۳۷: ۱۱)

ہم نے توان لوگوں کو چپکتی ہوئی مٹی سے پیدا کیا

۵۔ سلالۃ من طین (گارے کا کیمیائی (جمیع اجزائے ارضیہ کا) خلاصہ)

Extract of Clay

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ (المومنون ۲۳: ۱۲)

بے شک ہم نے انسان کی تخلیق (کی ابتداء) مٹی (کے کیمیائی اجزاء) کے

خلاصہ سے فرمائی۔

قرآن مجید فرقان حمید میں ہمیں جا بجا سائنسی اشارے ملتے ہیں اور انسانی تخلیق کا پورا عمل کھول کھول کر بیان کیا گیا ہے انسان کا جدید علم برسوں کی تحقیق کے بعد جن سائنسی حقائق تک آج پہنچا ہے قرآن مجید نے ان سائنسی حقائق کی نشاندہی آج سے چودہ سو سال پہلے کر دی تھی سائنس دان قرآن کو الہامی کتاب تسلیم کرنے پر مجبور ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ آج سے چودہ سو سال پہلے ان حقائق کی نقاب کشائی سوائے وحی الٰہی کے ممکن ہی نہ تھی' یہاں کیمیائی خلاصے سے مراد وہ کیمیائی حالت ہے جس سے جمیع کیمیائی اجزائے ارضی مل کر مختلف کمپاؤنڈز کے ساتھ کیمیائی تعامل کے نتیجے میں ایک ایسی حالت جدیدہ کو پہنچتے ہیں جس میں ان تمام اجزائے ارضیہ کے اثرات / کیمیائی اجزا ایک متحدہ قوت کے طور پر یکجا پائے جاتے ہیں اور ایک اکائی بناتے ہیں۔

۶۔ صلصال من حمأٍ مسنون (مدت گزیدہ' سیاہ شدہ' بدبودار خشکی مائل گارا

(Chamically Altered stinking dried mud

یہ وہ کیفیت ہے جس میں گزشتہ حالت یں کیمیائی تبدیلی واقع ہو جاتی ہے اور طویل مدت گزرنے کے باعث ایک تو خشک ہونے کے قریب ہو جاتی ہے اور دوسرے یہ بو چھوڑنے لگتی ہے۔ نیز کیمیائی خواص میں تبدیلی آجاتی ہے' یہ ایک طرح سے جمیع اجزائے ارضیہ کا خلاصہ ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ربانی ہے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ (الحجر' ۱۵:۲۶)

اور بے شک ہم نے انسانی (کیمیائی) تخلیق ایسے خشک بجنے والے گارے سے کی جو (پہلے) سن رسیدہ سیاہ بدبودار ہو چکا تھا۔

آیت مقدسہ سے واضح ہوا کہ حضرت آدم علیہ السلام کا خمیر مٹی سے اٹھایا گیا تھا۔ نسل آدم کو اسی لئے آدم خاکی کہا جاتا ہے' مٹی اور گارے سے حضرت آدم علیہ

السلام کی تخلیق کے ذکر سے تضحیک یا تحقیر کا پہلو نہیں نکلتا' عروج آدم خاکی سے تو انجم بھی سہمے جاتے ہیں اور پھر مٹی اور گارے سے پیدا کیا جانے والا انسان مسجود ملائکہ بھی ٹھہرا۔

۷۔ صلصال کالفخار (بجتی ہوئی مٹی۔Sounding Clay)

گذشتہ حالت پر جب مزید مدت گزرتی ہے تو اس گارے کے خلاصے میں مکمل خشکی آجاتی ہے حتی کہ ارضی اجزا پر مشتمل یہ گارا خشک ہو کر سخت ہو جاتا ہے اور ٹھوکر سے آواز دینے لگتا ہے اس میں خصائص ارضیہ مزید پختہ ہو جاتے ہیں۔

قرآن مجید میں ہے۔

خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ — اسی نے انسان کو مٹی سے جو ٹھیکرے کی طرح بجتی تھی پیدا کیا۔
(الرحمٰن' ۵۵:۱۴)

قرآن پاک میں تخلیق آدم کے جس عمل کو پوری سائنسی وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اس سے اس امر کی مزید وضاحت ہو جاتی ہے آدم کی تخلیق بشری زمین کے اجزا سے ہوئی ہے اس امر کو قرآن ایک اور مقام پر یوں بیان کرتا ہے۔

هُوَ اَنْشَاَكُمْ مِنَ الْاَرْضِ — اسی نے تمہیں زمین سے پیدا فرمایا۔
(ھود' ۱۱:۶۱)

هُوَ اَعْلَمُ بِكُمْ اِذْ اَنْشَاَكُمْ مِنَ الْاَرْضِ — (اور لوگو) وہ تم کو (اس وقت سے) خوب جانتا ہے جب اس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا۔
(النجم' ۵۳:۳۲)

سورہ نوح میں فرمان باری تعالیٰ ہے۔

وَاللّٰهُ اَنْبَتَكُمْ مِنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا — اور اللہ ہی نے تم کو زمین سے ایک خاص طور پر پیدا کیا۔
(نوح' ۷۱:۱۷)

ان آیات مقدسہ سے معلوم ہوا کہ حضرت آدم علیہ السلام کو زمینی اجزا کی

تمام خصوصیات کا مظہر بنا کر پیدا کیا گیا گویا زمین کے تمام اجزا سے تخلیق فرمایا کیونکہ آگے چل کر انہوں نے انہی زمینی رشتوں کو مضبوط بنا کر آسمانی رشتوں کی بنا استوار کرنا تھی۔

حدیث پاک میں ہے۔

ان اللہ خلق ادم من قبضہ قبضھا من جمیع الارض فجاء بنو ادم علی قدر الارض فجاء منھم الابیض والاحمر والاسود وبین ذالک والسھل والحزن وبین ذالک والخبیث والطیب (مسند احمد بن حنبل)
(البدایہ والنہایہ' ۱ : ۸۵)
(قصص الانبیاء لابن کثیر' ۱ : ۳۹)
(تاریخ الانبیاء لمحمد الطیب النجار:۵۱)

بے شک اللہ نے آدم کو اس قبضہ بھر (مٹھی بھر) مٹی سے پیدا کیا جو اس نے ساری زمین سے لی تھی سو بنی آدم بھی زمین ہی کی طرح سامنے آئے ان میں سے سفید سرخ سیاہ اور اسکے درمیان ہیں ان میں خوش اور دکھی اور ان کے درمیان (والے) ہیں (ان میں سے) اچھے برے اور اس کے درمیان والے ہیں

حدیث پاک سے بھی یہی معلوم ہوا کہ حضرت آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا کیا گیا۔

تخلیق آدمؑ زمین کے لئے

جیسا کہ پہلے بھی بیان ہو چکا ہے کہ تخلیق آدمؑ زمین ہی کے لئے تھی نہ کہ جنت کے لئے' کیونکہ جنت میں خلافت اور امارت کا کوئی تصور نہیں وہاں نہ نیابت ہے اور نہ امامت' قرآن مجید میں ہے۔

وَ اِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰٓئِکَۃِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً۔ (البقرہ' ۲:۳۰)

اور (وہ وقت یاد کریں) جب آپ کے رب نے فرشتوں سے فرمایا کہ میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں۔

یہاں یہ نکتہ قابل غور ہے کہ ابھی وجودِ بشر تشنہ تکمیل ہے' ابھی تخلیق تشکیل

کے مراحل میں ہے ابھی انسان کا پیکر وجود میں نہیں آیا۔ اسے مسجود ملائکہ کا اعزاز بہت بعد میں ملنے والا ہے لیکن مشیت ایزدی نے پہلے سے فیصلہ کر لیا ہے کہ اسے زمین پر اپنا نائب بنا کر بھیجا جائے گا' زمین پر حق و باطل کا معرکہ برپا ہو گا' ایک انقلابی جدوجہد کا آغاز ہو گا کبھی بظاہر باطل غالب آتا نظر آئے گا اور کبھی حق کا بول بالا ہو گا' عنان رسالت تاجدار کائنات ﷺ کے ہاتھ میں آئے گی اور اعلان ہو گا کہ کفر اختیار کرنے والے آج مایوس ہو گئے۔ مختصرا یہ کہ حضرت آدم علیہ السلام کا جنت سے زمین پر آنا خدانخواستہ کسی تنزلی کا باعث نہیں بلکہ انہیں اس مقام کی طرف بھیجا گیا جہاں انہیں خلافت ملنے والی تھی' بالکل ایسے ہی جیسے حضور ﷺ کا مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ آنا' کسی خوف یا شکست کا نتیجہ نہیں تھا نہ یہ فرار کی کوئی صورت تھی کیونکہ حکمت عملی اور منصوبہ بندی کو فرار کا نام نہیں دیا جا سکتا بلکہ یہ مصطفوی انقلاب کا ایک اہم موڑ تھا اور تقاضائے فطرت کے عین مطابق' کیا کبھی شکست' خوف اور فرار کے بطن سے صبح انقلاب کے اجالے بھی پھوٹے ہیں؟

فرش زمین پر قیام حضرت آدم علیہ السلام کی شروعات

حضرت آدم علیہ السلام کی ابتدائی سکونت جنت الفردوس کے سرسبز و شاداب باغات میں تھی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَقُلْنَا يٰاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَ زَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا

(البقرہ' ۲:۳۵)

اور ہم نے حکم دیا اے آدم! تم اور تمہاری بیوی اس جنت میں رہو اور تم دونوں اس میں سے جو چاہو جہاں سے چاہو' کھاؤ۔

اسی مضمون کو قرآن حکیم کی سورہ الاعراف (۷:۱۹) میں بھی بیان گیا ہے۔

یہ کون سی جنت تھی

وہ جنت جہاں حضرت آدم علیہ السلام کا ابتدائی مسکن تھا اور جس کے بارے

میں حکم ربی ہوا کہ اے آدمؑ! تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو اور رزق کثیر کھاؤ اس بارے میں دو آراء پائی جاتی ہیں۔

پہلی رائے

پہلی رائے یہی ہے کہ یہ جنت وہی جنت تھی جس میں قیامت کے بعد اہل ایمان کو داخل کیا جائے گا یہ وہی جنت ہے جس کی بشارت اللہ کی راہ میں جان کے نذرانے پیش کرنے والے شہدا کو دی گئی ہے اور یہی رائے حق ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ وہ جنت کیسی ہے کتنی بڑی ہے' ہم اتنا ہی جانتے ہیں جتنا ہمیں اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ نے بتایا ہے ہم جانتے ہیں کہ جنت کی وسعت کو قرآن کریم اشارتاً آسمان اور زمین کے مابین کی وسعت سے تعبیر کرتا ہے اور ہمیں بتاتا ہے کہ اس میں نہریں اور درخت ہیں اور اس کی دیگر خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔

(خلاصہ از قصص الانبیاء لابن کثیر' ۱:۱۵ بحوالہ تاریخ الانبیاء لمحمد الطیب النجار: ۶۰)

دوسری رائے

دوسرے رائے کا ذکر بھی ابن کثیر نے ہی کیا ہے لیکن اس کا ذکر البدایہ والنہایہ میں بھی ہے نہ کہ صرف قصص الانبیاء میں' اس رائے کے مطابق وہ جنت جسے حضرت آدم علیہ السلام کا اولین مسکن بنایا گیا کوئی اور جنت تھی' زمین کے اوپر ہی کسی جگہ' اس رائے کے مطابق یہ جنت حضرت آدم علیہ السلام کے لئے خاص طور پر تخلیق کی گئی تھی جب آدم علیہ السلام جنت سے نکلے تو وہ جنت بھی ختم کر دی گئی اس صورت میں جنت سے نیچے آنا ھبوط معنوی ہوگا۔ جیسا کہ بنی اسرائیل سے فرمایا:

اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ
(البقرہ' ۲:۶۱)

(اگر تمہاری یہی خواہش ہے تو) کسی بھی شہر میں جا اترو یقیناً (وہاں) تمہارے لئے وہ کچھ (میسر) ہوگا جو تم مانگتے ہو۔

اسی طرح فرمایا:

وَ اِنَّ مِنۡهَا لَمَا یَهۡبِطُ مِنۡ خَشۡیَةِ اللّٰهِ (البقرہ ۲:۷۴)

اور بے شک ان میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو اللہ کے خوف سے گر پڑتے ہیں۔

اور نہ فی الارض سے یہ لازم آتا ہے کہ وہ آسمان میں تھے۔ جیسا کہ بنی اسرائیل سے فرمایا:

اُسۡكُنُوا الۡاَرۡضَ (الاسراء ۱۷:۱۰۴)

تم اس ملک میں آباد ہو جاؤ

لیکن اس رائے کو قبول کرنے کی صورت میں تاویلات کی پناہ لینا پڑے گی اور معنی کو حقیقت سے مجاز کی طرف لے جانا پڑے گا۔ اس صورت میں یہ معنی ضعیف ہو جائے گا۔

جنت سے ہجرت

جنت سے آدم علیہ السلام کی ہجرت کسی انسان کی پہلی ہجرت تھی اس ہجرت کا ذکر قرآن مجید نے مختلف اسالیب میں کیا ہے' کہیں ھبوط کا لفظ آیا ہے تو کہیں اخراج کے کلمات استعمال ہوئے ہیں ارشاد ہوتا ہے۔

فَاَزَلَّهُمَا الشَّیۡطٰنُ عَنۡهَا فَاَخۡرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِیۡهِ وَ قُلۡنَا اهۡبِطُوۡا (البقرہ ۲:۳۶)

پھر شیطان نے انہیں اس جگہ سے ہلا دیا اور انہیں اس (راحت کے) مقام سے جہاں وہ تھے' الگ کر دیا اور (بالآخر) ہم نے حکم دیا کہ تم نیچے اتر جاؤ

قُلۡنَا اهۡبِطُوۡا مِنۡهَا جَمِیۡعًا (البقرہ ۲:۳۸)

ہم نے فرمایا کہ تم سب (جنت) سے اتر جاؤ۔

ایک دوسرے مقام پر یہ اسلوب اپنایا گیا۔

قَالَ اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ (الاعراف، ۷: ۲۴)

ارشاد باری ہوا تم (سب) نیچے اتر جاؤ تم میں سے بعض بعض کے دشمن ہیں۔

ایک دوسرے مقام پر تنبیہ کا انداز اختیار کیا گیا۔

قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيْعًا (طہٰ، ۲۰: ۱۲۳)

فرمایا کہ تم دونوں کے دونوں (آدم و حوا) اس جنت سے نکل جاؤ۔

حضرت آدم علیہ السلام کی یہ ہجرت جنت سے نکل کر اس مقام پر سکونت اختیار کرنے سے عبارت ہے جس مقام کے لئے انہیں پیدا کیا گیا تھا جہاں انہیں خلافت ارضیہ نصیب ہونے والی تھی، اس مقام پر یہ نکتہ قابل غور ہے کہ جس خلافت آدم کو حضرت آدمؑ کی عظمت اور بنی نوع انسان کی رفعت و تکریم سے تعبیر کیا گیا اس خلافت کے احکامات کا عملی اجراء حضرت آدمؑ کی ہجرت سے ہوا، سچ تو یہ ہے کہ بنو آدم کی عظمت و رفعت اور عزت و تکریم کا عملی نقطہ آغاز جہاں سے ان کے کمال کی طرف سفر شروع ہوا وہ سیدنا آدم علیہ السلام کی جنت سے زمین کی طرف ہجرت ہے یہ انسان کی عملی زندگی میں درجات و احوال کی تبدیلی اور عظیم انقلاب کا آغاز ہے۔

مختصر یہ کہ حضرت آدم علیہ السلام کی ہجرت انقلابی اہمیت کی حامل ہے یہ اسی اسلامی انقلاب کا نقطہ آغاز ہے جس کی انتہا وہ مصطفوی انقلاب ہے جس کا آغاز فاران کی چوٹیوں پر رشد و ہدایت کے آفتاب کے طلوع کے ساتھ ہوا تھا۔

باب – ۳

حضرت نوح علیہ السلام کی ہجرت

ہجرت' سلسلہ انبیاء کے پہلے جلیل القدر نبی کی سنت مطہرہ ہے' حضرت آدم علیہ السلام سے حضور ختمی مرتبت ﷺ تک انبیاء کی اکثریت تحریک اسلامی کے فروغ اور پیغام حق کی ترویج کے پہلے مرحلہ سے گزری۔ حضرت نوح علیہ السلام بھی اللہ کے برگزیدہ نبی تھے آپ نے بھی ہجرت کی صعوبتیں برداشت کیں۔ حضرت نوح علیہ السلام کی جائے پیدائش اور مرکز تبلیغ سرزمین عراق ہے۔ انہیں اللہ جل مجدہ نے اس علاقے میں تبلیغ حق کا امر فرمایا۔ اس زمانے میں اہل عراق بتوں کی پوجا کرتے تھے' ان سے اپنی مرادیں مانگتے تھے' اصنام پرستی عام تھی' اپنے ہاتھ سے تراشیدہ بے جان پتھروں کے ٹکڑوں کو حاجت روائی اور مشکل کشائی کے لئے پکارا جاتا' شرک اہل عراق کی فطرت کا حصہ بن چکا تھا اس بنا پر ان کے لئے سب سے مشکل کام قبول حق تھا' وہ شرک کی دلدل میں اس حد تک آگے جا چکے تھے کہ کوئی عقلی دلیل ان پر کارگر ثابت نہ ہو سکی تھی' عقل انسانی پر جہالت کی دھند چھائی ہوئی تھی' کفر و شرک سے آلودہ ماحول میں اللہ رب العزت نے حضرت نوح علیہ السلام کو پیغام حق دے کر بھیجا کہ کفر و شرک کے مرض میں مبتلا لوگوں کو حق کی طرف بلائیں' مرحلہ دعوت کا آغاز ہوا تو کفر قدم قدم پر مزاحم ہوا۔ آزمائش کے دور کا آغاز ہوا۔ آپ کا پیغام بڑا واضح اور روشن تھا' جو خدائے واحد پر ایمان لائے گا' نیکی کی راہ اپنائے گا وہ دنیا میں بھی کامیاب ہو گا اور آخرت میں بھی نجات پائے گا۔ باطل کے ایوانوں میں زلزلہ آگیا' قصر کفر و شرک کو اپنی بنیادیں منہدم ہوتی دکھائی دینے لگیں' بغض و عدوات کا ایک لاوا ابل پڑا۔ اللہ کے نبی کے خلاف ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ ان بدبختوں نے اللہ کے نبی کو اذیتیں دینا شروع کر دیں' حضرت نوح علیہ السلام نے نو سو سال سے زیادہ عرصہ تبلیغ کی۔ لوگوں کو حق کی طرف بلایا لیکن ان کی عقل پر پتھر پڑ چکے تھے۔ اس طویل عرصہ تبلیغ میں دعوت حق قبول کرنے والوں کی تعداد ایک سو سے زیادہ نہ تھی۔

حضرت نوح علیہ السلام کی بددعا

نبی اپنی قوم کے لئے چشمہ رحمت ہوتا ہے۔ فیض رسانی کا باعث اور راحت و رحمت کا مرکز و محور ہوتا ہے۔ لیکن جب اعلان حق پر اور دعوت حق دینے پر اللہ تعالیٰ کے نبیوں کو تضحیک و تحقیر کا نشانہ بنایا جائے ان کی راہ میں کانٹے بچھائے جائیں انہیں جسمانی اذیت دی جائے تو اس عالم میں اگر ان کی زبان مبارک سے حرف بددعا نکل جائے تو اللہ اپنے بندوں کی پکار کو سننے والا ہے' ایک شفیق باپ بھی بعض اوقات اپنی نافرمان اولاد پر سختی کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام نے تنگ آکر اپنے پروردگار سے دعا کی کہ یا باری تعالیٰ میرے اور میری قوم کے درمیان فیصلہ فرما دے کہ ہم میں سے کون حق پر ہے اور کون غلط ہے۔ یہ فیصلہ مانگنے کا مطلب یہ تھا کہ ان کے لئے عذاب طلب کیا جا رہا ہے کیونکہ حق اور باطل میں فیصلہ خود حضرت نوح علیہ السلام نے عذاب الٰہی ہی کو قرار دیا تھا۔ قرآن مجید نے ارشاد فرمایا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے دعا کی۔

قَالَ رَبِّ اِنَّ قَوْمِیْ كَذَّبُوْنِ ○ فَافْتَحْ بَیْنِیْ وَ بَیْنَهُمْ فَتْحًا وَّ نَجِّنِیْ وَ مَنْ مَّعِیَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ
(الشعراء'۲۶:۱۱۷-۱۱۸)

(نوح نے) التجا کی اے میرے رب! مجھے میری قوم نے جھٹلایا ہے۔ سو تو ہی میرے اور ان کے درمیان ایک کھلا فیصلہ فرما دے اور مجھے اور جو میرے ساتھ ایمان لانے والے ہیں ان کو بچا لے۔

اس مقام پر واضح فیصلہ کے بالمقابل مومنین کی نجات کو رکھا ہے اس حقیقت کی مزید تائید ہوتی ہے کہ واضح فیصلہ سے مراد عذاب الٰہی کی آمد ہی ہے جس میں نجات نہیں ہوتی۔ عذاب الٰہی کی گرفت بڑی سخت ہوتی ہے۔ اس کی وضاحت ایک اور مقام پر بھی ہوتی ہے۔ سورہ نوح میں حضرت نوح علیہ السلام کی دعا کے الفاظ یہ ہیں جو

انہوں نے دوران دعا ادا کیے۔

قَالَ رَبِّ اِنِّیْ دَعَوْتُ قَوْمِیْ لَیْلًا وَّ نَهَارًاO فَلَمْ یَزِدْهُمْ دُعَآءِیْٓ اِلَّا فِرَارًاO وَ اِنِّیْ كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوْٓا اَصَابِعَهُمْ فِیْٓ اٰذَانِهِمْ وَ اسْتَغْشَوْا ثِیَابَهُمْ وَ اَصَرُّوْا وَ اسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًاO

(نوح '۷۱: ۵-۷)

عرض کیا اے میرے رب! میں اپنی قوم کو رات دن (ہمہ وقت دین کی طرف) بلاتا رہا۔ لیکن میرے بلانے سے وہ (دین سے) اور زیادہ بھاگنے لگے اور جب بھی میں نے ان کو بلایا (کہ میری دعوت حق کو قبول کریں) تاکہ تو ان کو بخش دے تو انہوں نے اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں دے لیں اور اپنے اوپر کپڑے ڈال لئے اور وہ (اپنے کفر پر) اڑے رہے اور انتہائی تکبر کرتے رہے۔

حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کی مزاحمت بڑی شدید تھی یہ حق کی آواز پر لبیک کیا کہتے یہ اللہ کے نبی کی حق بات سننے کے لئے بھی تیار نہیں تھے۔ اللہ کے نبی نے ساڑھے نو سو سال تبلیغ کی لیکن ان کے اندر کی برف کو نہ پگھلنا تھا نہ پگھلی۔ یہ اپنے کفر پر مضبوطی سے قائم رہے تو ایسے میں فطری بات ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کو یہ خیال گزرا کہ کہیں جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ بھی حق سے نہ پھر جائیں کہیں اہل حق بھی ہمت نہ ہار بیٹھیں۔ چنانچہ جب حضرت نوح علیہ السلام کی تبلیغ کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوا' تو اللہ کے نبی نے اللہ رب العزت کی بارگاہ میں باقاعدہ کفار پر وعید کے سچا ہو جانے کی دعا مانگی۔

وَ قَالَ نُوْحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِیْنَ دَیَّارًاO اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ یُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَ لَا یَلِدُوْٓا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًاO رَبِّ اغْفِرْ لِیْ وَ

اور نوح نے (یہ بھی) دعا کی (تھی) اے میرے رب (اب) روئے زمین پر کسی کافر کو بستا ہوا نہ چھوڑ۔ اگر تو نے ان کو چھوڑ دیا تو یہ تیرے بندوں کو بہکاتے ہی

لِوَالِدَيَّ وَلِمَنْ دَخَلَ بَيْتِيَ مُؤْمِنًا وَّلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنَاتِ وَ لَا تَزِدِ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا تَبَارًا○

(نوح '۷۱:۲۶-۲۸)

رہیں گے اور ان کی اولاد بھی بدکار اور کافر ہی ہو گی۔ اے میرے پرورگار مجھ کو بخش دے اور میرے والدین کو (بھی) اور (ان کو بھی) جو میرے گھر میں ایمان کے ساتھ داخل ہوئے اور تمام مؤمنین اور مؤمنات کو بھی (اپنے لطف و کرم سے بخش دے) اور کافروں کی یہ تباہی بڑھاتا ہی جا۔

ہجرت کی تیاریاں

اصلاح احوال کی ہر سعی پر ٹھٹھا مذاق ہوتا' جب حق قبول کرنے کی کوئی صورت باقی نہ رہی تو بارگاہ خداوندی میں التماس گزاری گئی کہ یہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے چنانچہ اس دعا کو قبولیت کی سند مل گئی۔ پانی سر سے گزر چکا تھا اور فیصلے کی گھڑی آ پہنچی' یہ فیصلہ کفر اور باطل کے درمیان ہونے والا تھا۔ حضرت نوح علیہ السلام کو ہجرت کا فیصلہ سنا دیا گیا اور وحی آ گئی کہ اب تم ایک بہت بڑی کشتی تیار کرو کیونکہ ایک بہت بڑا طوفان آنے والا ہے۔ یہ طوفان ہر شے کو خس و خاشاک کی طرح بہا لے جائے گا' ہر چیز پانی میں ڈوب جائے گی' ہر چیز فنا ہو جائے گی' کفار و مشرکین کا نام و نشان تک مٹ جائے گا۔

وَ اُوْحِيَ اِلٰى نُوْحٍ اَنَّهٗ لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ○ وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَ وَحْيِنَا وَ لَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ○

(ھود '۱۱:۳۶-۳۷)

اور نوح کی طرف وحی کی گئی کہ (اب) ہرگز تمہاری قوم میں سے (مزید) کوئی ایمان نہیں لائے گا سوائے ان کے جو (اس وقت تک) ایمان لا چکے۔ سو آپ ان کے (تکذیب واستہزا کے) کاموں سے رنجیدہ نہ ہوں۔ اور تم ہمارے حکم

کے مطابق ہمارے سامنے ایک کشتی بناؤ اور ظالموں کے بارے میں مجھ سے (کوئی) بات نہ کرنا وہ ضرور غرق کئے جائیں گے۔

کشتی کی تعمیر پر قوم کا تمسخر اور اس کا جواب

اللہ رب العزت کی طرف سے فیصلہ آ چکا تو حضرت نوح علیہ السلام نے ایک عظیم الشان کشتی بنانا شروع فرما دی۔ وہ علاقہ کسی بھی سمندر یا دریا سے کوسوں دور تھا۔ جس میں دور دور تک کسی طوفان یا سیلاب کی کوئی امکانی صورت دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ بظاہر کسی طوفان کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ اگر کوئی طوفانی بارش آتی تو وہ کوئی سیلاب وغیرہ کی شکل اختیار نہیں کر سکتی تھی پھر وہاں تو بارش کے بھی کوئی آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ اس بنا پر جب غیر ساحلی علاقے میں حضرت نوح کو کشتی بناتے دیکھا تو قوم کفار نے ان کا مذاق اڑانا شروع کر دیا۔ قرآن مجید نے یوں بیان کیا ہے۔

وَ يَصْنَعُ الْفُلْكَ وَ كُلَّمَا مَرَّ عَلَيْهِ مَلَاٌ مِّنْ قَوْمِهٖ سَخِرُوْا مِنْهُ قَالَ اِنْ تَسْخَرُوْا مِنَّا فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُوْنَ○ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَ يَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ○ (ھود ۱۱: ۳۸۔۳۹)

اور نوح کشتی بناتے رہے اور جب بھی ان کی قوم کے سردار ان کے پاس سے گزرتے ان کا مذاق اڑاتے نوح (انہیں جواباً) کہتے اگر (آج) تم ہم سے تمسخر کرتے ہو تو (کل) ہم بھی تم سے تمسخر کریں گے جیسے تم تمسخر کر رہے ہو۔ سو تم عنقریب جان لو گے کہ کس پر (دنیا میں ہی) عذاب آتا ہے جو اسے ذلیل و رسوا کر دے گا اور (پھر) کس پر (آخرت میں) عذاب اترتا ہے جو ہمیشہ قائم رہے گا۔

کفار و مشرکین اپنے کفر میں اندھے ہو رہے تھے لیکن نگاہ نبوت دیکھ رہی تھی کہ ایک زبردست طوفان آ رہا ہے جو عذاب الٰہی کی صورت میں ان نافرمانوں پر نازل ہو گا ادھر قوم نوح کا یہ رد عمل تھا کہ وہ کسی طوفان کے امکان ہی کا انکار کر رہے تھے اور ادھر ہجرت کی تیاری مکمل ہو رہی تھی اور بالآخر اہل حق نے اپنے گھربار چھوڑ دینے کا انتظام مکمل فرمالیا۔ یہ وہ مقام تھا جہاں حق و باطل کے مابین فیصلہ ہونا تھا اور یہی وہ مقام تھا جہاں اہل حق کو اپنا گھربار سب چھوڑ دینا تھا۔ چشم ظاہر بین یہی دیکھ رہی تھی کہ اہل حق بے سرو سامانی میں گھربار چھوڑ رہے ہیں جبکہ ان کی کور نظری کے باوجود اہل نظر کے نزدیک اہل ایمان و ایقان باطل پرستوں کی اس بستی کو تباہ و برباد کر دینے کا انتظام کر رہے تھے اور پھر فیصلہ کی گھڑی آ پہنچی اور ہجرت کا بھی آغاز ہو گیا۔

حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَ فَارَ التَّنُّوْرُ قُلْنَا احْمِلْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَاَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ وَمَنْ اٰمَنَ وَمَآ اٰمَنَ مَعَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلٌ ۝ وَ قَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَ مُرْسٰىهَا اِنَّ رَبِّيْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ وَهِيَ تَجْرِيْ بِهِمْ فِيْ مَوْجٍ كَالْجِبَالِ ۔

(ھود، ۱۱: ۴۰۔۴۲)

یہاں تک کہ جب ہمارا حکم (عذاب) آ پہنچا اور تنور (پانی کے چشموں کی طرح) جوش میں ابلنے لگا (تو) ہم نے کہا (اے نوح) اس کشتی میں ہر جنس میں سے (نر اور مادہ) دو عدد پر مشتمل جوڑا سوار کر لو اور اپنے گھر والوں کو بھی (لے لو) سوائے ان کے جن پر (ہلاکت کا) فرمان پہلے صادر ہو چکا ہے اور جو ایمان لے آیا ہے (اسے بھی ساتھ لے لو) اور چند (لوگوں) کے سوا ان کے ساتھ ایمان کوئی نہیں لایا تھا اور نوح نے کہا تم لوگ اس میں سوار ہو جاؤ، اللہ ہی کے نام سے اس کا چلنا اور اس کا ٹھہرنا ہے۔ بیشک میرا رب بڑا ہی بخشنے والا نہایت مہربان ہے اور وہ کشتی پہاڑوں جیسی

(طوفانی) لہروں میں انہیں لئے چلتی جا
رہی تھی

مرحلہ ہجرت مکمل ہوا کفار و مشرکین عذاب الٰہی سے نہ بچ سکے' ان کے سارے اندازے غلط ثابت ہوئے اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے پانی کی بپھری ہوئی لہروں کی نذر ہو گئے' مرحلہ ہجرت مکمل ہوا اور قافلہ اہل حق نجات پا کر امن و عافیت سے نقل مکانی کر گیا حضرت نوح علیہ السلام اپنی نو سو سال سے زائد عرصے کی محنت کی پونجی کم و بیش ۴۰ آدمی ساتھ لے کر جودی پر جا اترے جو دیار بکر کا ایک پہاڑ ہے جس کا پہاڑی سلسلہ آرمینیا کے پہاڑی سلسلے سے جا ملتا ہے۔ (تاریخ الانبیاء لمحمد الطیب النجار)

قرآن مجید میں ہے کہ اس سفر کے آخری مراحل میں

وَ قِيْلَ يٰۤاَرْضُ ابْلَعِيْ مَآءَكِ وَ يٰسَمَآءُ اَقْلِعِيْ وَ غِيْضَ الْمَآءُ وَ قُضِيَ الْاَمْرُ وَ اسْتَوَتْ عَلَى الْجُوْدِيِّ
(ھود' ۱۱: ۴۴)

اور (جب سفینہ نوح کے سوا سب ڈوب کر ہلاک ہو چکے تو) حکم دیا گیا اے زمین اپنا پانی نگل جا اور اے آسمان تو تھم جا اور پانی خشک کر دیا گیا اور کشتی جودی پہاڑ پر جا ٹھہری۔

اس مقام پر پھر حضرت نوح علیہ السلام ایک مدت تک فرائض رسالت ادا فرماتے رہے اور کفر و شرک کا طوفان پھر سر نہ اٹھا سکا۔ حضرت نوح علیہ السلام کی ہجرت ازلی معرکہ حق و باطل کے لئے باطل کی تباہی اور حق کی ابدی نجات کا باعث بنی۔ کفار پر اللہ کی وعید آئی باطل سرنگوں ہوا' کفر کی چٹان پاش پاش ہوئی' غرور و نخوت کے سارے آئینے ٹوٹ گئے اور اللہ کا وعدہ پورا ہو کے رہا۔

باب-۴

حضرت ہود علیہ السلام کی ہجرت

حضرت ہود علیہ السلام بھی ان جلیل القدر انبیاء میں سے تھے جنہوں نے اپنی قوم کو رشد و ہدایت سے بہرہ ور کرنے کی ذمہ داریاں احسن طریقے سے اور مشیت ایزدی کے مطابق سر انجام دیں۔ ان کے علاقے کا نام ارض الاحقاف ہے جو حضرت موسیٰ کے علاقے سے شمال کی طرف واقع ہے۔ حضرت ہود علیہ السلام "عاد" قبیلے میں پیدا ہوئے اور اس قبیلے کی ہدایت کی ذمہ داری ان کے سپرد کی گئی۔ یہ قبیلہ حضرت نوح علیہ السلام کے صاحبزادے حضرت سام کی اولاد میں سے تھا۔ کتب تاریخ میں ان کی بابت کچھ نہیں ملتا۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ یہ قبیلہ مکمل طور پر برباد ہو گیا تھا۔ یعنی اس قبیلہ کا کچھ بھی نہ بچا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس قبیلے کے بارے میں طرح طرح کی باتیں گھڑلی گئیں ہیں۔ مثلاً ان کے بارے میں مشہور ہے کہ ان کے سر گنبدوں کی طرح بڑے ہوتے تھے۔ ان کی آنکھیں اس طرح ہوتی تھیں کہ جانور اس میں چھلانگ لگا سکتا تھا۔ ان کے قد اتنے بڑے تھے کہ ایک شخص اچھل کر اس کی پنڈلی یا ٹخنے کے قریب پہنچتا تھا وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب جھوٹ کا پلندہ ہے جس کی کوئی اصل نہیں کیونکہ ان کے جو مکانات اب دریافت ہو چکے ہیں کا سائز عام مکانات جتنا ہے۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ ان کا قد کاٹھ ذرا نسبتاً غیر معمولی ہو باقی سب کہانیاں ہیں بے سروپا باتیں جن کی تصدیق کسی حوالے سے بھی متحقق نہیں۔ قوم ہود بھی بت پرست تھی، توحید کا کوئی تصور ان کے ہاں موجود نہ تھا۔ کفر و شرک کی اتھاہ گہرائیوں میں گر چکی تھی۔ یہ لوگ اس حد تک نیچے جا چکے تھے کہ ان کا حق کی طرف لوٹنا قریب قریب ناممکن تھا اور نہ وہ بحیثیت مجموعی واپس ہی آئے۔ حضرت ہود علیہ السلام نے انہیں دعوت حق دی، انہیں اصنام پرستی سے روکا لیکن اللہ کے نبی کی تعلیم ان کے نظام کہنہ کے لئے ایک کھلا چیلنج تھی، وہ حلقہ کفر سے باہر نکلنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے، ابلیسی قوتیں انکے اذہان پر مسلط تھیں اللہ کے نبی کی تعلیمات ان کے خود ساختہ نظریات سے ٹکراتی تھیں، اس لئے یہ اللہ کے دشمن ہو گئے، حق کی کھلی باتیں ان کی سمجھ میں نہ آتیں، ان کی آنکھیں ایمان کی روشنی

کو قبول نہ کر سکیں اور یہ کفر کے اندھیروں میں ڈوبتے چلے گئے بلکہ جو لوگ ایمان لائے تھے ان کے اور حضرت ہود علیہ السلام کے خلاف جھوٹا پروپیگنڈا کرنے لگے اور کہنے لگے کہ ہمارے کسی (مزعومہ) خدا (بت) نے اسے پکڑا ہے اور یہ جو ہمارے خداؤں کے بارے میں الٹی سیدھی کہتا ہے (معاذ اللہ) اس کے نتیجے میں ہمارے خداؤں نے اس کا دماغ پھیر دیا ہے (نعوذ باللہ)

حضرت ہود علیہ السلام نے ہر اعتراض کا جواب نہایت متانت اور سنجیدگی سے عطا فرمایا تحمل اور بردباری سے ان کے بے بنیاد الزامات کا جواب دیا۔ اور ہر سوال پر مسکت جوابات ارشاد فرمائے۔ اور اپنی دعوت کو مزید پھیلانے کے لئے کوشاں رہے۔ دشمنوں کی مخالفانہ کارروائیوں سے نہ تو ان کی جدوجہد میں کمی آئی نہ انہوں نے کسی مرحلہ پر کبھی پست ہمتی کا ہی مظاہرہ کیا۔ بلکہ اپنا کام اسی لگن، خلوص اور محبت سے کرتے رہے تاآنکہ کہ وقت آگیا کہ حق و باطل کے درمیان فیصلہ ہو جائے اور اس قریہ جبر سے رخت سفر باندھا جائے اور ہجرت کا فریضہ پورا کیا جائے اور اس ارض عذاب کو خیرباد کہہ دیا جائے۔ اس موقع پر انہوں نے رب ذوالجلال کی بارگاہ میں دست سوال دراز کیا اور عرض کیا۔

قَالَ رَبِّ انْصُرْنِیْ بِمَا كَذَّبُوْنِ
(المومنون، ۲۳:۳۹)

(پیغمبر ہودؑ نے) التجا کی اے میرے رب! میری مدد فرما کہ انہوں نے مجھ کو جھٹلایا (یہ اپنے کفر سے ہٹنے والے نہیں)۔

یعنی میرے رب جو ان سے عذاب کا عہد ہے پورا کر اور اپنے فضل اور احقاق حق کے ذریعے ابطال باطل سے امر حق کو غلبہ عطا فرمایا۔ ظاہر ہے یہ غلبہ مستقبل قریب میں مطلوب تھا حالات اتنے بگڑ چکے تھے کہ اب عذاب الٰہی کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں تھا جس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت ہود علیہ السلام نے قوم کے سامنے دو ہی باتیں رکھی تھیں۔ یا تو وہ حق کو قبول کر لیں ورنہ ان پر عذاب آجائے گا لہٰذا امر حق کے تحقق

کے لئے عذاب کا آنا ضروری تھا۔ اللہ جل مجدہ کی بارگاہ میں اس کے لئے استدعا کی گئی۔ جسے رب ذوالجلال نے قبول فرمالیا اور اللہ پاک نے جواب میں حضرت ہود علیہ السلام کو وعدہ پورا ہونے کی خوشخبری دی اور انہیں تسلی دیتے ہوئے فرمایا۔

قَالَ عَمَّا قَلِيلٍ لَّيُصْبِحُنَّ نَادِمِينَ۝ فَأَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ بِالْحَقِّ فَجَعَلْنَاهُمْ غُثَاءً (المومنون' ۲۳: ۴۰-۴۱)

(اللہ تعالیٰ نے) فرمایا (اے نبی وقت آگیا ہے) بس تھوڑے ہی دنوں میں (ایسا عذاب آئے گا کہ) ایک صبح یہ پشیمان ہو کر رہ جائیں گے۔ چنانچہ (ایسا ہی ہوا اور) ان کو ایک سخت آواز نے وعدہ برحق کے مطابق آپکڑا تو ہم نے ان کو (ہلاک کرکے) خس وخاشاک (کی طرح پامال کردیا)

قوم ہود اپنے کئے پر نادم تھی۔ یہ ندامت انہیں اس بات پر تھی جو انہوں نے حضرت ہود علیہ السلام کی تکذیب کرکے اپنے نامہ اعمال میں لکھوائی تھی لیکن اب وقت گزر چکا تھا اب شرمندہ ہونے اور اپنے کئے پر پچھتانے کا کوئی فائدہ نہ تھا کیونکہ اس وقت تو انہوں نے ہوش کے ناخن نہ لئے جب اللہ کے نبی نے انہیں دعوت حق دی اب اگر وہ پیکر ندامت بھی بن گئے تو کیا حاصل' مثبت اور بہتر نتائج اسی وقت حاصل ہوتے ہیں جب بروقت درست فیصلے کئے جائیں اگر فیصلے درست بھی ہوں لیکن بروقت نہ کئے جائیں تو درست فیصلے بھی کسی کام نہیں آتے' قوم ہود اسی انجام کی مستحق تھی جو انہیں عذاب کی صورت میں ملا۔ احساس ندامت کسی کام نہ آیا کیونکہ اب ہدایت کا وقت گزر چکا تھا اور عذاب کو آنکھوں سے دیکھنے کے بعد توبہ کی کوئی اہمیت نہ تھی' اگر عذاب الٰہی سامنے دیکھ کر مجبوراً توبہ کرلی جائے اور اپنے گناہوں کی معافی مانگ لی جائے تو کوئی کافر کافر نہ مرے اور کوئی گنہگار گنہگار ہونے کی حالت میں داعی اجل کو لبیک نہ کہے۔ ان کا جرم صرف انکار توحید ہی نہ تھا بلکہ ان کا جرم توہین رسالت تھا اور خدا

اپنے نبیوں اور رسولوں کی توہین کرنے والوں کو معاف نہیں کرتا۔ توہین رسالت کا انکار کرنے والے کی توبہ بھی قبول نہیں۔ انکار توحید کی بنیاد ہی اس بات کو بنایا تھا جو عین اہانت رسالت تھی۔ یعنی ایک تو انہوں نے حضرت ہود علیہ السلام کو جھوٹا کہا (معاذ اللہ) ان کی نبوت کی نفی کی' یہاں تک کہا گیا کہ آپ پر وحی آ ہی نہیں سکتی۔ اگر آ سکتی تو خود ان پر کیوں نہ آتی (معاذ اللہ) تیسرے قوم نے اللہ کے نبی کو کسی بدروح کا سایہ یا آسیب زدہ قرار دیا جس کا مطلب تھا کہ وہ حصار کفر سے باہر نہ نکل سکے اور منزل توحید سے دور ہوتے رہے' ان پر عذاب الٰہی نازل ہوا لہٰذا اب یہ فنا ہو گئے' اللہ نے ایمان لانے والوں کو اس عذاب سے محفوظ رکھا اور قوم ہود کو عبرت کا نشان بنا دیا۔

عذاب عاد

حضرت ہود علیہ السلام کی قوم پر عذاب الٰہی کا عمل سات دنوں میں مکمل ہوا۔ یہ عذاب بتدریج آیا' رفتہ رفتہ آیا' اس میں حکمت یہ تھی کہ قوم ھود کو عذاب شروع ہونے پر اپنا انجام صاف نظر آ جائے اور شدید احساس ندامت انہیں گھیر لے۔

اول الامر

اول الامر میں یعنی اس عذاب سے قبل یہ زبردست قحط سالی کا شکار ہو گئے تین سال تک تو انہیں بارش سے محروم رکھا گیا۔ جس نے شدید قحط کی صورت اختیار کر لی زمینیں بنجر ہو گئیں' سبزے کا نام و نشان تک مٹ گیا۔ کفار و مشرکین اور اللہ کے نبی کی تکذیب کرنے والے پانی کی ایک ایک بوند کو ترس گئے۔ یہ قحط سالی وغیرہ عذاب الٰہی کی شروعات تھیں' یہ اصل عذاب نہ تھا' مشیت ایزدی یہ تھی کہ انہیں ان کے جرائم کی عبرتناک سزا دی جائے کیونکہ ان کے جرائم کی فہرست بڑی طویل تھی اور پھر یہ توہین رسالت کے بھی مرتکب ہوئے تھے۔

اصل عذاب

اس مقام پر جبکہ ان کو قحط سالی نے مایوسی کی دلدل میں دھکیل دیا تھا اور وہ چاہتے ہوئے بھی بارش حاصل نہ کر سکتے تھے' نیز ان کی صبح و شام اسی حالت میں گزرتی تھی کہ شاید اب اس لمحے آسمان پر کہیں سے کوئی بادل کا ٹکڑا دکھائی دے دے جو ان کی امید کو برلائے۔ کاش کہ کوئی سحاب رحمت نصیب ہو جو زمین کی پیاس بجھا کر اسے اس قابل کر دے کہ وہ ان کا پیٹ بھرنے کے لئے اناج اگلنا شروع کر دے' اسی انتظار میں تین سال گزر گئے' ایک طرف ان کی مایوسی انتہا کو پہنچ چکی تھی تو دوسری طرف انکی بارش کی طلب دیدنی تھی جس سے بے بسی ٹپک رہی تھی۔ اسی کیفیت میں ایک روز دور سے انہیں افق پر بادل کا ایک ٹکڑا دکھائی دیا تو وہ خوشی سے ناچنے لگے لیکن انہیں معلوم نہ تھا کہ بادل کے جس ٹکڑے کو ہوا اپنے کندھے پر اٹھائے ہوئے ہے اور جسے دیکھ کر وہ خوشی سے پاگل ہوئے جا رہے ہیں انکے لئے کسی خوشی کا باعث نہ بن سکے گا۔ بادل کے اس ٹکڑے سے انہیں پانی کی ایک بوند بھی نہ ملے گی بلکہ یہ بادل تو ان کے لئے عذاب الٰہی لے کر آ رہا ہے' یہ انہیں اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔ پس جس شے سے انہیں خیر کی توقع تھی وہ شے ان پر المناک عذاب کا پہاڑ توڑنے والی تھی۔ یہ تو عذاب الٰہی تھا جو ان کی طرف بڑھ رہا تھا لیکن یہ نادان اسے اپنے دکھوں کا مداوا سمجھ رہے تھے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ بادل کا یہ ٹکڑا انکے لئے پیغام اجل لے کر آ رہا ہے۔ ان پر وہ عذاب نازل کرنے والا ہے جس میں انہیں حشر تک مبتلا رہنا ہے۔ قرآن کہتا ہے۔

فَلَمَّا رَاَوْهُ عَارِضًا مُّسْتَقْبِلَ اَوْدِيَتِهِمْ قَالُوْا هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا بَلْ هُوَ مَا اسْتَعْجَلْتُمْ بِهٖ رِيْحٌ فِيْهَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ○ تُدَمِّرُ كُلَّ شَيْءٍ بِاَمْرِ رَبِّهَا فَاَصْبَحُوْا لَا يُرٰى اِلَّا مَسٰكِنُهُمْ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ ○

(الاحقاف' ۴۶: ۲۴-۲۵)

پھر جب انہوں نے دیکھا کہ ایک بادل سامنے سے ان کی وادیوں کی طرف چلا آ رہا ہے (تو وہ خوش ہو کر) بولے کہ یہ گھٹا ہے جو ہم پر خوب برسے گی (نہیں نہیں۔ یہ ابر رحمت نہیں) بلکہ وہ (عذاب) ہے جس کی تم جلدی کر رہے

تھے (یہ وہ) آندھی ہے جس میں درد ناک عذاب ہے (یہ آئے گی اور) ہر شئے کو اپنے رب کے حکم سے اکھاڑ پھینکے گی۔ پس وہ ایسے (تباہ و برباد) ہوئے کہ ان کے (مسمار) گھروں کے علاوہ کچھ نظر نہ آتا تھا (دیکھو) اسی طرح ہم نافرمان لوگوں کو سزا دیا کرتے ہیں۔

فطرت افراد کی انفرادی غلطیوں کو معاف کر دیتی ہے لیکن ملت کے اجتماعی گناہوں کو نظر انداز نہیں کرتی۔ واضح طور پر کہا جا رہا ہے ہم مجرم قوموں کو ان کے اعمال بد کا پورا پورا بدلا دیتے ہیں۔ مفسرین کرام نے ذکر کیا ہے کہ ٹھنڈی ہوا آٹھ دن اور سات راتیں ان پر مستقل رہی یہ ہوا پہاڑوں' غاروں اور ان کے گھروں سمیت ہر جگہ ان کا تعاقب کرتی پہنچ جاتی اور اپنی عجیب قوت کی بناء پر انہیں وہاں سے نکال باہر کرتی اور ہلاک کر دیتی۔ اس طرح بعض اوقات ان کے مکانوں کو بھی برباد کر دیتی۔ اس قوم کو اپنی قوت اور اپنی عمارات کی مضبوطی پر بہت ناز تھا۔

کبھی تو ان کے منہ پر ایسی بات بھی آجاتی "ہم سے زیادہ طاقتور دنیا میں بھلا کون ہے؟" تو اللہ نے ان پر اس شے کو مسلط کیا جو ان سے بھی زیادہ طاقتور تھی یعنی ایک ایسی ہوا جو ہر شے کو تباہ کر دینے والی تھی۔ یہ ہوا جس کسی سے ٹکراتی اسے پیس کر رکھ دیتی۔ قرآن مجید ہمارے لئے اس حقیقت کو بیان کرتا ہے۔

وَ اَمَّا عَادٌ فَاُهْلِكُوْا بِرِيْحٍ صَرْصَرٍ عَاتِيَةٍ سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ وَّ ثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ حُسُوْمًا فَتَرَى الْقَوْمَ فِيْهَا صَرْعٰى كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ ○

(الحاقہ' ۶۹:۶-۷)

اور رہی (قوم) عاد تو وہ ایک نہایت تند و تیز (اور) سخت ہوا سے تباہ کر دیئے گئے۔ جس کو اللہ نے ان پر سات رات اور آٹھ دن متواتر مسلط رکھا (پھر اے مخاطب اگر) تو ان لوگوں کو اس (آندھی) میں دیکھتا تو ان کو ایسا گرا ہوا

پاتا جیسے کھجور کے (بے حس و حرکت)
کھوکھلے تنے (پڑے ہوتے ہیں)

وہ ٹھنڈی ہوا جو قوم ہود کی تباہی و ہلاکت کا باعث بنی اسے "دبور" کہتے ہیں۔
آقائے دوجہاں ﷺ کا ارشاد گرامی ہے۔

نصرت بالصبا و اھلکت عاد بالدبور میری "صبا" کے ذریعے مدد کی گئی ہے جبکہ عاد کو دبور سے ہلاک کیا گیا تھا۔
(مسند احمد بن حنبل' ۱:۲۲۸)

یہ وہ عذاب اور ہلاکت تھی جو حضرت ہود علیہ السلام کی قوم کے نصیب میں ان کے اعمال بد کے نتیجے میں لکھی گئی تھی۔ انکار نبوت' توحید سے فرار اور شرک پر اصرار ایسے جرم ہائے عظیم تھے جن کی بناء پر وہ اس عذاب کے مستحق ٹھہرے کہ ان کا وجود بھی ہمیشہ کے لئے مٹا دیا گیا۔ اس عذاب الٰہی اور اس کے نتیجے میں اتنی بڑی تباہی نے اس زمین کو اس قابل نہ چھوڑا تھا کہ وہاں کوئی انعامات خداوندی کا امیدوار خوشی سے رہنا پسند کرتا چنانچہ حضرت ہود علیہ السلام نے اس قریہ عذاب سے سفر ہجرت اختیار کیا۔

مقام عذاب سے حضرت ہودؑ کی ہجرت

یہ وہ مقام تھا جہاں اہل باطل کا نام و نشان تک مٹ چکا تھا' غلبہ حق کے لئے راہ ہموار ہو چکی تھی۔ حق و باطل کے مابین فیصلہ ہو چکا تھا۔ یہ فیصلہ کن معرکہ حق و باطل ہی وہ مقام ہے جس کے اول یا آخر میں ہجرت سنت انبیاء علیہم السلام ہے۔ تاریخ انبیاء اس بات پر گواہ ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کی ہجرت ہمیشہ ان کی تحریک کے کسی نہ کسی فیصلہ کن اور اہم مرحلے پر دلالت کرتی ہے۔ ہجرت نے ان کی انقلابی تحریکوں کی دعوت کو ہمیشہ نیا رنگ ڈھنگ بخشا ہے اور انہیں اپنے اہداف کے قریب تر کیا ہے۔ چنانچہ حضرت ہود علیہ السلام کے بارے میں بھی آتا ہے کہ انہوں نے اس مقام عذاب سے ہجرت کی۔ ارض عاد کو چھوڑ دیا اپنے ساتھ دوسرے اہل ایمان کو بھی لیا اور حضرموت کی طرف نقل مکانی کر گئے۔ وہیں پر آپ کا وصال ہوا اور وہیں مدفون

ہوئے۔ آپ کی قبر شریف "وادی برہوت" میں ہے۔ (الفصل' ۱: ۲۱۔ تاریخ: ۸۷'
کتاب الروح لابن قیم / شرح الصدور للسیوطی)

باب-۵

حضرت صالح علیہ السلام کی ہجرت

حضرت صالح علیہ السلام بھی اللہ کے جلیل القدر پیغمبر تھے۔ اپنے مشن کی تکمیل کے لئے سفر ہجرت اختیار کر کے انہوں نے بھی اس تسلسل کو برقرار رکھا جو کم وبیش ہر نبی اور رسول کے عہد نبوت میں تحریک اسلامی کے ایک ناگزیر مرحلے کے طور پر متعارف ہو چکا تھا۔ اور جس کی نتیجہ خیزی بھی سامنے آ چکی تھی' حضرت صالح علیہ السلام کا نسب حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد تک پہنچتا ہے۔ **آپکو جس قوم کی طرف بھیجا گیا** وہ قوم اور قبیلہ آپ کے پردادا کے پردادا (یعنی ماشخ کے پڑدادا) ثمود کے نام سے مشہور ہے (اس قوم کا نام ہی قوم ثمود پڑ گیا۔ یہ حضرت صالح علیہ السلام کے پانچویں دادا ہیں۔

ان کی قوم ثمود بھی حضرت ہود علیہ السلام کی قوم "عاد" کی طرح و ثنیت کی عادی تھی۔ بت پرستی ان کے خون میں رچی ہوئی تھی' کفر و شرک سے ان کا دامن آلود تھا' ذہنی پراگندگی اپنی انتہا کو چھو رہی تھی۔ ان کی رہائش "حجر" میں تھی' جو کہ تبوک کے قریب حجاز اور شام کے درمیان وادی القری میں واقع ہے۔ (طبری' الکشاف وغیرہ)

تاریخ طبری (۱: ۱۱۸) میں یہ بھی ہے کہ ماہرین جغرافیہ اور علوم ارضیہ (Geologians) نے الحجر کا دیار ثمود کے حوالے سے مطالعہ کیا اور بتایا کہ اس مقام پر ایک کنواں "بئر ثمود" کے نام سے بھی ہے۔ یہ جگہ وادی القری میں ہے۔ البدایہ والنہایہ میں ہے کہ حضور ﷺ غزوہ تبوک میں اس کنویں پر رکے تھے۔ (النجار' ۹۰) ڈاکٹر جواد علی نے اس پر طویل تحقیق کی ہے۔ اور اس بات کی تائید کی ہے کہ قوم ثمود تین مختلف مقامات پر آباد تھی۔ (وادی الحجاز میں) اور یہ تین مقامات عالی حجاز میں درج ہیں۔

۱۔ تیما کا مغربی علاقہ ۲۔ الحجر ۳۔ دومۃ الجندل

پھر یہ وضاحت بھی کی ہے کہ دیار ثمود میں حضرت صالح علیہ السلام جس جگہ رہتے تھے۔ وہ مدائن صالح نہیں بلکہ وہ اصل میں اس مقام پر تھے جسے آج کل

"الحزیتہ" کہتے ہیں۔ (المفصل '۱: ۳۶۲)

اہل ثمود ہنر مند تھے اور انہیں بہت سارے فنون میں مہارت حاصل تھی خاص طور پر یہ ماہر تعمیرات تھے اور اپنے فن میں اپنی مثال آپ تھے کہ یہ لوگ پہاڑوں اور چٹانوں کو تراش کر بہت وسیع و عریض' خوبصورت اور شاندار مکانات تعمیر کرنے میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ اور دوسری اہم بات یہ تھی کہ یہ لوگ نہایت طاقتور قوم تھے۔

مصلحتیں اللہ کے نبیوں کے پاؤں کی زنجیر کب بنی ہیں؟

اجتماعی حوالے سے یہ ایک فیصلہ کن قوت کے مالک تھے۔ اس طاقتور قوم کے عقائد باطلہ کو للکارنا اور ان کے سامنے کلمہ حق بیان کرنا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ لیکن مصلحتیں اللہ کے نبیوں کے پاؤں کی زنجیر کب بنی ہیں' حضرت صالح علیہ السلام نے پوری جرات کے ساتھ نعرہ حق بلند کیا اور مرحلہ دعوت کا آغاز کر دیا اور کمال استقامت سے پیغام حق پہنچایا۔ ان پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹے' ابتلاء و آزمائش کے مراحل آئے' ان کی راہ میں سازشوں کے جال بچھائے گئے' ان کے خلاف کردار کشی کا حربہ استعمال کیا گیا۔ نوبت ایذا رسانی تک پہنچی' الزام تراشیوں کا بازار گرم ہوا لیکن حضرت صالح علیہ السلام کی جبین شکن آلود نہ ہوئی' انہوں نے تحریک اسلامی کے مخالفین کے ہر وار کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا اور انتہائی خوش اسلوبی سے کار نبوت سرانجام دیتے رہے۔ انتہائی شائستگی اور کمال استقامت سے بہتان تراشیوں اور کفار کے اٹھائے گئے اعتراضات کا جواب دیتے کہ اہل باطل ساکت و مبہوت رہ جاتے' اللہ کے نبی کو تائید خداوندی حاصل تھی' اللہ تعالیٰ نے انہیں معجزات سے نوازا' ان کے دست حق پرست پر پے در پے معجزات کا ظہور ہوتے دیکھ کر بھی اہل باطل کے سینوں میں ایمان کی کوئی کرن نہ پھوٹی۔ سورج کو دیکھ کر بھی وہ سورج کی روشنی کا انکار کرتے رہے اور جو روشنی کا انکار کر دے اندھیرے ہمیشہ کے لئے اس کے مقدر میں لکھ دیئے جاتے ہیں'

قدم قدم پر انہیں اللہ کی نشانیاں دکھائی گئیں کہ کسی طرح وہ راہ راست پر آ جائیں لیکن وہ کفر کے سمندر میں اپنی ساری کشتیاں غرق کر چکے تھے' ایمان کے ساحلوں کی روشنی ان کی نظروں سے اوجھل ہی رہی۔ تحریک اسلامی کے خلاف کفار و مشرکین کی جنگ ان کے اپنے مفاد کے گرد گھومتی تھی' اللہ اپنے نبی کے ذریعہ جو پیغام دے رہا تھا وہ ان کے عقائد باطلہ کی موت تھی' یہ اپنے فرسودہ نظام حیات سے چمٹے رہے اور اپنی مجلسی اور ثقافتی زندگی میں کسی انقلابی تبدیلی کے روادار نہ ہوئے اور مسلسل کفر کے اندھیروں میں ڈوبے رہے۔

آسمانی نشانیوں کی من مانی تاویلات

کہتے ہیں کہ جب گیدڑ کی موت آتی ہے تو وہ شہر کی طرف بھاگتا ہے اسی طرح جب کسی قوم کی بربادی کا وقت قریب آ جاتا ہے تو اس کی ایک نشانی یہ بھی ہے کہ بعض اوقات وہ اپنے نبی سے نبوت کی کوئی ایسی نشانی مانگنے لگتی ہے کہ جس کا کوئی نبی بھی انکار نہ کر سکے لیکن اللہ کی نشانیوں کو آنکھوں سے دیکھ لینے کے باوجود ان کا انکار اس قوم کی گھٹی میں پڑا ہوتا ہے۔ منحرف چہروں کے جنگل میں ایمان اور ایقان کی بات کرنا اور عالم کفر میں پرچم توحید بلند کرنا یقیناً غیر معمولی بات ہے اور یہی کار نبوت ہے۔ یہ آسمانی نشانیوں کی من مانی تاویلات کرتے ہیں۔ معجزات پر معجزات طلب کرتے ہیں جب انہیں اللہ کی نشانیاں دکھائی جاتی ہیں تو صاف انکار کر دیتے ہیں' کیونکہ ان کا ذہنی فتور انہیں کلمہ حق قبول کرنے سے روکتا ہے ایک موقع پر جب بنی اسرائیل نے بھی حضرت موسیٰ علیہ السّلام سے مطالبہ کیا کہ آسمان سے ان کے لئے دسترخوان نازل کیا جائے تو ہم آپ کی صداقت پر ایمان لے آئیں گے قرآن اسے یوں بیان کرتا ہے۔

قَالَ اللّٰهُ اِنِّیْ مُنَزِّلُهَا عَلَیْكُمْ فَمَنْ یَّكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَاِنِّیْ اُعَذِّبُهٗ عَذَابًا لَّاۤ اُعَذِّبُهٗۤ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِیْنَ۝

اللہ نے فرمایا بیشک میں اسے تم پر نازل کرتا ہوں پھر تم میں سے جو شخص (اس کے بعد) کفر کرے گا تو یقیناً میں اسے ایسا

(المائدہ' ۵:۱۱۵)

عذاب دوں گا کہ تمام جہان والوں میں
سے کسی کو بھی ایسا عذاب نہ دوں گا۔

انبیاء کی تکذیب گوارا نہیں

کچھ ایسا ہی معاملہ حضرت صالح علیہ السلام کی قوم کے ساتھ ہوا۔ آخرکار انہوں نے مطالبہ کر دیا کہ ایک پہاڑی چٹان سے اونٹنی نکال کر دکھاؤ پھر اونٹنی کی بھی بے شمار نشانیاں گنوانی شروع کر دیں کہ اس طرح کی ہو اور فلاں فلاں باتیں اس میں پائی جاتی ہوں۔ حتی کہ اتنی نشانیاں گنوا دیں کہ جتنی نشانیوں والی اونٹنی کا پایا جانا ہی ان کے نزدیک محال تھا۔ اپنی طرف سے اس طرز پر مطالبہ کر کے انہوں نے چاہا کہ ہم (معاذ اللہ) اللہ کے نبی کو جھوٹا ثابت کر دیں گے۔ لیکن انہیں کیا خبر تھی کہ نبی تو اپنے نبی ہونے کا اعلان ہی اللہ کے حکم پر کرتا ہے لہٰذا اس کا ہر ہر قدم اللہ کی تائید غیبی کے تحت اٹھتا ہے۔ سو وہ خدا جو اپنے بندوں کی ہدایت کے لئے اپنے برگزیدہ نبیوں کو بھیجتا ہے اپنے ہی بھیجے ہوئے پیغمبر کی تکذیب بھلا کیسے گوارا کر سکتا ہے۔ سو اللہ رب العزت نے حضرت صالح کی طرف وحی فرمائی۔

إِنَّا مُرْسِلُوا النَّاقَةِ فِتْنَةً لَّهُمْ فَارْتَقِبْهُمْ وَاصْطَبِرْ ۝ (القمر، ۵۴:۲۷)

ہم ان کی آزمائش کے لئے ایک اونٹنی بھیجتے ہیں پھر (اے صالح) تم انہیں دیکھتے رہنا اور صبر سے کام لینا (دیکھو کیا نتیجہ نکلتا ہے)۔

مطلوبہ نشانیوں والی اونٹنی

حضرت صالح علیہ السلام نے قوم سے پختہ عہد لئے کہ اگر اونٹنی آ جائے جو کہ تمہاری مطلوبہ نشانیاں پوری بھی کر دے تو ضرور ایمان لے آئیں گے۔ جب عہد و پیمان ہو چکے تو حضرت صالح علیہ السلام نے بارگاہ ایزدی میں دست دعا دراز کر دیئے۔ دعا قبول ہوئی اور ان کی مطلوبہ علامات و خواص کی حامل اونٹنی انہیں مل گئی۔ ہوا یوں کہ ان سب کو جمع کیا گیا اور انکی نگاہوں کے سامنے چٹان پھٹی اور اس میں سے اونٹنی

نکل آئی۔ وہ اونٹنی بڑبڑاتی ہوئی اور سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھتی ہوئی نکلی جو اس بات کی علامت تھی کہ انہیں آسمانوں کے خالق و مالک حقیقی اور رب العالمین جو وحدہ لا شریک ہے پر ایمان لے آنا چاہئے مگر بات وہی ہوئی جو اس طرز پر نشانی مانگنے والوں کے ساتھ ہوا کرتا ہے یعنی اللہ کی طرف سے نشانی آ تو گئی لیکن اس کے ساتھ شرط بھی لگ گئی کہ جس نے اسے تنگ کیا یا تکلیف پہنچائی تو فوراً عذاب آ جائے گا ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ ان سے فرمایا گیا۔

هٰذِهٖ نَاقَةٌ لَّهَا شِرْبٌ وَّلَكُمْ شِرْبُ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ۝ وَ لَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابُ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝
(الشعراء ۲۶: ۱۵۵-۱۵۶)

(صالح نے) فرمایا (دیکھو) یہ اونٹنی ہے (جو ایک پتھر سے نکلی ہے) اس کے پانی پینے کی باری اور تمہارے پانی پینے کی باری کا دن مقرر ہے۔ اور اس کو کوئی تکلیف نہ دینا ورنہ تم کو ایک بڑے (سخت) دن کا عذاب آ پکڑے گا۔ (تم پر سخت آفت آ جائے گی)

ایک اور مقام پر یوں ہے کہ یہ ناقہ تمہارے لئے نشانی ہے۔ لہٰذا اسے نقصان پہنچانے یا تکلیف دینے کی کوشش کی تو عذاب آ جائے گا (ہود ۱۱: ۶۴) بلکہ یہ بھی ہے کہ یہ زمین میں (جو بھی) کھائے تو اسے کھلا چھوڑ دو۔

شدید عذاب کا پیش خیمہ

اس پر جن کے نصیب میں ایمان تھا وہ تو ایمان لے آئے لیکن جنہوں نے خود اپنے لئے بد بختی کی راہ منتخب کر لی تھی ان کا حساب مختلف ہوا۔ یعنی انہوں نے پھر انکار کر دیا اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ حضرت صالح علیہ السلام کو جوابی چیلنج کر دیا کہ اگر تم سچے ہو تو عذاب لا کر دکھاؤ اور اس کے ساتھ ہی انہوں نے اس اونٹنی کو قتل کر دیا تیر مارے اور ذبح کر دیا قرآن مجید ان کی اس حالت کو بیان فرماتا ہے۔

فَعَقَرُوا النَّاقَةَ وَ عَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ وَ

پس انہوں نے اونٹنی کو (کاٹ کر) مار ڈالا

قَالُوْا یٰصٰلِحُ ائْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الْمُرْسَلِیْنَ ۝ (الاعراف '۷:۷۷)

اور اپنے رب کے حکم سے سرکشی کی اور کہنے لگے اے صالح! تم وہ (عذاب) ہمارے پاس لے آؤ جس کی تم ہمیں وعید سناتے تھے اگر تم (واقعی) رسولوں میں سے ہو۔

اللہ کی پکڑ بڑی سخت ہوتی ہے

اس پر آخری فیصلہ یعنی شدید عذاب کا وقت آگیا۔ بارگاہ ایزدی سے اعلان ہو گیا اور اس کی وحی ان الفاظ میں آگئی جو حضرت صالح علیہ السلام نے ان تک پہنچا دی۔

تَمَتَّعُوْا فِیْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَیَّامٍ ذٰلِكَ وَعْدٌ غَیْرُ مَكْذُوْبٍ ۝
(ھود '۱۱:۶۵)

(اب) تم اپنے گھروں میں (صرف) تین دن (تک) عیش کر لو یہ وعدہ ہے جو (کبھی) جھوٹا نہ ہو گا۔

لہٰذا یہ تین دن جمعرات' جمعہ اور ہفتہ تھے۔ (جیسا کہ مفسرین و مورخین نے ذکر کیا ہے)

تین دن

ان تین دنوں میں واقعات عذاب اس ترتیب میں آئے۔

جمعرات کا عذاب

جمعرات آئی تو ان کے چہرے پیلے پڑ گئے۔ جب شام ہوئی تو افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہنے لگے کہ عدت میں سے پہلا دن گزر گیا۔

جمعہ کا عذاب

جمعہ آیا تو ان کے چہرے سرخی مائل (غالباً براؤن) ہو گئے۔ دن گزار کر کہنے لگے کہ افسوس ہے کہ دوسرا روز بھی گزر گیا۔

ہفتہ کا عذاب

تیسرا روز آیا تو ان کے چہرے سیاہ پڑ گئے' جب سیاہ رنگ کے ساتھ شام ہو گئی تو کف افسوس ملتے ہوئے کہنے لگے کہ تیسرا دن بھی گزر گیا۔

اتوار: زمین و آسمان کے غیظ و غضب کا دن

اتوار کی صبح آئی تو خوف زدہ بیٹھے عذاب کا انتظار کرنے لگے۔ انہیں کچھ خبر نہیں تھی کہ ان کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ نہ وہ یہ جانتے تھے کہ ان پر جو عذاب آنے والا ہے کس رنگ کا ہو گا۔ اس میں کتنی سختی ہو گی' وہ کس قدر تکلیف دہ ہو گا' اس کی صورت کیا ہو گی' اس کی شدت کا عالم کیا ہو گا وہ گومگو کی کیفیت میں تھے' اندر سے خوفزدہ بھی کہ کچھ ہونے والا ہے کیونکہ وہ تین روز میں اللہ کی نشانیاں دیکھ چکے تھے۔ ایسے میں طلوع آفتاب کا وقت قریب آگیا' سپیدہ سحر نمودار ہو چکا تھا اور اب چند لمحوں میں سورج دامن افق سے طلوع ہونے والا تھا۔ جونہی سورج طلوع ہوا اچانک دو طرح کا عذاب نازل ہوا۔

ایک تو آسمان سے شدید اور دلوں کو دہلا دینے والی چیخ سنائی دی اور دوسرے زمین کے نیچے سے شدید زلزلہ آگیا۔

ان دو چیزوں کی شدت سے دل کی حرکت بند ہو گئی' آنکھیں پھٹ گئیں' آوازیں حلق میں پھنس گئیں' اور روحیں پرواز کر گئیں۔ حق کا حق ہونا ثابت ہو گیا اور باطل کا باطل ہونا بالآخر نکھر کر سامنے آگیا۔

ہجرت کا وقت آچکا تھا

گذشتہ ابواب میں بتایا جا چکا ہے کہ انبیائے کرام کی ہجرت کا یا تو فیصلہ کن گھڑی سے قبل یا بعد تعلق ہوتا ہے یا پھر اس کا تعلق ان کے پیغمبرانہ مشن کے مختلف مراحل میں سے کسی اہم مرحلے سے رہا ہے۔ حضرت صالح علیہ السلام بھی اپنے پیغمبرانہ مشن کے ایک نہایت اہم مرحلے پر پہنچ چکے تھے۔ معرکہ حق و باطل میں باطل خائب و

خاسر ہو چکا تھا اور حق غلبہ پا چکا تھا۔ لہٰذا اب اہل حق کو اس سرزمین تک پہنچانا تھا جس کا انتخاب ان کے غلبے کی صورت میں ان کے لئے ہو چکا تھا۔ لہٰذا حضرت صالح علیہ السلام نے وادی القری کے "الحجر" سے نکل کر جو نقل مکانی کی تو ارض شام کی طرف تشریف لے گئے پھر تکمیل مشن کے بعد مکہ تشریف لے گئے۔ یہاں ایک مدت تک خلوت و سکون کے ساتھ اللہ کی عبادت میں مشغول رہے پھر یہیں آپ کا وصال ہوا اور یہیں پر آپ کا مدفن شریف بنا۔ (الکامل لابن اثیر' ۱:۹۰)

باب - ٦

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ہجرت

آتش نمرود میں بے خطر کودنے کی روایت انبیاء کی سنت ہے جسے اہل حق نے ہر دور اور ہر عہد میں زندہ و تابندہ رکھا ہے۔ اور اس احساس کو کبھی ضعیف یا کمزور نہیں ہونے دیا کہ بالآخر فتح حق کی ہوتی ہے اور باطل کے مقدر میں ذلت و رسوائی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی ان جلیل القدر انبیائے کرام علیہم السلام میں سے ہیں جنہوں نے فریضہ ہجرت ادا کیا بلکہ وہ مختلف اوقات میں مسلسل حالت ہجرت میں رہے۔ ان کی پیدائش عراق میں ہوئی' جہاں آپ کا خاندان مقیم تھا۔ آپ کا نسب مبارک بھی حضرت نوح علیہ السلام سے ملتا ہے۔ (ابراہیم بن تارخ بن ناخور......بن سام بن نوح) ایک روایت کے مطابق آپ اہواز کی زمین السوس میں پیدا ہوئے۔ بعض کے نزدیک آپ کی ولادت پاک بابل کی زمین السواد میں ہوئی۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ سواد کے بھی ایک نواحی علاقے الکوثی میں پیدا ہوئے۔ جبکہ عند البعض آپ کی پیدائش زوابی کے نواحی علاقے ورکاء میں ہوئی جو کہ کسکہ کی حدود پر ہے۔ لیکن بعض روایات میں صدان بھی آیا ہے۔ کچھ بھی ہو لیکن اتنا ضرور ہے کہ آپ کے والد گرامی آپ کو بابل کے علاقے میں لے آئے تھے جہاں آپ کی بعثت ہوئی۔ یہ علاقہ نمرود بن کوش کے زیر نگیں تھا جس نے خدائی کا دعوی کیا تھا۔ اس کا صاف معنی تھا کہ آپ کی نشوونما بت پرستی کے ماحول میں ہوئی۔ یہ بھی ایک تاریخی تسلسل ہی ہے کہ کعبہ کو پاسبان صنم خانوں ہی سے ملا کرتے ہیں' سورج ہمیشہ رات کے بطن سے پیدا ہوتا ہے۔ ایمان کفر کی آغوش میں پروان چڑھتا ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تربیت فرعون کے محلوں میں ہوتی ہے' جگنو کی چمک ہمیشہ تاریکی ہی میں دکھائی دیتی ہے۔ آپ کی پیدائش سے متعلق ایک روایت بہت سے مورخین نے نقل کی ہے کہ جب آپ کی ولادت کا زمانہ قریب آیا تو نمرود کو بعض نجومیوں نے آکر بتایا کہ تمہارے ملک میں ایک لڑکے کی پیدائش ہونے والی ہے اس کا نام ابراہیم ہو گا اور وہ فلاں سن فلاں مہینے میں پیدا ہو گا۔ نمرود نے اس بات پر یقین کر لیا اور اس زمانے میں

اس کے علاقے کی جتنی مستورات حاملہ تھیں انہیں الگ کروا لیا اور مردوں کا اس گاؤں میں داخلہ بند کروا دیا۔ چنانچہ جس کے بھی لڑکا ہوتا اس کو ذبح کر دیا جاتا۔

قدرت خداوندی نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حفاظت کے لئے دو انتظامات فرما دیئے۔ ایک تو یہ کہ اس واقعہ کے وقت تک آپ کی والدہ گرامی قدر کے حمل کے آثار ہی ظاہر نہ ہو سکے۔ جس کی وجہ سے نمرود کو حضرت ابراہیم کی پیدائش کا علم نہ ہو سکا دوسرے یہ کہ بعد ازاں نمرود وقت کے ساتھ ساتھ بھول گیا کہ منجمین نے اسے کہا تھا۔ اقتدار کے نشے میں اہل ہوس اپنے خدا کو بھی بھلا دیتے ہیں بلکہ مسند اقتدار پر براجمان ہوتے ہی خدا بن بیٹھتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ مسند اقتدار مسند عدل بھی ہے اور انہیں زمین پر عدل کی حکمرانی قائم کرنا ہے۔ لیکن آپ کی والدہ ماجدہ کو یاد تھا۔ لہٰذا جب آپ کی ولادت شریفہ کا وقت آیا تو آپ کی والدہ ماجدہ گھر کے قریب ایک غار میں تشریف لے گئیں۔ جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیدائش ہوئی۔ میلاد مبارک کے بعد آپ کی حفاظت کا قدرت نے ایک اور انتظام فرما دیا اور وہ یہ کہ آپ کی نشوونما ایک نہایت عجیب طریق پر بہت ہی غیر معمولی تیزی سے ہوئی تاکہ کسی کو بھی شک نہ ہو کہ آپ کی ولادت شریفہ اس سال ہوئی ہے۔ آپ کی سرعت نمو کا بیان ان الفاظ میں کیا جاتا ہے کہ ایک ماہ میں اتنا نمو پاتے گویا کہ ایک سال میں۔ یعنی چند ماہ میں آپ کی عمر مبارک چند سال کی محسوس ہونے لگی۔ اس سے فوراً سامنے آنے پر یہی معلوم ہوتا کہ آپ کی پیدائش اس سال کی نہیں بلکہ چند سال پہلے کی ہے۔ یہ قدرت کی طرف سے حفاظت کا طریقہ تھا کہ جو ابتدائے عمر میں آپ کے ساتھ روا رکھا گیا۔ (الکامل لابن اثیر، تاریخ الامم والملوک الطبری، المعارف لابن قتیبہ وغیرھا من الکتب فی ذکر ابراھیم خلیل اللہ) نیز دائرہ معارف اسلامیہ اردو پہلی جلد ذکر ابراھیم خلیل اللہ۔ دائرۃ المعارف الاسلامیہ میں اس کے تحت دو روایات اور بھی دی گئیں ہیں۔

حق کا ساتھ دینا ہر ایک کے مقدر میں کہاں

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعوت حق لوگوں تک پہنچائی تو لوگوں نے کہا

لیکن تمہارا چچا آذر تو کچھ اور بتاتا ہے اس پر آپ نے صراحتاً ارشاد فرمایا کہ وہ گمراہ ہو چکا ہے۔ رفتہ رفتہ لوگوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت پر لبیک کہنا شروع کر دیا اور بہت سے لوگ خدائے لاشریک کی وحدانیت اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نبوت پر ایمان لے آئے لیکن دعوت حق کی مخالفت کا آغاز حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اپنے گھر سے ہوا اور آپ کا چچا اس مزاحمتی تحریک میں پیش پیش تھا۔ کیونکہ کلمہ حق کی تبلیغ سے اس کے مفادات پر براہ راست زد پڑتی تھی اور مفادات کی قربانی دے کر حق کا ساتھ دینا ہر ایک کے مقدر میں کہاں۔

قرآن مجید نے اس کی منظر کشی فرمائی ہے کہ جب حضرت ابراہیم نے اپنے چچا کو دعوت حق دی اور شرک سے روکنا چاہا تو فرمایا۔

يَا أَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِي عَنْكَ شَيْئًا ۝ يَا أَبَتِ إِنِّي قَدْ جَاءَنِي مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَأْتِكَ فَاتَّبِعْنِي أَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا ۝ يَا أَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطَانَ إِنَّ الشَّيْطَانَ كَانَ لِلرَّحْمَٰنِ عَصِيًّا ۝ يَا أَبَتِ إِنِّي أَخَافُ أَنْ يَمَسَّكَ عَذَابٌ مِنَ الرَّحْمَٰنِ فَتَكُونَ لِلشَّيْطَانِ وَلِيًّا ۝ قَالَ أَرَاغِبٌ أَنْتَ عَنْ آلِهَتِي يَا إِبْرَاهِيمُ لَئِنْ لَمْ تَنْتَهِ لَأَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِي مَلِيًّا ۝

(مریم ۱۹: ۴۲ ـ ۴۶)

اے میرے باپ آپ ایسی چیز کی پرستش کیوں کرتے ہیں جو نہ سنے نہ دیکھے نہ آپ کے کچھ کام آ سکے۔ اے میرے باپ میرے پاس وہ علم آ چکا ہے جو آپ کو نہیں ملا۔ پس میری پیروی کیجئے میں آپ کو سیدھی راہ دکھا دوں گا۔ آیئے میرے پاس شیطان کی پرستش نہ کیجئے (اپنے ہواہوس کو خدا نہ بنایئے اس کے حکم پر نہ چلیے) بے شک شیطان (اس) رحمان (ورحیم خدا) کا نافرمان ہے۔ اے میرے باپ (یہ صحیح ہے کہ اللہ الرحمان' الرحیم ہے لیکن) مجھے خوف ہے کہ کہیں آپ اللہ کے کسی عذاب میں مبتلا نہ ہو جائیں تو آپ شیطان کے رفیق ہو جائیں۔ اس نے کہا اے ابراہیم کیا تو

میرے خداؤں سے برگشتہ ہے۔ اگر تو
(اپنی تبلیغ سے) باز نہ آیا تو میں تجھے
سنگسار کر دوں گا (میں تیری صورت دیکھنا
نہیں چاہتا)

باطل کے بقا کی جنگ

اہل حق نے ہمیشہ اپنے وقت کی باطل استحصالی طاقتوں سے ٹکر لی ہے' باطل نظام اور اس نظام کے محافظوں کو للکارا ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ حق کا اعلان ہونے کے ساتھ ہی باطل اپنی تمام قوت کے ساتھ مسافران حق کے مقابل آ جاتا ہے اور اپنی بقا کی جنگ لڑتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ انبیاء کی ساری جدوجہد ایک انقلابی جدوجہد ہے۔ انقلاب دشمن طاقتیں ہمیشہ سیاہ انقلاب سے نبرد آزما رہی ہیں' اندھیرے اجالوں سے الجھتے رہے ہیں لیکن روشنی کا سفر ہر حال میں جاری رہا ہے۔ یہ سفر آج بھی جاری ہے اور قیامت تک جاری رہے گی۔ آج بھی اسلام کا راستہ روکا جا رہا ہے اور اس کے انقلابی کردار کو ختم کر کے اسے محض عبادات تک محدود کرنے کی سازش کی جا رہی ہے تاکہ یہ ایک سیاسی قوت بن کر اپنا بھرپور کردار ادا کرنے کے قابل نہ رہے اور مسلمان یہود و ہنود و نصاریٰ کے لئے تر نوالہ ثابت ہوں اور عالمی قذاقوں کی سیاسی اور اقتصادی غلامی کے حصار سے نہ نکل سکیں۔ ایک طرف تو درون خانہ سیدنا ابراھیم علیہ السلام کی مخالفت ہو رہی تھی دوسری طرف گھر سے باہر بھی انقلاب دشمن طاقتیں ملوکیت کے تحفظ کے لئے منظم ہو رہی تھیں۔ نمرود کے دربار میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مکالمہ علم و دانش کا مرقع ہی نہیں فن خطابت کا بھی ایک معجزہ ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے موقف اور اپنے پیغام کی تائید میں دلائل و براہین سے نمرود کا منہ بند کر دیا۔

قرآن مجید نے سورہ بقرہ میں اس کو تفصیل سے بیان فرمایا ہے کہ جب نمرود نے سوال کیا کہ تمہارا رب کون ہے؟ (اگر میں نہیں) تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ارشاد فرمایا (میرا رب وہ ہے جو مردے کو زندگی دیتا ہے اور زندوں کو مار دیا کرتا ہے۔)

نمرود نے کہا (میں مردوں کو زندہ کرتا اور زندوں کو مارتا ہوں (یعنی پھر تو میں رب ہوا معاذ اللہ) (اس پر اس نے سزائے موت کے مجرم کو چھوڑ دیا اور ایک دوسرے شخص کو بلا وجہ مروا دیا) ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا "میرا رب تو وہ ہے جو سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تم (اگر رب ہو تو) اسے مغرب سے نکال (کر دکھا) دو" نمرود نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان مقدسہ سے جواب سنا تو وہ مبہوت ہو کر رہ گیا اس سے کوئی جواب نہ بن پڑا اور اس کے بعد نہ کوئی سوال کر سکا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام عوام کے درمیان

قرآن مجید نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بابت یہ بھی بیان فرمایا ہے کہ انہوں نے عامۃ الناس کو کس طرح قائل کرنے کی انتہائی کوشش کی اور انہیں باور کرانے کی بھرپور جدوجہد فرمائی کہ ان کے بت انہیں نہ نفع دے سکتے ہیں اور نہ انہیں کوئی نقصان پہنچا سکتے ہیں لیکن جنہوں نے نہ ماننا تھا وہ نہیں مانے۔ ہوا یوں کہ ان کا سالانہ میلہ تھا جس میں وہ شرکت کے لئے جا رہے تھے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو کہنے لگے کہ تم بھی چلو تو آپ نے فرمایا کہ نہیں ابھی (تمہارے ان جھمیلوں کی طرف سے) بیمار ہوں۔ (یعنی ناپسند کرتا ہوں اور طبیعت پر بوجھ آتا ہے) سو وہ پہلے ہی چلے گئے۔ جب وہ سب اہل کفر چلے گئے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بت خانے میں جا کر بتوں کو توڑنا شروع کر دیا اور سب بتوں کو تہس نہس کر کے آپ سیدھے سب سے بڑے بت کے پاس آ گئے اور جس کلہاڑی سے ان سب کو توڑا تھا اسے سب سے بڑے بت کے کندھے پر رکھ دیا اور واپس تشریف لے آئے۔ جب ان بتوں کے پجاری واپس آئے اور بتوں کی یہ درگت بنی ہوئی دیکھی تو آپس میں مکالمہ کرنے لگے کہ یہ کس نے کیا ہے؟ اور کون ہے جو اتنی بڑی جرأت کر سکتا ہے؟ بعض کہنے لگے کہ ایک جوان ہے جس کا نام ابراہیم ہے ہمیں "یہ کارستانی" اس کی لگتی ہے۔ لہٰذا اسی کو بلا کر پوچھا جائے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بلایا گیا اور پوچھ گچھ شروع ہو گئی۔

قَالُوْٓا ءَاَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا یٰٓا لوگوں نے کہا اے ابراہیم کیا تو ہی نے

اِبْرٰهِيْمُ ○ قَالَ بَلْ فَعَلَهٗ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا فَسْئَلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ ○
(الانبیاء ۲۱: ۶۲۔ ۶۳)

ہمارے معبودوں کے ساتھ یہ کام کیا۔ (ابراہیم نے) کہا بلکہ یہ تو کیا ہے (جس نے کیا ہے) لیکن ان (بتوں) میں بڑا یہ ہے پس اگر یہ بول سکتے ہوں تو ان سے پوچھ لو۔

اس دلیل نے شرمندگی سے سب کے سر جھکا دیے اور کوئی جواب نہ بن پڑا کیونکہ ان کے اپنے ہاتھوں سے تراشے ہوئے خدا اس قابل نہ تھے کہ کچھ بول سکتے۔ اس موقع پر ان کی عقل ایسی ماری گئی کہ خود اپنے ہی خلاف بے اختیار بول پڑے اور کہنے لگے۔

لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هٰٓؤُلَآءِ يَنْطِقُوْنَ ○
(الانبیاء ۲۱: ۶۵)

تم تو جانتے ہو کہ یہ بت بولتے نہیں۔

گویا اپنے عقیدے کی نفی کردی کہ بت تو ایک لفظ ادا کرنے پر بھی قادر نہیں بڑا بت چھوٹے بتوں کو تہس نہس کیسے کر سکتا ہے؟ یہ کفر کے خلاف کفر کی گواہی تھی۔ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بہت بڑی فتح تھی۔ لہٰذا اس پر انہوں نے موقع غنیمت جان کر اپنی فتح کا برملا اعلان فرما دیا اور ان بدبخت کافروں کو اس انداز سے کلام فرمایا کہ جو بظاہر ایک سوال ہی تھا لیکن کفار و مشرکین کے ضمیر کو جھنجھوڑنے کے لئے کافی تھا۔ فرمایا

اَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَالَا يَنْفَعُكُمْ شَيْئًا وَّلَا يَضُرُّكُمْ
(الانبیاء ۲۱: ۶۶)

فرمایا تو کیا تم اللہ کے سوا ایسوں کی عبادت کرتے ہو جو نہ تم کو نفع پہنچا سکیں اور نہ نقصان

کفار و مشرکین لاجواب ہو گئے، لوہا گرم دیکھ کر آپ نے فرمایا (یہ جملہ جذباتی سطح پر نہایت کارآمد جملہ تھا جو اس موقع پر نہایت مفید مطلب کا حامل تھا)

اُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ○
(الانبیاء ۲۱: ۶۷)

افسوس ہے تم پر۔ اور جن کی تم اللہ کے سوا عبادت کرتے ہو۔ کیا تمہاری عقل

ماری گئی ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو زندہ جلانے کا فیصلہ

اس پر بھی انہیں کوئی جواب نہ بن پڑا یعنی گھر سے بھی دلیل کا جواب نہ مل سکا۔ نمرود کے بس میں بھی سوال کا جواب نہ تھا اور اب عوام بھی بے بس ہو گئے تھے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں عقل ماؤف ہو جاتی ہیں اور دماغ شل ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا یہاں عوام کا ذہنی طور پر راغب الی الحق ہو جانے کا گمان غالب ہو جاتا ہے۔ اب اس کا علاج سوائے اس کے کوئی نہیں کہ اس دعوت حق کو لے کر اٹھنے والے کو ہی سرے سے ختم کر دیا جائے۔ لہٰذا انہوں نے فیصلہ کیا اور آپس میں مشورہ کرنے کے بعد کہنے لگا۔

قَالُوْا حَرِّقُوْهُ وَانْصُرُوْا اٰلِهَتَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ۝ (الانبیاء ۲۱:۶۸)

انہوں نے کہا اس کو (آگ میں) جلادو اور اس طرح اپنے ان معبودوں کی مدد کرو اگر تمہیں کرنا ہے (تو یہی کرو)۔

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق

جنہیں اپنے نصب العین کی سچائی کا یقین ہوتا ہے وہ ابتلاء و آزمائش کے ہر مرحلے سے دیوانہ وار گزر جاتے ہیں اور وہ اقتدار کے ایوانوں کو پر کاہ کی حیثیت بھی نہیں دیتے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بھی یہ ایک بہت بڑا امتحان تھا، لیکن عشق آتش نمرود میں بے خطر کود پڑا۔ ایک بہت بڑا الاؤ روشن کیا گیا اور حضرت ابراہیم کو آگ کے شعلوں کے سپرد کر دیا گیا آپ تین دن اس الاؤ میں رہے بعض روایات میں سات دنوں کا ذکر ہے قدرت خدا کی کہ الاؤ بھی روشن رہا اور حضرت ابراہیم کے جسم پر آنچ تک نہ آئی کہ یہ عقیدے کی بہت بڑی فتح تھی۔ مذکورہ بالا دنوں کے بعد آپ نمرود ہی کے کہنے پر باہر تشریف لے آئے (الکامل، تاریخ طبری)

اے آگ ٹھنڈی اور سلامتی والی ہو جا

اللہ جل مجدہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آگ میں مدد فرمائی ایک تو

آگ کو ٹھنڈا اور سلامتی والا بنا دیا۔ دوسرے اپنے نبی کی تنہائی اور وحشت کو دور کرنے کے لئے ایک فرشتے کو ان کا ہمشکل بنا کر بھیج دیا تاکہ حضرت ابراہیم کی تنہائی کا مداوا ہو اور ان کے درمیان انسیت ہو۔ (الکامل لابن اثیر وغیرہ) قرآن مجید نے اس میں سے ایک کو بیان فرمایا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

قُلْنَا يَا نَارُ كُونِي بَرْدًا وَّ سَلَامًا عَلٰى إِبْرَاهِيمَ ○ وَأَرَادُوا بِهِ كَيْدًا فَجَعَلْنَاهُمُ الْأَخْسَرِينَ

(الانبیاء '۲۱:۶۹-۷۰)

ہم نے حکم دیا اے آگ تو ابراہیم پر ٹھنڈی اور آرام دہ بن جا اور انہوں نے (یعنی کفار نے) تو ان کے ساتھ برائی کرنا چاہی تھی لیکن ہم نے (الٹا) ان ہی کو خسارہ میں ڈال دیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام راہ ہجرت پر

آتش نمرود ٹھنڈی پڑ گئی' آگ کے شعلے بھی اللہ کے نبی کو نقصان نہ پہنچا سکے۔ یہ ایک بہت بڑا معجزہ تھا لیکن نمرود کے مقدر میں ذلت و رسوائی لکھی جا چکی تھی۔ حق و باطل کے درمیان فیصلہ ہو چکا تھا کئی لوگ ایمان کی دولت سے سرفراز ہوئے۔ لیکن نمرود اور اس کے گروہ کے خوف سے بات پھیل نہ سکی۔ جو لوگ ایمان لائے ان میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے حضرت لوط علیہ السلام اور آپ کی آئندہ اہلیہ حضرت سارہ بھی شامل تھیں۔ اب پہلا اہم کام جو باقی تھا وہ حضرت لوط علیہ السلام کو ان کی جگہ پہنچانا تھا دوسرا اہم کام حضرت اسماعیل علیہ السلام کو (جو ابھی پیدا نہیں ہوئے تھے) ان کے مقام پر پہنچانا تھا۔

ایک اہم کام یہ بھی تھا کہ جو لوگ ایمان لے آئے ہیں ان کے ایمان کی حفاظت کا سامان کیا جائے لہٰذا آپ دیگر اہل ایمان کے ساتھ ہجرت فرما گئے اس لئے کہ فروغ دین کا بنیادی پتھر یہی ہجرت کا دروازہ ہے۔

کوثی سے حران تک

آپ اپنی اس ہجرت میں اولاً حران تشریف لے گئے جو موصل' شام اور رمام

کے راستے پر واقع ایک بڑا شہر ہے۔ آپ کے ساتھ دیگر اہل ایمان کے علاوہ آپ کے والد ماجد' حضرت لوط علیہ السلام اور سارہ بھی تھے۔ وہاں ایک عرصے تک رہے۔

حران سے اردن تک

یہاں سے حضرت ابراہیم علیہ السلام ہجرت فرما کر اردن کے مقام شکیم جا کر آباد ہو گئے۔ یہ شہر نابلس ہے جو دریائے اردن کے مغربی کنارے (فلسطین کی طرف) واقع ہے۔

اور پھر مصر کی طرف ہجرت

یہاں سے ہجرت فرما کر مصر تشریف لے گئے یہ دور اس وقت کے فرعون سنان بن علوان بن عبید کا تھا۔ یہاں کے جابر فرعون نے حضرت سارہ سے دست درازی کی کوشش کی جس میں وہ ناکام ہو گیا۔ یعنی جب بھی وہ ہاتھ بڑھانے کا سوچتا اس کے ہاتھ شل ہو جاتے اور وہ حرکت بھی نہ کر پاتا۔ پھر انہی سے عرض کرتا کہ میرے لئے دعا کریں اب میں کچھ نہیں کہوں گا تو ان کی دعا سے پھر ٹھیک ہو جاتا۔ جب تیسری مرتبہ ایسا ہوا تو اس پر رعب طاری ہو گیا۔ پھر اس نے حضرت ہاجرہ کو (جو اس کی لونڈی تھی) حضرت سارہ کی خدمت میں ہدیہ پیش کر دیا۔ وہ ٹل تو گیا تھا۔ لیکن اس کی طرف سے شر کا خطرہ تھا۔ لہٰذا یہاں سے پھر ہجرت فرمائی۔

مصر سے فلسطین تک

لہٰذا آپ یہاں سے ہجرت فرما کر فلسطین میں مقام سبع میں آباد ہو گئے جو شام کے صحرائی علاقے کا ایک ٹکڑا ہے۔ (سبع اس جگہ کا بھی نام ہے جو القدس اور کرک کے درمیان واقع ہے) یہاں سے ایک دن رات کے فاصلے پر انہوں نے حضرت لوط علیہ السلام کو آباد کیا۔ اس مقام پر آپ نے ایک کنواں کھودا یہ نہایت میٹھے پانی والا کنواں تھا۔ اس سے ان کی بکریاں پانی نہیں پیتی تھیں۔ اس مقام پر انہوں نے مسجد بھی تعمیر کرائی۔

السبع سے قط

سفر ہجرت جاری رہا۔ ہجرت کی وجوہات بدلتی رہیں۔ مقاصد تبدیل ہوتے رہے لیکن ہجرت کا بنیادی فلسفہ وہی رہا اذیت کا سلسلہ یہاں بھی ختم نہ ہو سکا۔ کرب وبلا کی ان گنت کڑیاں مربوط ہونے لگیں۔ جب پانی سر سے گزرنے لگا تو آپ نے السبع سے بھی ہجرت کے لئے رخت سفر باندھا اور قط میں آباد ہو گئے جو ایلیا اور رملہ کے درمیان واقع ہے۔

ہجرت مکہ

اس کے بعد آپ مکہ کے سفر پر روانہ ہوئے یعنی حضرت اسماعیل علیہ السلام اور حضرت ہاجرہ کو اس بے آب وگیاہ علاقے میں چھوڑا۔ اس کے بعد حضرت ابراہیم کی کوئی ہجرت منقول نہیں۔ آپ کا وصال مبارک جوون میں ہوا جس کا ایک نام مدینہ الخلیل بھی ہے اسے خلیل الرحمن بھی کہتے ہیں۔

باب ۔ ۷

حضرت لوط علیہ السلام اور ہجرت

حضرت لوط علیہ السلام اللہ کے برگزیدہ پیغمبر ہیں' سلسلہ انبیاء رشد وہدایت کا سلسلہ اور اس انقلاب کی کڑیوں کو مربوط کرتا ہے جو روحانی ہی نہیں ایک سماجی انقلاب بھی ہے۔ ہجرت انقلاب کے دروازوں کو واکرتی ہے اور اہداف کے حصول کو آسان بناتی ہے تاریخ میں حضرت لوط علیہ السلام کی دو ہجرتوں کا ذکر ملتا ہے۔ ایک ہجرت دعوت حق کے آغاز سے قبل جبکہ دوسری ہجرت معرکہ حق وباطل کے فیصلہ کن مرحلے میں ہوئی۔

حضرت لوط علیہ السلام کی ولادت باسعادت

آپ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سگے بھتیجے تھے۔ یعنی آپ کے دادا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد تھے۔ آپ لوط بن ھاران بن تارخ ہیں۔ آپ جنوبی عراق کے قدیم شہر "ار" (UR) میں پیدا ہوئے (ایک روایت کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیدائش بھی یہیں کی تھی)

یہ شہر دریائے فرات کے کنارے بابل اور نینوا سے بھی پہلے سے آباد تھا۔ آج کے دور میں اس کا نام "تل عبید" ہے یعنی یہ شہر تل عبید کی کھدائی کے نتیجے میں دریافت ہوا ہے۔ (اردو دائرہ معارف اسلامیہ) حضرت لوط علیہ السلام نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زیر تربیت نشو ونما حاصل کی آپ کا رشتہ گویا حضرت ابراہیم علیہ السلام سے وہی تھا جو حضرت علی کا حضور نبی اکرم ﷺ سے۔ البتہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نبی اور رسول نہیں تھے۔

شاہراہ ہجرت پر پہلا قدم

حضرت لوط علیہ السلام کی اولین ہجرت حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ ہی پایہ تکمیل کو پہنچی تھی۔ یعنی آپ اولاً حران تشریف لے گئے پھر مصر اور پھر وہاں سے فلسطین چلے گئے۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام "السبع" کے مقام پر فروکش ہو گئے

اور وہیں دائمی قیام کا ارادہ فرمایا جو بعدازاں تبدیل ہو گیا تو اس مقام سے تقریباً ایک دن رات کے فاصلے پر ایک قدیم شہر سدھام ہے جہاں پر انہوں نے حضرت لوط علیہ السلام کو بھیجا اور وہیں آباد ہو جانے کا امر فرمایا یہ اور اس کے ساتھ چند اور شہر مثلاً عامورہ (عامورا / عمورہ) وغیرہ میں بھی حضرت لوط علیہ السلام کی قوم آباد تھی المسعودی نے مروج الذھب میں ان شہر کے نام یہ گنوائے ہیں۔

۱۔ سدوم ۲۔ عموراء (عامور' عمورہ' عامورا) عمرہ اس لئے یہ قوم مجموعی طور پر اصحاب المؤتفکہ کہلاتی ہے۔ ۳۔ ادموتا (دوما (عند ابی الاثیر) ۴۔ صاعورا یا صعوہ (عند ابن الاثیر) ۵۔ ماجورا (عند ابن الاثیر۔ معبہ)

یہ وہ شہر ہیں جو کبھی شام اور حجاز کی اردن اور فلسطین کے ساتھ ملحقہ سرحدوں پر فلسطین کی طرف موجود تھے (مروج الذھب للمسعودی' ۱: ۴۴ مع ذکر ولادۃ اسماعیل قبیلہ)

المنجد کی قسم الاعلام میں پھر اسی طرح معجم البلدان وغیرہ نیز اردو دائرہ معارف اسلامیہ میں ہے کہ یہ علاقے اس وقت "بحر میت" کے کنارے ہی پر واقع ہیں۔ مسعودی لکھتا ہے کہ اس کے زمانے میں بھی یہ علاقے بے آباد تھے۔ یہاں کوئی آباد نہ ہوتا تھا اور سیاح لوگ اسے دیکھنے جاتے تھے۔ اس میں اس وقت (حجارہ مسومہ) یعنی وہ نشان زدہ پتھر جو قوم لوط پر عذاب کے لئے عند اللہ مقرر تھے اور ان پر آسمان سے برسائے گئے موجود تھے۔

قوم لوط کا جرم

اس قوم میں دیگر خرابیاں تو تھیں ہی لیکن سب سے گھٹیا حرکت ان میں لواطت کی تھی (نعوذ باللہ منھا و من شرھا) بلکہ یہ اس فتنہ کے موجدین تھے۔ ان کے جرائم کی جو فہرست بت پرستی کے علاوہ آتی ہے اس میں سرفہرست تین جرم ہیں۔

۱۔ لواطت ۲۔ راہزنی (لوٹ مار اور قتل وغارت گری) ۳۔ مجالس میں نازیبا

حرکتیں۔

اس طرح کی دیگر غلیظ حرکات اس قوم کا شعار تھا اور پھر شرم و حیاء بھی ان میں نام کو نہ رہی تھی کہ یہ حرکتیں بر سر بازار اور مجالس میں سب کے سامنے کھلے بندوں کرتے تھے۔ نفس بے حیائی اور بے غیرتی میں ان کی حالت آج کے یورپ جیسی تھی جہاں لواطت و زنا وغیرہ ہر بات کو ہر جگہ روا سمجھا جاتا ہے (نعوذ باللہ من ذالک)

روشنی' پاکیزگی اور شائستگی کی طرف بلاوا

حضرت لوط علیہ السلام نے انہیں حق کی دعوت پیش کی اور اس جرم غلیظ سے روکنا چاہا اور ان کے ضمیر کو جھنجھوڑا۔

أَتَأْتُونَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ أَحَدٍ مِّنَ الْعَالَمِينَ ○ إِنَّكُمْ لَتَأْتُونَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُونِ النِّسَاءِ بَلْ أَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُونَ ○

(الاعراف' ۷: ۸۰' ۸۱)

کیا تم (ایسی) بے حیائی کا ارتکاب کرتے ہو جسے تم سے پہلے اہل جہاں میں سے کسی نے نہیں کیا تھا۔ بیشک تم نفسانی خواہش کے لئے عورتوں کو چھوڑ کر مردوں کے پاس آتے ہو بلکہ تم حد سے گزر جانے والے ہو۔

ایک مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام نے فرمایا۔

أَئِنَّكُمْ لَتَأْتُونَ الرِّجَالَ وَ تَقْطَعُونَ السَّبِيلَ وَ تَأْتُونَ فِي نَادِيكُمُ الْمُنْكَرَ

(العنکبوت' ۲۹: ۲۹)

(تم کو کیا ہو گیا ہے) کیا تم مردوں سے بدفعلی کرتے ہو اور (آفرینش نسل کی) راہ منقطع کرتے ہو۔ اور اپنی مجلسوں میں (علی الاعلان) برے کام کرتے ہو۔

حضرت لوط علیہ السلام کی اس مخلصانہ نصیحت پر قوم نے انہیں ڈرانے دھمکانے کی راہ پکڑی اور علاقے سے نکال دینے کی باتیں شروع کر دیں۔ (تفصیل قرآنی فلسفہ انقلاب کے باب میں فلسفہ تضاد کے تحت ملاحظہ کیجئے گا) اور اپنی ذات

داعمال اور خیالات کو پاک کر لینے کی بجائے ان پر الزام تراشی شروع کی کہ یہ پاکیزہ لوگ ہیں انہیں ان کے گھر سے نکال باہر کرو اور علاقہ بدر کر دو وغیرہ۔ یہ کلام ان کی طرف سے ایک طنز بھی تھا جو حضرت لوط علیہ السلام کی پاکبازی اور طہارت پر کسا گیا تھا۔

فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا ائْتِنَا بِعَذَابِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ○ (العنکبوت ۲۹:۲۹)

تو اس کا جواب ان کے پاس اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ وہ کہہ اٹھے (اچھا) اگر تم سچے ہو تو ہم پر اللہ کا قہر نازل کر دو۔

اور بلاشبہ ان کا یوں عذاب طلب کرنا بہت بڑی جرات اور ناقابل معافی جرم تھا جس کی سزا انہیں مل کر رہی ہیں۔

عذاب کا فیصلہ

اس پر حضرت لوط علیہ السلام نے دعا کی کہ ان سے کیا ہوا وعدہ الوہی پورا ہو جائے اور جس عذاب کو وہ مانگ رہے ہیں (نعوذ باللہ) وہ ان پر نازل کر دیا جائے۔ حضرت لوط علیہ السلام کا دست دعا دراز ہوا اور زبان مبارک پر کلمات آئے۔

رَبِّ نَجِّنِیْ وَ اَهْلِیْ مِمَّا یَعْمَلُوْنَ○ (الشعراء ۲۶:۱۶۹)

(اور اپنے رب کے حضور دعا کرتا ہوں کہ) اے میرے پروردگار مجھ کو اور میرے گھر والوں کو اُن کے کاموں (کے وبال) سے نجات دے۔

اسی طرح ایک اور مقام پر قرآن مجید ان کی دعا کے یہ لفظ بھی بیان فرماتا ہے کہ جب اس قوم نے عذاب (معاذ اللہ) طلب کیا تو حضرت لوط علیہ السلام کی دعا میں یہ لفظ بھی شامل تھے۔

قَالَ رَبِّ انْصُرْنِیْ عَلَى الْقَوْمِ الْمُفْسِدِیْنَ○ (العنکبوت ۲۹:۳۰)

(چنانچہ لوط نے) عرض کی اے میرے رب ان مفسد (گندے اور شریر) لوگوں

کے خلاف میری مدد فرمانا۔

نبی کی دعا عرش سے نیچے کہاں رکتی ہے؟ دعا کا ایک ایک لفظ بارگاہ ایزدی میں قبول ہو گیا اور اللہ جل مجدہ نے اس قوم کے عذاب اور اپنے پیارے نبی اور ان پر ایمان لانے والے افراد کی نجات کا انتظام فرمادیا۔ اس مرتبہ یہ نجات ایک ہجرت کے ذریعے تھی۔

فرشتے عذاب لے کر آتے ہیں

اس کو قرآن مجید نے کئی مقام پر بیان فرمایا ہے۔ تین فرشتے حضرت جرائیل امین حضرت میکائیل، حضرت اسرافیل کو کام کے لئے منتخب فرمایا گیا کہ وہ جائیں اور دو گھروں میں سے ایک گھر میں خوشخبری سنانے جائیں اور دوسرے گھر میں جا کر عذاب الٰہی پہنچائیں اور اہل حق و اہل ایمان کو بچا کر لے آئیں۔

خوشخبری والا گھر

لہٰذا فرشتے پہلے خوشخبری والے گھر جاتے ہیں۔ یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں۔ آپ مہمان سمجھ کر خوشی اور خندہ پیشانی سے ان کا استقبال کرتے ہیں۔ فرشتے بھی خود کو ظاہر نہیں کرتے بلکہ مہمان بن کر بیٹھ جاتے ہیں۔

مہمانوں کی خاطر مدارت

حضرت ابراہیم علیہ السلام "اکراماً للضیوف" فوراً ان کے لئے خاطر مدارت کا انتظام فرماتے ہیں۔ اس انتظام میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ ایک عدد اچھا موٹا اور صحت مند بچھڑا بھون کر تیار کر لائے۔ لیکن مہمانوں نے جب اسے ہاتھ لگایا تو انہیں خوف سا لاحق ہوا کہ خدا جانے کون ہیں کہیں کوئی عذاب ہی لے کر نہ آئے ہوں؟ کیونکہ ان کے کھانا نہ کھانے سے وہ اتنا تو سمجھ گئے تھے کہ یہ یہی فرشتے ہیں۔ لیکن انداز سے لگتا تھا کہ کوئی اہم مشن ان کے سپرد کیا گیا ہے۔

ہم خوشخبری سنانے آئے ہیں

جب انہوں نے یہ بات بتائی کہ وہ فرشتے ہیں اور انہیں خوشخبری سنانے آئے ہیں کہ اللہ پاک تمہیں ایک بیٹا (حضرت اسحاق علیہ السلام) عطا فرمائیں گے۔ اس پر حضرت سارہ کو ہنسی بھی آئی اور حیرت بھی ہوئی کہ اس عمر میں میرے ہاں اولاد کیا ہو گی! انہوں نے فرشتوں سے سوال بھی کیا کہ میرے اب اولاد کیسے ہو سکتی ہے جبکہ میں بانجھ ہوں اور میرے خاوند ضعیف العمر ہو چکے ہیں۔ انہوں نے جواب میں کہا کہ کیا تمہیں اللہ کے امر سے تعجب و استعجاب ہے (یعنی تم نبی کے گھر کا فرد ہو تمہیں تو معلوم ہونا چاہئے کہ کون ہر چیز پر قادر ہے) بعد ازاں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سوال کیا کہ کہاں کا ارادہ ہے؟ اس سوال پر فرشتوں نے کہا کہ ہم حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں۔ پھر ان کے درمیان مکالمہ جاری ہوا اور آخرکار وہ وہاں سے انہیں مطمئن کر کے رخصت ہوئے اور حضرت لوط علیہ السلام کی بستی کی طرف روانہ

فرشتوں کی حضرت لوط علیہ السلام کی بستی میں آمد

فرشتے جب حضرت لوط علیہ السلام کی بستی میں داخل ہوئے تو ان کے گھر تک پہنچنے کا تو کسی کو بھی پتہ نہ چلا بعض مورخین کے مطابق انہیں کسی عورت نے دیکھ لیا (اور بعض مورخین نے لکھا ہے کہ خود حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی جو کہ کافرہ تھی) نے مہمانوں کو دیکھا اس سے پہلے اس نے اتنے حسین و جمیل نوعمر نوجوان کبھی نہیں دیکھے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ فرشتے انہیں عذاب میں مبتلا کرنے کی خاطر آئے تھے اور یہ بتانے کے لئے کہ واقعتاً ان کا سنگین جرم تھا جس کی انہیں سزا دی گئی ہے ان فرشتوں کو دیکھتے ہی ان بدبختوں کے اندر شیطنت جاگ اٹھی اس طرح انہوں نے اپنے اوپر توبہ کے دروازے بند کر لئے اور حضرت لوط علیہ السلام سے بھی گواہی لی۔ اس موقع پر اس عورت نے (خواہ وہ اور کوئی عورت تھی یا حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی) پوری بستی کے لوگوں کو ان حسین و جمیل جوانوں کی طرف متوجہ کیا اور وہ اپنی نفسانی خواہش کی تسکین کے لئے دوڑتے ہوئے سیدھے حضرت لوط علیہ السلام کے گھر پہنچے۔

حضرت لوط علیہ السلام کی پریشانی

حضرت لوط علیہ السلام اس صورت حال سے بہت پریشان ہوئے۔ انہوں نے دروازہ اندر سے بند کیا تو قوم نے دروازہ پیٹنا شروع کر دیا۔ اب ایک طرف قوم کی بے چینی اور دوسری طرف حضرت لوط علیہ السلام کو اس بات کی فکر کہ مہمان اس قوم کے بارے میں کیا سوچیں گے۔ اس موقع پر حضرت لوط علیہ السلام بظاہر نہایت بے بسی کے عالم میں صورتحال کا جائزہ لے رہے تھے کہ اب کیا ہو گا۔

قرآن مجید نے اس وقت کا مکالمہ ان الفاظ میں نقل فرمایا ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام نے اپنی قوم سے یوں کلام فرمایا۔

قَالَ يٰقَوْمِ هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِیْ هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ فِیْ ضَیْفِیْ اَلَیْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِیْدٌ۝
(ھود ۱۱:۷۸)

لوط نے کہا اے میری (نافرمان) قوم! یہ میری (قوم کی) بیٹیاں ہیں یہ تمہارے لئے (بطریق نکاح) پاکیزہ و حلال ہیں سو تم اللہ سے ڈرو اور میرے مہمانوں میں (اپنی بے حیائی کے باعث) مجھے رسوا نہ کرو۔ کیا تم میں سے کوئی بھی نیک سیرت آدمی نہیں ہے۔

اس پر قوم نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

قَالُوْا لَقَدْ عَلِمْتَ مَا لَنَا فِیْ بَنٰتِكَ مِنْ حَقٍّ وَاِنَّكَ لَتَعْلَمُ مَا نُرِیْدُ۝
(ھود ۱۱:۷۹)

وہ بولے تم خوب جانتے ہو کہ ہمیں تمہاری (قوم کی) بیٹیوں سے کوئی غرض نہیں اور تم یقیناً جانتے ہو جو کچھ ہم چاہتے ہیں۔

غرض کہ ان بدبختوں نے حضرت لوط علیہ السلام کو غایت درجہ تنگ کیا تا آنکہ فرشتوں میں سے حضرت جبرائیل علیہ السلام نے انہیں تسلی دی کہ آپ پریشان نہ ہوں ہمیں اللہ نے اس قوم کو تباہ کر دینے اور ان کے جرائم کی سزا دینے کے لئے بھیجا ہے (نعوذ باللہ) یہ بدبخت بھلا ہمارا کیا بگاڑ سکیں گے۔ پھر اللہ کی بارگاہ سے اجازت لے کر

حضرت لوط علیہ السلام کو تو اطمینان سے ایک طرف بٹھا دیا اور پر جو مارا تو سب اندھے ہو گئے۔ اچانک اندھے ہو جانے پر دہ چلانے اور ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ بھاگو یہ مہمان تو کوئی بہت بڑے جادوگر معلوم ہوتے ہیں۔ وہ ان فرشتوں کو تو جادوگر کہہ کر بھاگ کھڑے ہوئے لیکن انہیں یہ بات معلوم نہیں تھی کہ یہ فرشتے انہیں ان کی بدفعلیوں' بداعمالیوں اور گناہوں کی سزا دینے آئے ہیں۔

بالآخر---(دوسری) ہجرت

یہ وہ مقام ہے جہاں سے حضرت لوط علیہ السلام نے ایک اور ہجرت کی۔ ان فرشتوں نے حضرت لوط علیہ السلام کی خدمت اقدس میں عرض کیا کہ ہم تو انہیں عذاب دے کر جائیں گے آپ اہل ایمان ساتھیوں کو ساتھ لے کر رات کے کسی حصے میں تیزی سے نکل جائیں لیکن ایک بات کا دھیان رہے کہ جاتے ہوئے کوئی پیچھے مڑ کر نہ دیکھے البتہ آپ کی بیوی ضرور مڑ کر دیکھے گی اور اس قوم کے ساتھ برباد ہو گی۔ کیونکہ جو پیچھے مڑ کر دیکھے گا وہ بھی اس قوم کے ساتھ ہی برباد ہو جائے گا۔ کتب تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام وہاں سے شام کی طرف ہجرت فرما گئے۔ (آپ کی ایک صاحبزادی حضرت شعیب علیہ السلام کی دادی جان ہیں جبکہ دوسری صاحبزادی حضرت ایوب علیہ السلام کی والدہ ہیں) (المعارف لابن قتیبہ: ۷۷'۳۱)

اردو دائرہ معارف اسلامیہ میں لوط کے تحت درج ہے کہ عذاب الٰہی کی وجہ سے یہ زمین تقریباً چار سو میٹر سمندر سے نیچے چلی گئی اور پانی ابھر آیا سدوم کی وہ سرسبز و شاداب بستیاں جہاں کہیں کبھی یہ قوم آباد تھی۔ اب بحرمیت یا بحرلوط کے نام سے وہاں سمندر ٹھاٹھیں مارتا ہے خاص سدوم کا کچھ حصہ ان عذاب کے نشان زدہ پتھروں سمیت نشان عبرت بنا ہوا ہے۔

باب۔۸

حضرت یوسف علیہ السلام کی ہجرت

اللہ کی آخری الہامی کتاب قرآن مجید میں حضرت یوسف علیہ السلام کی حیات مبارکہ کے ساتھ ان کی ہجرت کے واقعات بھی تفصیل سے درج ہیں۔ آپ کے دوسرے بھائیوں کے نام یہ ہیں۔

۱۔ راؤبین / روبین (Reuben)

۲۔ شمعون (Simeon)

۳۔ لاوی (levi)

۴۔ یہوذا / یہودا (Juhad)

۵۔ بساکر / یساکر (Issachor)

۶۔ زبولون / زابلون (Zebulun)

یہ اولاد ان کی پہلی بیوی 'ان کی ماموں زاد لیہ (Leah) سے تھے۔

۷۔ یوسف (Joseph)

۸۔ بنیامین (Benjamin)

یہ دونوں لیہ Leah کی چھوٹی بہن راحیل (Reahel) کے بطن مبارک سے تھے۔

۹۔ دان (Dan)

۱۰۔ نفتالی (Naphtali)

یہ دونوں ان کی بیوی (جو پہلے راحیل کی باندی تھی) بلہہ (Bidhah) کے بطن سے تھے۔

۱۱۔ جاد (Zilpha)(Gad)

۱۲۔ اشیر / اشیر (Asher)

یہ دونوں ان کی بیوی (جو پہلے لیہ کی باندی تھی) زلفہ Zil pha کے بطن سے تھے۔

ان میں سے صرف حضرت یوسف علیہ السلام ہی نبی تھے۔

جس وقت آپ کی پیدائش ہوئی تو آپ کے والدین کریمین بیس سال کے

طویل عرصے کے لئے اپنے ماموں کے یہاں حران (وقدان) میں آ چکے تھے۔ آپ کو یہ ہجرت حضرت اسحاق علیہ السلام کی وفات کے بعد اپنے بھائی عیص (انہیں عیصو یا عیسو بھی کہا جاتا ہے۔) کے ساتھ ناچاقی کی بنا پر کرنا پڑی تھی۔ لہٰذا آپ کی پیدائش حران میں ہوئی جسے حاران بھی کہتے ہیں یہ جگہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولین ہجرت کی جگہ بھی ہے اور ایک تاریخی روایت کے مطابق ان کی جائے میلاد بھی ہے۔

آپ کا ایک خواب اور نعمت کے ساتھ حسد

مقولہ ہے کہ نعمت والے سے حسد ضرور ہوتا ہے۔ جس پر اللہ کا احسان ہو اور فضل و نعمت نصیب ہو جائے اس کے حاسدین بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ ایسا ہی معاملہ حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ ہوا تھا۔ آپ کو اور آپ کی والدہ ماجدہ کو بمصداق حدیث رسول ﷺ دنیا کا نصف حسن ملا تھا۔ پھر نبوت کی اپنی خصوصیت اور وقار ہوتا ہے ان دونوں باتوں نے مل کر حضرت یوسف علیہ السلام کو اس درجہ لائق محبت بنا دیا تھا کہ حیطہ تحریر میں نہیں آ سکتا۔ اس بنا پر تو آپ حضرت یعقوب علیہ السلام کے نہایت لاڈلے اور محبوب صاحبزادے تھے۔ حتی کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی پھوپھی جن کے پاس آپ بچپن میں قیام پذیر رہے تھے۔ آپ کے بغیر ایک پل نہ رہ سکتی تھیں اور انہیں مختلف حیلوں بہانوں سے تاحیات اپنے ہی پاس رکھا۔ (الکامل لابن اثیر) پھر اس نعمت کے حصول اور ترقی پر آپ کو ایک خواب کی صورت میں بشارت بھی دی گئی۔ آپ کے والد گرامی حضرت یعقوب علیہ السلام کی شفقت تو پہلے ہی انہیں محسود بنا چکی تھی یعنی آپ کے بھائی آپ کے شدید مخالف اور خون کے پیاسے بن چکے تھے اس خواب نے انہیں مزید مشتعل کر دیا۔ ان کا وہ خواب محتاج بیان نہیں کیونکہ سب اسے جانتے ہیں کہ آپ نے چاند سورج اور گیارہ ستاروں کو دیکھا کہ آپ کو سجدہ کر رہے ہیں۔

خواب کا بھائیوں کو علم

آپ نے جس وقت یہ خواب اپنے والد گرامی حضرت یعقوب علیہ السلام کو

سنایا تو آپ نے خواب سنتے ہی نصیحتاً دو باتیں ارشاد فرمائیں۔ قرآن مجید میں اس کا بیان ان الفاظ میں آیا ہے۔

قَالَ يَا بُنَيَّ لَا تَقْصُصْ رُءْيَاكَ عَلٰى إِخْوَتِكَ فَيَكِيْدُوْا لَكَ كَيْدًا ۖ إِنَّ الشَّيْطَانَ لِلْإِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ○ وَكَذٰلِكَ يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَأْوِيْلِ الْأَحَادِيْثِ
(یوسف ۱۲: ۵-۶)

انہوں نے کہا اے میرے بیٹے اپنا یہ خواب اپنے بھائیوں سے بیان نہ کرنا ورنہ وہ تمہارے خلاف کوئی بھی فریبی چال چلیں گے۔ بیشک شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔ اسی طرح تمہارا رب تمہیں (بزرگی کے لئے) منتخب فرمالے گا اور تمہیں باتوں کے انجام تک پہنچنا (یعنی خوابوں کی تعبیر کا علم) سکھائے گا۔

ابن الاثیر کی الکامل میں ہے کہ جس وقت آپ یہ خواب سنا کر تعبیر ساعت فرما رہے تھے تو اس وقت حضرت یعقوب علیہ السلام کی ایک اہلیہ نے یہ گفتگو سن لی۔ اس پر انہوں نے انہیں تلقین کی کہ یہ خواب اپنی اولاد کو مت بتانا۔ انہوں نے اس لمحے تو "اچھا" کہہ دیا لیکن جب شام کو اپنی اولاد گھر واپس آئی تو بیٹوں سے سارا ماجرا کہہ ڈالا۔ بھائیوں کے جذبات بھڑک اٹھے۔ اور حسد کی جو جلن وہ سینے میں محسوس کرتے تھے وہ بغض کی شکل میں ان کی زبانوں پر آگئی۔ غصے سے کہنے لگے "اس کی چاند سے مراد تمہارے سوا (والدہ سے) اور سورج سے مراد ہمارے والد کے سوا اور کوئی نہیں۔ اسی طرح ستاروں سے اس کی مراد سوائے ہم بھائیوں کے اور کوئی نہیں۔ بلاشبہ وہ ہم سب کا مالک بننا اور یہ کہنا چاہتا ہے کہ میں تمہارا سردار و مالک ہوں (اور تم میرے غلام ہو) انہوں نے آپس میں مشورہ کیا اور کہنے لگے۔

إِذْ قَالُوْا لَيُوْسُفُ وَأَخُوْهُ أَحَبُّ إِلٰى أَبِيْنَا مِنَّا وَنَحْنُ عُصْبَةٌ ۚ إِنَّ أَبَانَا لَفِيْ ضَلَالٍ مُّبِيْنٍ ○ اقْتُلُوْا يُوْسُفَ أَوِ اطْرَحُوْهُ أَرْضًا يَخْلُ لَكُمْ وَجْهُ أَبِيْكُمْ

(وہ وقت یاد کیجئے) جب یوسف کے بھائیوں نے کہا کہ واقعی یوسف اور اس کا بھائی ہمارے باپ کو ہم سے زیادہ محبوب ہیں حالانکہ ہم (دس افراد پر

وَ تَكُوْنُوْا مِنْۢ بَعْدِهٖ قَوْمًا صٰلِحِیْنَ۝
(یوسف ‘۱۲:۸-۹)

مشتمل) زیادہ قوی جماعت ہیں۔ بیشک ہمارے والد (ان کی محبت کی) کھلی وارفتگی میں گم ہیں (اب یہی حل ہے کہ) تم یوسف کو قتل کر ڈالو یا دور کسی غیر معلوم علاقہ میں پھینک آؤ (اس طرح) تمہارے باپ کی توجہ خالصتاً تمہاری طرف ہو جائے گی اور اس کے بعد تم (توبہ کر کے) صالحین کی جماعت بن جانا۔

یہودا کا مشورہ

ان بھائیوں میں سب سے اچھا‘ افضل اور زیادہ سمجھدار بھائی یہودا تھا۔ وہ کہنے لگا کہ قتل تو بہت بڑا جرم ہے لہٰذا قتل نہ کرو بلکہ کسی گہرے اندھیرے کنویں میں پھینک دو۔ وہاں سے اسے کوئی گزرتا قافلہ (اگر یہ ان کو مل گیا تو) راہ چلتے اٹھا کر لے جائے گا۔ (یوسف‘ ۱۲: ۱۰) اس مشورے کے بعد وہ سب بھائی اس منصوبہ پر متفق ہو گئے۔

بیٹوں کی چال اور حضرت یعقوب علیہ السلام کا خواب

ادھر چند روز یہ منصوبہ مکمل کرنے میں لگے۔ ادھر حضرت یعقوب علیہ السلام کو اللہ نے ایک خواب میں اس سے ملتی جلتی صورت حال کی طرف اشارہ فرما دیا۔ انہوں نے خواب میں دیکھا کہ جیسے حضرت یوسف علیہ السلام کسی پہاڑ کی چوٹی پر ہیں اور دس بھیڑیوں نے انہیں قتل کرنے کے لئے انہیں گھیر لیا ہے۔ اتنے میں اچانک ان دس بھیڑیوں میں سے ایک انہیں قتل ہونے سے بچا لیتا ہے اور پھر دیکھتا ہے کہ پہلے حضرت یوسف علیہ السلام زمین پھٹنے کی وجہ سے اس میں جا گرے ہیں اور تین دن سے پہلے نہیں نکل سکے یعنی تین روز بعد آئے۔

لہٰذا جب بھائی اپنا منصوبہ مکمل کر کے اس کی تنفیذ کے لئے حضرت یعقوب علیہ السلام کی بارگاہ میں حاضر ہو کر سامنے بیٹھ گئے تو آپ نے سوال فرمایا کہ کیا بات ہے؟ یعنی کس چیز کی ضرورت ہے جو تم ادھر آ گئے ہو؟ اس پر کہنے لگے۔

يَا اَبَانَا مَالَكَ لَا تَاْمَنَّا عَلٰى يُوْسُفَ وَ اِنَّا لَهٗ لَنَاصِحُوْنَ ○ اَرْسِلْهُ مَعَنَا غَدًا يَّرْتَعْ وَ يَلْعَبْ وَ اِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ ○

(یوسف، ۱۲: ۱۱-۱۲)

انہوں نے کہا اے ہمارے باپ! آپ کو کیا ہو گیا ہے آپ یوسف کے بارے میں ہم پر اعتبار نہیں کرتے حالانکہ ہم یقینی طور پر اس کے خیر خواہ ہیں۔ آپ اسے کل ہمارے ساتھ بھیج دیجئے وہ خوب کھائے اور کھیلے اور بیشک ہم اس کے محافظ ہیں۔

اس پر حضرت یعقوب علیہ السلام نے جواب ارشاد فرمایا۔

قَالَ اِنِّیْ لَیَحْزُنُنِیْ اَنْ تَذْهَبُوْا بِهٖ وَ اَخَافُ اَنْ یَّاْكُلَهُ الذِّئْبُ وَ اَنْتُمْ عَنْهُ غَافِلُوْنَ ○

(یوسف، ۱۲: ۱۳)

انہوں نے کہا بیشک مجھے یہ خیال مغموم کرتا ہے کہ اسے لے جاؤ اور میں (اس خیال سے بھی) خوف زدہ ہوں کہ اسے بھیڑیا کھا جائے اور تم اس کی حفاظت سے غافل رہو۔

حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے خدشے کا اظہار فرما دیا لیکن ان کو جیسے معلوم ہی تھا کہ اسی نوعیت کا کوئی جواب ملے گا۔ لہٰذا انہوں نے فوراً کہا (گھڑا گھڑایا جواب دے دیا)

قَالُوْا لَئِنْ اَكَلَهُ الذِّئْبُ وَ نَحْنُ عُصْبَةٌ اِنَّا اِذًا لَّخَاسِرُوْنَ ○

(یوسف، ۱۲: ۱۴)

وہ بولے اگر اسے بھیڑیا کھا جائے حالانکہ ہم ایک قوی جماعت بھی (موجود) ہوں تو ہم تو بالکل ناکارہ ہوئے۔

اس بات کو سن کر حضرت یعقوب علیہ السلام نے انہیں اجازت دے دی کہ وہ سیدنا یوسف علیہ السلام کو ساتھ لے جائیں۔ (بعض روایات میں ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے خود بھی ساتھ جانے کی خواہش کا اظہار کیا تھا)

ایک انوکھی ہجرت کا آغاز

یہاں سے حضرت یوسف علیہ السلام کی ہجرت کا آغاز ہوتا ہے۔ انہیں خود بھی نہیں معلوم تھا کہ ان کی ہجرت کہاں جا کر ختم ہو گی۔ نہ وہ جانتے تھے کہ کبھی واپس بھی آئیں گے یا نہیں۔ غرض کہ یہ سترہ سالہ نوجوان گھر سے نکل پڑا جو اس بات پر خوش تھا کہ وہ اپنے بھائیوں کے ساتھ تفریح پر جا رہا ہے۔

جب وہ صحرا میں پہنچ گئے اور مقام "دوتین" (Dovthan) آیا تو پہلے انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو مارنا پیٹنا شروع کر دیا اور اس حد تک مارا کہ گویا جان سے ہی مار ڈالیں گے۔ اس لمحے بڑے بھائی نے انہیں روکا اور کہا کہ تم نے مجھ سے وعدہ نہیں کیا تھا کہ انہیں قتل نہیں کرو گے؟ اس پر وہ مار پیٹ سے باز آ گئے۔ آپ کو باندھا گیا اور گہرے اندھیرے کنویں میں پھینک دیا۔ آپ کہنے لگے کہ میری قمیض تو مجھے دیتے جاؤ کہ میں خود کو ڈھانپ لوں تو جواب ملا کہ سورج، چاند اور ستاروں کو پکارو کہ آ کر تمہاری مدد کر جائیں) یہ اس سفر ہجرت کی پہلی منزل تھی۔

اللہ کی شان کہ اس گہرے کنویں میں پانی کی اوپری سطح کے قریب ایک اونچا پتھر تھا جس پر آپ کو پناہ مل گئی اور آپ ڈوب کر شہید ہو جانے سے بچ گئے۔ کنویں میں آپ کا قیام تین روز رہا اور فرشتے کو مامور کیا گیا کہ آ کر آپ کے بند کھول دے اور وحی سے آپ کو تسلی دی گئی۔ (یوسف ۱۲: ۱۵)

سفر ہجرت کا دوسرا مرحلہ

تین روز بعد سفر ہجرت کا دوسرا مرحلہ شروع ہوا۔ ہوا یوں کہ جس کنویں میں حضرت یوسف علیہ السلام کو پھینکا گیا تھا وہ ایک تجارتی شاہراہ پر واقع تھا۔ وہاں سے مدیانی تاجروں اور اسماعیلی عربوں پر مشتمل ایک قافلہ کا گزر ہوا جو مصر جا رہا تھا۔ انہوں نے اپنا ایک آدمی کنویں میں پانی لینے بھیجا اس نے کنویں میں ڈول ڈالا تو حضرت یوسف علیہ السلام اس کے ساتھ لٹک کر باہر آ گئے جب آپ پر اس کی نظر پڑی تو چلا اٹھا۔

قَالَ يٰبُشْرٰى هٰذَا غُلٰمٌ ؕ خوش خبری ہو یہ ایک لڑکا ہے۔

وَاَسَرُّوْهُ بِضَاعَةً (یوسف ۱۲:۱۹) اور انہوں نے اسے قیمتی سامان تجارت سمجھتے ہوئے چھپالیا۔

اس مقام پر ابن الاثیر نے الکامل میں ایک اور بات لکھی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا سب سے بڑا بھائی یہودا آپ کے لئے (خدا جانے کیا سوچ کر) کھانا لے کر آیا تو آپ کو کنویں میں نہ پایا۔ اس پر اس نے ادھر ادھر تلاش کیا تو قافلے کے پاس دیکھ لیا۔ لہٰذا وہ سارے بھائیوں کو ساتھ لے کر آگیا اور کہنے لگا کہ یہ ہمارا بھاگا ہوا غلام ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کو گمان گزرا کہ اب شاید بھائی مجھے ان کی تحویل سے لے کر مار ڈالیں گے۔ لہٰذا آپ خاموش رہے اور وہ حضرت یوسف علیہ السلام کو ناپسند کرتے ہوئے بہت کم قیمت گنتی کے چند درہموں کے عوض بیچ کر چلے گئے۔ (یوسف ۱۲: ۲۰) اس طرح وہ قافلہ آپ کو لے کر مصر پہنچ گیا۔ وہاں بر سر بازار حضرت یوسف علیہ السلام کی قیمت لگائی گئی۔

سفر ہجرت کا آخری مرحلہ

یہاں پر آپ کو ایک شخص قطفیر (اس کا نام اطفر بھی ملا ہے) اسی کو تورات میں Potiphar فوطیفار کہا گیا ہے) یہ مصر کا وزیر خزانہ تھا۔ ان دنوں مصر کا بادشاہ عمالقہ کا ایک شخص الریان بن الولید تھا۔ وزیر خزانہ آپ کو اپنے گھر لے گیا اور آپ بہت باعزت مقام دیا اپنی بیوی سے کہنے لگا۔

اَكْرِمِىْ مَثْوٰىهُ (یوسف ۱۲:۲۱) اس کو باعزت ٹھکانہ دو۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی یہ ہجرت جس قدر انوکھی تھی اسی قدر اہم بھی تھی۔ یہ ہجرت حضرت یوسف علیہ السلام کو عزیز مصر کے گھر تک نہایت آسانی سے لے گئی اور غلبہ حق کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔

باب ۹

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ہجرت

تاریخ کے اوراق اس امر کے شاہد و عادل ہیں کہ مجبور و بے بس عوام ہمیشہ حکمرانوں کے ظلم و ستم کا نشان بنتے رہے ہیں۔ اس لئے عام آدمی ہر دور اور ہر عہد میں ان ظالم اور جابر حکمرانوں سے خوفزدہ رہا ہے۔ اضطراب کی لہریں اس کی سوچ کے مقفل دروازوں کے آگے جمود اور بے حسی کی دیوار بنتی رہی ہیں۔ تاریخ ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کہ ہر کوئی جبر اور استبداد کی راہ میں سینہ سپر ہونے کا حوصلہ اور صلاحیت نہیں رکھتا' قریہ جبر میں سر اٹھا کر چلنے کی آرزو موت کو دعوت دینے کے مترادف ہوتی ہے اور پھر مقتلوں کا لہو ہر کسی مقدر میں کہاں' کربلا کا سفر اختیار کرنے والے ہر دور میں بہت کم افراد ہوتے ہیں' سر پر کفن باندھ کر حرف حق کی گواہی دینا اور اپنے خون سے شہادت نامہ تحریر کرنا ایک انتہائی جرات مندانہ قدم ہے' خلعت شہادت نقد جان لٹانے سے ملتی ہے۔ اللہ کی راہ میں اپنے لہو کے چراغ روشن کرنے کا نام جہاد ہے۔ طائف کی وادیوں کا سفر ایک صبر آزما مرحلہ ہے' پتھروں کی بارش میں پرچم توحید بلند کرنا ہی کار نبوت ہے۔ ہر کوئی ابتلا و آزمائش کے ان مراحل میں ثابت قدم نہیں رہ سکتا' دین حق کی سربلندی کے لئے عہد موسوی میں بھی سیاسی انقلاب ناگزیر ہو گیا تھا' مصر پر فرعونوں کی حکومت تھی' ہر حکمران کو فرعون کہا جاتا تھا' ملکی سیاست' معیشت' معاشرت غرض ہر شعبہ زندگی ان مطلق العنان حکمرانوں کے پنجہ استبداد میں سسک رہا تھا۔ پورے ملک میں فرعون کے فرمان کو قانون کی حیثیت حاصل تھی۔ بنی اسرائیل کو فرعون کے ظلم و ستم سے نجات دلائے بغیر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت کا مقصد پورا نہیں ہو سکتا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہوا کہ فرعون کے دربار میں جا کر حق کا پرچم بلند کریں کیونکہ اسکی سرکشی حد سے بڑھ گئی تھی۔ یہ بنی اسرائیل کی سیاسی آزادی کی طرف انتہائی اہم قدم تھا اس لئے کہ آسمانی ہدایت کا نفاذ سیاسی اقتدار کے حصول کے بغیر اکثر و بیشتر حالتوں میں ممکن ہی نہیں' سیاسی بالادستی حاصل کئے بغیر محض تبلیغ و واعظ سے مطلوبہ اہداف حاصل نہیں کئے جا سکتے تھے اور نہ کسی سطح پر

انقلاب ہی برپا کیا جا سکتا تھا۔ یہ بھی ممکن نہ تھا کہ سیاسی اقتدار تو فرعون کے ہاتھ میں رہتا، حکم اس کا چلتا اور لوگوں کی ایک بڑی تعداد حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آتی، قوت نافذہ حاصل کرنے کے لئے پیغمبر خدا کو سیاسی عمل سے گزرنا تھا، ہجرت موسوی اسی سیاسی عمل کا حصہ تھی اسی ہجرت کے نتیجہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی انقلابی جدوجہد کامیابی و کامرانی سے ہمکنار ہوئی۔

اقلیمِ رسالت کا ایک انقلابی کردار

حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ رب العزت کے ایک جلیل القدر پیغمبر تھے آپ کی پوری زندگی ایک پرجوش انقلابی کی زندگی ہے آپ اقلیم رسالت کا ایک انقلابی کردار ہیں جن کی جدوجہد مسافران راہ حق کے لئے آج بھی مینارہ نور کی حیثیت رکھتی ہے۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام جد الانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح ہر ظالم و جابر اور سرکش و مستبد کے سامنے بے خطر آتش نمرود میں کود جاتے ہیں آپ بلا خوف و خطر جابر حکمرانوں کے سامنے کلمہ حق ادا کرتے ہوئے احقاق حق اور ابطال باطل کرتے نظر آتے ہیں، فرعون کے وحشت و بربریت ہو یا ھامان کا مکر و فریب، قارون کا تکبر و نخوت ہو یا سامری کا کفر و الحاد، شہنشاہ وقت کا فلک بوس محل یا سینا کا ریگ زار، اللہ کا یہ بے باک اور نڈر سپاہی ہر جگہ خدا کی وحدانیت کے ڈنکے بجاتا نظر آتا ہے۔ سیدنا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے وقت کے جابر حکمران کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے للکارا اور اللہ کے دین کے سربلندی کے لئے مصائب و آلام کو گوارا کیا۔ اپنے عظیم مشن کی تکمیل کے لئے اپنا گھربار چھوڑا، وطن سے بے وطن ہوئے، سفر ہجرت اختیار کیا اور وطن سے دور دشت و بیابان کو اپنا مستقر ٹھہرایا اور اپنی قوم کے جوانوں کو ایک عظیم انقلاب کے لئے تربیت کے مرحلے سے گزارا۔ سیدنا حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے مشن، شریعت اور مقصد بعثت کے اعتبار سے اور اپنی انقلابی جدوجہد کے مزاج کے لحاظ سے سرور کائنات نبی آخر الزماں حضور رحمت عالم ﷺ سے سب سے زیادہ مشابہت

رکھتے ہیں، آپ سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے طرح کثیرالہجرت بھی ہیں اور پیغمبر انقلاب بھی۔ سیاسی کشمکش ان کی حیات مبارکہ کا غالب عنصر ہے۔

آلِ یعقوبؑ (بنی اسرائیل) کی کنعان سے مصر میں آمد

ہجرت سنت انبیاء ہے۔ ہر دور اور ہر عہد میں اللہ کے یہ برگزیدہ بندے اپنے مقاصد بعثت کے حصول کے لئے اپنے وطن سے بے وطن ہوتے رہے۔ ہجرت ایک آزمائش کا نام ہے، اور اللہ کے نبی اور رسول اس آزمائش پر پورا اترتے رہے، تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ جب حضرت یعقوب علیہ السلام اور انکے اہل خاندان مصر میں حضرت یوسف علیہ السلام سے ملاقات کے لئے آئے تو سیدنا حضرت یوسف علیہ السلام نے آل یعقوب (بنی اسرائیل) کو مصر کے عام شہریوں سے الگ تھلگ "جشن" یا "گوشن" کے علاقے میں آباد کیا، شہر سے دور آل یعقوب کی بستی بسانے میں کئی حکمتیں کارفرما تھیں، اہل مصر برتری کے احساس میں مبتلا تھے، تہذیبی، تمدنی اور ثقافتی اعتبار سے یہ عبرانیوں سے بہت آگے تھے، عبرانیوں سے شدید نفرت کرتے، تہذیبی ٹکراؤ سے نفرت جنم لیتی ہے اگر انہیں مصری معاشرے میں گھل مل جانے کی اجازت دی جاتی تو یہ نفرت دوچند ہو جاتی اور نوبت مسلح تصادم تک پہنچ جاتی اس لئے اہل مصر کے جذبات کو قابو میں رکھنے کے لئے ان کی الگ سے بستی بسائی گئی آل یعقوب بت پرست نہیں تھی جبکہ مصری اصنام پرست تھے، آل یعقوب کی ثقافتی اکائی کے تحفظ کے لئے ضروری تھا کہ مصری معاشرے کی گرد میں گم ہو جانے سے انہیں بچایا جائے مصری حکومت چونکہ حضرت یوسف علیہ السلام کی وجہ سے ان پر مہربان تھی اس لئے ان کے تحفظ کے لئے ضروری اقدامات کئے گئے جن کی بدولت ان کی معیشت مستحکم بنیادوں پر استوار ہوئی۔ نہ صرف ان کی معیشت مضبوط بنیادوں پر استوار ہوئی انکی افرادی قوت میں بھی بے پناہ اضافہ ہوا۔

سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے ابتدائی حالات زندگی

سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی ولادت کا زمانہ فرعون کا دور استبداد تھا۔ آپ علیہ السلام عمران نامی ایک شخص کے گھر میں پیدا ہوئے۔ آپ علیہ السلام کی والدہ ماجدہ کا نام "یوکابد" تھا۔ آپ علیہ السلام کا سلسلہ نسب چند واسطوں سے حضرت ابراھیم علیہ السلام سے جا ملتا ہے۔ امام ابن کثیرؒ والد کی طرف سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا سلسلہ نسب بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

وھو موسیٰ بن عمران بن قاھث بن عازر بن لاوی بن یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم علیھم السلام
(قصص الانبیاء از ابن کثیر:۲۶۶)

اور وہ (یعنی سیدنا حضرت موسیٰ علیہ السلام کا سلسلہ نسب) موسیٰ بن عمران بن قاھث بن عازر بن لاوی بن یعقوب بن اسحٰق بن ابراہیم علیھم السلام ہے۔

سیدنا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ولادت کے وقت مصر کے تخت پر جو فرعون قابض تھا اس کا نام **رعمسیس ثانی** (II) Ramases تھا۔ **رعمسیس ثانی** کے حکم سے تمام نومولود لڑکوں کو قتل کر دیا جاتا تھا' حضرت موسیٰؑ کے والد' انکی والدہ اور دوسرے افراد خانہ اس صورتحال سے سخت پریشان تھے کہ نومولود کو قاتلوں کی خوفناک نگاہوں سے کس طرح بچایا جائے تذبذب اور اضطراب کے اس عالم میں اللہ رب العزت نے حضرت موسیٰؑ کی والدہ کے دل میں القاء کیا کہ وہ بدستور نومولود کو دودھ پلاتی رہے اور جب اسے یقین ہو جائے کہ اس بچے کے بارے میں فرعون کے کارندوں کو خبر ہو سکتی ہے اور اس کی زندگی سخت خطرے میں ہے تو وہ بچے کو ایک صندوق میں رکھ کر اسے دریا کی لہروں کے سپرد کر دے' حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو یہ تسلی بھی دی گئی کہ اسے (بچے کو) تیری طرف ہی لوٹا دیا جائے گا یعنی اسکی پرورش تیرے ہی سپرد ہوگی اور یہ کہ یہ نومولود ہمارا پیغمبر اور رسول ہو گا۔ قرآن اس واقعہ کو یوں بیان

رتا ہے:۔

وَ اَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّ مُوْسٰٓى اَنْ اَرْضِعِيْهِ فَاِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ فَاَلْقِيْهِ فِى الْيَمِّ وَلَا تَخَافِىْ وَلَا تَحْزَنِىْ اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَيْكِ وَجَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ۝
(القصص ۲۸:۷)

چنانچہ ہم نے موسیٰ علیہ السلام کی ماں کو حکم بھیجا کہ اس (بچہ) کو دودھ پلاتی رہو، پھر جب تم کو اس کے متعلق کچھ اندیشہ پیدا ہو تو اسے دریا میں ڈال دینا اور نہ تو (اپنی جان کا) خوف کرنا اور نہ (موسیٰ ہی پر) غمگین ہونا۔ ہم اس کو تمہارے پاس پہنچا دیں گے اور اس کو پیغمبروں میں سے بنا دیں گے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ ماجدہ کو جب فرعون کے کارندوں کی طرف سے خطرہ لاحق ہوا کہ وہ بچے کو قتل کر دیں گے تو انہوں نے بچے کو ایک صندوق میں رکھا اور اسے دریا میں بہا دیا۔ ساتھ اپنی بیٹی کو حکم بھی دیا کہ وہ صندوق کی نگرانی کرے اس پر نگاہ رکھے کہ دریا کی لہریں اسے کہاں لے جاتی ہیں اور خدا بچے کی حفاظت کا وعدہ کس طرح پورا کرتا ہے۔

فرعون کے محل میں سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی پرورش

اس کائنات رنگ و بو کا خالق بہتر تدبیر کرنے والا ہے وہ پتھر میں بھی کیڑے کو رزق پہنچاتا ہے وہ پتھروں کو بھی اذن گویائی عطا کرتا ہے وہ خدا جس کے قبضہ قدرت میں ہر ذی روح کی جان ہے اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی کی اس طرح حفاظت کی کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام فرعون کے محلوں میں ہی پرورش پانے لگے۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی ہمشیرہ بڑی احتیاط سے صندوق کا تعاقب کر رہی تھیں، تاکہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے پائے کہ صندوق میں رکھے بچے کے ساتھ انکا کوئی تعلق بھی ہے، صندوق دریائی لہروں پر سفر کر رہا تھا۔ آخر کار یہ صندوق شاہی محل کے کنارے پر آلگا۔

فرعون کے محل کی ایک عورت صندوق اٹھا کر محل میں لے گئی۔ صندوق کھولا تو اس میں بچے کو دیکھ کر حیران رہ گئی' اللہ رب العزت نے ملکہ کے دل میں بچے کی محبت پیدا کردی اس نے بچے کی پرورش کا فیصلہ کرلیا اور فرعون سے استدعا کی کہ اسے قتل نہ کیا جائے کیا عجب آگے چل کر یہ بچہ ہمارے کسی کام آئے' فرعون نے بھی ملکہ کی رائے سے اتفاق کیا اور باہر سے بچے کی پرورش کے لئے آیا لانے اور بچے کو اسکی نگرانی میں دینے کی اجازت دے دی اور یوں حضرت موسیٰؑ اپنی والدہ کے پاس واپس پہنچ گئے۔

سورہ قصص میں ارشاد ربانی ہے:۔

فَالْتَقَطَهٗۤ اٰلُ فِرْعَوْنَ لِيَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّ حَزَنًا ؕ اِنَّ فِرْعَوْنَ وَ هَامٰنَ وَ جُنُوْدَهُمَا كَانُوْا خٰطِـِٕيْنَ ○ وَقَالَتِ امْرَاَتُ فِرْعَوْنَ قُرَّتُ عَيْنٍ لِّيْ وَ لَكَ لَا تَقْتُلُوْهُ ۖ عَسٰۤى اَنْ يَّنْفَعَنَاۤ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا وَّ هُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ○ وَ اَصْبَحَ فُؤَادُ اُمِّ مُوْسٰى فٰرِغًا ؕ اِنْ كَادَتْ لَتُبْدِيْ بِهٖ لَوْلَاۤ اَنْ رَّبَطْنَا عَلٰى قَلْبِهَا لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ○ وَقَالَتْ لِاُخْتِهٖ قُصِّيْهِ فَبَصُرَتْ بِهٖ عَنْ جُنُبٍ وَّ هُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ○ وَحَرَّمْنَا عَلَيْهِ الْمَرَاضِعَ مِنْ قَبْلُ فَقَالَتْ هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰۤى اَهْلِ بَيْتٍ يَّكْفُلُوْنَهٗ لَكُمْ وَ هُمْ لَهٗ نٰصِحُوْنَ ○ فَرَدَدْنٰهُ اِلٰۤى اُمِّهٖ كَيْ تَقَرَّ عَيْنُهَا وَ لَا تَحْزَنَ وَ لِتَعْلَمَ اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ○

(القصص' ۲۸:۸۔۔۱۳)

پھر فرعون کے لوگوں نے اس (بچے) کو اٹھا لیا تاکہ وہ ان کے لئے ان کا دشمنی اور (موجب) غم ہو بے شک فرعون اور ہامان اور انکے لشکر سے (بڑی) چوک ہوئی (کسی کو خطرے کا احساس تک نہ ہوا) اور فرعون کی بی بی (کے دل میں اس کی محبت پیدا ہوئی اور اس) نے (فرعون سے کہا کہ یہ (بچہ) تو میرے اور تمہارے لئے آنکھوں کے ٹھنڈک ہے اور اس کو قتل نہ کرنا۔ ہو سکتا کہ یہ ہمارے کام آئے یا ہم اسے اپنا بیٹا ہی بنا لیں۔ اور ان کو (انجام کی) خبر نہ تھی اور (ادھر جب موسیٰؑ کو صندوق میں لٹا کر دریا میں ڈالا تو) موسیٰؑ کی ماں کا دل (صبر و قرار سے) خالی تھا۔ قریب تھا کہ وہ اپنی بے قراری کو ظاہر کر دیں (اور یقیناً

ان سے صبر ممکن نہ تھا) اگر ہم نے انکے
دل کو مضبوط نہ بنادیا ہوتا تاکہ وہ
(ہمارے وعدہ پر) یقین کرنے والوں میں
رہیں اور (موسیٰؑ کی ماں نے) موسیٰؑ کی
بہن سے کہا کہ (ذرا) تو اس کے پیچھے
(پیچھے) چلی جا اور وہ انجان ہو کر اس کو
دیکھتی رہی اور لوگوں کو اس کی خبر نہ
ہوئی اور ہم نے پہلے ہی موسیٰؑ پر سب
دائیوں (کے دودھ) کو حرام کر رکھا تھا تو
موسیٰؑ کی بہن نے کہا کہ میں تم کو ایسے
گھر والے بتاؤں جو تمہارے لئے اس
بچے کی پرورش کر دیں اور اس کے خیر
خواہ ہوں۔ اس طرح ہم نے ان کو ان
کی ماں کے پاس پہنچا دیا کہ ان کی
آنکھیں ٹھنڈی رہیں اور وہ غمگین نہ
ہوں اور جان لیں کہ بے شک اللہ کا
وعدہ سچا ہوتا ہے لیکن اکثر لوگ نہیں
جانتے۔

یوں حضرت موسیٰؑ نے اپنی والدہ ماجدہ کی آغوش محبت میں پرورش پائی۔ جب ان کا دودھ چھڑایا تو انہیں فرعون کے گھروالوں کے سپرد کر دیا اس طرح سیدنا موسیٰؑ کی پرورش اور تربیت شاہی محل میں ہونے لگی، جب سیدنا موسیٰؑ سن بلوغت کو پہنچے تو آپ ایک وجیہہ نوجوان تھے، قوی الجثہ تھے، جرات و بہادری کی علامت تھے، قدرت نے آپ کو قوت بازو کے ساتھ قوت فکر سے بھی نوازا تھا۔ ارشاد باری تعالیٰ

ہے:۔

وَ لَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَ اسْتَوٰۤى اٰتَیْنٰهُ حُكْمًا وَّ عِلْمًاؕ وَ كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ۝

(القصص ۲۸:۱۴)

اور جب وہ پورے شباب پر پہنچے اور (ذہنی صلاحیتوں سے) درست ہو گئے تو ہم نے انہیں حکمت اور علم عطا کیا اور اسی طرح ہم نیک کردار لوگوں کو اجر دیا کرتے ہیں۔

قبطی کا قتل

نبی اور رسول کا ہر فعل مشیت ایزدی کے مطابق ہوتا ہے۔ اس لئے نبی اور رسول معصوم عن الخطا ہوتے ہیں۔ حضور رحمت عالم ﷺ کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ:۔

"حضور ﷺ اپنی خواہش سے نہیں بولتے مگر وہی فرماتے ہیں جو ان کی طرف وحی کی جاتی ہے"۔

حضرت موسیٰؑ بھی اللہ کے برگزیدہ بندے اور رسول تھے ایک خاص زمانے میں خاص مقاصد کے حصول کے لئے مبعوث ہوئے' حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی مشیت ایزدی کے ضمن میں فرماتے ہیں:۔

"پھر اللہ تعالیٰ کی مشیت یہ ہوئی کہ موسیٰ کو فرعونیوں کی تربیت سے الگ کر کے کسی مومن کی صحبت میں پہنچا دیا جائے تاکہ ان کی فطرت کا انشراح درجہ کمال کو پہنچ جائے اور وہ علم اور ہدایت میں کامل ترین انسان بن جائیں جس میں فرعونیوں کے ساتھ معاشرت مانع تھی (یعنی مشیت ایزدی کی تکمیل فرعونی معاشرے میں رہ کر ممکن نہ تھی) چنانچہ اللہ جل شانہ نے اسکے لئے ایک تقریب بہم پہنچائی"

(تاویل الاحادیث:۹۹'۱۰۰)

معاملہ کچھ اس طرح بنا کہ ایک دفعہ حضرت موسیٰؑ بے وقت محل سے نکل کر جا رہے تھے کہ دیکھا ایک مصری اور ایک اسرائیلی آپس میں جھگڑ رہے ہیں' اسرائیلی

نے سیدنا موسیٰ کو دیکھا تو فریادی ہوا اور دادرسی چاہی' حضرت موسیٰ نے اسرائیلی کے فریق مخالف اس مصری (قبطی) کو ایک گھونسا دے مارا۔ وہ مصری ضرب موسیٰ کو برداشت نہ کر سکا۔ چکرا کر گرا اور وہیں جان جان آفریں کے حوالے کر دی' حضرت موسیٰ کو قبطی کی موت پر دلی رنج ہوا کیونکہ وہ قطعاً اس کے قتل کا ارادہ نہیں رکھتے تھے وہ تو محض اسے سزا دینا چاہتے تھے' دل ہی دل میں کہنے لگے کہ بلاشبہ یہ شیطان لعین کی کارستانی ہے وہی انسان کو ایسے غلط کاموں پر اکساتا ہے' قرآن حکیم نے اس واقعہ کا ذکر یوں کیا ہے:۔

وَ دَخَلَ الْمَدِيْنَةَ عَلٰى حِيْنِ غَفْلَةٍ مِّنْ اَهْلِهَا فَوَجَدَ فِيْهَا رَجُلَيْنِ يَقْتَتِلٰنِ هٰذَا مِنْ شِيْعَتِهٖ وَ هٰذَا مِنْ عَدُوِّهٖ فَاسْتَغَاثَهُ الَّذِيْ مِنْ شِيْعَتِهٖ عَلَى الَّذِيْ مِنْ عَدُوِّهٖ فَوَكَزَهٗ مُوْسٰى فَقَضٰى عَلَيْهِ قَالَ هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِيْنٌ○ قَالَ رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ فَاغْفِرْ لِيْ فَغَفَرَ لَهٗ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ○ قَالَ رَبِّ بِمَآ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ فَلَنْ اَكُوْنَ ظَهِيْرًا لِّلْمُجْرِمِيْنَ○

(القصص' ۲۸:۱۵-۱۷)

اور (موسیٰ ایک مرتبہ ایسے وقت) شہر میں آئے جبکہ اس کے باشندے بے خبر تھے تو آپ نے اس میں دو آدمیوں کو لڑتے ہوئے پایا۔ ایک تو ان کی قوم (یعنی بنی اسرائیل) کا اور ایک ان کے دشمنوں (یعنی فرعون کی قبط قوم) کا' پس اس نے جو آپ کی قوم کا تھا اس کے خلاف جو آپ کے دشمنوں کی قوم کا تھا فریاد کی تو موسیٰ نے اس (قبطی) کو گھونسا رسید کیا اور اس کا کام تمام کر دیا موسیٰ (چونک کر) فرمانے لگے یہ تو (غلط کام) شیطانی کام ہو گیا' بیشک شیطان بہکانے والا صریح دشمن ہے' عرض کی اے میرے رب! میں نے اپنی جان پر ظلم کیا ہے پس تو مجھ کو بخش دے تو (اللہ نے) ان کو بخش دیا' بیشک وہی بڑا بخشنے والا

مہربان ہے:(اللہ تعالیٰ کی بخشش و رحمت
پر حضرت موسیٰؑ نے) عرض کی اے
میرے رب جیسا تو نے مجھ پر فضل فرمایا
ہے میں بھی (آیندہ کبھی) مجرموں کی
پشت پناہی نہ کروں گا۔

شہر میں قبطی کے قتل کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی' قاتل کا کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا۔ مصریوں نے فرعون کے پاس استغاثہ کیا۔ فرعون نے کہا تم قاتل کا پتہ چلاؤ میں ضرور اس کو کیفر کردار تک پہنچاؤں گا۔ اتفاق کی بات ہے کہ حضرت موسیٰؑ شہر میں جا رہے تھے گزشتہ روز کے افسوسناک واقعہ کی وجہ سے قدرے سہمے ہوئے تھے اور ہر طرف سے خطرہ بھی محسوس کر رہے تھے کہ انہوں نے دیکھا کہ وہی اسرائیلی ایک دوسرے قبطی سے پھر جھگڑا کر رہا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ قبطی اسرائیلی پر غالب ہے۔ اسرائیلی کی حضرت موسیٰؑ پر نظر پڑی تو کل کی طرح پھر آپکو مدد کے لئے پکارا۔ سیدنا موسیٰؑ نے یہ واقعہ دیکھ کر دوہری ناگواری محسوس کی اور اپنے ہم قوم (اسرائیلی) کو جھڑک دیا اور فرمایا کہ تو بڑا ہی بہکا ہوا آدمی ہے' کسی نہ کسی سے لڑتا جھگڑتا رہتا ہے اس کے بعد آپ نے فرعونی کو اسرائیلی سے الگ کر دینے کی غرض سے ہاتھ بڑھایا تو' اسرائیلی سمجھا چونکہ ڈانٹ مجھے پڑی ہے اس لئے سیدنا موسیٰؑ نے ہاتھ مجھے ہی مارنے کے لئے بڑھایا ہے تو وہ فوراً چیخ کر کہنے لگا:۔

يَا مُوسَىٰ أَتُرِيدُ أَن تَقْتُلَنِي كَمَا قَتَلْتَ نَفْسًا بِالْأَمْسِ ۖ إِن تُرِيدُ إِلَّا أَن تَكُونَ جَبَّارًا فِي الْأَرْضِ وَمَا تُرِيدُ أَن تَكُونَ مِنَ الْمُصْلِحِينَ ○ (القصص' ۱۹:۲۸)

اے موسیٰؑ! کیا تم چاہتے ہو کہ مجھے بھی مار ڈالو جس طرح تم نے کل ایک آدمی کو مار ڈالا تھا پس تم تو دنیا میں اپنا زور بٹھانا چاہتے ہو اور تم اصلاح کرنا نہیں چاہتے۔

اس احمق اسرائیلی نے راز فاش کر دیا۔ اس کی نادانی رنگ لائی' قبطی کا قتل

جس پر ابھی تک پردہ پڑا ہوا تھا مخفی نہ رہا اور آناً فاناً یہ خبر شہر میں پہنچ گئی کہ گزشتہ روز قتل ہونے والا قبطی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں مارا گیا چنانچہ مصریوں کی طرف سے فرعون کے شاہی دربار میں سیدنا موسیٰ کے قتل کا مطالبہ ہونے لگا۔

مدین کی طرف ہجرت

جب فرعون کے علم میں یہ بات آئی کہ گزشتہ روز قتل ہونے والا قبطی سیدنا موسیٰ کے ہاتھوں مارا گیا تو اس نے فوراً حضرت موسیٰ علیہ السلام کی گرفتاری کا حکم صادر کر دیا۔ فرعون کا ایک درباری دل و جان سے حضرت موسیٰ سے محبت کرتا تھا اور اسرائیل مذہب کو حق جانتا تھا لیکن فرعون کے خوف سے حرف حق زبان پر لانے کی جرات اپنے اندر نہیں پاتا تھا۔ حضرت موسیٰ کے بارے میں جب وہ فرعون کے ارادے سے آگاہ ہوا تو وہ فوراً فرعون کی مجلس سے اٹھ کر حضرت موسیٰ کے پاس پہنچا اور انہیں سارا ماجرا کہہ سنایا اور مشورہ دیا کہ وہ فوراً شہر سے چلے جائیں اور فرعونیوں کی دسترس سے نکل جائیں' حضرت موسیٰ نے ہمدرد درباری کے مشورہ پر عمل کیا اور شہر کو خیرباد کہا لیکن مصری حکومت کی نظروں سے بچ نکلنا آسان کام نہ تھا۔ جگہ جگہ فرعونیوں نے چوکیاں قائم کر رکھی تھیں۔ بظاہر بچ نکلنے کے امکانات بہت کم تھے۔ گھبراہٹ اور کسمپرسی کے عالم میں حضرت موسیٰ نے اپنے پروردگار کو پکارا دست دعا بارگاہ خداوندی میں اٹھے اور ہونٹوں پر یہ الفاظ التجا بن کر بکھر گئے کہ اے میرے رب! مجھے اس جابر اور ظالم قوم سے نجات دلا اور مجھے صحیح راستہ پر چلا کر کسی پر امن مقام پر پہنچا دے۔ قرآن اس واقعہ کو اپنے الفاظ میں یوں بیان کرتا ہے۔

وَجَآءَ رَجُلٌ مِّنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ يَسْعٰى قَالَ يٰمُوْسٰٓى اِنَّ الْمَلَاَ يَاْتَمِرُوْنَ بِكَ لِيَقْتُلُوْكَ فَاخْرُجْ اِنِّىْ لَكَ مِنَ النّٰصِحِيْنَ○ فَخَرَجَ مِنْهَا خَآئِفًا

اور ایک آدمی شہر کے اس کنارے سے بھاگتا ہوا آیا (اور) کہا اے موسیٰ! دربار والے تمہارے متعلق مشورہ کر رہے ہیں کہ تم کو مار ڈالیں پس تم نکل جاؤ!

يَتَرَقَّبُ ۡقَالَ رَبِّ نَجِّنِىۡ مِنَ الۡقَوۡمِ الظّٰلِمِيۡنَ ○ وَلَمَّا تَوَجَّهَ تِلۡقَآءَ مَدۡيَنَ قَالَ عَسٰى رَبِّىۡۤ اَنۡ يَّهۡدِيَنِىۡ سَوَآءَ السَّبِيۡلِ ○

(القصص '۲۸:۲۰-۲۲)

میں تمہارا خیر خواہ ہوں۔ پس موسیٰ ڈرتے ڈرتے شہر سے نکل کھڑے ہوئے اس انتظار میں کہ اب کیا ہوتا ہے (اور اللہ کے حضور) التجا کی اے پروردگار! مجھے اس ظالم قوم سے نجات دے اور جب (موسیٰ) نے مدین کی طرف رخ کیا (تو دل میں) کہا امید ہے میرا رب مجھے سیدھی راہ پر لے جائے گا۔

سفر ہجرت سفر انقلاب ہوتا ہے اور سفر انقلاب پھولوں کی سیج نہیں ہوتا۔ قدم قدم پر مصائب و آلام کا سامنا کرنا پڑتا ہے خون کے پیاسے تعاقب میں ہوتے ہیں لیکن مسافران حق کے پائے استقلال لغزش کے ہر مفہوم سے بے نیاز ہو کر اپنے مشن کی تکمیل کی خاطر آگے بڑھتے رہتے ہیں۔ سیدنا موسیٰ بھی شہر فرعون سے گوشہ عافیت کی تلاش میں نکلے تو فرعون آپ کی گرفتاری کا حکم صادر کر چکا تھا۔ آپ کی تلاش جاری تھی لیکن اللہ کے یہ برگزیدہ پیغمبر راہ انقلاب کی سختیاں برداشت کرتے ہوئے مدین کی طرف بڑھ رہے تھے' مدین مصر سے آٹھ منزل کے فاصلے پر بحر قلزم کے مشرقی کنارے اور جزیرہ نمائے عرب کے شمال مغرب میں واقع تھا۔ اسے شام سے متصل حجاز کا آخری حصہ کہا جا سکتا تھا۔ حضرت موسیٰ شہر فرعون سے تن تنہا شاہراہ ہجرت پر روانہ ہوئے تھے نہ کوئی سنگی تھا اور نہ کوئی ساتھی' نہ زاد سفر اور نہ کوئی راستہ بتانے والا' درختوں کے پتے کھا کر سجدہ شکر بجا لاتے' برہنہ پا شہر اماں کی طرف اپنا سفر جاری رکھے ہوئے تھے۔

مدین میں طبقاتی کشمکش

سیدنا حضرت موسیٰ مدین میں داخل ہوئے تو قدوم مقدسہ کی کھال تک اتر چکی تھی' سفر ہجرت کی یہی آبلہ پائی سند امتیاز بن جاتی ہے اور مسافران راہ حق کے

پاؤں کے انہی چھاؤں کو بوسہ دے کر انقلاب کا سورج طلوع ہوتا ہے جب آپ مدین کی بستی کے باہر ایک کنویں کے پاس پہنچے اور ارد گرد نظر دوڑائی تو آپ کے مشاہدے میں یہ بات آئی کہ مدین کی بستی میں بھی طبقاتی کشمکش اپنے عروج پر ہے۔ جنگل کا کالا قانون اس بستی کا سکہ رائج الوقت ہے۔ انسان اس بستی میں "مسند خدائی" پر متمکن ہے' عدل و انصاف کا ہر تصور اس بستی کے مکینوں کے اذہان سے مٹ چکا ہے۔ دختر حوا کی چیخوں سے فضائے مدین بھی معمور ہے' ظلم کی چکی کے دونوں پاٹ اس خطہ جبر میں بھی حرکت میں رہتے ہیں' صدائے احتجاج بلند کرنے کا حق بھی ابن آدم سے چھین کر زمین پر اس کی رگ رگ میں بے نوائی کا زہر بھر دیا گیا ہے۔ اس کے ہونٹوں پر قفل ڈال کر اسکے تمام بنیادی حقوق غصب کر لئے گئے ہیں سیدنا حضرت موسیٰؑ نے دیکھا کہ ایک کنویں سے کچھ فاصلے پر دو عورتیں اپنے جانوروں کو روکے ہوئے ہیں اور آگے بڑھ کر انہیں پانی پلانے سے ہچکچا رہی ہیں یوں لگتا تھا جیسے یہ عورتیں کسی غریب اور کمزور گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں اور اس انتظار میں ہیں کہ جابر' قوی اور سرکش لوگ اپنے جانوروں کو پانی پلا چکیں تو وہ اپنے جانوروں کو بچے کھچے پانی سے سیراب کریں' اللہ کے نبی آگے بڑھے اور ان عورتوں سے ان کی پریشانی کی وجہ پوچھی تو انہوں نے جواب دیا کہ اس وقت تک ہم اپنے جانوروں کو پانی نہیں پلا سکتیں جب تک یہ چرواہے اپنے جانوروں کو پانی پلانے کے بعد یہاں سے لے نہ جائیں' ہم اگر جانوروں کو لے کر آگے بڑھتی ہیں تو یہ طاقتور لوگ ہمیں پیچھے دھکیل دیتے ہیں' ہمارے والد گرامی بہت بوڑھے ہو چکے ہیں' اب ان میں اتنی طاقت باقی نہیں کہ ان طاقتور لوگوں کی راہ میں مزاحم ہو سکیں' حضرت موسیٰؑ انکا جواب سن کر رنجیدہ ہوئے وہ آگے بڑھے کنویں سے پانی کا ڈول تن تنہا کھینچا اور ان لڑکیوں کے مویشیوں کو پانی پلایا اور واپس آکر سائے میں بیٹھ گئے اور بے چارگی کے عالم میں ایک بار پھر اپنے مالک حقیقی کو پکارا اور اللہ کی مدد کے طلب گار ہوئے۔ قرآن اس واقعے کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:۔

وَلَمَّا وَرَدَ مَآءَ مَدْيَنَ وَجَدَ عَلَيْهِ أُمَّةً   اور جب مدین کے پانی پر پہنچے تو وہاں

مِّنَ النَّاسِ يَسْقُوْنَ وَ وَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمُ امْرَاَتَيْنِ تَذُوْدٰنِ قَالَ مَاخَطْبُكُمَا قَالَتَا لَانَسْقِيْ حَتّٰى يُصْدِرَ الرِّعَآءُ وَ اَبُوْنَا شَيْخٌ كَبِيْرٌO فَسَقٰى لَهُمَا ثُمَّ تَوَلّٰٓى اِلَى الظِّلِّ فَقَالَ رَبِّ اِنِّيْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيْرٌO

(القصص '۲۸: ۲۳-۲۴)

لوگوں کے ایک ہجوم کو دیکھا کہ (اپنے جانوروں کو) پانی پلا رہے ہیں اور ان کے ایک طرف دو عورتوں کو دیکھا جو (اپنی بکریوں کو) روکے کھڑی تھیں (موسیٰؑ نے ان سے) کہا تمہارا کیا کام ہے' ان دونوں نے جواب دیا جب تک دوسرے چرواہے (اپنے جانور) نہ ہٹالیں ہم (اپنی بکریوں کو) پانی نہیں پلاتے (ہمارے ہاں کوئی مرد نہیں جو اس ریوڑ کو لے کر آئے) اور ہمارا باپ بہت بوڑھا ہے' غرض موسیٰؑ نے ان کے جانوروں کو پانی پلادیا پھر (خاموشی سے) ہٹ کر سائے میں آگئے' پھر عرض کی اے میرے رب! تو جو نعمت مجھے عطا فرمائے میں اس کا محتاج ہوں۔

یہ دونوں حضرت شعیبؑ کی بیٹیاں تھیں جب یہ اپنے ریوڑ کو لے کر گھر پہنچیں اور اپنے والد گرامی جو اللہ کے برگزیدہ پیغمبر تھے سے سارا واقعہ بیان کیا تو اللہ کے نبی نے پیغمبرانہ فراست سے حضرت موسیٰؑ کا مقام پہچان لیا اور بڑی لڑکی سے کہا کہ فوراً جاؤ اور اس شخص (سیدنا موسیٰؑ) کو میرے پاس لے کر آؤ' حضرت شعیبؑ کی بڑی لڑکی شرم و حیا کا پیکر بنی حضرت موسیٰؑ کے پاس آئی اور کہنے لگی کہ میرے والد گرامی آپ کو بلا رہے ہیں اس لئے کہ آپ نے ہمارے جانوروں کو پانی پلایا ہے اور وہ آپ کو اس کا اجر دیں' حضرت موسیٰؑ نے سوچا شاید یوں کوئی بہتر صورت نکل آئے اس لئے انہوں نے اس دعوت کو قبول کرلیا۔ حضرت موسیٰؑ حضرت شعیبؑ کی خدمت میں حاضر

ہوئے اور مصر سے روانگی اور مدین کی طرف ہجرت کا سارا واقعہ ان سے کہہ ڈالا تو بزرگ مکرم نے یہ کہہ کر انہیں تسلی دی اور انہیں اطمینان دلایا کہ اب تمہیں ظالموں کے پنجہ استبداد سے رہائی مل چکی ہے تم اب ان کی دسترس سے دور ہو اب تمہیں کسی قسم کا خطرہ یا خدشہ نہیں اللہ کا شکر بجالاؤ' جب حضرت شعیبؑ اور حضرت موسیٰؑ کے درمیان یہ گفتگو جاری تھی تو حضرت موسیٰؑ کو بلا کر لانے والی لڑکی نے اپنے والد مکرم کو مطمئن پا کر یہ تجویز ان کے سامنے رکھی کہ آپ اس مہمان کو اپنے مویشیوں کو چرانے اور انہیں پانی پلانے کے لئے اجیر رکھ لیں کیونکہ اجیر کے لئے طاقتور اور امانت دار ہونا ضروری ہے' شیخ کبیرؒ کو اپنی بیٹی کا مشورہ پسند آیا اور تھوڑی بہت ترمیم کے بعد اس مشورے کو قبول کر لیا۔ انہوں نے حضرت موسیٰؑ کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ میں چاہتا ہوں اپنی ان دونوں بیٹیوں میں سے ایک کو تمہارے نکاح میں دے دوں' شرط یہ ہے کہ تم آٹھ سال تک میرے ہاں ملازمت کرو اور اگر دس سال کا عرصہ مکمل کرو تو یہ تمہاری مرضی' میں تم پر سختی نہیں کرنا چاہتا' تم انشاء اللہ مجھے نیک پاؤ گے' حضرت موسیٰؑ نے حضرت شعیبؑ کی اس شرط کو قبول فرما لیا اور کہا کہ یہ میری صوابدید پر چھوڑ دیجئے میں ان دونوں مدتوں میں سے جس مدت کو چاہوں پورا کروں' آپ کی جانب سے مجھ پر کوئی جبر نہیں ہو گا' مزید فرمایا جو قول و قرار ہم کر رہے ہیں اس پر اللہ نگہبان ہے' قرآن مجید میں ہے:۔

فَجَآءَتْهُ اِحْدٰىهُمَا تَمْشِىْ عَلَى اسْتِحْيَآءٍ قَالَتْ اِنَّ اَبِىْ يَدْعُوْكَ لِيَجْزِيَكَ اَجْرَ مَا سَقَيْتَ لَنَا فَلَمَّا جَآءَهٗ وَقَصَّ عَلَيْهِ الْقَصَصَ قَالَ لَا تَخَفْ نَجَوْتَ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝ قَالَتْ اِحْدٰىهُمَا يٰۤاَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ اِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِىُّ الْاَمِيْنُ ۝ قَالَ اِنِّىْۤ اُرِيْدُ اَنْ

چنانچہ ان (لڑکیوں) میں سے ایک شرم و حیا کے ساتھ چلتی ہوئی ان کے پاس آئی (اور) کہا میرے باپ تم کو بلاتے ہیں تاکہ تم نے جو ہماری خاطر پانی پلایا تھا تم کو اس کا بدلہ دیں پھر جب (موسیٰؑ) انکے پاس پہنچے اور ان سے اپنا احوال بیان کیا تو انہوں نے کہا (اب) خوف مت کرو تم

أُنْكِحَكَ إِحْدَى ابْنَتَيَّ هَاتَيْنِ عَلَى أَنْ تَأْجُرَنِي ثَمَانِيَ حِجَجٍ فَإِنْ أَتْمَمْتَ عَشْرًا فَمِنْ عِنْدِكَ وَمَا أُرِيدُ أَنْ أَشُقَّ عَلَيْكَ سَتَجِدُنِي إِنْ شَاءَ اللَّهُ مِنَ الصَّالِحِينَ ○ قَالَ ذَٰلِكَ بَيْنِي وَبَيْنَكَ أَيَّمَا الْأَجَلَيْنِ قَضَيْتُ فَلَا عُدْوَانَ عَلَيَّ وَاللَّهُ عَلَىٰ مَا نَقُولُ وَكِيلٌ ○

(القصص ۲۸:۲۵-۲۸)

ظالم لوگوں سے بچ آئے ہو، ان دونوں (لڑکیوں) میں سے ایک نے کہا اے باپ ان کو ملازم رکھ لیجئے کہ بے شک اچھا ملازم وہی ہے جو طاقتور امانت دار ہو، (حضرت شعیبؑ نے) کہا میں چاہتا ہوں کہ اپنی دو بیٹیوں میں سے ایک کو تمہارے نکاح میں دے دوں اس شرط پر کہ تم آٹھ سال میری خدمت کرو اور اگر تم دس سال پورے کرو تو یہ تمہاری اپنی خوشی پر ہے اور میں تم پر کوئی سختی نہیں کرنا چاہتا، انشاء اللہ تم مجھ کو خوش معاملہ پاؤ گے (حضرت موسیٰؑ نے) کہا اچھا میرے اور آپؑ کے درمیان یہ عہد ہو گیا میں ان دو میں سے جو بھی مدت پوری کروں مجھ پر کوئی زیادتی نہ ہو اور ہم جو معاہدہ کر رہے ہیں اللہ اس کا ذمہ دار ہے۔

یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ حضرت شعیب نے حضرت موسیٰؑ پر آٹھ سال خدمت کی پابندی لگائی بظاہر تو یہ ذاتی خدمت تھی لیکن اس میں یہ حکمت کار فرما تھی کہ آٹھ سال کے عرصے میں حضرت موسیٰؑ کو علوم نبوت کی تعلیم دی جائے اور انہیں معرفت الٰہی کے لئے تیار کیا جائے، مزید دو سال کا عرصہ حضرت موسیٰؑ کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا کہ آٹھ سال کے بعد وہ اپنی روحانی کیفیات کا اندازہ لگائیں اگر خوشی سے خدمت شیخ کرنا چاہیں تو اس صورت میں ان کا قلب اطہر ان انوار و کیفیات

سے اور معمور اور سرشار ہو جائے گا جو کیفیات ذاتی تڑپ سے حاصل ہوتی ہیں' حضرت شعیبؑ نے حضرت موسیٰؑ کی تربیت کا آغاز انکی شادی سے کیا اس لئے کہ شادی سے انسان کے مزاج میں اعتدال پیدا ہوتا ہے اس کی شخصیت انس اور محبت کی خوشبو سے ہمکنار ہوتی ہے اور اس کے کردار میں وقار اور نکھار آتا ہے۔

سیدنا موسیٰؑ کی پہلی اور دوسری ہجرت

حضرت موسیٰؑ کی اولین ہجرت آپ کی زمانہ شیر خوارگی میں ہوئی۔ اللہ رب العزت نے انہیں بنی اسرائیل کے محلے سے نکال کر خود فرعون کے محل میں پہنچا دیا اس وقت حضرت موسیٰؑ کے لئے دو باتیں انتہائی اہمیت کی حامل تھیں۔

(i) یہ زمانہ آپؑ کے بچپن کا زمانہ تھا۔ اس دور میں انسانی جسم کے ساتھ انسان کا مزاج بھی تشکیل پاتا ہے اور اس کی شخصیت کے نقوش بھی اجاگر ہوتے ہیں' حریت فکر کا جذبہ اسی ابتدائی شکل میں سوچ اور اظہار کی قوتوں کی بنیاد بنتا ہے' ہم جانتے ہیں کہ صدیوں کی محکومی اور غلامی نے بنی اسرائیل کے افکار کو پسماندہ اور بڑی حد تک غلامانہ بنا دیا تھا۔ لہٰذا لازم تھا کہ انہیں اس ماحول سے نجات دلا کر نہ صرف یہ کہ آزاد فکری ماحول میں لے جایا جائے بلکہ انہیں خود مکر و فریب اور چالبازیوں کے گڑھ میں پہنچا دیا جائے تاکہ حکمران کی ساحری کے انداز خود ان لوگوں میں رہ کر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں لہٰذا ہجرت کا پہلا مقصد حضرت موسیٰؑ کے فکر و سوچ کا رخ درجہ ذیل باتوں کی طرف بالخصوص متوجہ فرمانا تھا۔

(الف) کفر کی چالوں کی سمجھ بوجھ حاصل کروانا

(ب) ذہنی و فکری آزادی پیدا کرنا

(ج) آداب جہاں بانی کی طرف توجہ کرانا

(ii) انتہائی اہمیت کی حامل دوسری بات یہ تھی کہ حضرت موسیٰؑ کو اپنی قوم بنی اسرائیل کے احوال کی خبر رہے اپنی قوم کی تاریخ سے آگاہ اور اسکے مزاج سے آشنائی حاصل ہو دل میں بنی اسرائیل کی سلامتی اور بقا کی تڑپ پیدا ہو ان مقاصد کے حصول کے لئے اللہ رب العزت نے حضرت موسیٰؑ کو اپنی والدہ سے ملوایا اور ایسا انتظام کیا کہ ان کی والدہ ماجدہ ہی ان

کی پرورش کے لئے مقرر ہوئیں اور آغوش مادر ہی ان کی اولین تربیت گاہ قرار پائی۔

شہر فرعون سے مدین کی طرف سیدنا موسیٰؑ کی ہجرت ان کی حیات مبارکہ کی دوسری ہجرت تھی۔ اس ہجرت کے نتیجے میں آپ نے تقریباً دس سال حضرت شعیبؑ کی صحبت کریمانہ میں گزارے اس ہجرت میں درج ذیل حکمتیں کار فرما تھیں۔

۱:۔ فکری آزادی اور علمی پختگی کے بعد اب آپ کو ایک عرصہ کے لئے خالص روحانی ماحول کی ضرورت تھی تاکہ حصول وحی کے لیے انہیں تیار کیا جا سکے۔

۲:۔ دوسری ضرورت یہ بھی تھی کہ ایک زمانے تک شاہی محل میں رہنے کی وجہ سے اس بات کے امکانات کم از کم بظاہر ضرور پیدا ہو جاتے ہیں کہ شہزادگی کی زندگی نفس کو فتنوں میں مبتلا کر دے (معاذ اللہ) حضرت موسیٰؑ چونکہ اللہ کے برگزیدہ نبی تھے لہٰذا آپ کی عصمت کا تقاضا تھا کہ اس نام نہاد امکان کو بھی جڑ سے اکھاڑ پھینکا جائے۔

۳:۔ آپ کی پرورش بڑے ناز و نعم میں ہوئی تھی' ایک طویل عرصہ راحت و آرام میں گزارا تھا اس لئے لازم تھا کہ بار نبوت کندھوں پر اٹھانے سے قبل اس جسمانی اور ذہنی مشقت کی مشق بھی اچھی طرح سے ہو جائے وہ مشقت جس سے آنے والے دنوں میں حضرت موسیٰؑ کو واسطہ پڑنے والا تھا۔

جب سیدنا موسیٰؑ کو منصب رسالت عطا ہوا

منصب رسالت سنبھالنے سے قبل حضرت موسیٰؑ کو تربیت کے مرحلے سے گزارا گیا امتحان اور آزمائش کے سو رنگ ہوتے ہیں' آپ ایک عرصہ تک اپنے خسر مکرم جو ایک جلیل القدر پیغمبر بھی تھے کے ریوڑ کی گلہ بانی کا فریضہ سرانجام دیتے رہے' یہ عملی تربیت ان کی فکری اور نظری صلاحیتوں کو جلا بخشنے کے لئے تھی' ایک دن سیدنا حضرت موسیٰؑ بھیڑ بکریاں چراتے ہوئے مدین سے بہت دور کوہ سینا کی طرف نکل گئے' آپ کے اہل و عیال بھی آپ کے ہمراہ تھے' کوہ سینا مصر کو جانے والی شاہراہ پر واقع تھا' رات سر پر آگئی' سردی سے بچنے کے لئے آگ کی تلاش ہوئی لیکن دور دور تک کسی آبادی کا نشان نہ تھا۔ نظر دوڑائی تو ایک شعلہ سا چمکتا دکھائی دیا لیکن انکی اہلیہ یہ شعلہ نہ

دیکھ سکیں۔ سیدنا حضرت موسیٰ نے اپنی اہلیہ سے کہا کہ تم یہیں رکو' میں نے آگ دیکھی ہے' میں جاتا ہوں تاکہ تپش اور حرارت کے لئے چند ایک انگارے ساتھ لے آؤں اور ممکن ہے وہاں سے کوئی رہنما بھی مل جائے' چنانچہ آگ کے حصول کے لئے اس سمت چل پڑے جہاں آپؑ کو آگ کا شعلہ دکھائی دیا تھا۔ قریب پہنچے تو اچانک ایک آواز فضا میں گونجی' قرآن نے اس واقعہ کو یوں بیان کیا ہے:۔

فَلَمَّآ اَتٰهَا نُوْدِیَ یٰمُوْسٰیO اِنِّیْٓ اَنَا رَبُّکَ فَاخْلَعْ نَعْلَیْکَ اِنَّکَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًیO وَ اَنَا اخْتَرْتُکَ فَاسْتَمِعْ لِمَا یُوْحٰیO

(طٰہٰ '۲۰:۱۱۔۱۳)

"پھر جب اس (آگ) کے پاس پہنچے تو آواز آئی اے موسیٰ بے شک میں ہی تمہارا رب ہوں پس (یہ مقام ادب ہے) تم اپنے جوتے اتار دو بے شک تم طوی کی مقدس وادی میں ہو اور میں نے تم کو منتخب فرمایا ہے۔ پس جو حکم تم کو ملے وہ سنتے رہو"۔

اور یوں سیدنا موسیٰ کو منصب رسالت عطا ہوا' اللہ رب العزت کی طرف سے انہیں بنیادی تعلیمات دینے کے بعد معجزات بھی عطا فرمائے گئے' خدائے لم یزل اس عظیم ہستی سے عدیم النظر اور فقید المثال کام لینے والا تھا۔ ایک انقلاب رونما ہونے والا تھا' صبح انقلاب کے قدموں کی چاپ صاف سنائی دے رہی تھی' خورشید انقلاب طلوع ہوا چاہتا تھا۔ اپنے رب سے ہمکلامی کا شرف بہت بڑا اعزاز تھا۔ حضرت موسیٰ عالم فریفتگی میں حیران کھڑے تھے' خالق کائنات نے خود اپنے بندے سے دریافت کیا قرآن میں ہے۔

وَمَا تِلْکَ بِیَمِیْنِکَ یٰمُوْسٰیO قَالَ هِیَ عَصَایَ اَتَوَکَّؤُا عَلَیْهَا وَ اَهُشُّ بِهَا عَلٰی غَنَمِیْ وَلِیَ فِیْهَا مَاٰرِبُ اُخْرٰیO قَالَ اَلْقِهَا یٰمُوْسٰیO فَاَلْقٰهَا فَاِذَا هِیَ حَیَّةٌ

اے موسیٰ! یہ تمہارے دائیں ہاتھ میں کیا ہے کہا یہ میری لاٹھی ہے' اس پر میں ٹیک لگاتا ہوں اور اس سے اپنی بکریوں کے لئے پتے جھاڑتا ہوں اور اس سے

تَسۡعٰی ○ قَالَ خُذۡهَا وَلَا تَخَفۡ سَنُعِيۡدُهَا سِيۡرَتَهَا الۡاُوۡلٰی ○ وَاضۡمُمۡ يَدَكَ اِلٰى جَنَاحِكَ تَخۡرُجۡ بَيۡضَآءَ مِنۡ غَيۡرِ سُوۡٓءٍ اٰيَةً اُخۡرٰى ○ لِنُرِيَكَ مِنۡ اٰيٰتِنَا الۡكُبۡرٰى ○

(طٰہٰ '۲۰:۱۷۔۲۳)

میری اور بھی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں فرمایا اے موسیٰ! اسکو (زمین پر) پھینک دو' پس انہوں نے اسے پھینک دیا تو وہ دوڑتا ہوا سانپ بن گیا (حکم) فرمایا اس کو پکڑ لو اور مت ڈرو' ہم اس کو ابھی اس کی پہلی حالت پر لوٹا دیں گے' اور (موسیٰ ذرا) اپنی بغل میں ہاتھ تو دباؤ (دیکھو) وہ بغیر کسی بیماری کے سفید (چمکتا ہوا) نکلے گا' یہ دوسری نشانی ہوئی (یہ سب اس لئے ہے) تاکہ ہم تم کو اپنی بڑی بڑی نشانیاں دکھائیں۔

فرعون مصر کے دربار میں جانے کا حکم

حضرت موسیٰ کو واضح نشانیاں عطا کرنے کے بعد اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا:۔

اِذۡهَبۡ اِلٰى فِرۡعَوۡنَ اِنَّهٗ طَغٰى

(طٰہٰ '۲۰:۲۴)

اے موسیٰ! تم فرعون کی طرف جاؤ کہ اس نے بہت سر اٹھایا ہے۔

بعثت موسوی کا مقصد ظلم و استحصال اور کفر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے للکارنا قرار پایا کہ اس کی سرکشی کو کچلا جاسکے فتنہ و شر کے اس مرکز کو ختم کرکے خلق خدا کو مژدہ امن سنایا جاسکے' حکم ہوا' موسیٰ! اب جاؤ' فرعون اور فرعونیوں کو راہ ہدایت دکھاؤ۔ وہ سرکش اور باغی ہو چکے ہیں' کبر و نخوت کی تصویر بنے انسانوں پر جبر و تشدد کا ہر حربہ آزما رہے ہیں بنی اسرائیل کو ان استحصالی اور استعماری قوتوں نے اپنا غلام بنا رکھا ہے سو جاؤ اور بنی اسرائیل کو ان ظالموں کے پنجہ استبداد سے نجات دلاؤ۔

اس پر حضرت موسیٰ بارگاہ خداوندی میں عرض پرداز ہوئے۔

رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ ○ وَيَسِّرْ لِيْٓ اَمْرِيْ ○ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ ○ يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ ○ وَاجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ ○ هٰرُوْنَ اَخِي ○ اشْدُدْ بِهٖٓ اَزْرِيْ ○ وَاَشْرِكْهُ فِيْٓ اَمْرِيْ ○

(طٰہٰ '۲۰:۲۵۔۳۲)

اے میرے پروردگار! میرا سینہ کشادہ فرما دے (تاکہ حلم و بردباری سے تبلیغ کے فرائض ادا کروں) اور میرا کام آسان کر دے اور میری زبان سے یہ گرہ کھول دے (تاکہ سب لوگ) میری بات سمجھ سکیں اور میرے گھر والوں میں سے مجھے ایک کام بٹانے والا عطا فرما (یعنی) میرے بھائی ہارون (کہ عمر میں مجھ سے بڑے ہیں اور فہم بھی اچھی رکھتے ہیں) ان سے میری کمر مضبوط فرما اور ان کو میرے کام میں (میرا) شریک بنا دے۔

حضرت موسیٰ کی اس التجا کو بارگاہ خداوندی سے شرف قبولیت کا پروانہ عطا ہوا۔ انہیں ہر طرح سے تسلی دی گئی انہیں زبان کی قوت اور حوصلے کی بلندی بخشی گئی اور حضرت ہارون کو بھی منصب نبوت سے سرفراز کیا گیا۔

جابر سلطان کے سامنے کلمۂ حق کی ادائیگی

شاہراہ انقلاب حضرت موسیٰ کے قدموں کو بوسہ دینے کی منتظر تھی' سیدنا موسیٰ خلعت رسالت سے سرفراز' منصب نبوت پر جلوہ افروز اور اللہ رب العزت سے براہ راست ہمکلام ہونے کے بعد وادی مقدس سے اترے اور حکم الٰہی پر عمل کرتے ہوئے اپنے انقلابی اور جہادی سفر پر روانہ ہوئے' یہ مصر کی طرف آپ کا سفر ہجرت تھا' منزلوں پر منزلیں طے کرتے ہوئے اپنی والدہ ماجدہ اور اپنے بھائی حضرت ہارون علیہ

السلام کے پاس پہنچ گئے۔ آپ نے اپنے بھائی ہارون کو مخاطب کر کے فرمایا:۔

یا ہارون! ان اللہ امرنی و امرک ان ندعو فرعون الی عبادتہ فقم معی (قصص الانبیاء از ابن کثیر:۲۸۹)

اے ہارونؑ! بے شک اللہ نے مجھے اور تجھے یہ حکم دیا ہے ہم فرعون کو اس (اللہ) کی عبادت (و طاعت) کی طرف بلائیں (لہٰذا) تم میرے ساتھ چلو (تاکہ ہم مل کر اس کو اللہ کی نافرمانی کرنے سے ڈرائیں)۔

دونوں بھائی جو اللہ کے برگزیدہ پیغمبر تھے بلاخوف و خطر کلمہ حق بلند کرنے کے لئے فرعون جیسے ظالم بادشاہ کے دربار میں جاپہنچے اور سیدنا موسیٰؑ نے بھرے دربار میں اپنی آمد کا مقصد بیان کرتے ہوئے فرمایا:۔

يَا فِرْعَوْنُ إِنِّي رَسُولٌ مِّن رَّبِّ الْعَالَمِينَ ○ حَقِيقٌ عَلَىٰ أَن لَّا أَقُولَ عَلَى اللَّهِ إِلَّا الْحَقَّ قَدْ جِئْتُكُم بِبَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ فَأَرْسِلْ مَعِيَ بَنِي إِسْرَائِيلَ ○ (الاعراف '۷: ۱۰۴'۱۰۵)

اے فرعون! بیشک میں تمام جہانوں کے رب کی طرف سے رسول (آیا) ہوں' مجھے یہی زیب دیتا ہے کہ اللہ کے بارے میں حق بات کے سوا (کچھ) نہ کہوں' بے شک میں تمہارے رب (کی جانب) سے تمہارے پاس واضح نشانی لایا ہوں سو تو بنی اسرائیل کو (اپنی غلامی سے آزاد کرکے) میرے ساتھ بھیج دے۔

گویا نبی اور رسول محکوم قوموں کی آزادی کے لئے بھی معبوث ہوتے ہیں کیونکہ اللہ اور اسکے رسول کی غلامی کے سوا ہر غلامی سے نجات انسان کا بنیادی حق ہے' رسول کی غلامی رسول کی اطاعت ہی کا دوسرا نام ہے۔ غلامی کے مروجہ مفہوم سے اسے کوئی علاقہ یا واسطہ نہیں تاریخ انبیاء ہمیں بتاتی ہے کہ انسان کے بنیادی حقوق کی پاسداری نگاہ نبوت سے کبھی اوجھل نہیں ہوئی' محکوموں' مظلوموں اور مقہوروں کی

داد رسی کار پیغمبری ہے۔ فرعون کے بھرے دربار میں سیدنا موسیٰؑ کے اچانک اعلان رسالت اور بنی اسرائیل کے رہائی کے مطالبے پر فرعون نے استخفاف اور تحقیر سے کام لیتے ہوئے کہا کہ اے موسیٰ! آج تو پیغمبر بن کر میرے سامنے بنی اسرائیل کی رہائی کا مطالبہ کرتا ہے کیا تو وہ دن بھول گیا جب تو نے میرے ہی گھر میں پرورش پائی تھی اور ایک قبطی کو قتل کرکے یہاں سے بھاگ گیا تھا۔ اس کے جواب میں اللہ کے نبی برحق نے فرمایا:۔

قَالَ فَعَلْتُهَآ اِذًا وَّ اَنَا مِنَ الضَّآلِّيْنَ ○ فَفَرَرْتُ مِنْكُمْ لَمَّا خِفْتُكُمْ فَوَهَبَ لِيْ رَبِّيْ حُكْمًا وَّ جَعَلَنِيْ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ○ وَ تِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ○ (الشعراء ۲۶: ۲۰-۲۲)

(سیدنا موسیٰؑ نے) کہا میں نے اس وقت وہ کام کیا تھا (لیکن میں نے دانستہ نہیں کیا) اور مجھ سے چوک ہو گئی چنانچہ جب مجھ کو ڈر لگا تو میں تمہارے ہاں سے بھاگ گیا پھر میرے پروردگار نے مجھ کو علم عطا فرمایا اور مجھے پیغمبروں علیہم السلام میں شامل کر دیا اور کیا وہ (بھی کوئی) احسان ہے جس کو تو جتا رہا ہے (جب) کہ تو نے (میری پوری قوم) بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا ہے۔

ابطالِ باطل اور احقاقِ حق کے لئے مکالمہ

اللہ کے رسول برحق سیدنا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے دربار شاہی میں جس جرات و بیباکی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کلمہ حق بلند کیا اور پرچم توحید لہرا کر فرعون کو دعوت دی اور بنی اسرائیل کی آزادی کا مطالبہ کرکے اس کی جھوٹی خدائی کو للکارا۔ اس پر فرعون حیران و ششدر رہ گیا۔ پیغمبر خدا کی زبان اقدس پر شیریں بیانی کے گلاب مہک رہے تھے۔ ان کے چہرہ اقدس پر اپنے نصب العین کی سچائی کا یقین اعتماد کا

نور بن کر چمک رہا تھا۔ موسیٰؑ پیکر عجز و نیاز بنے اہل دربار کو صراط مستقیم دکھا کر فریضہ رسالت ادا کر رہے تھے۔ فرعون کی تضحیک و تحقیر پر کمال بردباری کا ثبوت دے رہے تھے' برداشت اور تحمل کا بے مثال مظاہرہ کر رہے تھے' فرعون سے جب کوئی جواب بن نہ پڑا تو گفتگو کا رخ بدلنے کے درپے ہوا۔

قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ○ قَالَ رَبُّ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ ○

(الشعراء' ۲۶: ۲۳' ۲۴)

فرعون بولا اور پروردگار عالم کی حقیقت کیا ہے؟ فرمایا (وہ) آسمانوں اور زمینوں کا پروردگار ہے اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے اگر تم لوگ یقین کرو۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ رب العزت کی جو صفات بیان کیں وہ کسی دیوی دیوتا میں نہیں پائی جاتی تھیں۔ کائنات رنگ و بو کی صفات پیغمبر خدا کی زبانی سن کر فرعون کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت کی اہمیت کا احساس ہوا۔ چنانچہ اس نے اپنے درباریوں کی توجہ اس جانب مبذول کراتے ہوئے کہا "**الا تستمعون**" کیا تم سنتے نہیں ہو؟ (کہ موسیٰ کیا کہہ رہے ہیں)

شکست خوردگی کا احساس فرعون کے الفاظ میں نمایاں تھا۔ دوسری طرف حضرت موسیٰ علیہ السلام استقامت کا کوہ گراں بنے اپنی بات جاری رکھے ہوئے تھے۔

قَالَ رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ○

(الشعراء' ۲۶: ۲۶)

فرمایا (لوگو! وہ اللہ) تم سب کا اور تمہارے اگلے باپ دادوں کا پروردگار ہے۔

تب فرعون نے لاجواب ہو کر کہا۔

قَالَ فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰى ○

(طٰہٰ' ۲۰: ۵۱)

(فرعون نے) کہا' اچھا! پہلی قوموں کا کیا حال ہوا۔

فرعون کا مطلب یہ تھا کہ اے موسیٰ! اگر تیری بات درست ہے تو پھر ہم سے پہلے لوگ اور ہمارے آباؤ اجداد جو تمہارے خدا کو نہیں مانتے تھے آخر ان پر کیا

گزری اور ان کا کیا انجام ہوا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کی کج بحثی کو سمجھ گئے اور بھانپ گئے کہ فرعون لاجواب ہو کر اصل مقصد کو لفظوں کے ہیر پھیر میں الجھانا چاہتا ہے اس لئے آپ نے فرعون کو فوراً جواب دیا۔

قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ فِيْ كِتٰبٍ ۚ لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَ لَا يَنْسَى ○
(طٰہٰ، ۲۰:۵۲)

فرمایا اس کا علم میرے پروردگار کے پاس کتاب میں ہے (اور) میرا رب نہ چوکتا ہے نہ بھولتا ہے۔

فرعون پیغمبرانہ بصیرت کا سامنا نہ کر سکا۔ اپنے باطل موقف کے حق میں اس کے پاس کوئی دلیل نہ رہی۔ اس کی قوت استدلال جواب دے گئی تو وہ اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آیا اور بوکھلاہٹ کے عالم میں ہذیان بکنے لگا اور اللہ کے نبی کی کردار کشی پر اتر آیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں نازیبا کلمات استعمال کرتے ہوئے فرعون نے (معاذاللہ) انہیں پاگل، دیوانہ اور مجنوں قرار دیا۔

قَالَ اِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِيْٓ اُرْسِلَ اِلَيْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ ○
(الشعراء، ۲۶:۲۷)

(فرعون نے) کہا کہ (لوگو! تم موسیٰ کی باتوں میں نہ آنا) یہ تمہارا پیغمبر جو (اپنے خیال میں) تمہاری طرف بھیجا گیا ہے ضرور عقل سے خالی ہے۔

فرعون کی اشتعال انگیزی کے باوجود سیدنا موسیٰ علیہ السلام غصہ میں نہیں آئے۔ فرعون کے گستاخانہ کلمات کا جواب پیغمبرانہ آداب حکمت سے دیا۔

قَالَ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَ مَا بَيْنَهُمَا ۭ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ○
(الشعراء، ۲۶:۲۸)

(موسیٰ نے) فرمایا (اللہ تو) مشرق اور مغرب کا اور جو کچھ اس کے درمیان ہے سب کا پروردگار ہے۔

مطلق العنان بادشاہ جو خدائی کا دعویدار بھی تھا، حضرت موسیٰ کے مبنی بر صداقت موقف سے زچ ہو چکا تھا لیکن سلسلہ گفتگو ابھی جاری تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام ازلی صداقتوں اور ابدی سچائیوں کا ذکر کر رہے تھے۔ کائنات ہست و بود کے

خالق و مالک کی ربوبیت کا اعلان کر رہے تھے۔ اس کی وحدانیت کا پرچم بلند کر رہے تھے۔ فرعون خوب جانتا تھا کہ میری "ربوبیت اور الوہیت" کی سرے سے کوئی بنیاد ہی نہیں اور اس کی "خدائی" موسوی صداقت اور حقانیت کے سامنے تار عنکبوت کی طرح تار تار ہو رہی ہے۔ جب فرعون لاجواب ہو گیا تو من ہی من میں پیچ و تاب کھانے لگا۔

قَالَ لَئِنِ اتَّخَذْتَ اِلٰهًا غَيْرِيْ لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ ○ (الشعراء ۲۶:۲۹)

(فرعون) بولا اگر تم نے میرے سوا کسی اور کو معبود ٹھہرایا تو میں تم کو قید کر دوں گا۔

جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے۔ جھوٹا شخص جب فرار کی کوئی راہ نہیں ڈھونڈ پاتا تو طاقت کے استعمال پر اتر آتا ہے اور بزور بازو حق کی آواز دبانے کے لئے پر تولنے لگتا ہے۔ کچھ اسی قسم کی کیفیت سے فرعون بھی دوچار تھا۔ طاقت کے گھمنڈ نے اس سے سوچنے سمجھنے اور حق کو قبول کرنے کی صلاحیت چھین لی۔ سیدنا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی محسوس کر لیا کہ فرعون معقولیت کی راہ اختیار کرنے کی بجائے اب طاقت کے استعمال پر اتر آیا ہے تو انہوں نے بھی دوسرا راستہ اختیار کیا۔

قَالَ اَوَلَوْ جِئْتُكَ بِشَيْءٍ مُّبِيْنٍ ○ قَالَ فَاْتِ بِهٖٓ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ○ فَاَلْقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ ○ وَّ نَزَعَ يَدَهٗ فَاِذَا هِيَ بَيْضَآءُ لِلنّٰظِرِيْنَ ○ (الشعراء ۲۶:۳۰-۳۳)

(موسیٰ علیہ السلام نے) فرمایا ہر چند کہ میں تمہارے سامنے کوئی کھلی بات (یعنی معجزہ) پیش کروں (کیا تب بھی تم نہ مانو گے؟ فرعون نے) کہا تو وہ پیش کرو اگر تم سچے ہو تو موسیٰ نے اپنا عصا ڈال دیا۔ پس وہ صاف (سچ مچ کا) اژدھا بن گیا اور (جب بغل کے اندر سے) اپنا ہاتھ نکالا تو ناگاہ وہ دیکھنے والوں کی نگاہ میں سفید ہو گیا۔

معجزہ دیکھ کر بھی فرعون کی خود ساختہ خدائی کا تصور تار تار نہ ہوا اور وہ ہٹ دھری پر اتر آیا۔ اپنے درباریوں اور عمائدین سلطنت سے مخاطب ہوا۔

قَالَ لِلْمَلَاِ حَوْلَهٗٓ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ ○ يُّرِيْدُ اَنْ يُّخْرِجَكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهٖ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ ○ (الشعراء' ۲۶: ۳۴' ۳۵)

(فرعون نے) اپنے اردگرد کے لوگوں سے کہا کہ (یہ معجزہ وغیرہ کچھ نہیں) یہ تو کوئی بڑا جاننے والا (ماہر) جادوگر ہے۔ (یہ تو) چاہتا ہے کہ تم کو تمہارے ملک سے اپنے جادو کے زور سے نکال دے' پس تمہاری کیا رائے ہے۔

حالانکہ سیدنا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی ایک کھلی کتاب کی مانند تھی۔ بچپن سے جوانی تک آپ کی حیات مبارکہ کا ایک ایک لمحہ فرعون کی نظر میں تھا لیکن سچائی کا اعتراف کرنے کی بجائے فرعون نے اللہ کے نبی پر جادوگر ہونے کا الزام لگا کر اپنی خفت کو مٹانے کی سعی ناکام کی۔ اپنے سیاسی مخالفین کی کردار کشی کوئی نئی چیز نہیں بلکہ فرعون نے بھی یہ حربہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلاف استعمال کیا لیکن منہ کی کھائی۔ فرعون کے درباریوں اور عمائدین سلطنت نے فرعون کو یہ مشورہ دیا کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے میں اپنے جادوگروں کو لائے۔ فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے شاہی جادوگروں کا مقابلہ کرنے کے لئے کوئی دن مقرر کرنے کو کہا۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے قومی جشن کے دن شاہی جادوگروں کا مقابلہ کرنا منظور فرما لیا۔ فرعون کو بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تجویز سے اتفاق کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

شاہی جادوگروں کے طلسم کا دامن تار تار ہوتا ہے

قومی جشن کا دن آپہنچا' عوام الناس بھی میدان میں جمع ہو گئے۔

وَجَآءَ السَّحَرَةُ فِرْعَوْنَ قَالُوْٓا اِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ ○ قَالَ

اور جادوگر فرعون کے پاس آئے تو انہوں نے کہا یقیناً ہمارے لئے کچھ

نَعَمْ وَاِنَّكُمْ لَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ○
(الاعراف' ۷: ۱۱۳-۱۱۴)

اجرت ہونی چاہئے بشرطیکہ ہم غالب آجائیں' فرعون نے کہا ہاں اور بے شک تم (میرے دربار کی) قربت والوں میں سے ہو جاؤ گے۔

حضرت موسیٰؑ نے جادوگروں کو بھی دعوت حق دی' انہوں نے جادوگروں کو خبردار بھی کیا کہ اللہ کے رسول کا اور اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نشانیوں کا سحر فسوں کاریوں اور شعبدہ بازیوں سے مقابلہ کرکے عذاب الٰہی کو دعوت نہ دو' اللہ کے نبی کے اس انتباہ پر چند ایک جادوگر تذبذب میں بھی پڑ گئے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اللہ علیم و خبیر ہے جس کے آگے ان کی حیثیت رائی کے دانے کے برابر بھی نہیں اور یہ کہ ان کی سحر آفرینی کی حقیقت کلام الٰہی کے آگے پرکاہ کے برابر بھی نہیں' مگر فرعون کے عمائدین سلطنت نے ان جادوگروں کی ہمت بندھائی اور کہا کہ ذرو مت یہ دونوں موسیٰؑ اور ہارونؑ بھی تو محض جادوگر ہی ہیں' یہ اپنے جادو کے زور سے تمہیں تمہاری سلطنت سے بے دخل کرنا چاہتے ہیں' ان کی کسی بات میں نہ آنا' عمائدین سلطنت کے اس بہکاوے میں آکر جادوگر مقابلے پر آمادہ ہو گئے۔

قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِمَّآ اَنْ تُلْقِيَ وَاِمَّآ اَنْ نَّكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَلْقٰى ○ قَالَ بَلْ اَلْقُوْا فَاِذَا حِبَالُهُمْ وَعِصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى ○ فَاَوْجَسَ فِيْ نَفْسِهٖ خِيْفَةً مُّوْسٰى ○ قُلْنَا لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰى ○ وَاَلْقِ مَا فِيْ يَمِيْنِكَ تَلْقَفْ مَا صَنَعُوْا اِنَّمَا صَنَعُوْا كَيْدُ سٰحِرٍ وَلَا يُفْلِحُ السّٰحِرُ حَيْثُ اَتٰى
(طٰہٰ' ۲۰: ۶۵-۶۹)

وہ بولے اے موسیٰؑ یا تو آپ (اپنا جادو) ڈالیں یا (اپنا سحر) ڈالنے والے ہم ہوں؟ (موسیٰؑ نے) کہا نہیں تم ہی ڈالو' پس (جیسے ہی انہوں نے اپنی رسیاں ڈالیں) وہ رسیاں اور لاٹھیاں ان کے جادو کے زور سے (موسیٰؑ کو بھی) یوں دکھائی دینے لگیں جیسے ادھر ادھر دوڑ رہی ہیں' پس موسیٰ نے اپنے دل میں (ایک طرح کا) ڈر محسوس کیا' ہم نے کہا کہ تم گھبراؤ

نہیں یقیناً تم ہی غالب رہو گے اور (اے موسیٰ) جو تمہارے دائیں ہاتھ میں (عصا) ہے وہ ڈال دو وہ ان کا بنایا ہوا فریب نگل جائے گا اور جو کچھ انہوں نے (سوانگ) بھرا ہے وہ جادوگروں کا (عام) فریب ہے اور جادوگر جہاں بھی جائے فلاح نہیں پاتا۔

بارگاہِ خداوندی میں جادوگروں کی سجدہ ریزی

یہ جادوگر اپنے فن میں کامل تھے' سچائی تک پہنچنے میں انہیں دیر نہ لگی' جب انہوں نے دیکھا کہ سیدنا موسیٰ کا عصا اژدہا بن کر ان کے رچائے ہوئے سوانگ کو نگل گیا ہے تو انہیں یقین ہو گیا کہ سیدنا موسیٰ اللہ کے سچے نبی ہیں وہ کوئی جادوگر نہیں' وہ جادوگر فوراً سجدے میں گر پڑے اور اعلان کر دیا کہ ہم موسیٰ اور ہارون کے رب پر ایمان لائے قرآن کہتا ہے۔

فَأُلْقِيَ السَّحَرَةُ سُجَّدًا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَمُوْسٰى ○ (طٰہٰ '۲۰:۷۰)

چنانچہ سب جادوگر سجدے میں گر گئے اور (بول) اٹھے ہم ہارون اور موسیٰ کے پروردگار پر ایمان لائے۔

عقل عیار ہے سو بھیس بدل لیتی ہے۔ فرعون نے جب احقاق حق اور ابطال باطل ہوتے دیکھا اور اپنی خود ساختہ "خدائی" کا سنگھاسن اسے ڈولتا نظر آیا اس نے پینترا بدلا' ایک نئی چال چلی اور غصے سے کہنے لگا موسیٰ! یقیناً تم سب (جادوگروں) کے گروہ ہو اور تم سب نے مل کر میرے خلاف سازش کی ہے تاکہ لوگوں کو ان کے ملک سے نکال باہر کرو' قرآن اس مقام پر کہتا ہے۔

قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۚ اِنَّهٗ

(فرعون) بولا تم اس پر ایمان لے آئے'

لَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّلَاُصَلِّبَنَّكُمْ فِي جُذُوْعِ النَّخْلِ وَلَتَعْلَمُنَّ اَيُّنَآ اَشَدُّ عَذَابًا وَّاَبْقٰى ۝ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ

(طٰہٰ، ۲۰:۷۱)

قبل اس کے کہ میں تم کو (اس کی) اجازت دوں، یقیناً وہ تمہارا بڑا (جادوگر) ہے جس نے تم کو سحر سکھایا ہے، پس میں ضرور تمہارے ایک طرف کے ہاتھ اور دوسری طرف کے پاؤں کاٹوں گا اور تمہیں کھجور کے تنوں پر سولی چڑھا دوں گا اور تم جان لوگے کہ کس کا عذاب سخت اور دیرپا ہے۔

شاہی رعب اور دبدبہ سے فرعون نے جادوگروں کو مرعوب کرنا چاہا، استعماری طاقتوں کا یہی طرز عمل رہا ہے کہ وہ سیاہ انقلاب کی راہ میں قدم قدم پر سولیاں کھڑی کرتی ہیں، زبانوں پر قفل ڈالتی ہیں کہ ان پر حرف حق پھول بن کر کھل نہ اٹھے، انسان کی سوچوں پر پہرے بٹھاتی ہیں کہ ان کے اقتدار کا سورج غروب نہ ہو لیکن وہ مردان حق جن کے سینوں میں صداقت کے چراغ جل اٹھیں اور جن کے دامن ایمان کی دولت سے بھر جائیں وہ کسی شہنشاہ کے جاہ و جلال کو کب خاطر میں لاتے ہیں وہ حق کی خاطر پھانسی کے پھندے کو چوم کر گلے میں ڈال لیتے ہیں وہ راہ حق میں اپنے لہو کے چراغ روشن کر کے حق کی گواہی دیتے ہیں اور خلعت شہادت کے سزاوار ٹھہرتے ہیں، جادوگروں نے کہا کہ اے فرعون تجھ سے جو بن پڑتا ہے کر لے، ہم تو اب راہ حق کے مسافر ہیں، شمع توحید ہمارے سینوں میں روشن ہو چکی ہے تو زیادہ سے زیادہ یہی کرے گا کہ ہمیں جان سے مار ڈالے گا، یہ جان تو اسی کی دی ہوئی ہے اگر اسی کی راہ میں کام آگئی تو اس سے بڑی سعادت کیا ہوگی، جادوگر ایمان کی دولت سے فیض یاب ہونے اور وقت کی استعماری قوت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے للکار رہے تھے۔

قَالُوْا لَنْ نُّؤْثِرَكَ عَلٰى مَا جَآءَنَا مِنَ

وہ (جادوگر) بولے ان صاف دلائل

الْبَيِّنَاتِ وَالَّذِيْ فَطَرَنَا فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ اِنَّمَا تَقْضِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا۝ اِنَّآ اٰمَنَّا بِرَبِّنَا لِيَغْفِرَ لَنَا خَطٰيٰنَا وَمَآ اَكْرَهْتَنَا عَلَيْهِ مِنَ السِّحْرِ وَاللّٰهُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى۝

(طٰہٰ' ۲۰: ۷۲۔۷۳)

(اور نشانیوں) کے مقابلہ میں جو ہم کو مل چکے ہیں اور جس نے ہم کو پیدا کیا ہے (اس کی قدرت کاملہ کے سامنے) ہم تجھے ہرگز ترجیح نہ دیں گے پس تجھ کو جو کرنا ہے وہ کر گزر تو جو کرے گا اسی دنیا کی زندگی میں کرے گا ہم تو اپنے رب پر ایمان لائے ہیں تاکہ وہ ہمارے گناہ بخش دے اور یہ جادو جو تو نے ہم سے زبردستی کروایا ہے (وہ معاف فرمادے) اور اللہ ہی سب سے بہتر اور ہمیشہ باقی رہنے والا ہے۔

حضرت موسیٰؑ نے جادوگروں کو استقامت کی تلقین کی کیونکہ ابتلا و آزمائش کے وقت ثابت قدم رہ کر اپنے ایمان کی حفاظت ضروری ہو جاتی ہے سیدنا موسیٰؑ نے کہا کہ اب ایمان لائے ہو تو اس پر بھروسہ کرنا' صبر کرنا اور آخر دم تک ایمان پر قائم رہنا' اپنی قوم کو اک ولولہ تازہ بھی عطا کیا کہ یہی ولولہ تازہ آزادی کی راہ میں حریت پسندوں کا زاد سفر ٹھہرتا ہے۔

قَالَ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ۝

(الاعراف' ۷: ۱۲۹)

موسیٰؑ نے (اپنی قوم کو تسلی دیتے ہوئے) فرمایا قریب ہے کہ تمہارا رب تمہارے دشمن کو ہلاک کردے اور (اس کے بعد) زمین میں تمہیں جانشین بنادے پھر وہ دیکھے کہ تم کیسے عمل کرتے ہو۔

سیدنا موسیٰؑ کے قتل کا گھناؤنا ارادہ

شکست خوردگی کے احساس نے فرعون کے اوسان خطا کردیئے وہ کبھی یہ

تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اس کے محلوں میں پرورش پانے والے موسیٰؑ ایک دن اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے للکاریں گے اور اس کی (خود ساختہ) خدائی کیلئے خطرہ بن جائیں گے' جادوگروں کے دائرہ ایمان میں داخل ہونے سے تو اس کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے کہ موت کا خوف بھی ان کے ایمان کو متزلزل نہ کر سکا' ظالم استحصالی طاقتیں اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کیلئے اپنے سیاسی مخالفین کو اپنے راستے سے ہٹانے کیلئے ہر حربہ استعمال کرتی ہیں اگر وہ اپنے سیاسی اقتدار کو برقرار رکھنے کیلئے کسی کی جان لینا ضروری خیال کریں تو وہ انتہائی قدم اٹھانے سے بھی دریغ نہیں کرتیں' سیدنا موسیٰؑ کے روحانی غلبے کا تصور اور معجزات کا کمال فرعون کو اندر سے ریزہ ریزہ کر گیا۔ وہ ہر ممکن طریقے سے حضرت موسیٰؑ کو اپنی راہ سے ہٹانا چاہتا تھا چنانچہ اس نے اپنے درباریوں اور عمائدین سلطنت کو اعتماد میں لینا ضروری خیال کیا۔

وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُوْنِيْٓ اَقْتُلْ مُوْسٰى وَلْيَدْعُ رَبَّهٗ ۚ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يُّبَدِّلَ دِيْنَكُمْ اَوْ اَنْ يُّظْهِرَ فِي الْاَرْضِ الْفَسَادَ ○ (المومن' ۴۰:۲۶)

اور فرعون نے (جھنجلا کر) کہا کہ مجھے چھوڑ دو کہ موسیٰؑ کو قتل کر ڈالوں اور بے شک وہ اپنے رب کو بلا لے' مجھ کو اندیشہ ہے کہ وہ تمہارے دین کو بدل نہ ڈالے اور ملک میں فساد نہ پھیلائے۔

باطل طاغوتی طاقتیں ہمیشہ عوام اور امن کی آڑ میں صداقت کے چراغوں کو بجھانے اور اپنے اقتدار کو طول دینے کی منصوبہ بندی کرتی ہیں۔ فرعون نے بھی حضرت موسیٰؑ کے قتل (نعوذ باللہ) کا ارادہ کیا تو اسے امن عامہ سے مشروط کر دیا اور اپنے سرداروں سے کہا کہ مجھے اندیشہ ہے کہ وہ موسیٰؑ کہیں تمہارے آبائی دین کو بدل نہ ڈالے اور یہ نظام ہی یکسر تبدیل نہ کر ڈالے اور نظام کی اس تبدیلی کے حوالے سے ملک میں "فساد" نہ پھیلائے' گویا انقلابی جدوجہد پر شرپسندی کا الزام لگایا انہیں غبار تشکیک میں چھپانے کی ناکام کوشش کی جا رہی ہے۔

وَقَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَكْتُمُ اِيْمَانَهٗۤ اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ وَقَدْ جَآءَكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ مِنْ رَّبِّكُمْ ۭ وَاِنْ يَّكُ كَاذِبًا فَعَلَيْهِ كَذِبُهٗ ۚ وَاِنْ يَّكُ صَادِقًا يُّصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ يَعِدُكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ ○

(المومن‘ ۴۰:۲۸)

اور ایک مرد مومن جو فرعون ہی کے لوگوں میں سے تھا اور اپنے ایمان کو چھپائے ہوئے تھا بولا‘ کیا تم ایک شخص کو (محض) اس بات پر قتل کئے دیتے ہو کہ وہ کہتا ہے‘ میرا رب اللہ ہے اور (پھر) وہ تمہارے رب کے یہاں سے تمہارے پاس کھلی نشانیاں لے کر آیا ہے اور وہ اگر جھوٹا ہے تو اس کا جھوٹ اس پر پڑے گا اور اگر وہ سچا ہے تو جو پیشین گوئی وہ کر رہا ہے اس میں سے کچھ تو تم پر پڑ کر رہے گی۔ بے شک اللہ اس شخص کو ہدایت نہیں دیتا جو حد سے گزرنے والا اور سراسر جھوٹا ہو۔

لیکن ان معقول باتوں کا بھی فرعون نے کوئی اثر قبول نہ کیا اور حکمت اور دانائی سے لبریز اس پر مغز اور نصیحت آمیز گفتگو کو فرعون نے طاقت کے نشے میں پائے حقارت سے ٹھکرا دیا۔ جب عقل پر پتھر پڑ جائیں اور آنکھوں پر ضد اور ہٹ دھرمی کی پٹی بندھ جائے‘ انسان اپنے دونوں کانوں میں اپنی انگلیاں ٹھونس لے اور حرف حق کی دستک پر اپنے ذہن کے دروازے بند کر لے تو پھر نہ اس کی نظر نور ایمان سے اکتساب شعور کر سکتی ہے اور نہ سچائی تک پہنچنے کی کوئی آرزو ہی اس کے دل و دماغ میں پیدا ہو سکتی ہے بلکہ وہ اپنی انا کی گرد میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو بھی گم کر بیٹھتا ہے فرعون کے سر میں خدائی کا سودا سمایا ہوا تھا۔ شوریدہ سری کا زہر اس کی رگ رگ میں اتر کر اندھیروں کو جنم دے رہا تھا۔ اس مرد مومن کی دانشمندانہ گفتگو بھی مزاج شاہ پر گراں

گزری اس نے اس مرد مومن کو بھی نقصان پہنچانا چاہا لیکن اللہ رب العزت جو کل جہانوں کا پالنے والا ہے جو اس کائنات رنگ و بو کا خالق و مالک ہے نے اس مرد مومن کو فرعون اور اس کے بد طینت حواریوں کے مکر و فریب' اور فتنہ و شر سے محفوظ رکھا کہ وہ ہر چیز پر قادر ہے زندگی اور موت صرف اور صرف اسی کے اختیار میں ہے۔

فرعونیوں کیلئے موسیٰؑ کی بددعا

فرعون اور اس کے سرداروں کا طرز عمل ناقابل برداشت ہوتا جارہا تھا لیکن سیدنا موسیٰؑ اشتعال انگیزی اور گستاخانہ رویوں کے باوجود پرسکون رہے اور صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا اور ہر ہر مرحلے پر پیغمبرانہ بصیرت اور مومنانہ فراست کے موتی بکھیرے جب فرعونیوں کی بداخلاقی حد سے بڑھ گئی اور وہ اللہ کے نبیؑ کے خون کے پیاسے ہو گئے اور اصلاح احوال کا کوئی امکان باقی نہ رہا تو سیدنا حضرت موسیٰؑ نے بارگاہ خداوندی میں ہاتھ اٹھا دیئے۔

وَقَالَ مُوسٰى رَبَّنَآ اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَاَهٗ زِيْنَةً وَّاَمْوَالًا فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِكَ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓى اَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ○

(یونس' ۱۰:۸۸)

اور موسیٰ علیہ السلام نے کہا اے ہمارے رب بے شک تو نے فرعون اور اس کے سرداروں کو دنیوی زندگی میں اسباب زیست اور مال و دولت (کی کثرت) دے رکھی ہے' اے ہمارے رب! (کیا تو نے انہیں یہ سب کچھ اس لئے دیا ہے) تاکہ وہ (لوگوں کو) تیری راہ سے بہکا سکیں' اے ہمارے رب! تو ان کے مال و دولت کو برباد کر دے اور ان کے دلوں کو (اتنا) سخت کر دے کہ وہ پھر بھی ایمان نہ لائیں حتیٰ کہ وہ دردناک عذاب دیکھ

لیں۔

سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے ان حروف مذمت کو بھی شرف قبولیت کی خلعت عطا ہوئی' فرمایا کہ تم دونوں ثابت قدم رہو اور ان لوگوں کے طریقے کی ہرگز ہرگز پیروی نہ کرنا جو میرے راستے سے بھٹکے ہوئے ہیں۔

مصر سے وادیٔ سینا کی طرف ہجرت

ہجرت فتح و نصرت اور شاہراہ انقلاب پر نئے امکانات کا دروازہ ہے' خطہ جبر سے قریہ امن کی طرف سفر کو سفر ہجرت کہتے ہیں' فرعون تکبر و رعونت کا پیکر بنا ہوا تھا' جب پانی سر سے گزر چکا اور فرعون کے ظلم و تشدد کی انتہا ہو گئی تو سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا گیا کہ اب وقت آگیا ہے کہ تم بنی اسرائیل کو مصر سے نکال کر اپنے باپ دادا کی سرزمین کی طرف لے جاؤ' چنانچہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام اور سیدنا ہارون علیہ السلام راتوں رات بنی اسرائیل کو لے کر بحیرۂ احمر (Red Sea) کے راستے پر ہو لئے اور بحیرہ قلزم کے کنارے جا کر ڈیرے ڈال دیئے یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تیسری اور اہم ترین ہجرت تھی جب فرعون کو اطلاع ملی کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کے ساتھ سفر ہجرت پر روانہ ہو گئے ہیں تو اس نے فوری طور پر اپنی فوجیں جمع کرنے کیلئے شہروں میں اپنے نقیب بھیج دیئے چنانچہ صبح ہوتے ہی فرعونی اسرائیلیوں کے تعاقب میں نکل کھڑے ہوئے جب فرعون کے لشکر کو آتے دیکھا تو بنی اسرائیل خوفزدہ ہو گئے کہ اب تو ہم مارے گئے فرعون کے لشکر کی صورت میں انہیں اپنی موت نظر آ رہی تھی لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں تسلی دی اور کہا کہ ہمارا پروردگار ہمارے ساتھ ہے۔

قَالَ کَلَّآ اِنَّ مَعِیَ رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ ○ (الشعراء' ۲۶:۶۲)

(موسیٰ ؑ نے فرمایا) ہرگز نہیں' میرا پروردگار میرے ساتھ ہے وہ مجھے راہ (نجات) بتا دے گا۔

فرعون اور اس کے لشکریوں کی غرقابی

بنی اسرائیل پریشان تھے کہ ان کی روانگی کے تمام راستے مسدود ہو رہے ہیں۔ ایک طرف سمندر تھا اور دوسری طرف فرعون کا لشکر انسانوں کے سمندر کا منظر پیش کر رہا تھا۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو یقین کامل تھا کہ اللہ کی مدد و نصرت ضرور اترے گی اور وہ قادر مطلق انہیں ضرور راہ نجات دکھلائے گا۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو وحی کے ذریعہ حکم ملا کہ اپنا عصا سمندر پر ماریں کہ اللہ بہتر تدبیر کرنے والا ہے۔ جونہی سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے حکم الٰہی کے مطابق سمندر پر اپنا عصا مارا وہ اسی وقت پھٹ گیا اور اس کا ہر ایک ٹکڑا فلک بوس پہاڑ بن گیا۔ دائیں بائیں پانی کی دیواریں کھڑی ہو گئیں اور ان دیواروں کے درمیان محفوظ خشک راستہ بن گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم سمیت کسی خوف کے بغیر حکم ربی کے مطابق سمندر پار کر گئے۔ فرعون نے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کو پانی کے پہاڑوں کے درمیان خشک راستے کے ذریعہ سمندر کو عبور کرتے دیکھا تو وہ بھی اپنے لشکر لے کر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کے تعاقب میں اس راستے پر چل پڑا لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام تو اپنی قوم سمیت سمندر پار کر گئے لیکن فرعون اور اس کا لشکر سمندر میں غرق ہو گیا۔ پانی کے پہاڑ ان پر ٹوٹ پڑے۔ فرعون کی پکار فضا میں تحلیل ہو کر رہ گئی۔

اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِيْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِيْلَ وَ اَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ۝ (یونس، ۱۰:۹۰)

(فرعون کہنے لگا) میں اس پر ایمان لے آیا کہ کوئی معبود نہیں سوائے اس (معبود) کے جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں اور میں (اب) مسلمانوں میں سے ہوں۔

لیکن اللہ رب العزت نے فرعون کے قبول اسلام کو رد کر دیا اور وہ اپنے لشکر سمیت سمندر کی خوفناک لہروں کی نذر ہو گیا۔ اس کی لاش آج بھی عجائب گھر میں عبرت کا

نشان بنی ہوئی ہے۔

بنی اسرائیل وادی سینا میں

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل سمندر عبور کر کے جزیرہ نمائے سینا میں داخل ہوئے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو حکم دیا کہ فرعون کی غلامی سے نجات اور آزادی اور ایمان کی صورت میں اللہ نے انہیں جو عظیم نعمت عطا کی ہے اس پر وہ اللہ کا شکر بجالائیں۔ انہوں نے خود بھی اللہ کی حمد و ثنا بیان کی' بیابان شور سے گزرتے ہوئے ان کا گزر ایک ایسی بستی سے ہوا جس کے باشندے سے بتوں کی پوجا میں مشغول تھے۔ بنی اسرائیل نے یہ منظر دیکھا تو بستی والوں کے پوجا پاٹ سے متاثر ہو کر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہنے لگے۔

يَا مُوسَى اجْعَلْ لَنَا إِلَهًا كَمَا لَهُمْ آلِهَةٌ ۝ (اعراف '۷:۱۳۸)

اے موسیٰ! ہمارے لئے بھی ایسا (ہی) معبود بنا دیں جیسے ان کے معبود ہیں۔

اس خلاف عقل مشرکانہ اور جاہلانہ مطالبہ پر حضرت موسیٰ علیہ السلام سخت برہم ہوئے اور فرمانے لگے بدبختو! خدا کی آیات بینات اپنی ننگی آنکھوں سے دیکھ کر بھی بتوں کی پرستش کی طرف مائل ہو رہے ہو۔ آپ نے مزید فرمایا۔

إِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُونَ ۝ إِنَّ هَؤُلَاءِ مُتَبَّرٌ مَا هُمْ فِيهِ وَبَاطِلٌ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝ قَالَ أَغَيْرَ اللَّهِ أَبْغِيكُمْ إِلَهًا وَهُوَ فَضَّلَكُمْ عَلَى الْعَالَمِينَ ۝

(الاعراف '۷:۱۳۸-۱۴۰)

تم یقیناً بڑے جاہل لوگ ہو۔ بلاشبہ یہ لوگ جس چیز (کی پوجا) میں (پھنسے ہوئے) ہیں وہ ہلاک ہو جانے والی ہے اور جو کچھ وہ کر رہے ہیں وہ (بالکل) باطل ہے۔ (موسیٰ علیہ السلام نے) کہا کیا میں تمہارے لئے اللہ کے سوا اور معبود تلاش کروں حالانکہ اس نے تمہیں سارے جہانوں پر فضیلت بخشی ہے۔

ہجرت موسوی کے مقاصد

اس ہجرت کے تین بنیادی مقاصد تھے۔

۱۔ بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی اور محکومی سے نجات دلانا۔

۲۔ بنی اسرائیل کی آزاد مملکت کا قیام

۳۔ اس نئی اور آزاد مملکت میں موسوی نظام شریعت قائم کرنا۔

ہجرت مدینہ کے بھی کم و بیش یہی مقاصد تھے۔ ہجرت مدینہ کے نتیجے میں مسلمانوں کو مکہ کے کفار و مشرکین کی سازشوں سے نجات ملی۔ مسلمانوں پر ڈھائے جانے والے مظالم کا خاتمہ ہوا۔ مدینہ میں مسلمانوں کی آزاد مملکت قائم ہوئی اور اس نوزائیدہ مملکت میں شریعت محمدی کا نفاذ عمل میں آیا۔ قیام پاکستان کے وقت بھی بھارت سے مسلمانوں نے پاکستان کی طرف ہجرت کی کیونکہ یہ ملک اللہ اور اس کے رسول کے نام پر حاصل کیا گیا تھا۔ انگریز اور ہندوؤں سے غلامی اور محکومی سے نجات کا واحد ذریعہ ہجرت ہی تھی البتہ اس مملکت خداداد پاکستان میں شریعت محمدی کے عملی نفاذ کی منزل ہماری کوتاہیوں کی وجہ سے ممکن نہیں ہو سکی۔

طور پر چالیس دن کا اعتکاف

بنی اسرائیل نے کچھ عرصہ بعد سیدنا موسیٰ علیہ السلام سے درخواست کی کہ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ وہ ہمارے لئے کتاب اور شریعت نازل کرے تاکہ ہم اللہ کے نازل کردہ احکامات کے مطابق اپنی زندگی بسر کر سکیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے بھائی سیدنا ہارون علیہ السلام جو خود بھی اللہ تعالیٰ کے نبی تھے، کو اپنا نائب مقرر کیا اور کوہ طور پر چالیس دن کے لئے معتکف ہوئے۔ چالیس دن کا اعتکاف مکمل ہوا تو اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا۔

يَا مُوْسٰٓى اِنِّى اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِىْ وَبِكَلَامِىْ فَخُذْ مَآ اٰتَيْتُكَ وَ

اے موسیٰ! بے شک میں نے تمہیں لوگوں پر اپنے پیغامات اور اپنے کلام کے

كُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ ○ وَ كَتَبْنَا لَهٗ فِي الْاَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْعِظَةً وَّ تَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ وَّ اْمُرْ قَوْمَكَ يَاْخُذُوْا بِاَحْسَنِهَا ؕ سَاُورِيْكُمْ دَارَ الْفٰسِقِيْنَ ○

(الاعراف '۷: ۱۴۴ '۱۴۵)

ذریعہ برگزیدہ و منتخب فرمالیا۔ سو میں نے تمہیں جو کچھ عطا فرمایا ہے اسے تھام لو اور شکر گزاروں میں سے ہو جاؤ اور ہم نے ان کے لئے (تورات کی) تختیوں میں ہر ایک چیز کی نصیحت اور ہر ایک چیز کی تفصیل لکھ دی (ہے) تم اسے مضبوطی سے تھام لو اور اپنی قوم کو بھی حکم دو کہ وہ اس کی بہترین باتوں کو اختیار کریں۔ میں عنقریب تمہیں نافرمانوں کا مقام دکھاؤں گا۔

بنی اسرائیل کی ذہنی پستی اور گوسالہ پرستی

پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ بنی اسرائیل کا گزر ایک ایسی قوم پر سے ہوا جو بت پرست تھے اور پتھر کے بے جان معبودوں کی پوجاپاٹ میں مصروف تھی اور بنی اسرائیل نے ان کی پوجاپاٹ سے متاثر ہو کر سیدنا موسیٰ علیہ السلام سے مطالبہ کیا تھا کہ ہمارے لئے بھی ان جیسے معبودوں کا انتظام کیا جائے۔ بنی اسرائیل کی ذہنی پستی اور اخلاقی گراوٹ کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب سیدنا موسیٰ علیہ السلام کوہ طور پر اعتکاف کی حالت میں تھے اور اپنے پروردگار سے راز و نیاز میں مصروف تھے اور بنی اسرائیل کے لئے شریعت کی صورت میں ضابطہ حیات کے نزول کے تمنائی تھے تو نیچے وادیٔ سینا میں سامری کی قیادت میں بنی اسرائیل نے ایک طوفان بدتمیزی کھڑا کر دیا اور خود اپنا معبود (گوسالہ) منتخب کر کے اس کی پرستش شروع کر دی۔ یہ سونے کا ایک بچھڑا تھا جو شیطانی قوتوں سے حرکت کرتا دکھائی دیتا تھا۔ ادھر اللہ رب العزت نے سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو بتا دیا کہ ان کی عدم موجودگی میں سامری نے بنی اسرائیل کو گمراہ کر دیا ہے اور بنی اسرائیل ایک بچھڑے کی پوجا کرنے لگے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے علم

میں یہ بات آئی تو وہ شدید غم و غصہ کی حالت میں اپنی قوم میں واپس آنے اور ان سے باز پرس کی۔ سیدنا ہارون علیہ السلام سے بھی جواب طلبی کی کہ یہ سب کیسے ہوا؟ انہوں نے قوم کو گمراہ ہونے سے کیوں نہ روکا؟ حضرت ہارون علیہ السلام نے اس کی معقول وجہ بیان کی تو ان کا غصہ ذرا ٹھنڈا ہوا۔ اس کے بعد آپ نے سامری کو ملامت کی کہ یہ اس نے کیا ڈھونگ رچا رکھا ہے۔ سزا کے طور پر اسے اپنی جماعت سے خارج کر دیا کہ فتنہ کھڑا کرنے اور قوم کو گمراہ کرنے والوں کی ہمارے درمیان کوئی جگہ نہیں اور اپنی جماعت کو حکم دیا کہ سامری کے ساتھ کسی قسم کا لین دین نہ کریں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بچھڑے کو جلا کر اس کی راکھ کو دریا کی لہروں کے سپرد کر دیا اور یوں اس فتنے کا تدارک کیا۔

حکم جہاد اور بنی اسرائیل کا رویہ

جذبہ جہاد کو ہر سطح اور ہر مرحلے پر زندہ و بیدار رکھنے کی ضرورت پر ہم سیرت الرسول ﷺ کی جلد ہفتم میں جہاد اور امن کے حوالے سے سیر حاصل گفتگو کریں گے۔ یہاں صرف اتنا عرض کر دینا ضروری ہے کہ جذبہ جہاد کو عملاً اپنی زندگیوں کا حصہ بنائے بغیر نہ دین حق کو تمام ادیان باطلہ پر غالب کیا جا سکتا ہے اور نہ قوموں کی برادری میں برابری کی سطح پر اپنے حقوق کا تحفظ ممکن ہے۔ سیدنا حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم بنی اسرائیل کی اصل منزل فلسطین اور اردن کا علاقہ تھا جہاں اس وقت ایک طاقتور اور جابر قوم حکمران تھی۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو جہاد کی ترغیب دی کیونکہ جہاد کے بغیر وہ اپنے لئے ایک باوقار زندگی کی ضمانت حاصل نہیں کر سکتے تھے لیکن ایک عرصہ تک غلامی کی زندگی بسر کرنے والی قوم کے اعصاب جواب دے چکے تھے۔ انہوں نے جہاد سے اعراض و انکار کیا اور سیدنا حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہنے لگے کہ جب تک فلسطین سے جابر و قاہر حکمران نکل نہیں جاتا ہم اس میں ہرگز ہرگز داخل نہ ہوں گے۔ گویا وہ چاہتے تھے کہ آزاد فلسطین کی ریاست کوئی انہیں طشتری میں رکھ کر پیش کر دے اور یہ بھول گئے کہ عروس آزادی سے ہمکنار ہونے کے لئے

اپنی دونوں ہتھیلیوں پر اپنے لہو کے چراغ جلانا پڑتے ہیں۔ قرآن کی زبان میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم سے یوں گویا ہوئے۔

يَا قَوْمِ ادْخُلُوا الْأَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِي كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ وَلَا تَرْتَدُّوا عَلَىٰ أَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوا خَاسِرِينَ ○ قَالُوا يَا مُوسَىٰ إِنَّ فِيهَا قَوْمًا جَبَّارِينَ وَإِنَّا لَنْ نَدْخُلَهَا حَتَّىٰ يَخْرُجُوا مِنْهَا فَإِنْ يَخْرُجُوا مِنْهَا فَإِنَّا دَاخِلُونَ ○

(المائدہ ۵: ۲۱، ۲۲)

اے میری قوم! (ملک شام یا بیت المقدس کی) اس مقدس سرزمین میں داخل ہو جاؤ جو اللہ نے تمہارے لئے لکھ دی ہے اور اپنی پشت پر (پیچھے) نہ پلٹنا ورنہ تم نقصان اٹھانے والے بن کر پلٹو گے۔ انہوں نے (جواباً) کہا اے موسیٰ! اس میں تو زبردست (ظالم) لوگ (رہتے) ہیں اور ہم اس میں ہرگز داخل نہیں ہوں گے یہاں تک کہ وہ اس (زمین) سے نکل جائیں۔ پس وہ اگر یہاں سے نکل جائیں تو ہم ضرور داخل ہو جائیں گے۔

بنی اسرائیل ایک ضدی قوم تھی۔ ہر بات کو اپنے مطالبات کی بجا آوری سے مشروط کر دیتی۔ جہاد سے انکاری ہوئی کہ اس علاقے سے ظالم قوم اپنا رخت سفر باندھ لیں تو ہم اس میں داخل ہو جائیں گے۔ کبھی اپنے نبی سے فرمائش کرے کہ آسمان سے ہمارے لئے من و سلویٰ اتارا جائے۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام جو توحید خداوندی کا پرچم بلند کر رہے تھے ان سے بت پرستی کی اجازت طلب کرتے اور ان کی عدم موجودگی میں سونے کے بچھڑے کی پوجا شروع کر دیتے۔ عجب تضادات کی حامل قوم تھی اور آج بھی پوری دنیا میں یہ قوم فتنہ و فساد کا باعث بنی ہوئی ہے۔ بنی اسرائیل میں سے صرف دو افراد نے سیدنا موسیٰ علیہ السلام کا ساتھ دیا' باقی قوم نے جہاد سے منہ موڑتے ہوئے کہا۔

فَاذْهَبْ أَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا إِنَّا هَاهُنَا قَاعِدُونَ

(المائدہ ۵: ۲۴)

پس تم جاؤ اور تمہارا رب (ساتھ جائے) سو تم دونوں جنگ کرو۔ ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔

۴۰ سال کے لئے ارض فلسطین کو یہودیوں کے لئے حرام کر دیا گیا

وہ قومیں جو اپنی تلواریں نیام میں کر لیتی ہیں اور جہاد سے منہ موڑ لیتی ہیں' ذلت و رسوائی ان کے مقدر میں لکھ دی جاتی ہے۔ جہاد کا جذبہ سرد خانے کی نذر ہو جائے اور لہو کی گردش میں جہد عمل کی روشنی نہ بنے تو قوموں پر جمود طاری ہو جاتا ہے اور وہ بے عملی کا شکار ہو کر اپنے اقتدار اعلیٰ سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتی ہیں۔ بنی اسرائیل نے جہاد سے انکار کیا تو قعر ذلت میں جا گری۔ آج بھی جہاد کے حوالے سے علمی اور عملی سطح پر مسلمانوں کے خلاف سازشوں کے جال بنے جا رہے ہیں۔ جہاد کے ڈانڈے دہشت گردی سے ملا کر تاریخ کا چہرہ مسخ کیا جا رہا ہے۔ عالم یہود و نصرانیت مسلمانوں کی جہادی تحریکوں سے خوفزدہ ہے۔ وہ امن عالم کے قیام کی آڑ لے کر اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کی کردار کشی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ سیدنا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رب سے التجا کی کہ اے میرے پروردگار! مجھے اپنے اور اپنے بھائی کے سوا کسی پر اختیار نہیں تو ہم میں اور نافرمان لوگوں میں جدائی کر دے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس التجا پر اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو ان کی سرکشی پر یہ سزا دی کہ چالیس سال کے لئے ارض فلسطین کو ان پر حرام کر دیا گیا۔ وہ چالیس سال تک اسی ' دشت کا رزق بنتے رہے۔

قَالَ فَإِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ أَرْبَعِينَ سَنَةً يَتِيهُونَ فِي الْأَرْضِ ۚ فَلَا تَأْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفَاسِقِينَ ۝

(المائدہ' ۵:۲۶)

فرمایا پس یہ (سرزمین) ان (نافرمان) لوگوں پر چالیس سال تک حرام کر دی گئی ہے۔ یہ لوگ زمین میں (پریشان حال) سرگرداں پھرتے رہیں گے۔ (اے موسیٰ! اب) اس نافرمان قوم (کے عبرتناک حال) پر افسوس نہ کرنا۔

عظمتِ موسیٰ اور قرآن

سیدنا حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ کے برگزیدہ نبی تھے جن کی ساری زندگی انقلابی جدوجہد سے عبارت ہے۔ یہ جدوجہد محکوم اور غلام قوموں کو جہد مسلسل کی ترغیب دیتی ہے اور آزادی کے لئے ان کے سینے میں تڑپ پیدا کرتی ہے۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے اپنے وقت کے جابر حکمران فرعون جو خدائی کا بھی دعویدار تھا کی جھوٹی خدائی کو بے نقاب کیا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کے بھرے دربار میں کلمہ حق بلند کیا۔ قرآن نے سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی جرات و بہادری' عظمت و رفعت اور صبر و تحمل کو متعدد مقامات پر بیان کیا ہے۔ یہ اللہ کے عظیم نبی اور رسول ہیں۔ خدا کے ساتھ ہمکلامی کا شرف بھی انہیں حاصل ہے۔ انہوں نے سفرِ ہجرت بھی اختیار کیا۔ ان کی ہجرتوں کا تفصیلی ذکر ہو چکا ہے لیکن بنی اسرائیل صدیوں کی غلامی کے بعد بزدلی کا شکار ہو چکے تھے۔ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے سے گھبراتے' دشمن سے ٹکر لینے کی جرأت ان میں پیدا نہ ہو سکی۔ اللہ تعالیٰ نے امت محمدیہ کو خبردار کرتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اٰذَوْا مُوْسٰى فَبَرَّاَهُ اللّٰهُ مِمَّا قَالُوْا ؕ وَ كَانَ عِنْدَ اللّٰهِ وَجِيْهًا ۝

(الاحزاب' ۳۳:۶۹)

اے ایمان والو! تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے موسیٰ علیہ السلام کو ستایا تھا۔ پھر اللہ نے ان کی تہمت سے انہیں بری ثابت کر دیا اور اللہ کے نزدیک وہ بڑے باوفا تھے۔

سیدنا موسیٰ علیہ السلام کا وصال

سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے لاکھوں مجبور و مقہور اسرائیلیوں کو جابر و مستبد حکمرانوں سے نجات دلائی اور صحرائے سینا میں اگلی نسلوں کی تربیت کر کے انہیں اس قابل بنایا کہ وہ یوشع بن نون علیہ السلام کی قیادت میں فلسطین کے ظالم حکمرانوں سے

حکومت چھین سکیں۔ بالآخر ایک سو بیس سال کی عمر میں آپ نے وفات پائی اور ایک بھرپور زندگی گزارنے کے بعد اپنے خالق حقیقی سے جاملے۔

يا أيها النبي جاهد الكفار والمنافقين واغلظ عليهم ومأواهم جهنم وبئس المصير

حصہ سوم

ہجرت کی مختلف تعبیرات

باب۔ا

اجتماعی شعور کا آئینہ

ہجرت مدینہ کی ثقافتی اور تاریخی اہمیت کا اندازہ اس امر سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں نے اپنے کیلنڈر ایئر کا آغاز ہی اس عظیم واقعہ سے کیا اس لئے کہ ہجرت مدینہ اجتماعی شعور کا ایک ایسا آئینہ ہے جس میں اسلامی ریاست کے قیام کے امکانات ہی روشن نظر نہیں آتے بلکہ ایک اجتماعی نظام بھی تشکیل پاتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ واقعہ ہجرت سے آزمائش کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا کیونکہ مہاجرین کو پناہ دینا پورے عالم عرب کی اجتماعی جارحیت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ تاہم یثرب کی فضا مکہ معظمہ کی نسبت تحریک اسلامی کے لئے سازگار ثابت ہوئی' حبشہ کے بعد یثرب کو دوسرا "دارالہجرت" قرار دے کر مسلمانوں کو ہجرت کا حکم دینا اور خود بھی داعی انقلاب اسلامی کا اپنے آبائی وطن کو خیرباد کہہ کر نفاذ اسلام کے لئے یثرب کو اپنا مسکن ٹھہرانا اسلامی تاریخ کا ایک تاریخ ساز واقعہ ہے۔ مقصدیت اور نتیجہ خیزی تحریک اسلامی کی قیادت کی نظروں سے کبھی بھی اوجھل نہیں رہی۔ پیغمبر انقلاب نے یثرب کی نفسیاتی فضا کا حقیقت پسندانہ تجزیہ کرتے ہوئے فوری طور پر ایسے اقدامات کئے جو شہر کی سماجی اور مجلسی زندگی میں بھی خوشگوار تبدیلیوں کا باعث بنے مثلاً اوس اور خزرج کی خانہ جنگی کے خاتمے سے اسلامی تحریک کے لئے ایک ایسا ماحول میسر آیا جو اسلامی حکومت کے قیام کا بنیادی پتھر ثابت ہوا۔ مہاجرین کی آمد سے قدرتی طور پر مدینہ منورہ کی آبادی پر دباؤ پڑا۔ وسائل جو نہ ہونے کے برابر تھے ایک حد تک ہی اس دباؤ کے متحمل ہو سکتے تھے۔ اقتصادی صورت حال مزید خراب ہو گئی۔ لیکن مدینے کی بیدار مغز قیادت نے جلد ہی حالات کی سنگینی پر قابو پا لیا اور آہستہ آہستہ قوت نافذہ حاصل کر کے اسلام کے عملی نفاذ کی راہ ہموار کر دی' ہجرت مدینہ کئی حوالوں سے اور کئی جہتوں سے روشنی کے سفر کا رخ متعین کرنے کا سبب بنی' تاریخ اسلام ہی نہیں تاریخ عالم نے بھی اس عظیم واقعہ کے اثرات قبول کئے اور اولاد آدم کو زندگی کو نئے زاویہ نگاہ سے دیکھنے کا شعور عطا ہوا۔

ہجرت کے فضائل اور اس کی اہمیت بذات خود ایک اہم اور کثیر الجہات موضوع ہے۔ اس کے مادی فضائل بھی مسلم ہیں اور اس کے روحانی' نفسیاتی' دینی اور ایمانی فضائل بھی بڑی اہمیت کے حامل ہیں' اس باب میں بھی ہجرت کے روحانی فضائل کو زیر بحث لایا جارہا ہے اس کے دیگر پہلوؤں سے بحث فلسفہ و حکمت کے باب میں کی جائے گی۔

ہجرت شرعی

ارباب علم و فن نے مختلف حوالوں اور جہتوں سے اپنے اپنے انداز میں ہجرت کے مفہوم کو واضح کرنے کی سعی کی ہے مثلاً یہ کہ ایک جگہ کو چھوڑ کر دوسری جگہ پر جاکر آباد ہو جانے کو ہجرت کہتے ہیں لیکن شرعی اعتبار سے محض نقل مکانی ہی کو ہجرت نہیں کہتے بلکہ اس کے ساتھ مزید شرائط بھی ہیں اور ان شرائط پر پورا اترنے کے بعد ہی ہجرت محض شرعی ہجرت بنتی ہے۔ گذشتہ صفحات پر ہجرت کی مختلف تعریفات سے بحث کی گئی ہے' ہجرت کی ایک تعریف یہ بھی تھی کہ ہجرت محض نقل مکانی نہیں بلکہ ایک غیر اسلامی ملک کو چھوڑ کر اسلامی ملک میں آنے کو ہجرت شرعی کہتے ہیں۔ اسی طرح مہاجر کے مفہوم کو اس طرح متعین کیا گیا ہے کہ مہاجر اس شخص کو کہتے ہیں جو نبی اکرم ﷺ کی صحبت و سنگت میں' آپ کی معیت میں ہجرت کرے اسی طرح ایک تعریف یہ بھی زیر بحث آئی ہے کہ مہاجر وہ ہے جو آقائے دوجہاں کی بارگاہ اقدس کی طرف نقل مکانی کرے' ان تعریفات کی روشنی میں ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ پہلی تعریف کے مطابق ہجرت حضور علیہ السلام کی ہمراہی میں کی جانے والی نقل مکانی کو کہتے ہیں اور دوسری تعریف کے مطابق ہجرت اس نقل مکانی کو کہتے ہیں جس میں کوئی شخص اپنا گھربار چھوڑ کر حضور نبی اکرم ﷺ کی طرف ہجرت کرے بالفاظ دیگر حضور ﷺ کی طرف نقل مکانی کی جائے۔

حضور ﷺ کی طرف ہجرت کرنے کا مفہوم

آج کا انسان اپنے مفادات کا قیدی ہے۔ اس کے افکار مصلحتوں کی زنجیر سے بندھے ہوئے ہیں۔ خدا پرستی کی جگہ مادہ پرستی نے لے لی ہے یہی وجہ ہے کہ انسانی معاشرہ حیوانیت کی سطح پر آ کھڑا ہوا ہے۔ شکوک و شبہات سے اصل حقائق کا چہرہ مسخ کر دیا جاتا ہے حتیٰ کہ مسلمہ انسانی رویوں کی تعبیر بھی اپنے مخصوص مفادات کے حوالے سے کی جاتی ہے۔ دین کے اصل تصورات پر بھی الا ماشاء اللہ جہالت کا پردہ ڈال دیا گیا ہے۔ تشکیک اور ابہام کی اس فضا میں ضروری ہے کہ حضور ﷺ کی طرف ہجرت کے شرعی مفہوم کو اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ بیان کر دیا جائے تاکہ ہر چیز واضح اور روشن ہو جائے مثلاً یہ سمجھ لیا جائے کہ حضور ﷺ کی ظاہری و باطنی قربت و سنگت کے لئے کی جانے والی نقل مکانی کو حضور ﷺ کی طرف ہجرت کرنا کہا جاتا ہے۔ حضور ﷺ کی طرف ہجرت کرنے کی دو تعبیرات ہیں۔ (۱) روحانی تعبیر (۲) مادی تعبیر

ہجرت الی الرسول ﷺ کی روحانی تعبیر

جس طرح ہجرت الی الرسول ﷺ کی دو تعبیرات (روحانی اور مادی) ہیں اسی طرح ہجرت الی الرسول ﷺ کی روحانی تعبیر کی بھی دو جہتیں ہیں۔

پہلی جہت

ہجرت الی الرسول ﷺ کی روحانی تعبیر کی پہلی جہت یہ ہے کہ انسان ان تمام اعمال فاسدہ کو کلیتاً ترک کر دے جو فیضان نبوت کے حصول میں حارج ہوں یا رکاوٹ پیدا کریں۔ اطاعت رسول ﷺ کو اپنا شعار بنائے اور حضور ﷺ کے افعال و اقوال سے روشنی کشید کرے۔ آقائے دو جہاں ﷺ کے آثار حیات سے رہنمائی حاصل کرے اور اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ ارشادات نبوی ﷺ کے مطابق بسر کرے اور قولاً و فعلاً شریعت محمدی کی پابندی کرے اور ان تمام افعال کی طرف رجوع کرے جو فیضان نبوت ﷺ کے حصول میں حارج یا رکاوٹ نہ ہوں بلکہ وہ فیضان نبوت ﷺ کے حصول میں ممد و معاون ہوں۔ حضور ﷺ کے روحانی فیض کی طرف

لوٹنا اور اپنا دامن صد چاک حضور ﷺ کے فیوض و برکات سے بھرنے کو ہجرت الی الرسول ﷺ کہتے ہیں۔

دوسری جہت

ہجرت الی الرسول کی روحانی تعبیر کی دوسری جہت یہ ہے کہ انسان صالح اعمال کی طرف رجوع کرے۔ ان اعمال صالحہ کی طرف جو فیضان نبوت کے حصول میں اس کے ممد و معاون ثابت ہوں اور اگر کافرانہ ماحول کی وجہ سے ان اعمال صالحہ کی ادائیگی میں کوئی رکاوٹ حائل ہوتی ہو اور ان رکاوٹوں کو دور کرنا وہ اپنے لئے مشکل محسوس کرے تو اس خطہ جبر کو خیرباد کہہ کر ایک ایسے ماحول کی طرف نقل مکانی کر جائے جہاں احکام خداوندی بجالانے میں اسے آسانی ہو اور صالح اعمال کی بجا آوری میں کوئی امر مانع نہ ہوتا ہو' ظاہری اعتبار سے ایسی نقل مکانی بھی اگرچہ مادی ہجرت ہوگی مگر اصلاً چونکہ یہ ہجرت فیضان نبوت کے حصول کے لئے کی گئی ہوگی اس لئے اس ہجرت کو بھی ہجرت الی الرسول کی روحانی تعبیر ہی سے تعبیر کیا جائے گا۔

ہجرت الی الرسول ﷺ کی مادی تعبیر

ہجرت الی الرسول کی مادی تعبیر یہ ہے کہ انسان دارالحرب کو چھوڑ کر دارالسلام میں پناہ لے لے اور سیاسی اعتبار سے بھی خلیفہ الرسول کی حفاظت میں آ جائے۔ (یاد رہے کہ ہم اس وقت شرعی ہجرت کی بات کر رہے ہیں لہٰذا ہم اپنی گفتگو کو مسلمانوں کی ہجرت تک ہی محدود رکھیں گے) ہجرت الی الرسول ﷺ کی مادی تعبیر پر مزید گفتگو سے پہلے ضروری ہے کہ اس امر کی تمام جہتوں کی وضاحت کی جائے کہ اسلام کا تصور خلافت کیا ہے اور اس کی عملی تعبیر کیا ہے۔

اسلام کے تصور خلافت کا سیاسی پہلو

اسلام کا تصور خلافت بھرپور اور توانا اسلامی روایات کا آئینہ دار ہے۔

خلافت کی بنیادیں خوف خدا اور عدل کے عملی نفاذ پر استوار کی گئی ہیں۔ ہر لمحہ جوابدہی کا احساس ایک فلاحی ریاست کے خدوخال کو اجاگر کرتا ہے۔ اسلام میں تصور خلافت و بیعت کا جہاں ایک روحانی پہلو ہے وہاں خلافت و بیعت کا ایک سیاسی پہلو بھی ہے اور اس وقت اسلام کے تصور حکومت کا یہی سیاسی پہلو زیر بحث ہے۔

اللہ کا خلیفہ

دنیاوی بادشاہوں' سلطانوں اور نوابوں کے لئے ظل الٰہی کی ترکیب تخلیق کی گئی۔ اہل ہوس نے خوشامد پسند ذہنوں کو مطمئن کر کے اپنے وقتی عیش و نشاط کا اہتمام تو کر لیا لیکن امت مسلمہ میں یہ غلط عقیدہ بھی راسخ ہوتا چلا گیا کہ شاہان وقت زمین پر اللہ کے خلیفہ ہیں حالانکہ حقیقت قطعاً اس کے برعکس ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ اللہ کا خلیفہ (براہ راست) کوئی سربراہ مملکت بادشاہ یا سلطان (Head of the State) نہیں ہو سکتا۔ اللہ رب العزت نے حضرت آدم علیہ السلام کو زمین پر اپنا خلیفہ بنا کر بھیجا اس اعزاز کے حقدار بھی تاجدار کائنات ﷺ ہیں جو محبوب خدا بھی ہیں اور مقصود کائنات بھی' وہ براہ راست اللہ کے خلیفہ ہیں اس لئے ان کے ہاتھ پر بیعت حکماً اللہ سے ہی بیعت متصور ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول آخر ﷺ کی اطاعت و فرمانبرداری غیر مشروط ہے اور حضور ﷺ کی اطاعت و وفاداری اللہ کی اطاعت و وفاداری ہی متصور ہوتی ہے۔ ارشاد خداوندی ہے۔

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ — جس نے رسول ﷺ کا حکم مانا' بے شک اس نے اللہ (ہی) کا حکم مانا۔
(النساء' ۴:۸۰)

وحدت حکمیہ کیا ہے' یہ اصطلاح کن معنوں میں استعمال ہوتی ہے اس کا اطلاق کس کس مقام پر ہوتا ہے۔ اس وقت یہ ہمارا موضوع نہیں ورنہ یہ موضوع تو ایک الگ مضمون کا متقاضی ہے' ارشاد باری تعالٰی ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ — بے شک وہ لوگ جو (اے حبیب ﷺ)

اللّٰہِ یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ
(الفتح ۴۸:۱۰)

آپ کے دست حق پرست پر بیعت کرتے ہیں وہ تو صرف اور صرف اللہ ہی سے بیعت کرتے ہیں ان کے ہاتھ پر اللہ کا ہاتھ (دست قدرت ونصرت) ہے۔

امت مسلمہ کو پوری دنیا میں اقامت دین کا فریضہ سرانجام دینا ہے۔ عالمی سطح پر ایک انقلابی تحریک بپا کر کے مطلوبہ اہداف حاصل کرنا ہیں تاکہ اسلام کو تمام ادیان عالم پر غلبہ حاصل ہو سکے اور اسلام کی آفاقی تعلیمات کی بدولت امن عالم کی راہ ہموار کی جا سکے۔ اس لئے دین کے عملی نفاذ کو اولیت دی گئی ہے تاکہ انسان کے ظاہری وباطنی احوال کی اصلاح کا بھی اہتمام ہو سکے' امت کے جان ومال کی حفاظت اصلاً اللہ کے رسول کی ذمہ داری ہے (یعنی مخلوقات میں سے اصلاً رسول اللہ کی نہ کہ مطلقاً کیونکہ مطلقاً ذمہ داری خود اللہ رب العزت کی ہے) ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

۱۔ وَیَکُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَیْکُمْ شَھِیْدًا
(البقرہ ۲:۱۴۳)

اور رسول تم پر نگہبان اور گواہ ہیں۔

۲۔ سَیُؤْتِیْنَا اللّٰہُ مِنْ فَضْلِہٖ وَرَسُوْلُہٗ
(التوبہ ۹:۵۹)

عنقریب ہمیں اللہ اپنے فضل سے اور اس کا رسول (مزید) عطا فرمائے گا۔

۳۔ اَنْ اَغْنَاھُمُ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ
(التوبہ ۹:۷۴)

انہیں اللہ اور اس کے رسول نے غنی کر دیا۔

۴۔ بَرَاءَۃٌ مِّنَ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ
(التوبہ ۹:۱)

اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے براءۃ کا اعلان کیا ہے (کہ وہ ذمہ دار نہیں کفار ومشرکین کے)

۵۔ اَذَانٌ مِّنَ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ
(التوبہ ۹:۳)

اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلان ہے۔

۶۔ اِنَّ اللّٰہَ بَرِیٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِیْنَ وَ رَسُوْلُہٗ (التوبہ ۹: ۳)

بے شک اللہ اور اس کا رسول ﷺ مشرکین سے بری ہیں (یعنی ان کی حفظ جان و مال کے ذمہ دار نہیں)

درج بالا آیات قرآنی کی روشنی میں ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اللہ رب العزت (اصالتاً) اور اللہ کے رسول (نیابتاً و خلافتاً) اپنی رعایا کے جان و مال کے نگہبان اور محافظ ہیں' اللہ اور اللہ کے رسول عہد توڑنے والے افراد سے برات والے ہیں' ارشاد خداوندی ہے۔

هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْهُدٰی وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّہٖ (التوبہ ۹: ۳۳)

وہی (اللہ) ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اس (رسول ﷺ) کو ہر دین (والے) پر غالب کر دے۔

یہاں یہ امر قابل غور ہے کہ **لیظهر** کا فاعل اللہ بھی ہو سکتا ہے (وہ ابعد ہے) اور اس کا فاعل رسول بھی ہو سکتے ہیں (اور وہ اقرب ہے) حکماً دونوں کے لئے بھی ایک ضمیر استعمال ہو سکتی ہے قرآن مجید میں کئی مقامات پر اس کی مثالیں ملتی ہیں خلاصہ بحث یہ ہوا کہ

(ا) قانون فطرت ہے کہ آفتاب کی روشنی میں چراغ کی روشنی اپنے ظاہری وجود کے باوجود بے وقعت ہو جاتی ہے' جب دین حق آگیا تو ادیان باطلہ کے وجود کو برقرار رکھنے کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا' اللہ نے اپنا رسول بھیجا تاکہ وہ اللہ کے دین کو تمام ادیان پر غالب کر دیں اس صورت میں فاعل صرف اللہ ہو گا اور اس کے فعل کا مظہر یا ذریعہ اظہار رسول اکرم ﷺ ہوں گے یعنی آقا علیہ الصلوۃ والسلام کی فنائیت کا اس درجے کا بیان ہے جس میں فاعل کو اپنا وجود بھی دکھائی نہیں دیتا کجا یہ کہ فعل کا صدور خود سے ہونا اس کی مثال میں یہ حدیث پاک پیش کی جا سکتی ہے۔

الحق ینطق علی لسان عمر اللہ تعالیٰ عمر کی زبان پر کلام فرماتا ہے۔

واضح رہے کہ اس حدیث پاک میں فاعل اللہ تعالٰی کی ذات ہے' ارادہ بھی اللہ تعالٰی ہی فرماتے ہیں لیکن اس کا اظہار لسان عمر پر ہو رہا ہے۔ گویا نسبت فعل مجازاً بھی ادھر نہیں ہو رہی۔

۲۔ اللہ رب العزت نے اپنے پیارے رسول حضرت محمد ﷺ کو دین حق کے ساتھ مبعوث فرمایا تاکہ رسول عظیم ﷺ دین بر حق کو تمام ادیان باطلہ پر غالب فرمادیں دوسرے لفظوں میں اقامت دین کا فریضہ سرانجام دیں خواہ اقامت دین کا راستہ طائف کی وادیوں سے ہی ہو کر کیوں نہ گزرتا ہو۔ اس صورت میں بھی حقیقی فاعل اللہ ہی ہے مگر چونکہ ارادہ جناب رسالت مآب ﷺ کا بھی ہے اس لئے نسبت فعل مجازاً حضور رحمت عالم کی طرف کی گئی ہے۔ پہلی صورت میں ارادے سے ہی فنائیت تھی۔ جبکہ اس صورت میں ارادے کی ارادہ الٰہی میں فنائیت ہے' وہ فنائیت ذات پاک مصطفےٰ ﷺ کی اپنے ارادے سے تھی یہ فنائیت ارادہ مصطفےٰ ﷺ کی ارادہ الوہیت میں ہے' معنی دونوں کا ایک ہی ہے کہ جو اللہ کی رضا و مشیئت وہی رسول خدا ﷺ کا ارادہ اور جو اللہ کا ارادہ وہ رسول کریم ﷺ کا عمل' اگر کوئی فرق ہے تو فعل میں اصالتاً اور نیابتاً کا ہے جبکہ نسبت فعل میں فرق حقیقتاً اور مجازاً کا ہے' حاصل بحث یہ کہ دونوں معنوں کا حاصل یہ نکلا کہ حضور رحمت عالم ﷺ کو براہ راست اللہ کے نائب ہونے کی حیثیت حاصل ہے اور وہی خلیفہ اللہ ہیں' اللہ کی نیابت کا تاج انہی کے سر اقدس پر سجتا ہے۔

۳۔ تیسرے معنی کی رو سے اظہار دین کے اصل فعل کو تو ایک ہی فعل قرار دیا جائے گا' جس میں فعل حقیقتاً اللہ کا اور حکماً رسول اللہ ﷺ کا ہوتا ہے' دوسرے لفظوں میں صورتاً اللہ اور رسول کے دو الگ فعل قرار پائیں گے لیکن معنوں کے لحاظ سے وہ فعل ایک ہی ہو گا۔ چنانچہ اس بنا پر دو فاعلوں کے ہوتے ہوئے بھی ضمیر واحد کو لوٹایا جا رہا ہے' اس سے یہ مفہوم مراد ہو گا کہ خواہ اظہار دین کا عمل اللہ رب العزت یا اس کے رسول معظم ﷺ کریں دونوں کا فعل حکماً ایک ہی قرار پائے گا اور اللہ اور اس کے

رسول ﷺ کی اطاعت' محبت' رضا اور نسبت وغیرہ حکماً ایک ہی گردانی جائے گی' مثالوں سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ نگہبانی' عطا' فضل و احسان' برات اور اذان وغیرہ کو حکماً ایک ہی گردانا گیا ہے۔

اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ کا براہ راست خلیفہ ہونے کا اعزاز حضور ختمی مرتبت ﷺ کو حاصل ہے یہی وجہ تھی کہ یار غار سیدنا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جب منصب خلافت سنبھالا اور انہیں خلیفہ اللہ کہا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ

لست خلیفۃ اللّٰہ و لکنی خلیفۃ رسول اللّٰہ ﷺ میں اللہ کا خلیفہ نہیں بلکہ اللہ کے رسول ﷺ کا خلیفہ ہوں۔ (مقدمہ ابن خلدون: ۱۲۴)

عہد رسالت مآب ﷺ میں خود حضور ﷺ کا بھی یہ عمل رہا اور پھر خلفائے راشدین بھی جب کبھی کسی سے کوئی معاہدہ طے کرتے تو اسی پر عمل کرتے۔

انتم.....فی ذمۃ اللّٰہ و رسولہ (کہ تم ..) اللہ اور اس کے رسول (دونوں) کی حفاظت میں ہو۔

یا پھر یہ کہ

و لکم ذمۃ اللّٰہ و رسولہ تمہارے لئے اللہ اور اس کے رسول کی حفاظت و ضمانت ہے۔

زیر بحث الفاظ اور دیگر الفاظ اس مفہوم کو کھول کھول کر بیان کر رہے ہیں کہ سربراہ مملکت' کوئی بادشاہ یا سلطان براہ راست اللہ کا خلیفہ نہیں ہوتا بلکہ وہ براہ راست حضور ختمی مرتبت کا خلیفہ ہوتا ہے وہ اللہ کا خلیفہ بواسطہ رسالت و نبوت ہے۔ اگر یہ واسطہ یا رابطہ درمیان میں نہ ہو اور براہ راست اللہ کے خلیفہ ہونے کا دعوی سلاطین زمانہ کی طرف سے کیا جائے تو وہ دعوی باطل ہو گا جھوٹ ہو گا خلاف عقل ہو گا اور منشائے ایزدی کے خلاف ہو گا۔ ابن خلدون اپنی شہرہ آفاق تاریخ کی پہلی جلد میں رقمطراز ہیں۔

و اذ قد بینا حقیقۃ ھذا المنصب و انہ اور (چونکہ) ہم اس منصب کی حقیقت

نیابۃ عن صاحب الشریعۃ فی حفظ الدین و سیاسۃ الدنیا تسمی خلافۃ و امامۃ و القائم بہ خلیفۃ و اماما فاما تسمیتہ اماما فتشبیھا بامام الصلوۃ فی اتباعہ و الاقتداء بہ و لھذا یقال الامامۃ الکبری و اما تسمیتہ خلیفۃ فلکونہ یخلف النبی فی امتہ فیقال خلیفۃ باطلا و خلیفۃ رسول اللہ

(مقدمہ ابن خلدون : فصل فی اختلاف الامہ' :۱۰۹)

بیان کر چکے ہیں اور یہ کہ یہ منصب حفظ دین اور سیاست دنیا میں صاحب شریعت ﷺ کی نیابت ہے (اسی لئے) اس کا نام خلافت اور امامت اور اس کو قائم کرنے والے کا نام خلیفہ اور امام رکھا جاتا ہے اس کا نام امام رکھنا تو نماز میں امام کی اتباع واقتداء اور اس سے تشبیہ کی بنا پر ہے۔ اسی بنا پر اسے امامت کبریٰ کہا جاتا ہے' رہا اس کا نام خلیفہ رکھنا تو وہ نبی علیہ السلام کی امت میں آقا علیہ السلام کا نائب ہونے کی وجہ سے ہے۔ لہٰذا اسے مطلقاً صرف خلیفہ یا رسول خدا ﷺ کا خلیفہ کہا جائے گا۔

آگے چل کر انہوں نے سرابرہ مملکت کو خلیفہ اللہ کہنے کے بارے میں جمہور کے نقطہ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے۔

وقدنھی ابوبکر عنہ لما دعی بہ وقال لست خلیفۃ اللّٰہ ولکنی خلیفۃ رسول اللہ ﷺ

(مقدمہ ابن خلدون' ۱۳۴)

اور سیدنا ابوبکر صدیقؓ نے بھی جب انہیں خلیفہ اللہ کہہ کر پکارا گیا' اس سے روک دیا تھا اور کہا تھا کہ میں اللہ کے رسول ﷺ کا خلیفہ ہوں۔

خلیفہ اول سیدنا حضرت ابوبکر صدیقؓ کا قول نقل کرنے کے بعد انہوں نے اس موقف کی تائید میں ایک عقلی دلیل بھی پیش کی ہے کہ استخلاف حاضر سے نہیں ہوتا بلکہ استخلاف غائب ہی سے ممکن ہے' لکھتے ہیں۔

ولان الاستخلاف انما هو فی حق الغائب واما الحاضر فلا
(مقدمہ ابن خلدون' ۱۳۴)

(اور خلیفہ اللہ کہنا) اس وجہ سے بھی (منع ہے) کہ استخلاف (نائب ہونا) ایسے شخص کے حق میں ہوتا ہے جو موجود نہ ہو یعنی غائب ہو' رہا موجود شخص تو پھر (اس کے حق میں استخلاف) نہیں (ہوا کرتا کیونکہ وہ تو خود موجود ہے اس کی جگہ کون لے گا)

اس بحث کی روشنی میں ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ انسان اللہ کا خلیفہ بواسطہ رسول ﷺ ہے۔ حقیقت میں وہ خلیفہ الرسول (ﷺ) ہے اب یہ مسئلہ مزید واضح ہو گیا کہ اسلامی حکومت اور خلیفہ یا امیرالمومنین کی پناہ میں آنا دراصل اصالۃً اللہ' نیابتاً رسول ﷺ اور پھر اس کی اتباع میں ظاہراً اسلامی حکومت کی پناہ میں آنا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ اسلامی علاقے کی طرف ہجرت کر جانا اصل میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف ہجرت کرنا ہے اور یہی ہجرت الی الرسول ﷺ کی مادی وظاہری تعبیر ہے۔

ہجرت کس کی طرف؟

اب یہ مسئلہ روز روشن کی طرح واضح ہو گیا ہے کہ وہ ہجرت شرعاً ہجرت کہلائے گی جو اس کی یہ بنیادی شرط پورا کرے کہ وہ نقل مکانی ظاہری اور باطنی' مادی اور روحانی ہر اعتبار سے اصلاً الی اللہ اور نیابتاً الی الرسول ﷺ ہو' ہجرت کا مقصد وحید ایمان کی ترقی اور روحانی کمال کا حصول ہوتا ہے' ہجرت اگر یہ بنیادی شرط پوری نہیں کرتی تو اسے نقل مکانی تو کہا جائے گا لیکن اسے کسی صورت میں بھی شرعی ہجرت نہیں کہا جا سکتا وہ اخلاقی اور روحانی کمال خواہ اپنی کوتاہی سے بچنے کے لئے کافرانہ ماحول سے نقل مکانی کر کے مومنانہ ماحول میں آنے کی صورت میں ہو جیسا کہ عامۃ الناس کا

معاملہ ہوتا ہے یا یہ ایمان کی ترقی اور دعوت حق کی خاطر اپنے شہر کو چھوڑ کر کافروں کے ماحول میں قیام کرنے کی صورت میں ہو جیساکہ اولیائے کاملین کا تبلیغ دین اور اشاعت اسلام کے عظیم مقاصد کے لئے کافرانہ ماحول میں رہائش اختیار کرنا اور کفر کے ظلمت کدوں میں ایمان کی روشنی تقسیم کرنے کا منصب سنبھالنا ہے۔ شرعی ہجرت کہلائے گی۔ تاریخ اسلام گواہ ہے کہ اکناف عالم میں اسلام صحابہ کرام کی مساعی جمیلہ سے متعارف ہوا۔ اولیاء کرام اور صوفیائے کرام نے صحابہ کی اس عظیم روایت کو زندہ رکھا اور چار دانگ عالم میں اسلام کی حقانیت کا پرچم لے کر نکل کھڑے ہوئے۔ برصغیر پاک وہند میں بھی اسلام انہی صوفیا اور اولیاء کی تبلیغ سے پھیلا ان کے کردار کی خوشبو ذہنوں پر دستک دینے لگی اور ذات پات میں جکڑے ہوئے معاشرے میں عوام دیوانہ وار اسلام کی سرمدی روشنی کی طرف لپکے اور دیکھتے ہی دیکھتے برصغیر پاک وہند کے دور دراز علاقوں مین اسلام کی عظمت وشوکت کا پرچم لہرانے لگا۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ جب محمد بن قاسم نے ایک بہن کی پکار پر ہندوستان کی سرزمین پر پہلا قدم رکھا اور راجہ داہر کو عبرتناک شکست دی تو اسلام کی روشنی اسلامی عساکر کی آمد سے قبل ہی کفرستان ہند میں پہنچ چکی تھی۔ حضرت خواجہ اجمیر ؒ کا اجمیر شریف آنا اور داتائے ہجویر ؒ کا لاہور آنا اسی سلسلہ کی مختلف کڑیاں ہیں۔

ہجرت کی شرعی تعریف

اللہ کے دین کی سربلندی کے لئے کی جانے والی نقل مکانی کے مختلف پہلوؤں پر تبصرہ کرنے کے بعد ہجرت شرعیہ کی تعریف ان الفاظ میں کی جاسکتی ہے۔

ہجرت شرعیہ اس نقل مکانی کو کہتے ہیں جس میں ایمان کی ترقی اور روحانی کمال پیش نظر ہو جو خالصتاً اللہ کے دین کی سربلندی کے لئے ہو خواہ یہ ہجرت کافرانہ ماحول سے مسلم معاشرے کی طرف ہو یا مسلم معاشرے سے کافرانہ ماحول کی طرف ہو' یہ نقل مکانی اگر اللہ اور اس کے رسول کی رضا کے حصول کے لئے ہو تو یہ ہجرت شرعی

ہجرت کہلائے گی۔

ہجرت شریعت اسلامیہ کے بنیادی تصورات کا لازمی اور مستقل حصہ

اسلام ایک آفاقی دین ہے یہ اس کرہ ارضی کا ہی نہیں پوری کائنات کے لئے مینارہ نور ہے۔ اس کی تعلیمات زمان ومکان کی حدود سے ماورا ہیں' یہ کسی قسم کی علاقائی اور جغرافیائی حد بندیوں کا نہ تو قائل ہے اور نہ انہیں تسلیم ہی کرتا ہے۔ اسلام رنگ ونسل کے بتوں کی پرستش کو بھی باطل قرار دیتا ہے اور یوں ایک وسیع تر انسانی معاشرے کی تشکیل کے لئے راہ ہموار کرتا ہے اسلام پوری کائنات کے لئے ایک انقلاب آفریں پیغام ہے۔ بعثت نبوی سے قبل آسمانی ادیان بھی بعض علاقوں اور بعض قوموں تک محدود تھے لیکن اسلام نے ان تمام علاقائی حد بندیوں کو ختم کر دیا۔ ہجرت مدینہ اور ہجرت حبشہ نے قومیت کے محدود تصورات کو ہی یکسر بدل کر رکھ دیا۔ بقول اقبالؒ

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی ﷺ

کسی فرد یا افراد کے کسی گروہ کے مفادات کے تحفظ کے لئے بنائے گئے قوموں کی تشکیل وتعمیر کے تمام اصولوں اور ضابطوں کی نفی کر کے اسلام نے تہذیب وتمدن کے سفر ارتقاء میں قوم رسول ہاشمی کو تمام مصنوعی جکڑ بندیوں سے آزاد کر دیا اور اسے کھلی اور کشادہ فضا میں سانس لینے کا ہنر سکھایا' ہجرت اس ذہنی اور فکری کشادگی کا استعارہ ہے ہجرت شریعت مطہرہ کے انتہائی بنیادی تصورات کا مستقل اور لازمی حصہ ہے فلسفہ ہجرت کی تمام جہتوں کا مطالعہ کئے بغیر اور اس میں کارفرما حکمتوں کو سمجھے بغیر ہم عالمگیر سطح پر اس عظیم الشان انقلاب کی حقیقی روح کو نہیں پا سکتے جس نے ہر شعبہ زندگی میں انسانوں کی رہنمائی کی اور قیامت تک کے لئے ایک ایسا ضابطہ حیات نسل انسانی کو دیا جو ہر روشنی کا منبع اور ہر خیر کا مرکز ہے جو انسان کی فکری بالیدگی کی تکمیل کرتا ہے

اور ہر مرتبے پر شرف انسانی کی حفاظت کرتا ہے اور انسانی ذہن میں عظمت کردار کی وہ پرتیں کھولتا ہے کہ وہ مسجود ملائکہ بھی ٹھہرتا ہے اور اشرف المخلوقات ہونے کا سزاوار بھی قرار پاتا ہے۔

بزم انبیاء میں آقائے دوجہاں ﷺ کا منفرد مقام

حضور ختمی مرتبت ﷺ کو کل جہانوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا گیا' عرب کے چاند (ﷺ) کی اقلیم رسالت نہ کسی جغرافیائی سرحدوں کی پابند ہے اور نہ کسی مخصوص گروہ یا مخصوص زمانے کے لئے ہے۔ بزم انبیاء میں آقائے دوجہاں ﷺ کو یہ منفرد مقام حاصل ہے۔ دیگر انبیاء تاریخ کے مختلف ادوار میں مختلف علاقوں اور مخصوص قوموں میں آتے رہے اس بنا پر ان کے تصور قومیت میں علاقائیت وغیرہ کے عناصر کو خصوصی اہمیت حاصل تھی' ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَإِلَىٰ عَادٍ أَخَاهُمْ هُوْدًا (الاعراف' ۷: ۶۵)	اور (ہم نے) قوم عاد کی طرف ان کے (دینی) بھائی ھود کو (بھیجا)
وَإِلَىٰ مَدْيَنَ أَخَاهُمْ شُعَيْبًا (الاعراف' ۷: ۸۵)	اور (ہم نے اہل) مدین کی طرف ان کے (دینی) بھائی شعیب کو (بھیجا)

گویا نبی آخرالزماں ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے مبعوث ہونے والے انبیاء کرام کی دعوت کا کام بھی مخصوص اقوام اور مخصوص زمانے تک محدود رہتا تھا۔ یہ سارا دعوتی اور تربیتی نظام علاقائی بنیادوں پر مرتب کیا جاتا۔ اصلاح کے کام کے لئے مخصوص اقوام کو منتخب کیا جاتا۔ ہمہ گیریت اور عالمگیریت کے پہلو کو بوجوہ نمایاں نہ کیا جاتا' آسمانی ہدایت کو بتدریج فروغ دیا جارہا تھا یہی منشائے ایزدی اور فطرت انسانی کے مطابق تھا۔ اس مسلسل تربیتی عمل کے بعد کاروان حیات ذہنی اور فکری ارتقاء کی منازل طے کرتا ہوا اب ایک ایسے مقام پر آپہنچا تھا جہاں وہ ایک ہمہ گیر اور عالمگیر سطح پر بپا ہونے والی انقلابی تبدیلیوں کو عملاً اور ذہناً قبول کرنے کے لئے تیار تھا۔ اب نبی آخر

الزماں ﷺ مبعوث ہوئے تو فطرت کے پرانے اصول بدل گئے' حدود زمانہ بھی اٹھالی گئیں، اور حدود مکان بھی توڑ دی گئیں اور ابد تک کے لئے انسان کی رہنمائی کا اہتمام کر دیا گیا۔ قرآن مجید میں ارشاد خداوندی ہے۔

وَمَا اَرْسَلْنَاکَ اِلَّا کَافَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَنَذِیْرًا (سبا' ۳۴:۲۸)

ہم نے تمہیں بھیجا مگر جمیع انسانوں کی طرف بطور بشیر ونذیر (خوشخبری دینے والا اور ڈر سنانے والا بنا کر)

آقائے دوجہاں ﷺ ' رسول ازلی ہیں' جمیع انسانوں کے لئے ہدایت کا آسمانی پیغام لے کر مبعوث ہوئے خود حضور ﷺ کا ارشاد گرامی ہے۔

ارسلت الی الخلق کافۃ (صحیح المسلم)

میں تمام کائنات ہست وبود کی طرف بھیجا گیا ہوں۔

چونکہ حضور ﷺ کا لایا ہوا آفاقی نظام زمان ومکان کی حدود سے ماوراء ہے اس لئے حضور ﷺ کی امت پر بھی لازم ہوا کہ وہ کرہ ارضی کے ہر خطے' ہر قوم اور ہر ملک میں یہ پیغام پہنچائے' فروغ دین کے لئے اپنے عہد کے تقاضوں کے مطابق سرگرم عمل ہو' دعوت کا یہ کام ہجرت کے بغیر ممکن نہیں' تاجدار کائنات ﷺ نے فرمایا۔

جعلت لی الارض مسجدا وطهورا (صحیح البخاری' ۱: ۶۲)

ساری زمین میرے لئے سجدہ گاہ اور پاکیزہ بنادی گئی ہے۔

مسلمانوں نے اپنے آقا ﷺ کے اس فرمان کے مطابق پوری دنیا میں دعوت کے کام کو پھیلا دیا مسلمان شرق سے غرب تک زمین پر پھیل گئے اور دنیا کا گوشہ گوشہ اسلام کی روشنی سے منور ہونے لگا۔ انفرادی اور اجتماعی سطح پر فلسفہ ہجرت ہر دور اور ہر عہد میں مسلمانوں کی سیاسی' اقتصادی اور ثقافتی زندگی میں امکانات کے نئے نئے دروازے کھولتا رہا ہے۔ آج بھی اسلامی تحریکوں کا دائرہ کار اسلامی ممالک تک ہی محدود نہیں بلکہ وہ یورپ کے کلیساؤں میں بھی اذانیں دینے کا فریضہ سرانجام دے رہی

ہیں۔ احیائے اسلام کا کام عالمی سطح پر ہو رہا ہے۔ جدید اسالیب کو اپناتے ہوئے غیر مسلم معاشروں میں فروغ دین اور ترویج اسلام کے کام میں مثبت پیش رفت ہوئی ہے۔ عظمت رفتہ کی بازیابی کا خواب شرمندہ تعبیر ہونے کے آثار پیدا ہو رہے ہیں' مغرب کا بے سکون معاشرہ اب اس نتیجہ پر پہنچ چکا ہے کہ اگر دنیا کو امن' سلامتی اور عافیت کی تلاش ہے تو اسے اپنے قبلے کا رخ مسلمانوں کے قبلے کی طرف موڑ کر دہلیز مصطفیٰ ﷺ پر جھک جانا ہو گا یہ شعور پختہ ہوتا جا رہا ہے۔ حضور ﷺ سے غلامی کا رشتہ استوار کر کے دنیا کے بے سکون معاشروں کو ایک ایسے دائمی امن سے ہمکنار کیا جا سکتا ہے

جو انسانی ذہن کے افق پر آسودہ لمحوں کی بشارت لے کر طلوع ہو گا اور ہر سطح پر روشنی اور خیر کا ضامن ہو گا۔ امت مسلمہ پر یہ ذمہ داری بھی عائد ہوتی کہ وہ صرف اسلام کا پیغام پہنچانے پر ہی اکتفانہ کریں بلکہ جہاں جائیں وہاں اپنے کردار کی خوشبو بھی لے کر جائیں' اسلامی تعلیمات کا عملی نمونہ بن کر دکھائیں' دعوت کے ساتھ تربیت کا فریضہ بھی سرانجام دیں' امت مسلمہ کو ہجرت کا حکم ہوا اور **ارض اللّٰہ واسعۃ** کا درس دیا گیا۔ ارشاد ہوتا ہے۔

اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا کیا اللہ کی زمین وسیع نہیں تھی تاکہ تم اس میں ہجرت کر سکو۔ (النساء' ۴:۹۸)

ہم دیکھتے ہیں کہ اشاعت اسلام میں ہجرت کا اپنا ایک کردار ہے۔ اس ٹھوس اور مثبت کردار کے بغیر فروغ دین کا کام عالمی سطح پر ممکن ہی نہیں' آج سے چودہ سو سال پہلے جب ذرائع نقل و حمل محدود تھے اور ذرائع ابلاغ نہ ہونے کے برابر تھے اس وقت بھی مسلمانوں نے حیرت انگیز طور پر دعوت کا کام انفرادی اور اجتماعی دونوں سطحوں پر سرانجام دیا۔ انہوں نے اپنی جدوجہد کی نتیجہ خیزی کی ضمانت عملاً حاصل کی کہ آج دنیا کے کسی گوشے میں چلے جائیں اسلامی تہذیب و تمدن کے آثار ضرور دکھائی دیں گے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم خود اپنی تہذیب و ثقافت کے ہر نشان کو مٹانے پر تلے ہوئے ہیں۔ ہم نے اپنی تاریخ کے روشن اوراق کو اپنے خودساختہ سانچوں اور بے بنیاد مفروضوں کے

اندھیروں میں دفن کرنے کا فریضہ پوری دیانتداری سے ادا کیا ہے۔ وہ مغرب جس کی مصنوعی روشنیوں کی چکا چوند سے ہماری آنکھیں خیرہ ہوئی جا رہی ہیں خود وہی یورپ اسلام قبول کرنے کے لئے بیتاب نظر آتا ہے۔ یہ سارا کام فلسفہ ہجرت کی عملی توجیہہ کے بغیر نہ کل ممکن تھا اور نہ آج ممکن ہے۔

باب ـ ۲

اوصاف ہجرت

ہجرت: تحفظ ایمان کا وسیلہ

جب پنجہ استبداد کی گرفت ناروا سخت سے سخت تر ہو رہی ہو' ہوائے جبر میں سانس لینا مشکل ہو رہا ہو' انسان کی عزت و آبرو کو ہوس کے پجاریوں کی طرف سے خطرہ لاحق ہو' شیطنت ننگی ہو کر ناچ رہی ہو تو آزمائش کی ان گھڑیوں میں پائے استقلال میں لغزش نہ آنے دینا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ ازل سے اہل حق اسی مسلک عشق پر کاربند رہے ہیں کہ انہوں نے جان پر کھیل کر اپنے افکار و نظریات کا تحفظ کیا۔ تاریخ اسلام ایثار و قربانی' جرات و بہادری' عزم و استقلال اور غیرت ایمانی کی ان گنت مثالوں سے بھری پڑی ہے' کفار مکہ نے مسلمانوں پر کیا کیا ستم نہ ڈھائے خود داعی انقلاب اسلامی کی زندگی خطرے میں تھی لیکن مصطفوی انقلاب کا قافلہ فتنوں اور سازشوں کا مقابلہ کرتا ہوا پورے اعتماد کے ساتھ راہ حق پر گامزن رہا' جبر و تشدد کے اس ماحول میں عموماً مصلحتیں پاؤں کی زنجیر بن جایا کرتی ہیں اور نسبتاً کمزور اعصاب کے مالک حوصلہ ہار بیٹھتے ہیں اگرچہ اصحاب رسول یہ تمام صعوبتیں خندہ پیشانی سے برداشت کر رہے تھے اور وہ سرمو بھی حق کی راہ سے نہیں ہٹتے تھے تاہم پیغمبر اعظم' حضور رحمت عالم ﷺ اس ماحول کا جائزہ لے رہے تھے' اپنے رفقاء کو حبشہ کی طرف ہجرت کا حکم دے کر آپ نے جس قائدانہ بصیرت کا مظاہرہ کیا اسے تاریخ نے اپنے اوراق پر آب زر سے رقم کیا ہے۔ ہجرت حبشہ دور رس نتائج کی حامل ثابت ہوئی' جبر کی اس فضا میں رہ کر ایمان کا تحفظ بھی خطرے میں پڑ جانے کا اندیشہ ہوتا ہے' دار الحرب میں کھل کر احکام شریعت کی پابندی کرنا عملاً ناممکن بنا دیا جاتا ہے اور پھر بے مقصد جدوجہد کا کوئی اخلاقی جواز بھی باقی نہیں رہتا۔ ایمان کو بچانا فرض ہے' جس ماحول میں رہنے سے ایمان کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے اس شہر' علاقے یا ماحول کو چھوڑ دینا اور ایسے مقام پر رہائش اختیار کر لینا جہاں دینی زندگی گزارنا آسان ہو' احکام شریعت کی بجاآوری میں ناروا

پابندیاں حائل نہ ہوں' واجب ہو جاتا ہے' ارشاد خداوندی ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰهُمْ جَهَنَّمُ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا (النساء' ۴:۹۷)

بیشک جن لوگوں کی روح فرشتے اس حال میں قبض کرتے ہیں کہ وہ (اسلام دشمن ماحول میں رہ کر) اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے ہیں (تو) وہ ان سے دریافت کرتے ہیں کہ تم کس حال میں تھے (تم نے اقامت دین کی جدوجہد کی نہ سرزمین کفر کو چھوڑا) وہ (معذرتاً) کہتے ہیں کہ ہم زمین میں کمزور و بے بس تھے' فرشتے (جواباً) کہتے ہیں' کیا اللہ کی زمین فراخ نہ تھی کہ تم اس میں (کہیں) ہجرت کر جاتے سو یہی وہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ بہت ہی برا ٹھکانہ ہے۔

ہجرت: تلاش امن کی سعی دلپذیر

جہاں کفر غالب ہو اور مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ کر دیا جائے اگر قدرت اور طاقت رکھنے کے باوجود اپنے ایمان کے تحفظ کی خاطر ہجرت نہ کی جائے تو یہ طرز عمل ہٹ دھرمی اور ضد کے زمرے میں شمار ہو گا۔ قرآن نے اس رویے کو اپنی جانوں پر ظلم کرنے کے مترادف قرار دیا ہے۔ جبر کی اس فضا میں احکام خداوندی بھی آزادانہ طور پر ادا نہیں کئے جا سکتے' کمزور انسان قوت نافذہ بھی حاصل نہیں کر سکتا جبکہ اسلام تو آیا ہی ادیان باطلہ پر غالب آنے کے لئے ہے' خطہ جبرواستبداد میں جہاں کفر مسند اقتدار پر جلوہ گر ہو وہاں اہل حق کا معاشی استحصال بھی ہوتا ہے اور معاشی استحصال سیاسی استحصال سے بھی بدتر نتائج کا حامل ہوتا ہے۔ پھر جبر کی اس فضا میں فرد کے اندر آزادی

کا فطری جذبہ بھی کمزور پڑ جاتا ہے اور حریت فکر کا تصور بھی آہستہ آہستہ ناپید ہو جاتا ہے اس لئے مسلمانوں کو ظلم و ستم کی اس فضا سے نکل جانے کا حکم ہے۔ مذکورہ آیت میں واضح طور پر بیان کیا گیا ہے فرشتے موت کے وقت انسان سے پوچھتے ہیں کہ تم کس دین پر تھے؟ وہ کہتے ہیں کہ ہم تھے تو مسلمان ہی لیکن کمزوری اور ضعف کی وجہ سے کھل کر دین کی بات نہیں کر سکتے تھے' اعلانیہ شریعت کی پابندی نہ کر سکتے تھے تو فرشتے جواب میں کہتے ہیں کہ کیا اللہ کی زمین کھلی' کشادہ اور وسیع نہ تھی' کیا اللہ کی زمین اتنی ہی تنگ ہو گئی تھی کہ تمہیں ہجرت کے لئے بھی کوئی علاقہ نہ مل سکا۔ یعنی زمین کا وہ ٹکڑا جہاں تم کافروں کے ساتھ رہتے تھے وہی تو کل زمین نہ تھی تم تلاش امن میں کسی دوسری جگہ نقل مکانی بھی کر سکتے تھے' اس حکم پر نہ چلنے والے نافرمانی کے مرتکب ہوتے ہیں۔

ہجرت: فرزند زمین ہونے کے گمراہ کن فلسفے کی نفی

قرآن کا یہ حکم فرزند زمین ہونے کے گمراہ کن فلسفے کی بھی نفی کر رہا ہے' جغرافیائی اور سیاسی حد بندیوں کو توڑ کر ایمان کے تحفظ کے لئے دارالسلام کی طرف نقل مکانی کرنا حکمت و دانش کے تقاضوں کے عین مطابق ہی نہیں بلکہ منشائے قدرت اور فطرت انسانی کے بھی عین مطابق ہے۔ شیطانوں کو کنکریاں مارنے اور خطہ جبر سے دوڑ کر گزرنے جیسے علامتی افعال بھی اسی ذیل میں آتے ہیں۔

حفظ دین کے لئے ہجرت کی ضرورت اور اہمیت سے انکار ممکن نہیں اس لئے کہ سفر انقلاب میں ہجرت ایک ناگزیر عمل ہے آخرت کی نجات کا ایک راستہ ہجرت بھی ہے' دنیا اور آخرت دونوں میں ہجرت فلاح اور نجات کی ضامن ہے ہجرت دین کے بنیادی تصورات میں سے ایک نہایت اہم تصور ہے اور دین کا مستقل لازمی حصہ ہے۔

باب۔ ۳

ہجرت: قرآن مجید کی روشنی میں

قرآن مجید جو آسمانی ہدایت کی آخری کتاب ہے میں ہجرت کے فضائل کے حوالے سے متعدد بار ذہن انسانی کی رہنمائی کی گئی ہے اور شب تاریک میں اسے سیدھا راستہ دکھایا گیا ہے لیکن ہم یہاں اختصار سے کام لیتے ہوئے چند ایک مقامات کے حوالے سے گفتگو کریں گے۔

ا۔ ہجرت: امتیاز نفاق و ایمان

اہل ایمان کا اپنا ایک الگ تشخص ہے ان کی ایک الگ پہچان ہے اس تشخص اور پہچان کی بہت سی علامتیں ہیں جو انہیں منافقین سے ممتاز کرتی ہیں' نفاق کی بھی بہت سی علامتیں ہیں جو انہیں اہل ایمان سے جدا کرتی ہیں' اس سلسلہ امتیازات میں ہجرت کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ قرآن مجید نے ہجرت کو اہل ایمان کا امتیازی اعزاز قرار دیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنَافِقِينَ فِئَتَيْنِ وَاللّٰهُ أَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوْا أَتُرِيْدُوْنَ أَنْ تَهْدُوْا مَنْ أَضَلَّ اللّٰهُ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا○ وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ أَوْلِيَآءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا○

(النساء' ۴: ۸۸-۸۹)

پس تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ منافقوں کے بارے میں دو گروہ ہو گئے ہو حالانکہ اللہ نے ان کے اپنے کرتوتوں کے باعث ان (کی عقل اور سوچ) کو روندھا کر دیا ہے۔ کیا تم اس شخص کو راہ راست پر لانا چاہتے ہو جسے اللہ نے گمراہ کر دیا ہے اور (اے مخاطب) جسے اللہ گمراہ کر دے تو اس کے لئے ہرگز کوئی راہ (ہدایت) نہیں پا سکتا وہ (منافق تو) یہ تمنا کرتے ہیں کہ تم بھی کفر کرو جیسے انہوں نے کفر کیا تاکہ تم سب برابر ہو جاؤ سو تم ان میں

سے (کسی کو) دوست نہ بناؤ یہانتک کہ
وہ اللہ کی راہ میں ہجرت (کر کے اپنا
ایمان اور اخلاص ثابت) کریں پھر اگر وہ
روگردانی کریں تو انہیں پکڑ لو اور جہاں
بھی پاؤ انہیں قتل کر ڈالو اور ان میں
سے (کسی کو) دوست نہ بناؤ اور نہ
مددگار۔

کلامِ الٰہی کا ایک ایک لفظ بلکہ ایک ایک حرف حکمت و دانش کا سمندر ہے' رشد و ہدایت کا سرچشمہ ہے' خیر و برکت کا منبع ہے' بصیرت و بصارت کا خزانہ ہے' علم و دانائی کا مظہر ہے' قدم قدم پر ہدایت کا نور روشنی دکھا رہا ہے' گنجلک مسائل کا حل بتا رہا ہے۔ الجھی ہوئی گتھیاں سلجھا رہا ہے اور نفسیات انسانی کی گرہیں کھول رہا ہے۔ مذکورہ آیت مبارکہ میں بھی منافقین کے اصلی چہروں کو بے نقاب کر کے اہل ایمان کو ان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانے سے منع کیا گیا ہے' اہل ایمان کو خیر و شر میں تمیز کا ہنر سکھایا جا رہا ہے۔ آج ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم اپنے مفادات کے لئے کی جانے والی دوستیوں کو ہر چیز پر مقدم سمجھنے لگے ہیں اور یوں قرآن کے بتائے ہوئے رہنما اصولوں سے روگردانی کے مرتکب ہو رہے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہے کہ در در کی ٹھوکریں کھا رہے ہیں' آزمائش و ابتلا کے وقت یہ "دوست" آنکھیں پھیر لیتے ہیں' اور مسائل و مصائب کے جنگل میں اہل ایمان کو تنہا چھوڑ کر ان کی بے بسی کا تماشا دیکھتے ہیں۔ عالمی سطح پر امت مسلمہ جن شرمناک اور مسلسل ناکامیوں کا سامنا کر رہی ہے اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ ہم نے دین کے دشمنوں کو اپنا دوست بنا کر ان پر اندھا اعتماد کرنے کے راستے کو اپنایا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ راستہ ہمیں تباہی اور گمراہی کے گڑھوں میں دھکیل دے گا اور ہماری نسلوں کے مقدر میں ناآسودہ لمحوں کا کرب تحریر کر دے گا۔ ہم نے اپنے تہذیبی اور ثقافتی سفر کے لئے اسی راستے کو منتخب کیا ہے۔ ہم نے اپنے تمام وسائل غیروں کے

قبضے میں دے دیئے کہ اس طرح ہماری انا کے مقفل دروازوں کے تحفظ کی ضمانت ملتی تھی۔ ہم نے اپنے وقتی مفادات کی خاطر امت مسلمہ کے مفاد کو بھی گروی رکھا ہوا ہے۔ ہم نے اپنے بچوں سے اچھے دنوں کے خواب دیکھنے کا حق بھی چھین لیا ہے۔ حکمرانوں کے اس طرز عمل پر امت مسلمہ دو گروہوں میں بٹی ہوئی ہے۔ ایک گروہ جو حکمرانوں کی ہاں میں ہاں ملا کر اپنے مفادات کے گرد تحفظ کی دیواریں اونچی کر رہا ہے۔ ایک وہ گروہ جو حکمرانوں کے ان رویوں اور فیصلوں سے اختلاف کرتا ہے اور اس طرز عمل کو امت مسلمہ کے لئے زہر قاتل قرار دیتا ہے یہی وجہ ہے کہ اکثر عالمی موضوعات پر بین الاقوامی امور و مسائل پر حکمرانوں کا رد عمل عوامی سطح پر رونما ہونے والے رد عمل سے یکسر مختلف ہوتا ہے۔ قرآن مجید نے آج سے چودہ سو سال پہلے اس تضاد کی کوکھ سے جنم لینے والے نقصانات سے اہل ایمان کو خبردار کر دیا تھا۔ ہوا یوں کہ جب مسلمان مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے تحریری دستور کی بنیاد پر قائم ہونے والی دنیا کی پہلی ریاست یعنی ریاست مدینہ میں آباد ہونے لگے تو مکہ مکرمہ میں کچھ پرانے ساتھی اور دوست ایسے رہ گئے جو یا تو ابھی بظاہر مسلمان نہیں ہوئے تھے یا بظاہر مسلمان ہو چکے تھے لیکن حقیقتاً مسلمان نہیں تھے۔ اسلامی تعلیمات کے ساتھ انہیں دور کا بھی واسطہ نہیں تھا وہ محض اپنے مفادات کے قیدی تھے' لیکن ان کی دوستی کے پیچھے کچھ اور ہی عوامل کار فرما تھے وہ ہوا کا رخ دیکھ رہے تھے کہ اگر مسلمانوں اور کافروں کے درمیان مسلح تصادم ہوتا ہے اور مسلمانوں کو جنگ میں فتح نصیب ہوتی ہے اور ان کا علاقہ مسلمانوں کے قبضے میں چلا جاتا ہے تو اس صورت میں وہ مسلمانوں کے ساتھ اپنی دوستی کی بنا پر اپنے جان و مال کی حفاظت کی ضمانت حاصل کر لیں گے اور اگر کامیابی کفار کے حصہ میں آتی ہے تو وہ کہہ سکیں گے کہ ہم تو اپنے آبائی دین پر قائم ہیں' مسلمانوں سے ہمیں کیا سروکار' چند مسلمانوں پر ان دوست نما دشمنوں کا راز افشاء ہو چکا تھا اور انہوں نے ان سے اپنا تعلق قطع بھی کر لیا تھا اور احباب کو بھی یہی مشورہ دیا تھا کہ ایسے منافقین کی دوستی کسی کام کی نہیں کیونکہ ان سے مراسم استوار کر کے یا برقرار رکھ کر دین اور اہل ایمان کے لئے

کوئی فائدہ حاصل نہیں کیا جا سکتا لیکن چند مسلمانوں کا خیال تھا کہ ان سے ترک تعلق نہ کیا جائے ممکن ہے وہ دوستی کا بھرم رکھیں اور آگے چل کر دائرہ اسلام میں داخل ہو جائیں۔ دو نقطہ ہائے نظر سامنے آئے' اختلاف بڑھا تو قرآن مجید نے دو ٹوک الفاظ میں فیصلہ دے دیا کہ وہ لوگ جو بظاہر اسلام کا دم بھرتے ہیں لیکن در پردہ ان کے عزائم کچھ اور ہیں منافق ہیں اور کسی حوالے سے بھی قابل اعتماد نہیں۔ لہٰذا ان کے بارے میں مسلمانوں کو دو گروہوں میں تقسیم ہو کر اپنے درمیان منافرت کی دیوار نہیں کھڑی کرنی چاہئے۔ بلکہ ان منافقین کے بارے میں اہل ایمان کو ایک مشترکہ موقف اختیار کرنا چاہئے کہ وہ ان منافقین سے قطع تعلق کر لیں نہ ان کو اپنا دوست سمجھا جائے اور نہ ان سے دوستی برقرار رکھی جائے۔ قرآن نے واضح طور پر بتا دیا کہ نہ وہ تمہارے مددگار ہو سکتے ہیں اور نہ انہیں اہل ایمان کا ساتھی کہا جا سکتا ہے بلکہ اے ایمان والو! ان کی خفیہ دشمنی کے جواب میں ان سے کھلی دشمنی کا اعلان کرو اور یہ منافقین تمہیں جہاں کہیں بھی ملیں انہیں اور ان کی وساطت سے جھوٹ' منافقت اور فتنہ و شر کو نیست و نابود کر دو یعنی ان کا نام و نشان تک مٹا دو۔

۲۔ ہجرت ایمان کی پختگی کی دلیل

قرآن حکیم غیر مبہم اور واشگاف الفاظ میں بیان کر رہا ہے کہ منافقین ہرگز ہرگز اہل ایمان کی دوستی کے لائق نہیں ایمان والوں کی دوستی کے حق دار صرف اور صرف ایمان والے ہی ہو سکتے ہیں' ایسے لوگوں کے ایمان کو پرکھنے کے لئے ہجرت کو کسوٹی قرار دیا گیا اور اگر یہ لوگ اللہ کی راہ میں ہجرت کے مرحلے سے گزریں تو ان پر اعتماد کیا جا سکتا ہے اور یہ دوستی کے لائق ہو سکتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ دوستی کے وقت وہ مسلمان ہوں گے۔ لہٰذا ہجرت کے بعد وہ لوگ اہل ایمان تصور کئے جائیں گے یہ وہ نکتہ ہے جس کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے سے ہجرت کی اہمیت روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے اور یہ بات کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ ہجرت ایمان اور نفاق کے

مابین حد فاصل ہے ،قرآن نے ہجرت کو ایمان اور منافقت کے باہمی تقابل میں ایمان کی علامات میں سے ایک علامت گردانا ہے ۔مذکورہ آیت کریمہ کے حوالے سے چند اہم نکات مزید درج کیئے جاتے ہیں۔

۱۔منافقین اہل ایمان کے کفر کی طرف لوٹنے کے خواہ ہیں لہٰذا اہل ایمان کو ان کے دام فریب میں نہیں آنا چاہئے اور اپنا دامن ان کی دوستی جو درحقیقت دشمنی ہے سے آلودہ نہیں کرنا چاہئے کیونکہ ان کی قربت اہل ایمان کے لئے خسارے کا سودہ ہے ۔

۲۔منافقین اپنی ازلی بدبختی کی بنا پر گمراہی کے قعر مذلت میں گر چلے ہیں یعنی ہدایت سے محروم ہو چکے ہیں ۔لہٰذا ان کے ساتھ مراسم استوار کرنے والے ،محبت کی پینگیں بڑھانے والے بھی نقصان میں رہیں گے ان کے فتنہ وشر سے محفوظ رہنے کے لئے ان سے قطع تعلق ضروری ہے۔

۳۔منافقین ہجرت کے مرحلے سے گزرنے سے کتراتے ہیں کیونکہ راہ حق میں ایثار وقربانی کی عملی مثالیں بھی پیش کرنا ہوتی ہیں ،اللہ کے دین کی سربلندی کے لئے مسائل ومصائب کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے اور اپنے سر ہتھیلی پر سجا کر میدان جہاد میں بھی نکلنا پڑتا ہے۔

۴۔منافقین کبھی بھی نہ مومنین کے ساتھ پر خلوص ہو سکتے ہیں اور نہ کبھی ان کی دوستی پر اعتماد کیا جا سکتا ہے چنانچہ ایسے لوگوں سے دور رہنا اور ان کی در پردہ سازشوں سے آگاہ رہنا حفظ ایمان کے لئے ضروری ہے۔

۵۔منافقین فتنہ وشر کو ہوا دیتے ہیں ،اہل ایمان کے بارے میں بدگمانیاں پھیلاتے ہیں ان کے ایمان کو متزلزل کرنے کے لئے پروپیگنڈہ کی مہم چلاتے ہیں ،من گھڑت افواہوں سے اہل حق کے ایمان کی دیوار میں شگاف ڈالنے کی سعی کرتے ہیں ،کشت ایمان میں وسوسوں کی فصل بو کر تشکیک وشبہات کا غبار اڑاتے ہیں ،بہتان تراشیوں کا طومار باندھتے ہیں اور کفار ومشرکین کے ساتھ مراسم استوار رکھتے ہیں ۔اور اسلام کے خلاف کفر کے دست وبازو بنتے ہیں اس لئے فتنہ وفساد کے مراکز بند کر دینا چاہئیں ۔منافقین کی

صورت میں جو ناسور سماج کی پیشانی پر ابھر آتا ہے اسے کاٹ دینا وقت کی ضرورت بن جاتا ہے۔

۶۔ ہجرت ایمان کی پختگی کی دلیل ہے اگر یہ لوگ اللہ کی راہ میں ہجرت کریں اور ایثار و قربانی کی ضرورت کا عملی مظاہرہ کریں تو یہ منافق نہیں کہلائیں گے بلکہ ہجرت ان کے اہل ایمان ہونے کی ظاہری علامتوں میں ایک علامت متصور ہو گی اور ان کے ایمان پر شک نہیں کیا جائے گا۔

۳۔ ہجرت: بنائے اخوت و جہاد

ہجرت اسلامی اخوت اور جہاد کی بھی بنیاد ہے، جس طرح ہجرت نہ کرنا منافقت کی علامات میں سے ہے اسی طرح ہجرت کرنا ایمان کی علامت ہے، حضور ﷺ کی ہجرت کے بعد یثرب کی مجلسی زندگی میں ایک خوشگوار تبدیلی آئی جب ایک طرف میثاق مدینہ کے حوالے سے شہر میں آباد مختلف طبقات کے درمیان تعاون اور اعتماد کی فضا قائم کی گئی اور شہر کے داخلی امن کو پائیدار بنیادوں پر استوار کیا گیا تو دوسری طرف خود مہاجرین اور انصار کے درمیان اسلامی اخوت کا وہ لازوال رشتہ قائم کیا گیا جو رشتہ خون کے رشتوں سے زیادہ مستحکم ثابت ہوا۔ ہجرت مدینہ کے بعد جب مسلمانوں کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی مہلت ملی تو انہوں نے اپنی عسکری قوت کو بھی منظم کیا، اگرچہ وسائل کی کمی کی بنا پر کوئی باقاعدہ فوج تو تشکیل نہ دی جا سکی۔ تاہم اس کی منصوبہ بندی ضرور کی گئی کہ شہر پر حملہ کی صورت میں دشمن کو بروقت موثر جواب دیا جا سکے۔ ہجرت کے بعد مسلمانوں کو آگے بڑھ کر دست تظلم پر کاری ضرب لگانے کی بھی اجازت ملی، دراصل ہجرت نے قوت نافذہ کے حصول کی وہ راہ ہموار کی جسے حاصل کئے بغیر اسلام کو تمام ادیان باطلہ پر غالب کرنے کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکتا تھا اور نہ اسلام کی انقلابی تعلیمات کے نفاذ کے لئے ہی کوئی حوصلہ افزا پیش رفت ممکن تھی، اگر میدان جہاد میں اتر کر اللہ کے دین کی سربلندی کے لئے جان و مال کے نذرانے پیش نہ کئے جاتے تو

دعوت حق کا کام کبھی بھی اپنے منطقی انجام کو نہ پہنچتا۔ ارشاد خداوندی ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ ھَاجَرُوْا وَ جٰھَدُوْا بِاَمْوَالِھِمْ وَ اَنْفُسِھِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَ الَّذِیْنَ اٰوَوْا وَّ نَصَرُوْٓا اُولٰٓئِکَ بَعْضُھُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ (الانفال ۸:۷۲)

بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے ہجرت کی اور اپنے اموال اور انفس کے ساتھ اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور وہ جنہوں نے مدد کی (مہاجرین کی) وہ سب ایک دوسرے کے دوست ہیں۔

مزید ارشاد ہوتا ہے۔

وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ ھَاجَرُوْا وَ جٰھَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَ الَّذِیْنَ اٰوَوْا وَّ نَصَرُوْٓا اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا لَھُمْ مَّغْفِرَۃٌ وَّ رِزْقٌ کَرِیْمٌ ○ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْ بَعْدُ وَ ھَاجَرُوْا وَ جٰھَدُوْا مَعَکُمْ فَاُولٰٓئِکَ مِنْکُمْ
(انفال ۸:۷۴۔۷۵)

اور جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور جن لوگوں نے (راہ خدا میں گھر بار اور وطن قربان کر دینے والوں کو) جگہ دی اور (ان کی) مدد کی' وہی لوگ حقیقت میں سچے مسلمان ہیں' ان ہی کے لئے بخشش اور عزت کی روزی ہے اور جو لوگ اس کے بعد ایمان لائے اور انہوں نے راہ حق میں (قربانی دیتے ہوئے) گھر بار چھوڑ دیئے اور تمہارے ساتھ مل کر جہاد کیا وہ لوگ (بھی) تم ہی میں سے ہیں۔

قرآن نے کئی ایک مقامات پر فضائل ہجرت بیان کرتے ہوئے ہجرت کی اہمیت کو واضح کیا ہے تین مقامات پر ایمان ہجرت اور جہاد کو یکجا کر دیا گیا ہے' دو دیگر مقامات پر ان کے ساتھ پناہ دینے اور مدد کرنے (انصار کے عمل) کا بھی ذکر ہے' مہاجرین اور انصار کے باہمی تعلق کا ذکر تین مقامات پر ان کلمات کے ساتھ کیا گیا ہے۔

ا۔ یہ ایک دوسرے کے دوست اور مددگار ہیں۔

ب۔ یہ سچے ایمان والے ہیں۔

ج۔ یہ دونوں ایک ہی ہیں۔ گویا اللہ تعالیٰ نے ایمان پر ہجرت کو' ہجرت پر مدد و نصرت کو اور مدد و نصرت پر جہاد کو اور ایمان کی پختگی اور سچائی کو مترتب کیا ہے۔

بالفاظ دیگر مہاجرین اور انصار ایک ہی ہیں' یہ ایمان کے بندھن میں بندھے ہوئے ہیں' ان کے درمیان مواخات قائم ہے' بھائی چارے کی فضا برقرار ہے اور وہ مل کر ایک ہی مقصد کے لئے جہاد کرتے ہیں اور وہ ہے غلبہ حق کے لئے کوشاں رہتے ہیں' اسلام کا عملی نفاذ ان کا مقصود و مطلوب ہے' انصار و مہاجرین مل کر کفار کے ساتھ جہاد اس لئے کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنے ایمان کا تحفظ کرتے ہوئے ہجرت اسی مقصد کے لئے کی تھی کہ اللہ کا دین تمام ادیان باطلہ پر غالب آئے اور اسلام کی حقانیت کے پرچم ہر سو لہرانے لگیں' قرآن مجید نے ہجرت کو بعد از ایمان' مواخات' بھائی چارے' یکجہتی اور اتفاق و اتحاد کے ساتھ ایک مضبوط' مسلسل غیر مصالحانہ جہاد کی بنیاد قرار دیا ہے' ایمان کے بعد ہجرت جہاد کا پہلا دروازہ ہے اور یہ دروازہ غلبہ دین حق کے ان گنت دروازوں کو کھولنے کا باعث بنتا ہے۔

۴۔ ہجرت کو بنائے مواخات بنانے کے تقاضے

ہجرت میں نقل مکانی کو بنیادی حیثیت حاصل ہے' یہ نقل مکانی اللہ کے دین کی سربلندی کے لئے اختیار کی جاتی ہے' یہ نقل مکانی انفرادی سطح پر بھی ہوتی ہے اور اجتماعی سطح پر بھی' ہجرت حبشہ اور ہجرت مدینہ انفرادی اور اجتماعی نقل مکانی کی روشن مثالیں ہیں' جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے' ہجرت قصر اخوت کا پہلا بنیادی پتھر ہے' اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہجرت کو بنائے مواخات بنانے کے تقاضے کیا ہیں' یہ نکتہ ذہن میں رکھنا چاہئے کہ ہجرت انسانی زندگی میں غیر معمولی سماجی' سیاسی اور معاشی تبدیلیوں کا بھی باعث بنتی ہے۔ ان گنت مسائل پیدا ہوتے ہیں' سماجی قدریں بری طرح متاثر ہوتی

ہیں' ایک جگہ سے دوسری جگہ لوگوں کی نقل مکانی اور پھر نئی جگہ پر مستقل قیام بہت سی نفسیاتی الجھنوں کو بھی جنم دیتا ہے اور قدم قدم پر سماجی اور علاقائی تضادات سر اٹھا کر مصائب اور مسائل کے پہاڑ کھڑے کر دیتے ہیں' یہ تضادات عموماً معاشرتی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ مثلاً علاقے' زبان' مزاج کے تضادات یا تہذیب و تمدن کا فرق' ثقافتی سطح پر سوچ اور اظہار میں بعد مذہب کا فرق اور مفادات کا ٹکراؤ وغیرہ ان تضادات اور فروق کے ہوتے ہوئے ہجرت مختلف انسانی طبقات کے مابین نزاع کا باعث بنتی ہے' فلسطینیوں کی وہ نسل جو مہاجر کیمپوں میں جوان ہوئی ہے اس کے مسائل اور عزائم یقیناً مسلمانوں کی اس نوجوان نسل کے مسائل اور عزائم سے مختلف ہوں گے جو آزاد فضا میں اور نسبتاً پر امن ماحول میں سن بلوغ تک پہنچی ہے' مذکورہ تضادات اور فروق کی وجہ سے جھگڑے کھڑے ہو جاتے ہیں اور بعض صورتوں میں مسلح تصادم تک نوبت آ جاتی ہے' اگر ایسا نہ بھی ہو اور لوگ ممکن حد تک تحمل' بردباری اور صلح جوئی کا مظاہرہ کریں پھر بھی ہجرت سے پیدا ہونے والے مسائل و مصائب سے مفر نہیں' مختلف گروہوں کے درمیان اختلافات کی خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی جاتی ہے' مہاجرین کی آمد سے مقامی لوگوں میں ایک اضطراب سا پیدا ہو جاتا ہے کہ ان کے وسائل پر قبضہ جمایا جا رہا ہے دوسری طرف مہاجرین جو پہلے ہی دل شکستہ ہوتے ہیں' آبائی وطن سے وابستگی جذباتی سطح پر ذہنی دباؤ کی صورت میں متشکل ہوتی ہے تو وہ مایوسی کا شکار ہو جاتے ہیں اور یہ مایوسی جذبہ تعمیر کی قاتل ہے' اس طرح پورا معاشرتی ڈھانچہ متاثر ہوتا ہے لیکن مدینے کی بیدار مغز قیادت نے اس قسم کے تضادات کو سر ابھارنے کا موقع ہی نہیں دیا' آقائے دوجہاں ﷺ نے فوری اور موثر اقدامات کئے' قدم قدم پر سیاسی بصیرتوں کے دریا بہا دیئے' روش روش پر سماجی شعور کے آئینے رکھ دیئے کہ ہم آہنگی' اخوت اور بھائی چارے کی ایک ایسی فضا نے مدینے کے شہریوں کو اپنی آغوش میں لے لیا جس میں مہاجرین کا ہر زخم پھول بن کر مہکنے لگا۔ محبت کی خوشبو مشام جاں کو معطر کرنے لگی' ثقافتی سطح پر ایک عظیم معجزہ رونما ہوا اور انصار و مہاجرین اخوت کے رشتوں میں یوں

بندھ گئے' کہ خون کے رشتے اس فکری اور ذہنی انقلاب کی گرد کو بھی نہ پا سکے اور چشم فلک حیرت سے اس انقلاب کی عینی شاہد بن گئی جس انقلاب کے دامن سے روشنی' خیر اور محبت کا ایک سمندر بہہ نکلا۔ یہ ہجرت خالصتاً نظریاتی بنیادوں پر وقوع پذیر ہوئی تھی اور اس کا نظریاتی پہلو ہر قسم کے جذباتی اور نفسیاتی پہلوؤں پر غالب تھا' ایمان کی روایات مستحکم تھیں' مکی دور کی تیرہ سالہ تربیت نے صاحبان نظر کی تحلیل نفسی دونوں طرف سے اس نہج پر کر دی تھی کہ مفادات میں ٹکراؤ پیدا ہونے کی نوبت ہی نہ آئی' مفادات ایک تھے' نصب العین ایک تھا' زندگی کا مقصد ایک تھا' خدا ایک' رسول ایک' دین ایک' دوست ایک' دشمن ایک' دلی جذبات اور ذہنی خیالات کا سمندر بھی ایک ہی رخ پر بہہ رہا تھا' انصار اور مہاجرین کی وفاداریوں کا مرکز بھی ایک تھا' یہ علاقائی سوچ کے حصار سے نکل آئے تھے' قبائلی عصبیتوں کا دامن تار تار ہو چکا تھا' ان کی تہذیب و ثقافت کی اساس ایک تھی' ان کی زبان ایک تھی' ان کے سینوں میں ایک ہی قرآن کا چراغ روشن تھا' یہ سب اپنے عظیم قائد اپنے عظیم پیغمبر اور کائنات ہست و بود کے سب سے عظیم انسان حضور رحمت عالم ﷺ کی جنبش ابرو کے منتظر رہتے تھے اور ان کے ایک اشارے پر اپنی جانیں قربان کر دینے کے آرزو مند تھے جب سوچ کے دھارے مختلف نہ رہیں تو دوئی کا ہر نشان خود بخود مٹ جاتا ہے اور اشتراک عمل کی ایسی ایسی صورتیں جنم لیتیں ہیں کہ خود تاریخ بھی ورطہ حیرت میں ڈوب ڈوب جاتی ہے' ہم دیکھتے ہیں کہ ہجرت مدینہ اختلافات کا باعث بننے کی بجائے مواخات کا ذریعہ اور اخوت کے ایک نئے باب کا عنوان بنی۔

۵۔ ہجرت: بنائے نجات

مکہ کے کفار و مشرکین نے مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ کر رکھا تھا۔ ہجرت مدینہ سے ان کے ابتلاء و آزمائش کے دور کا خاتمہ ہوا۔ مسلمانوں پر کفار و مشرکین کا جبر اور تشدد اس حد تک بڑھ گیا تھا اور بعض کمزور مسلمان ان کے شکنجے میں اس طرح پھنس کر رہ گئے تھے کہ بعض اوقات بعض کی زبان سے کلمہ کفر بھی نکل جاتا' تاریخ بتاتی ہے کہ جب ان کمزور مسلمانوں نے ہجرت کی تو انہیں کفر کے پنجہ استبداد سے رہائی ملی یہ

ذہنی دباؤ سے آزاد ہوئے اور حصار اذیت سے نکلے تو ان کے ایمان اور ایقان میں پختگی آئی' انہوں نے غزوات میں داد شجاعت دے کر حریت کی ایک نئی تاریخ رقم کی اور فروغ دین کے لئے کارہائے نمایاں سرانجام دیئے۔ ان کی زندگی سراپا جہاد بن گئی اور انہوں نے حق پر قائم رہنے کا حق ادا کر دیا۔ ایسے افراد جن سے کلمہ کفر مجبوراً صادر ہو گیا تھا کے بارے میں ارشاد خداوندی ہے۔

ثُمَّ اِنَّ رَبَّکَ لِلَّذِیْنَ هَاجَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا فُتِنُوْا ثُمَّ جَاهَدُوْا وَ صَبَرُوْۤا اِنَّ رَبَّکَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ

(النحل' ۱۶:۱۱۰)

پھر آپ کا رب ان لوگوں کے لئے جنہوں نے آزمائشوں (اور تکلیفوں) میں مبتلا کئے جانے کے بعد ہجرت کی (یعنی اللہ کے لئے اپنے وطن چھوڑ دیئے) پھر جہاد کئے اور (پریشانیوں پر) صبر کئے تو (اے حبیب مکرم) آپ کا رب اس کے بعد بڑا بخشنے والا نہایت مہربان ہے۔

حق پر قائم رہنا اور باطل سے ٹکرا جانا اہل ایمان کی ایک بہت بڑی خوبی ہے۔ آیت مذکورہ میں اللہ جل مجدہ نے تین خصوصیات والوں کے لئے بخشش و مغفرت اور دوزخ سے نجات کا ذکر کیا ہے۔ ہجرت' جہاد اور راہ حق میں ثابت قدمی کی طرف اشارا لیا گیا ہے' یہی تین چیزیں نجات کا باعث بنتی ہیں' اولین درجہ ہجرت کو حاصل ہے پھر لفظ "ثم" بھی اس کی زمانی اولیت کے ساتھ مرتبی بعد پر دلالت کر رہا ہے۔

۶۔ ہجرت: بنائے قصر عبادات

مقصود اللہ کی بندگی ہے مطلوب قولاً و عملاً اقرار توحید ہے اور ہجرت بنائے قصر عبادات ہے۔ قرآن مجید نے خدائے بزرگ و برتر کی بندگی کے عملی مظاہرے کے لئے بھی اسلام کے پیروکاروں کی طرف سے ہجرت اختیار کرنے کو پسند فرمایا ہے۔ وہ خطہ ارض' وہ شہر یا وہ ملک جہاں خدائے وحدہ لا شریک کی عبادت میں رکاوٹ ڈالی جا رہی ہو

اور بندگان خدا کو بزور بازو بارگاہ خداوندی میں سربسجود ہونے سے روکا جا رہا ہو' وہاں سے نقل مکانی کر جانا اور کمال مجاہدہ اختیار کرنا عین مقصود شریعت ہے۔ بالخصوص جب ایسے مقام تک رسائی بھی ہو جہاں تعلیمات اسلامی پر عمل پیرا ہونے میں کوئی مشکل نہ ہو بلکہ آسانی ہو اور مسلمان جبر کے ہاتھوں سے آزاد ہو کر اپنے فرائض آزادانہ طور پر سرانجام دے سکتے ہوں یا دے رہے ہوں تو اس وقت مقام جبر سے ہجرت کر جانا واجب ہو جاتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

يَا عِبَادِيَ الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ أَرْضِي وَاسِعَةٌ فَإِيَّايَ فَاعْبُدُونِ

(العنکبوت' ۲۹:۵۶)

اے میرے وہ بندو جو ایمان لائے ہو بے شک میری زمین بہت وسیع (وعریض) ہے (تاکہ تم ہجرت کر کے کہیں اور جا سکو جہاں تمہیں آسانی ہو کہ اپنے دین پر عمل کر سکو) لہٰذا (کسی اور جگہ نقل مکانی کر کے) صرف اور صرف میری ہی عبادت کرو۔

حکم دیا جا رہا ہے کہ زمین کے جس حصے میں میری عبادت پر پہرے بٹھا دیئے گئے ہوں وہاں سے ہجرت کر جاؤ' جہاں اللہ کی عبادت پر بھی قدغن لگائی جا رہی ہو وہاں سے ہجرت کر جانا اہل ایمان کے لئے ضروری ہو جاتا ہے۔ جب کمیونزم کی سیاہ رات نے سنٹرل ایشیا کی مسلمان ریاستوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تو تاشقند' بلخ' بخارا کے دینی مراکز کو حکماً اور جبراً بند کر دیا گیا تھا مسجدوں' خانقاہوں اور درسگاہوں پر قفل ڈال دیئے گئے تھے' اسلامی ثقافت کی بات کرنے والوں کو طرح طرح کی اذیتیں دے کر انہیں پابند سلاسل کر دیا جاتا۔ جبر کی اس فضا میں احکام خداوندی' بجا لانا جب ممکن نہ رہا ہو تو اہل ایمان نے اس فضا سے رخت سفر باندھا اور مسلم معاشروں کی طرف ہجرت کر گئے۔

۷۔ ہجرت: امید رحمت

ایک مسلمان کے وہ افعال واقوال جن کی بنا وہ رحمت حق کا سزاوار ٹھہرتا ہے

ان افعال واقوال میں ہجرت کے عمل کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ یعنی سفر ہجرت اختیار کرنے والا مسلمان رحمت حق کی امید باندھ سکتا ہے بلکہ رحمت حق اس کے مقدر میں لکھ بھی دی جاتی ہے۔ قرآن مجید میں رحمت حق کی امید دلانا اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے عبادت گزار متقی اور پرہیزگار بندوں پر اپنی بے پایاں رحمت کے دروازے کھول دیتے ہیں۔ ارشاد خداوندی ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِکَ یَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (البقرہ ۲:۲۱۸)

بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے جنہوں نے اللہ کے لئے وطن چھوڑا اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا یہی لوگ اللہ کی رحمت کے امیدوار ہیں اور اللہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔

رحمت خداوندی کا دائرہ ہر شئے پر محیط ہے' یہ رحمت ہر کسی کے لئے عام ہے اس میں تنگی نہیں وسعت ہی وسعت ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

رَحْمَتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیْءٍ (الاعراف ۷:۱۵۶)

میری رحمت ہر چیز پر وسعت رکھتی ہے۔

ارشاد خداوندی ہے۔

کَتَبَ عَلٰی نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ (الانعام ۶:۱۲)

اس نے اپنی ذات پر رحمت لازم فرمائی ہے۔

ایک مقام پر یوں ارشاد ہوا۔

وَسِعَ کُلَّ شَیْءٍ عِلْمًا (طٰہٰ ۲۰:۹۸)

اسکے احاطہ علمی نے ہر شئے کو گھیر رکھا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت وہ بحر ہے جس کا کوئی کنارا نہیں' اللہ کی رحمت کے خزانوں میں کوئی کمی نہیں' ہمیں ہی مانگنے کا سلیقہ نہیں آتا۔ دنیا میں بھی اس کی رحمت دستگیری کرتی ہے اور عقبیٰ میں نجات کا باعث بنتی ہے۔ آخرت کی منزلیں بھی اسی کی رحمت کے سہارے طے کرتی ہیں اور بوقت عدل بھی اسی کی

رحمت اپنے بندوں پر ابر کرم کی طرح برستی ہے۔ البتہ اس کی رحمت کا حقدار بننے کے کچھ تقاضے بھی ہیں ان تقاضوں کو پورا کرنے کے بعد ہی انسان رحمت خداوندی کا سزاوار ٹھہرتا ہے اور صرف رحمت ہی نہیں اللہ کی خصوصی رحمت بھی بندوں کو عطا ہوتی ہے' جملہ تقاضوں میں سے ایک تقاضا ہجرت کا بھی ہے کہ اللہ کی راہ میں سفر ہجرت اختیار کیا جائے اس کے دین کی سربلندی اور اپنے ایمان کی حفاظت کے لئے سفر کی صعوبتیں برداشت کی جائیں اور پھر جہاد کے کھلے دروازوں سے داخل ہو کر دین حق کے غلبے کے لئے انقلابی جدوجہد میں عملاً بھی شرکت کی جائے۔

۸۔ ہجرت: کفارۂ ذنوب و خطایا

ہجرت کا عمل انسان کے ظاہر و باطن دونوں کی تطہیر کرتا ہے' فرد کا دامن بھی روشنیوں سے منور ہو جاتا ہے اور اس کا خارج بھی اجالوں کا مرکز و محور قرار پاتا ہے۔ ہجرت بارگاہ خداوندی میں بندے کی مغفرت کا باعث بنتی ہے اس کے ایمان کو تحفظ کی ردا عطا ہوتی ہے' نجات کے دروازے کھلتے ہیں اور رحمت کے دریچے وا ہوتے ہیں' اسی طرح ہجرت خود کفارہ ذنوب بھی ہے' شانوں پر سے خطاؤں کا بار ہٹانے کا ذریعہ بھی' جب انسان اللہ کی راہ میں ہجرت کے دکھ اٹھاتا ہے سفر کی صعوبتیں برداشت کرتا ہے' اپنے آبائی وطن کو خیرباد کہتا ہے' روحانی رشتوں کو خونی رشتوں پر مقدم جانتا ہے رنگ و نسل کے بتوں کو پاش پاش کر کے اقامت دین کے عظیم مشن پر روانہ ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اپنے اطاعت گزار بندوں پر انعام و اکرام کی بارش کر دیتا ہے' ابر کرم کو اپنے بندوں کی طرف حکم سفر دیتا ہے اور اس کی رحمت اپنے بندوں کو اپنے دامن میں چھپا لیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی خطاؤں سے درگزر کر کے انہیں کامیابی اور کامرانی کی نوید سناتا ہے ان کی دعائیں مستجاب ہوتی ہیں اور انہیں فضل بے پایاں سے نوازا جاتا ہے۔ ارشاد خداوندی ہے۔

فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّیْ لَاۤ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى بَعْضُكُمْ	پھر ان کے رب نے ان کی دعا قبول فرما لی (اور فرمایا) یقیناً میں تم میں سے کسی

مِنْۢ بَعْضٍ فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ (آل عمران' ۳:۱۹۵)

محنت والے کی مزدوری ضائع نہیں کرتا۔ خواہ مرد ہو یا عورت تم سب ایک دوسرے میں سے (ہی) ہو۔ پس جن لوگوں نے (اللہ کے لئے) وطن چھوڑ دیئے اور (اسی کے باعث) اپنے گھروں سے نکال دیئے گئے اور میری راہ میں ستائے گئے اور (میری خاطر) لڑے اور مارے گئے تو میں ضرور ان کے گناہ ان (کے نامہ اعمال) سے مٹا دوں گا اور انہیں یقیناً ان جنتوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی' یہ اللہ کے حضور سے اجر ہے اور اللہ ہی کے پاس (اس سے بھی) بہتر اجر ہے۔

اس آیہ کریمہ میں انسان کی فکری اور عملی رہنمائی کے لئے متعدد نکات بیان کئے گئے ہیں' ارشاد ہوتا ہے کہ اللہ اپنے بندوں کی دعائیں قبول کرتا ہے' ان کی التجاؤں کو شرف باریابی بخشتا ہے' ان کی حاجت روائی کرتا ہے' ان کے لئے مشکل کشائی کے راستے کھولتا ہے' کیونکہ وہ کسی کی محنت کو ضائع نہیں کرتا' وہ اپنے بندوں کی محنت اور جدوجہد کا اجر اور ثواب بھی عطا کرتا ہے' وہ ایمان کے پودے کی کاشت کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ایمان کے ان درختوں کو ثمربار بھی کرتا ہے' اپنے بندوں کی محنت اور جدوجہد کو نتیجہ خیز بھی بناتا ہے اور انہیں قدم قدم پر منزل کامرانی سے ہمکنار کرتا ہے۔

آیت مذکورہ میں بیان کیا گیا ہے کہ اے انسانو! تم سب آدم کی اولاد ہو یعنی انسان ہونے کی حیثیت میں تم سب برابر ہو گویا قانون کی نظروں میں شاہ و گدا میں کوئی فرق روا نہیں رکھا جائے گا۔ حضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ مجھے قسم ہے اس پروردگار کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے اگر میری بیٹی فاطمہ بھی چوری کرے گی تو

اس کے ہاتھ بھی کاٹے جائیں گے۔ اس آیت میں بھی زمین پر عدل اور انصاف کے نفاذ کی بات کی گئی ہے یہ کہہ کر کہ تم سب آدم کی اولاد ہو' انسانوں کی برابری کے اس تصور کے ساتھ یہ بات بھی کھول کر بیان کر دی گئی ہے کہ بعض ایسے انسان بھی ہیں جن کے لئے خاص طور پر انعامات رکھے گئے ہیں' اپنے نیکوکار بندوں کو کامرانی کی بشارت دی جا رہی ہے' معافی اور گناہوں کی دوری کی صورت میں ان پر فضل ربی کی نوید سنائی جا رہی ہے۔ اس فضل ربی کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں انہیں گناہ کے برے اثرات یعنی سزا سے دور رکھا جائے' اور انسانی خطاؤں سے درگزر کیا جائے' دوسرے ان کی گناہوں ہی سے حفاظت کر دی جائے اور انہیں محفوظین کا درجہ عطا فرما دیا جائے یہ بات صرف اولیائے کاملین کے ساتھ خاص ہے مگر معصوم کے درجے تک وہ بھی نہیں پہنچ سکتے کیونکہ یہ خاصہ انبیاء ہے' بارگاہ الوہیت سے اللہ کے متقی اور پرہیزگار بندوں کو اجر و ثواب سے نوازا جاتا ہے کیونکہ اللہ اچھا بدلہ دینے والا ہے' اللہ کی رحمت اور اس کے فضل بے پایاں کے سزاوار کون لوگ ہیں قرآن مجید نے ان لوگوں کا ذکر کیا ہے کہ

(ا) جنہوں نے ہجرت کی (ب) جو گھروں سے نکالے گئے (ج) جنہوں نے تکالیف برداشت کیں (د) جنہوں نے جہاد کیا (ہ) جو شہید ہو گئے جن لوگوں کو معافی دی گئی۔

ان میں سرفہرست وہ لوگ ہیں جنہوں نے اللہ کی راہ میں ہجرت کی' ہجرت کرنے والے' نقل مکانی کرنے والے' مکہ چھوڑ کر مدینہ تشریف لے جانے والے اور مکہ میں تکالیف برداشت کرنے والے حتی کہ گھروں سے نکالے جانے والے' ان سب کی خطاؤں سے درگزر کیا جا رہا ہے' قابل غور نکتہ یہ ہے کہ ان لوگوں کے لئے باقاعدہ جہاد ممکن ہی ہجرت کے صدقے میں ہوا۔ لہٰذا اس کا اجر بھی ہجرت کی طرف ہی لوٹتا ہے۔ اس تفصیلی گفتگو کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ گناہوں کے کفارے کا اصل سبب ہجرت ہی کو قرار دیا گیا ہے۔

۹۔ ہجرت اچھے انجام کا باعث

ہجرت کے فضائل میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ہجرت کا عمل بالآخر انسان کے

لئے اچھے انجام کا باعث بنتا ہے اسے دنیا میں بھی کامیابی نصیب ہوتی ہے اور خلعت کامرانی اسے آخرت میں بھی عطا ہوتی ہے۔ آیت مذکور میں واضح طور پر بیان کیا گیا ہے کہ جہاں ہجرت گناہوں کے کفارے کا سبب بنتی ہے وہاں ہجرت حسن الثواب یعنی اہل کمال کے لئے جنت میں اعلیٰ درجات اور نعمت عظمیٰ کے حصول کا وسیلہ بھی بنتی ہے' کیونکہ راہ حق کے مسافروں کو ابتلاو آزمائش کے مراحل سے صرف اس لئے گزرنا پڑتا ہے کہ وہ اللہ پر ایمان لاتے ہیں اور اللہ کے رسول کی تصدیق کرتے ہیں۔ ارشاد خداوندی ہے۔

يَاأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ تُلْقُوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوْا بِمَا جَآءَكُمْ مِّنَ الْحَقِّ يُخْرِجُوْنَ الرَّسُوْلَ وَاِيَّاكُمْ اَنْ تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ رَبِّكُمْ (الممتحنہ' ۶۰:۱)

اے وہ لوگو! جو ایمان لائے' میرے اور اپنے دشمن کو دوست مت بناؤ' تم ان کی طرف دوستی (کا پیغام) بھیجتے ہو جبکہ وہ تمہارے پاس جو حق آیا ہے اس کا انکار کر چکے ہیں رسول (ﷺ) اور تمہیں (گھروں سے) نکالتے ہیں (اس کی پاداش میں) کہ تم اپنے رب اللہ پر ایمان لاتے ہو۔

اسلام' حضرت آدم علیہ السلام سے حضرت عیسیٰ تک کی آسمانی ہدایت ہی کی ایک تدریجی حتمی اور مکمل صورت ہے لیکن کفار و مشرکین نے اسلام کی آفاقی تعلیمات کو دین ابراہیمی سے انحراف کے مترادف ایک ایسا اقدام گردانا جو ان کے نزدیک کسی بھی صورت میں لائق صرف نظر نہ تھا۔ اس لئے انہوں نے اس الہامی دین کی ہر سطح پر زبردست مزاحمت کی قرآن ایک اور مقام پر صراحتاً بیان کرتا ہے۔

وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ۝ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۝ (البروج' ۸۵:۸-۹)

اور وہ (کفار) ان (مسلمانوں سے) اس بات کے سوا کسی اور شے کا بدلہ نہ لیتے تھے کہ وہ (مسلمان) ہمیشہ غلبہ والے' ہر تعریف کے لائق اس اللہ پر ایمان لے آئے (تھے) کہ زمین اور آسمانوں کی

ساری بادشاہتیں ایک اسی کے لئے ہیں
(ان کی ملک نہیں ہیں) اور اللہ ہر شئے پر
(اپنے علم وقدرت کے ساتھ) نگہبان
اور گواہ ہے۔

پیکران عزیمت نے دشمنان اسلام کے ہر وار کو اپنے سینے پر سہا' آلام ومصائب برداشت کیے۔ مگر جس دین کی خاطر اہل ایمان یہ مظالم اور شدائد برداشت کر رہے تھے جب اس دین کی حفاظت اور ایمان کے بچاؤ کے لئے ترک وطن کرنا پڑا تو اہل حق نے اس ہجرت کے حکم کو بھی اپنے ماتھے پر کوئی شکن ڈالے بغیر قبول کیا اور رضائے الٰہی کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا۔ ہجرت ایک طرف تو ان کے لئے کفارہ ذنوب اور مغفرت کا باعث بنی تو دوسری طرف ان کے خاتمہ بالخیر کا سبب بھی قرار پائی۔

۱۰۔ ہجرت: بنائے راحت وسکون

رات کتنی بھی طویل اور تاریک کیوں نہ ہو بہرحال اسے گزر جانا ہوتا ہے' ہر رات کی کوکھ سے ایک چمکدار اور روشن سورج جنم لیتا ہے کفار ومشرکین کی سازشوں کو بھی ایک دن ختم ہونا تھا راہ حق میں اٹھائی جانے والی مزاحمتوں کو بھی ایک دن دم توڑنا تھا' ظلم کی زنجیر کو عزائم کی دیوار سے ٹکرا ٹوٹ کر گرنا ہی تھا' سو وہ گری' مزاحمتیں دم توڑ گئیں اور سازشیں اپنی موت آپ مر گئیں' قرآن پاک نے ہجرت کو اس کے ایک خاص پس منظر میں مؤمنین کے لئے راحت وسکون کا باعث بھی قرار دیا ہے' بالخصوص وہ اہل ایمان جو بوجوہ فوری طور پر سفر ہجرت اختیار نہ کر سکے اور کفار ومشرکین کے حصار بے امان میں رہ کر اپنے ایمان کے تقاضے پورے کرنا ان کے لئے مشکل ہو گیا۔ پنجہ استبداد کی گرفت ناروا اتنی سخت ہو گئی کہ اسے برداشت کرنا انسانی بس میں نہ رہا اور نقل مکانی کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ جب یہ لوگ مدینہ منورہ میں آباد ہوئے تو نہ صرف انہیں جسمانی طور پر آرام اور سکون ملا بلکہ ذہنی اور روحانی آسودگی بھی حاصل ہوئی' ارشاد خداوندی ہے۔

وَالَّذِیْنَ ھَاجَرُوْا فِی اللّٰہِ مِنْ بَعْدِ مَاظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّھُمْ فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَکْبَرُ لَوْ کَانُوْا یَعْلَمُوْنَ ○ اَلَّذِیْنَ صَبَرُوْا وَعَلٰی رَبِّھِمْ یَتَوَکَّلُوْنَ ○ وَمَآاَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِکَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِیْٓ اِلَیْھِمْ فَسْئَلُوْٓا اَھْلَ الذِّکْرِ اِنْ کُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ○

(النحل '۱۶: ۴۱-۴۳)

اور جنہوں نے اللہ کی راہ میں ہجرت کی اس کے بعد ان پر (طرح طرح) کے ظلم توڑے گئے تو ہم ضرور انہیں دنیا (ہی) میں بہتر ٹھکانہ دیں گے اور آخرت کا اجر تو یقیناً بہت بڑا ہے کاش وہ (اس راز کو) جانتے ہوتے جن لوگوں نے صبر کیا اور اپنے رب پر توکل کئے رکھتے ہیں اور ہم نے آپ سے پہلے بھی مردوں ہی کو رسول بنا کر بھیجا جن کی طرف ہم وحی بھیجتے تھے سو تم اہل ذکر سے پوچھ لیا کرو اگر تمہیں خود کچھ معلوم نہ ہو۔

آیات ربانی میں ہجرت اور اہل ہجرت کے مزید فضائل پر روشنی ڈالی گئی ہے اور ہجرت کی سماجی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔

فرمایا گیا ہے کہ ہجرت کرنے والوں نے مخالفین کی معاندانہ کارروائیوں سے تنگ آکر نقل مکانی کی' سچی بات ہے کوئی بھی خوشی سے اپنے آبائی وطن کو خیرباد نہیں کہتا' اپنے خونی رشتوں سے یونہی کوئی منہ نہیں موڑ لیتا' پانی جب سر سے اونچا ہو جائے' اصلاح احوال کی کوئی صورت نظر نہ آئے' وسائل کے مسلسل ضیاع کا اندیشہ ہو اور جدوجہد مطلوبہ نتائج پیدا نہ کر رہی ہو تو پھر سفر انقلاب میں ہجرت کا عمل ناگزیر ہو جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے مہاجرین سے وعدہ فرمایا کہ انہیں اس دنیا میں بھی بہتر ٹھکانہ ملے گا' یہ آیت مبارکہ حبشہ کی طرف ہجرت کرنے والے اہل ایمان کی شان میں نازل ہوئی تھی' اکثر مفکرین کا قول ہے کہ یہ مکی آیت ہے ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ پورا ہوا۔ مہاجرین کو مکہ کی نسبت مدینہ منورہ میں اچھی رہائش ملی' ان کا ذریعہ معاش

بھی مکہ میں ان کے ذریعہ معاش سے بہتر تھا۔ مدینہ منورہ میں انہیں جو معاشرہ ملا وہ مکی معاشرے سے اچھا تھا' سماجی ماحول' معاشرتی رتبہ و مقام' عزت و آبرو کا تحفظ غرض ہر چیز مکہ سے بہتر تھی' نظام مدینہ نظام مکہ سے بدرجہا بہتر تھا' مدینہ منورہ میں انہیں مکمل سماجی تحفظ بھی حاصل تھا یہاں کفار و مشرکین کی چیرہ دستیوں کی بجائے راحت اور سکون نصیب ہوا بالآخر مکہ پر غلبہ بھی حاصل ہوا اور مسلمانوں کو واضح طور پر عرب کے دیگر طبقات پر عسکری اور سیاسی برتری بھی حاصل ہوئی۔

آیت کریمہ میں آخرت کے جس عظیم اجر کا ذکر کیا گیا ہے وہ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ جسے قرآن نے "اکبر" یعنی سب سے بڑا کہہ کر بیان کیا۔

قرآن پاک نے مہاجرین کی جو صفات گنوائی ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے کہ یہ لوگ معرکہ حق و باطل میں ثابت قدم رہتے ہیں نہ وہ دشمن کی افرادی قوت سے خوفزدہ ہوتے ہیں اور نہ اس کے سامان حرب سے مرعوب ہوتے ہیں وہ اللہ کی مدد و نصرت پر بھروسہ کرتے ہیں اور اپنے پائے استقلال میں ذرا سی بھی لغزش نہیں آنے دیتے۔ اقبال نے کہا تھا۔

یقیں محکم عمل پیہم محبت فاتح عالم
جہاد زندگانی میں یہ ہیں مردوں کی شمشیریں

راہ انقلاب کے مسافروں کا زاد سفر ان کا وہ یقین کامل ہوتا جو انہیں اپنے نصب العین کی سچائی کی صورت میں عطا ہوتا ہے ان کامیاب و کامران لوگوں کی ایک نہایت اہم صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ ہر مرحلے اور ہر صورت میں اللہ کی قوت پر بھروسہ رکھتے ہیں اور توکل کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے' اللہ کی ذات پر کامل بھروسہ ایک ایسی ناقابل شکست قوت کا حامل ہے جس قوت کی بدولت وہ خود بھی ناقابل تسخیر بن جاتے ہیں' باطل حق کی قوت سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتا ہے۔ یقین محکم ایمان کی سیڑھی کا پہلا زینہ ہے وگرنہ مادی وسائل یقین محکم کے بغیر دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔

تیسری آیت میں ہے کہ عہد گزشتہ میں بھی انبیاء انسانوں ہی میں سے ہوا کرتے تھے' ان کی طرف بھی وحی کا نزول ہوتا تھا۔ اس خاص مقام پر اس اعلان کا مقصد صرف اتنا ہے کہ سب کو معلوم ہو جائے کہ وہ لوگ جو اب ماضی کا حصہ ہیں انسان ہی تھے لیکن ان کا انسان ہونا ان کے نتیجہ پیدا کرنے اور باطل کو مغلوب کرنے میں مانع نہیں رہا' سبق دیا جا رہا ہے کہ ماضی کی طرح آج بھی اہل حق باطل سے ٹکرا جائیں تو باطل کو اپنے تمام مادی وسائل کے ساتھ نیست و نابود کرنا کوئی غیر معمولی بات نہیں بلکہ یہ عین ممکن ہے اور اس دور میں بھی مطلوبہ نتائج حاصل کئے جا سکتے ہیں جس طرح اللہ کا وعدہ پچھلی اقوام کے حق میں حق ثابت ہوا اسی طرح اللہ کا وعدہ آج بھی پورا ہو سکتا ہے' شرط صرف ذوق یقین پیدا کرنے کی ہے کٹنا تو زنجیروں کا مقدر ہوتا ہے اور انہیں کٹنا ہی ہوتا ہے۔

اس حقیقت سے کسے مفر ہے کہ انسان بحیثیت انسان عموماً یقین کامل کی دولت سے محروم رہتا ہے۔ حتی کہ اہل ایقان اور اہل ایمان میں بھی فرق ہوتا ہے وہ جو ایمان نہیں رکھتے ان کی تو بات ہی دوسری ہے' وہ یقین کرنے کی بجائے اس کا مذاق اڑاتے ہیں آخرت کے اجر کو وہ "**اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ**" اور قصے کہانیاں کہہ کر ٹھکرا دیتے ہیں۔ چنانچہ اہل ایمان کے ایمان کو ایقان میں بدلنے اور نفسیاتی طور پر انہیں مطمئن کرنے کے لئے فرمایا گیا "**لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ**" کاش کہ وہ جانتے' اس ایک جملے نے مہاجرین کے ایمان کو مزید پختہ کیا۔ آنے والے راحت اور سکون کے بارے میں ان کے ایمان میں اضافہ ہوا۔ مختصر یہ کہ آیت مبارکہ توکل الٰہی اور جہد مسلسل پر یقین کامل رکھنے والے افراد کو راحت و سکون کی ضمانت بھی عطا فرماتی ہے مگر یہ ضمانت بوسیلہ ہجرت فراہم کرتی ہے۔ مختصر یہ کہ ہجرت انسانی زندگی میں ایک جرات مندانہ اقدام ہے' یہ درحقیقت ایک نعرہ مستانہ ہے اور جرات رندانہ کے ساتھ حق کا اعلان ہے جو تاریخ اسلام میں ان گنت انقلابی تبدیلیوں کی بنیاد بنا۔

۱۱۔ ہجرت: باعث رضوان

حضور ﷺ کی تیرہ سالہ مکی زندگی پر نظر ڈالیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ تبلیغ دین کا فریضہ مرحلہ وار ادا ہو رہا تھا اور کفار و مشرکین کی سازشوں کا انتہائی پامردی اور جرات سے مقابلہ کیا جا رہا تھا۔ قدم قدم پر حکمت و تدبر کے چراغ روشن کئے جا رہے تھے، تحریک اسلامی کے کارکنوں کی عملی تربیت کا بھی اہتمام ہو رہا تھا اور کارکن براہ راست دانش نبوی سے فیض یاب ہو رہے تھے اگرچہ ان پر زبردست سیاسی سماجی اور اقتصادی دباؤ تھا۔ نفرت اور حقارت کی دیواریں اونچی کی جا رہی تھیں لیکن راہ حق میں استقامت کے چراغ روشن کئے جا رہے تھے۔ اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے بارے میں بدگمانیاں پھیلائی جا رہی تھیں اور اسلامی قیادت کی کردار کشی کی جا رہی تھی، سماجی سطح پر مسلمانوں کو حقارت کا نشانہ بنایا جا رہا تھا۔ ہجرت مدینہ سے مسلمانوں کو اس فضائے تیرہ و تار سے نجات ملی اور وہ مدینہ منورہ میں اعلیٰ سماجی مراتب پر فائز ہوئے نہ صرف انہیں سیاسی غلبہ نصیب ہوا بلکہ عسکری اور اقتصادی حوالے سے ماحول اور علاقے پر ان کی گرفت بھی مضبوط ہوئی اور روحانی اقتدار کے فروغ اور اسلامی تعلیمات کے عملی نفاذ کے لئے راہ ہموار ہوئی اور ایک ایسا معاشرہ تشکیل پذیر ہوا جس کی بنیادیں خیر اور روشنی پر اٹھائی گئی تھیں، ہجرت عملاً مہاجرین کو اعلیٰ درجات دلانے کا باعث بنی۔ قرآن مجید نے اس نکتے کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا۔

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ○ يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ ○ خَالِدِيْنَ فِيْهَا اَبَدًا اِنَّ اللّٰهَ

جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنے اموال اور اپنی جانوں سے جہاد کرتے رہے وہ اللہ کی بارگاہ میں درجہ کے لحاظ سے بہت بڑے ہیں اور وہی لوگ ہی مراد کو پہنچے ہوئے ہیں۔ ان کا رب انہیں اپنی جانب

عِنْدَهٗۤ اَجْرٌ عَظِيْمٌ○
(التوبہ '۹: ۲۰-۲۲)

سے رحمت کی اور (اپنی) رضا کی اور (ان) جنتوں کی خوشخبری دیتا ہے جن میں ان کے لئے دائمی نعمتیں ہیں (وہ) ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے بیشک اللہ ہی کے پاس بڑا اجر ہے۔

آیت مذکور میں اللہ رب العزت نے مسلمانوں کے تین اعمال کا ذکر کیا ہے اور ان اعمال کے صلے میں تین طرح کے انعامات کی نوید سنائی ہے۔ ایمان' ہجرت اور جہاد (مال اور جان سے) کے انعامات' اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاص رحمت' اس کی رضا اور خوشنودی اور جنتوں کی صورت میں دیئے جا رہے ہیں' ایمان کے مقابلے میں اللہ کی خاص رحمت ہے' حق بھی یہی ہے کہ ایمان کے بغیر رحمت حق کے دروازے نہیں کھلا کرتے' ہجرت پر اللہ کی رضا نصیب ہوتی ہے رضائے الٰہی اللہ کے بندوں کو کائنات میں جنت سے بھی زیادہ عزیز ہے' رضائے الٰہی افضل ترین شئے ہے اور تخلیق' ایمان عمل واتباع وغیرہ ہر چیز کا مقصود حقیقی اللہ کی رضا ہی ہے اور یہی وہ پہلی سیڑھی ہے جس کے ذریعے انسان عظمتوں رفعتوں اور بلندیوں کی طرف قدم بڑھاتا ہے' جان ومال کے جہاد کے مقابلے میں جنت رکھی گئی ہے جو کہ ظاہر ہے اس دنیا میں زندگی اللہ کی راہ میں قربان کرنے کے صلے میں جنت میں دائمی زندگی بھی عطا فرماتا ہے' حکم دیا کہ اللہ کی راہ میں جان قربان کرنے والوں کو مردہ مت کہو وہ زندہ ہیں لیکن تمہیں ان کی اخروی زندگی کا ادراک نہیں' جنت میں جن نعمتوں سے نوازنے کا ذکر کیا گیا ہے وہ بھی دائمی ہیں اور ہمیشہ جنت میں رہنے والی ہیں جان کا بدلہ دائمی زندگی کی صورت میں اور اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے کا صلہ جنت میں ایسی نعمتیں عطا کر کے دیا جا رہا ہے جو عارضی یا وقتی نہیں بلکہ دائمی نوعیت کی ہیں۔

ایک سوال

ایک سوال ذہن انسانی میں ابھرتا ہے وہ یہ کہ رضائے الٰہی کا حصول ہر چیز پر

مقدم ہے جنت کی طلب بہت بڑی آرزو ہے۔ لیکن رضائے الٰہی کے مقابل اسے بھی ثانوی حیثیت حاصل ہے خصوصاً اولیائے کاملین اور اللہ کی راہ میں قربانی دینے والوں کے لئے اول سے آخر تک صرف اور صرف رضائے الٰہی کی تمنا ہوتی ہے' اللہ کے برگزیدہ پیغمبر بھی یہی حرف دعا لب ہائے مقدس پر سجاتے رہے۔

اَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضَاهُ
(الاحقاف '۴۶:۱۵) (النمل '۲۷:۱۹)

(اے اللہ مجھے توفیق دے) اس بات کی کہ میں ایسا نیک عمل کروں جس سے تو راضی ہو جائے۔

ایک دوسرے مقام پر اس کی صراحت بھی ہے کہ

وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ
(التوبہ '۹:۷۲)

اور (پھر) اللہ کی رضا اور خوشنودی (ان سب نعمتوں سے) بڑھ کر ہے۔

جب یہ بات واضح ہے تو اس جزا کو جہاد پر مترتب ہونا چاہئے تھا نہ کہ محض ترک وطن پر جبکہ یہاں اسے ہجرت پر مترتب کیا جا رہا ہے' سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ اس سوال کا جواب نہایت سادہ ہے' آگے بڑھنے سے پہلے ہمیں اس بات کے مفہوم کے تمام پہلوؤں کو سمجھنا ہوگا کہ اس مقام پر ہجرت کی اہمیت کیا ہے' اس کی فضیلت کیا ہے؟

امور ثلاثہ میں ہجرت کی مرکزیت

یاد رکھنا چاہئے کہ اس مقام پر مرکزی عمل' ایمان' ہجرت اور جہاد میں سے ہجرت ہے۔ باقی دونوں مرکزی نہیں ہیں' یہاں خدانخواستہ ایمان اور جہاد کی اہمیت کو کم کرنا مقصود نہیں' جہاد تو روح اسلام ہے اور ہر سطح پر جذبہ جہاد کو بیدار کئے بغیر ہم عظمت رفتہ کی بازیابی کا تصور بھی نہیں کر سکتے' اس مقام پر یہ واضح کیا جا رہا ہے کہ اگرچہ ایمان اللہ کی رحمتوں اور بخششوں کا باعث بنتا ہے بزرگان خدا کے لئے نوازشات ربی کا دروازہ کھلتا ہے لیکن اس ایمان کا عملی تحقق اس طرح تو ہرگز ہرگز ممکن نہیں کہ ایمان کا دعویدار حصار کفر میں بیٹھا رہے آزادانہ طور پر اپنی عبادات تک ادا نہ کر سکے اور وہ

طرز بود و باش اختیار کئے رہے جو اہل کفر اور اہل الحاد کو پسند ہے۔ اس کی سماجی زندگی کفار کے معاشرتی رویوں کی عکاسی کرے اور اس کے لئے اپنے ایمان کا تحفظ تک مشکل ہو جائے یہ طرز عمل منشائے ایزدی کے خلاف ہے' در رحمت کے کھلنے کا تحقق بالعموم ہجرت پر موقوف قرار پاتا ہے' اس اعتبار سے ہجرت کا درجہ ایمان کے مظہر کا ہوا' گویا رحمت کا عملی تحقق ہجرت کے ذریعے ہی ممکن ہے اس زاویہ نگاہ سے دیکھا جائے تو اصل عمل (ظاہر کے مطابق) ایمان خود نہیں رہ جاتا بلکہ رحمت حق کا دروازہ ہجرت پر کھلتا ہے۔

ان آیات میں جہاد کا ذکر بھی ہے اللہ کی راہ میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنا اور اپنے مال سے جہاد کو ممکن بنانا ایک غیر معمولی بات ہے اور اللہ کے ہاں اس کا اجر عظیم ہے۔ راہ حق میں جان و مال نذر کرنے والوں کو جنت کی بشارت دی گئی ہے مگر دیکھا جائے تو جہاد جیسا غیر معمولی عمل بھی ہجرت پر ہی موقوف ہے' اگر حضور رحمت عالم ﷺ سفر ہجرت اختیار نہ کرتے اور اپنے آبائی وطن کو خیرباد نہ کہتے تو مکہ میں کفار کے نرغے میں رہ کر عملی طور پر جہاد بالسیف بھی ممکن نہ ہوتا بلکہ معرکہ حق و باطل کی ضرورت پیش آئی تو پہلے سفر ہجرت اختیار کر کے مدینہ منورہ کو اپنا مسکن بنایا گیا' اپنی قوت کو مجتمع کیا گیا' مسلمانوں میں نظم پیدا کیا گیا اور باطل کے خلاف صف آرا ہونے کی باقاعدہ تیاری کی گئی چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہجرت ایمان کا ظاہری تحقق اور جہاد بالسیف کی بنیاد ہے خلاصہ بحث یہ ہوا کہ اس مقام پر مرکزی حیثیت نہ ایمان کو حاصل ہے اور نہ جہاد کو بلکہ اس خاص مقام پر مرکزیت کا سہرا ہجرت کے سر پر بندھتا ہے۔

رضوان کی مرکزیت

مسافران راہ حق کا سفر ہجرت اختیار کرنا بھی محض توفیق خداوندی ہے' شمع توحید کے وہ پروانے جو اللہ کی راہ میں اپنا سب کچھ لٹانے پر تیار ہو جاتے ہیں' انہیں اذن ہجرت عطا ہوتا ہے' ہجرت کے عمل سے گزرے بغیر نہ ایمان کو ردائے تحفظ نصیب ہوتی ہے' اور نہ ایقان کو استحکام ملتا ہے' تیقن کے پھول ہجرت کے خارزاروں میں کھلتے

ہیں روح کو بالیدگی سفر ہجرت میں صعوبتیں برداشت کرنے کے بعد عطا ہوتی ہے' سفر ہجرت ہی سفر انقلاب ہے اور رہتی دنیا تک انقلابی تحریکوں کے لئے مینارۂ نور بنا رہے گا' کیونکہ جب مقصود رضائے الٰہی ہو تو مرد مومن کا ہر فعل عبادت کے دائرے میں داخل ہو جاتا ہے امور ثلاثہ میں مرکزیت رضوان کو حاصل ہے وہ اس طرح کہ ایمان پر جو رحمت نصیب ہوتی ہے بندے پر جو نوازشات کی بارش ہوتی ہے وہ انسان کو اپنے مالک حقیقی کے قریب تر لے جاتی ہے چنانچہ معلوم ہوا کہ اللہ کی رحمت کا مقصد اولین حصول رضوان میں مدد فراہم کرنا ہے' دوسری طرف جنت اللہ کی رحمت سے اس لئے عطا ہوتی ہے کہ وہ اللہ کا قرب کا مقام ہے جو دلیل رضا ہے۔ لہٰذا ان جہت سے بھی جنت مقصود اصلی نہ رہی بلکہ "رضوان من اللہ" ہی اکبر ثابت ہوتی ہے۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ اللہ کی رضا مترتب ہے ہجرت پر یعنی ہجرت اللہ کی رحمت پر موقوف ہے۔

۱۲۔ ہجرت: باعث رزق حسن

ہجرت کا عمل ان گنت فضائل کا حامل ہے' اللہ کی راہ میں اٹھنے والا ہر قدم کامیابی کی علامت ہے۔ دین' دنیا کی فلاح کا ضامن ہے۔ قوت نافذہ اور غلبہ دین حق کا وسیلہ ہے' جہاد کا باعث ہونے کی بنا پر ہجرت بارگاہ خداوندی سے رزق حسن کے حصول کا ذریعہ ہے' ہجرت مہاجرین کو شہداء کے اجر بے کنار میں بڑی حد تک شریک کر لیتی ہے یعنی شہداء کے دامن آرزو میں نعمت' رحمت' اجر اور حیات ابدی کی صورت میں جو کچھ اللہ رب العزت کی طرف سے عطا ہوتا ہے وہ کافی حد تک مہاجرین کے حصہ میں بھی آتا ہے۔ ارشاد خداوندی ہے۔

وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ قُتِلُوْٓا اَوْ مَاتُوْا لَيَرْزُقَنَّهُمُ اللّٰهُ رِزْقًا حَسَنًا وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ○ لَيُدْخِلَنَّهُمْ مُّدْخَلًا يَّرْضَوْنَهٗ وَاِنَّ اللّٰهَ لَعَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ○ (الحج' ۲۲: ۵۸-۵۹)

وہ لوگ جنہوں نے اللہ کی راہ میں ترک وطن کیا پھر شہید کر دیئے گئے' یا طبعی موت سے وصال حق کیا۔ اللہ جل شانہ انہیں ضرور بالضرور (ان کی موت کے فوراً بعد قبر میں) عمدہ رزق ارزانی

فرمائیں گے اور یقیناً اللہ (ہی ہے کہ جو)
سب رزق دینے والوں سے بہتر رزق
عطا کرنے والا ہے (اور اس کے ساتھ ہی
ساتھ اللہ) انہیں ضرور بالضرور جنت میں
اعلیٰ درجات والی جگہ پر (بھی) ایسا داخل
فرمائے گا کہ وہ اس پر خوب راضی ہو
جائیں گے (بہت ہی پسند کریں گے) اور
بے شک اللہ ہر ہر بات کا ہمیشہ جاننے
والا' نہایت تحمل والا اور بردبار ہے۔

قرآن کا فیصلہ بڑا واضح اور دوٹوک ہے کہ راہ حق کا ہر مسافر خواہ اسے منصب شہادت ملا ہو یا اس نے طبعی موت پائی ہو بعینہٖ ایک ہی اجر اور ایک ہی ثواب کے حق دار ہوں گے۔

ثُمَّ قُتِلُوْٓا اَوْ مَاتُوْا (الحج' ۲۲:۵۸)　پھر وہ شہید کر دیئے گئے یا انہوں نے وفات پائی۔

اللہ کی راہ میں سفر ہجرت اختیار کرنے والے شہداء اور مرحومین کے جن اعزازات اور انعامات کا ذکر کیا جا رہا ہے ان کی تفصیل یہ ہے۔

۱۔ ان شہداء اور مرحومین کو ان کی قبروں میں رزق حسن یعنی عمدہ رزق سے نوازا جائے گا انہیں قبر میں بھی اچھی زندگی عطا ہو گی اچھا کھانا ملے گا' اور اچھا پہننے کو دیا جائے گا' انہیں جنت کی ہوائیں جنت کی خوشبوئیں اور جنت کے پھل فراہم کئے جائیں گے' ایسی ایسی نعمتیں جو ہمارے حیطہ گمان میں بھی نہیں آ سکتیں انہیں عطا کی جائیں گی' اس زندگی اور انعامات کے بارے میں ارشاد خداوندی ہے' **وَلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ** (لیکن تم اس کی بابت کچھ شعور (سمجھ بوجھ) نہیں رکھتے۔

۲۔ جب مردے قبروں سے اٹھائے جائیں گے تو راہ حق کے یہ مسافر جن میں شہداء بھی ہوں گے اور طبعی موت سے ہمکنار ہونے والے بھی' جنت میں داخل کئے جائیں گے

جہاں انہیں اعلیٰ وارفع مقامات پر رونق افروز کیا جائے گا۔ یہ اعزازات بھی شہداء اور غیر شہداء مہاجرین کے مابین مشترک ہوں گے۔

خلاصہ بحث یہ ہے کہ مہاجرین خواہ خلعت شہادت سے سرفراز ہوں یا شہادت کا اعزاز نہ پاسکیں اور طبعی موت پائیں انہیں اللہ کے ہاں یکساں اجر نصیب ہو گا اور انہیں ایک جیسا رزق حسن عطا کیا جائے گا۔

اس نکتے کی مزید وضاحت

اب یہ بات واضح ہو گئی کہ یہ تمام انعامات و اعزازات محض اللہ کی راہ میں جان قربان کرنے والے شہداء ہی سے مخصوص نہیں بلکہ ان اعزازات و انعامات کا حق دار راہ حق میں سفر اختیار کرنے والے ان مہاجرین کو بھی بنایا گیا ہے جو خلعت شہادت سے سرفراز نہ ہو سکے اور انہیں طبعی موت نصیب ہوئی۔ کیونکہ ان اعزازات و انعامات میں غیر شہداء کو بھی شامل کیا گیا ہے تو اس صورت میں اصل مبداء اجر و ثواب کچھ اور ہو گا اور وہ عامل موثر اس مقام پر ہجرت ہے کیونکہ تمام جزا کی شرط (**هاجروا**) ہے اب دوران ہجرت یا ہجرت کی بنا پر موت کا واقع ہونا طبعاً بھی ہو سکتا ہے۔ شہادتاً بھی ایسا ممکن ہے' خدائے حکمت و دانش نے شہداء اور مرحومین دونوں کا ذکر کر کے ان اعزازات و انعامات کو ہجرت کا اجر بیان کر دیا ہے۔ مختصراً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ خدائے بزرگ و برتر نے رزق حسن کا باعث محض ہجرت کو قرار دیا ہے اور یوں ہجرت کو ردائے فضیلت عطا کی گئی ہے۔

۱۳۔ ہجرت: سراسر نیکی

ہجرت کے فضائل کے بیان میں ہے کہ ہجرت نہ صرف نیک عمل میں معاون و مددگار ہے بلکہ خود بھی سراپا نیکی ہے اس اعتبار سے نیک اجر کا باعث بھی ہے' قرآن مجید میں ہے کہ

قُلْ يٰعِبَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ۭ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ۭ وَ

آپ (میری طرف سے) فرما دیجئے کہ اے میرے بندو جو ایمان لے آئے ہو'

أَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةٌ إِنَّمَا يُوَفَّى الصَّابِرُونَ أَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ
(الزمر ۳۹:۱۰)

آپ نے رب سے ڈرتے رہو، جن لوگوں نے اس دنیا میں نیک کام کئے ان کے لئے بھلائی ہے اور اللہ کی زمین کشادہ ہے۔ بلاشبہ صبر کرنے والوں ہی کو ان کے صبر کا پورا اور بے شمار اجر ملے گا۔

اس آیہ مبارکہ میں

۱۔ اللہ سے ڈرنے اور اس کے مطیع رہنے کا حکم ہے۔
۲۔ اس کے متصل نیکی کا حکم ہے اور آخرت میں اس کے اجر کا حکم دیا جا رہا ہے۔
۳۔ اس کے متصل ہجرت کا ارشاد ہے بلکہ ایک طرح سے ہجرت کا حکم دیا جا رہا ہے۔
۴۔ صبر کرنے والوں اور حق کی خاطر ڈٹ جانے والوں کے لئے بے حساب اجر و ثواب کا وعدہ کیا گیا ہے لفظ "انما" کے ساتھ مہاجرین اہل تقویٰ کے ساتھ مذکورہ خصوصی اجر و ثواب کے خاص ہونے کا بھی بیان ہے۔

نیکی کا جو حکم ہے اس کا تعلق ماقبل کے ساتھ بھی ہے اور مابعد کے ساتھ بھی۔

ماقبل سے تعلق

ماقبل کے ساتھ تعلق کو واضح کرنے کے لئے آیت کریمہ کے ترجمہ پر ایک بار پھر غور کرتے ہیں۔ ارشاد خداوندی ہے کہ "اللہ سے ڈرتے رہو جنھوں نے اس دنیا میں نیکی کی..." اس جملے سے معلوم ہوا کہ تقویٰ کو نیکی اور اصل اجر والی نیکی کی بنیاد قرار دیا جا رہا ہے، بندوں کو تقویٰ کا حکم دے کر فوراً فرمایا جا رہا ہے کہ جس نے نیکی کی یعنی تقویٰ اختیار کیا۔

مابعد سے تعلق

مابعد سے اس کے تعلق کی دو جہتیں ہیں ایک تو ماقبل کے ساتھ ملا کر اور ایک ماقبل سے ملے بغیر کی جہت،

۱۔ پہلی جہت

پہلی وجہ کے اعتبار سے معنی یہ بنے گا کہ اللہ کا تقویٰ اختیار کرو (اور یہ تقویٰ چونکہ نیکی ہے اس لئے) جس نے اس دنیا میں نیکی کی (تقویٰ اختیار کیا) اس کے لئے آخرت میں بھی بڑا اجر ہے (جو کسی طرح کی دشواری محسوس کرے یا اس کی راہ میں روڑے اٹکائے جائیں تو وہ اس نیکی کی راہ کو اپنانے کے لئے جان لے کہ) اللہ کی زمین وسیع ہے (تاکہ وہ ہجرت کر جائے) اور نیکی کی راہ اختیار کرنے میں اپنے لئے سہولت حاصل کر لے۔

۲۔ دوسری جہت

دوسری جہت میں اس کا تعلق صرف مابعد سے ہے ماقبل سے نہیں اس اعتبار سے اس کا یہ معنی ہو گا "جس نے اس دنیا میں نیکی کی اس کے لئے آخرت میں بہت بڑا اجر ہے لہٰذا اسے نیکی کرنی چاہئے' اب وہ نیکی کیسے کی جائے؟ اس کے لئے اللہ کی زمین وسیع ہے (یعنی وہ ہجرت کر جائیں) اس اعتبار سے ہجرت کا ذکر اس سوال کے جواب میں آیا ہے کہ وہ نیکی کیسے ہے؟ آیہ کریمہ کی روشنی ہجرت بذات خود ایک نیکی ہے' اب جبکہ طے ہو گیا کہ ہجرت خود ایک نیکی ہے تو اس کا مفہوم یہ ہوا کہ جس نے دنیا میں نیکی کی یعنی ہجرت کی' سفر ہجرت اختیار کیا' اس کے لئے آخرت میں بڑا اچھا اجر ہے اس اعتبار سے ہجرت آخرت میں اچھے اجر کا باعث بنتی ہے۔ گویا ہجرت دنیا و آخرت میں فلاح کا ایک کشادہ اور سیدھا راستہ ہے۔ اس آیہ مبارکہ میں ان نکات پر روشنی پڑتی ہے کہ ہجرت خود ایک نیکی ہے باعث اجر ہے اور نیکی کی راہ اختیار کرنے میں معاون ہے۔

خلاصہ بحث

ہم نے فضائل ہجرت کے مختلف پہلوؤں اور مختلف جہتوں پر بحث کرتے ہوئے آیات ربانی سے استدلال کیا فضائل ہجرت کے بارے میں درج ذیل نکات سامنے آئے ہیں۔

۱۔ ہجرت شریعت اسلامیہ کا ایک مستقل لازمی بنیادی تصور ہے جو ایک مسلمان کے عقائد اس کے اعمال افعال اور کردار کا عنوان بنا۔

۲۔ ہجرت حفظ ایمان کا ایک ذریعہ بھی ہے نہ صرف حفظ ایمان کا بلکہ استحکام ایقان کا بھی۔

۳۔ ہجرت، حق اور باطل کے درمیان امتیاز کرتی ہے، ایمان اور منافقت کے درمیان حد فاصل ہے گویا ایمان اور حق کی پہچان ہجرت کے وسیلہ جلیلہ سے ہوتی ہے۔

۴۔ ہجرت ثقافتی سطح پر اسلام کے تصور مواخات کے اظہار کا ایک خوبصورت ذریعہ ہے۔ ہجرت اسلامی اخوت کی وہ خوشبو ہے جس سے تاریخ آج بھی مہک رہے ہیں، وسیع تر بنیادوں میں انسانی معاشرے کے قیام کا پہلا سنگ میل، انسانی رشتوں کی ایک ایسی زنجیر جو افق عالم پر دائمی امن کی بشارتیں لے کر طلوع ہوئی۔

۵۔ تصور ہجرت نے تصور جہاد کو مضبوط بنیادیں فراہم کیں، کفر کے ساتھ دیوانہ وار ٹکرا جانے کا شعور عطا کیا، راہ حق میں اپنا تن من دھن سب کچھ قربان کر دینے کی خوئے دلنواز سے نوازا۔

۶۔ ہجرت نہ صرف دنیا میں مسلمانوں کے وقار اور تمکنت کا باعث بنی بلکہ ایک مسلمان کے لئے نجات اخروی کا بھی ذریعہ بنی ہے۔

۷۔ ہجرت ایمانیات کے باب میں خدائے وحدہ لا شریک کی عبادت کے موثر اہتمام کا وسیلہ بھی بنی، توحید کے پرچم چار دانگ عالم میں لہرانے لگے، اپنے وسیع تر مفہوم میں ہجرت اشاعت دین کا پہلا زینہ ثابت ہوئی۔

۸۔ ہجرت نے قدم قدم پر باب رحمت وا کر کے مسافران راہ حق کے دامان آرزو کو خیر و برکت کے پھولوں سے بھر دیا اور ان کا کشکول تمنا رحمت کے سکوں سے لبریز ہو گیا۔ ہجرت بارگاہ الوہیت سے رحمت کے خزانے لوٹنے کی نوید ہے۔

۹۔ ہجرت دامن عصیاں کے ہر داغ کو مٹا دیتی ہے۔ ظاہر اور باطن دونوں کو ایمان کی روشنی سے منور کرتی ہے اور انسان کے گناہوں کا کفارہ بنتی ہے۔

۱۰۔ ہجرت اس دنیا میں بھی انسان کی فلاح کی ضمانت دیتی ہے اور آخرت میں اچھے انجام سے ہمکنار کرتی ہے' ہجرت خیر ہی خیر ہے۔ روشنی ہی روشنی ہے جس سے دونوں جہانوں میں چراغاں ہوتا ہے۔

۱۱۔ ہجرت انسان کو اعتماد ہی نہیں اعتبار کی دولت سے بھی نوازتی ہے' شعور کی پختگی ایمان کی پختگی سے مشروط ہے' اور ہجرت قصر ایمان کو انہی پختہ بنیادوں پر تعمیر کرتی ہے۔ ہجرت انسان کو اپنے نصب العین کی سچائی پر یقین کامل کا جوہر عطا کرتی ہے اور یوں انسان کے قلبی اطمینان اور اس کی راحت جان کا باعث بنتی ہے۔

۱۲۔ ہجرت جنت الفردوس میں انسان کے لئے ان گنت انعامات و اعزازات کا دروازہ کھولتی ہے اسے اجر پہاڑ بن کر ملتا ہے اور وہ ہر لحظہ نوازشات خداوندی سے فیض یاب ہوتا ہے۔

۱۳۔ ہجرت ایمان کامل کی بنیاد ہے ایمان کی وہ پختگی جس پر فرشتے بھی رشک کرتے ہیں' ہجرت اللہ پر توکل کی ظاہری علامت ہے اور جسے توکل کی دولت نصیب ہو جائے وہ اپنے معبود حقیقی کی بارگاہ میں سربسجود رہتا ہے اور اپنے ہر معاملے کو وہ اللہ کے سپرد کر دیتا ہے اور اللہ قدم قدم پر اس کے لئے دشوار راہوں کو آسان بناتا ہے اس کی دستگیری کرتا ہے اور اس کی مشکلیں آسان کرتا ہے۔

۱۴۔ ہجرت رضائے الٰہی کے حصول کا ذریعہ ہے اور رضائے الٰہی ہی مقصود عبادت ہے۔

۱۵۔ ہجرت سفر آخرت کی منزلیں بھی آسان کرتی ہے' اور جنت میں رزق حسن کی فراوانی کی بھی ضمانت دیتی ہے۔

۱۶۔ ہجرت جنت میں داخلے کا ذریعہ ہے' اللہ اپنے ان بندوں پر اپنے فضل بے پایاں کی بارش کر دیتا ہے جو اس کی راہ میں سفر ہجرت اختیار کرتے ہیں۔

۱۷۔ ہجرت خود ایک نیکی ہے اور ان گنت نیکیوں کا پیش خیمہ بنتی ہے' ہجرت بدی کے خلاف اعلان جنگ ہے۔

۱۸۔ جیساکہ بیان ہوا ہجرت سراپا نیکی ہے نیکی کی راہ اختیار کرنے والوں کی معاون بھی ثابت ہوتی ہے اور اس کی یہ معاونت نیکیوں کا دروازہ کھول دیتی ہے۔

ہجرت تاریخ انسانی کا ایک روشن باب ہے جو مختلف حوالوں اور مختلف جہتوں سے اولاد آدم کی سیاسی اقتصادی ' سماجی ' ثقافتی 'اعتقادی اور روحانی زندگی پر اثر انداز ہوئی اور اس کائنات ہست و بود کے آخری دن تک اس کے فیوض و برکات سے بنی نوع انسان فیض یاب ہوتی رہے گی ' ہجرت کے فضائل میں بہت کچھ کہا گیا ہے اور بہت کچھ کہا جائے گا ' لیکن ایک بات طے ہے کہ ہجرت اسلامی تاریخ کا ایک انقلابی موڑ ہے ایک ایسا دروازہ ہے جس سے گزر کر مسافران راہ حق نے ایک ایسے تمدن کی بنیاد رکھی ہے جو روشنیوں کا مرکز و محور ہے ' اسی دروازے سے گزر کر جہاد کے دروازوں پر دستک دی گئی ' دین حق کو تمام ادیان باطلہ پر غلبہ حاصل ہوا ' نفاذ اسلام کی عملی تعبیر سامنے آئی اور مصطفوی انقلاب کی تکمیل کا مرحلہ طے ہوا۔ ہجرت محض نقل مکانی کا نام نہیں یہ ان تمام مصنوعی حد بندیوں کو توڑنے کا نام ہے جن حد بندیوں نے انسان کی سوچ تک کو مفلوج کر رکھا تھا اور اسے رنگ و نسل کی اونچی دیواروں میں محصور کر کے انقلابی تبدیلیوں کے ہر دروازے کو مقفل کر دیا تھا۔ ہجرت ان تمام تنگناؤں سے نکل کر کھلی اور کشادہ فضا میں نئے موسموں کے استقبال کا نام ہے۔

باب ۔ ۴

ہجرت: احادیث مبارکہ کی روشنی میں

گزشتہ باب میں ہم نے آیات ربانی کی روشنی میں ہجرت کے فضائل کا جائزہ لیا اور ان نکات سے بحث کی جنہیں اللہ رب العزت نے مذکورہ آیات میں کھول کھول کر بیان کیا اور جنہیں دنیا و آخرت میں انسان کی کامیابی و کامرانی کا ضامن قرار دیا ہے۔ اس باب میں ہم احادیث مبارکہ کے حوالے سے ہجرت کے فضائل کا ذکر کریں گے۔

افضل ہجرت

ہجرت کی مختلف صورتیں اور مختلف جہتیں ہو سکتی ہیں' ہجرت ایک جامد اور محدود عمل کا نام نہیں یہ ایک مثبت رویے' ٹھوس فلسفے اور ایک زندہ تحریک کا نام ہے' یہ ان قابل عمل اساسی رویوں کا نام ہے جو تاریخ انسانی کے ارتقاء کا سبب بنتے ہیں' جن کے بغیر تاریخ کا سفر رک جاتا ہے اور ذہن انسانی جستجو کے ہنر سے محروم ہو جاتا ہے' ہجرت کے مختلف درجات ہیں جن میں کچھ کم اور کچھ زیادہ ارفع و اعلیٰ ہیں۔

ان النبی ﷺ ..... فای الھجرۃ افضل؟ ..... من ھجر ماحرم اللہ عزوجل

(سنن نسائی: کتاب الزکوۃ' باب جھد المقل)

آقائے دوجہاں ﷺ کی خدمت میں عرض کیا گیا۔ کون سی ہجرت زیادہ فضیلت و بزرگی والی ہے (زیادہ اہم اور اجر کا باعث ہے) فرمایا کہ (اس شخص کی ہجرت) جس نے ہر اس کام کو ترک کر دیا جس کو اللہ جل مجدہ نے حرام کیا ہے۔

آقائے نامدار حضرت محمد ﷺ کے بارگاہ اقدس میں سوال عرض کیا گیا ہے کہ یا رسول اللہ (میرے ماں باپ آپ قربان) کون سی ہجرت افضل ہے؟ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا یوں تو ہجرت کی فضیلت اور اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے' لیکن جو لذت اور حلاوت ایمانی اور افضلیت ایسی ہجرت میں ملتی ہے' جس کی بنا پر ہجرت کرنے والا اللہ کے منع کردہ ہر عمل سے سو فی صد مجتنب ہو جاتا ہے تو اس کی افضلیت کی بات ہی کچھ

اور یہ انسانی فطرت ہے کہ اسے جس چیز سے منع کیا جائے اور روکا جائے وہ اسی چیز کی جستجو میں لگ جاتا ہے۔ حرام چیزوں کی طرف کھنچا چلا جاتا ہے اس لئے کہ گناہ میں ظاہراً کشش زیادہ ہوتی ہے اور پھر مسلمان ہونا تو شہادت گہ الفت میں قدم رکھنا ہے یہاں تو قدم قدم پر ابتلاء و آزمائش کے مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس فضا میں احکامات خداوندی کی پیروی کرنا' حرام چیزوں سے اجتناب کرنا' اپنے ایمان کی حفاظت کرنا اور تمام ممنوعات سے عملاً ہجرت اختیار کرنا یعنی انہیں چھوڑ کر شریعت اسلامیہ کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنانا نہ صرف استحکام ایقان کا باعث بنتا ہے بلکہ بندے کا یہ طرز عمل عین مشیت ایزدی کے بھی مطابق ہے گزشتہ باب میں ہجرت اور ہجرت شرعیہ کے مابین فرق کو واضح کیا گیا تھا اور بتایا گیا تھا کہ ہجرت شرعیہ ہجرت الی الرسول کو کہتے ہیں جس کی حقیقی روح یہ ہے کہ ہجرت انسان کی ایمانی ترقی کا موجب ہے اور اس سے اسے روحانی کمالات حاصل ہوتے ہیں ہجرت شرعیہ کے ثمرات اسی طرح حاصل کئے جا سکتے ہیں کہ انسان اللہ کی حرام کردہ اشیاء کو ہر اعتبار سے حرام جانے اور اللہ کی حلال کردہ اشیاء کو حلال سمجھے' جس بات سے اسے روکا گیا ہے اپنے ہر مفاد کو قربان کر کے اس امر سے رک جائے۔ یہی وہ بنیادی وجہ ہے جس کی بنا پر ہجرت شرعیہ کو افضل ترین ہجرت قرار دیا گیا ہے۔ یوں ذہنی اور باطنی ہجرت' ہجرت شرعیہ کے دائرے میں داخل ہو جاتی ہے۔

ہجرت ایک بے مثل عمل کا نام

انسان جب اطاعت خداوندی کو اپنا شعار بنالیتا ہے' رضائے الٰہی اس کے ہر عمل کا مقصود ٹھہرتا ہے تو وہ مقدور بھر کوشش کرتا ہے کہ احتیاط کا دامن اس کے ہاتھ سے نہ چھوٹے' رفتہ رفتہ اس کا میلان روحانی بڑھتا ہے اور وہ تیزی سے روحانیت کے مدارج طے کرنے لگتا ہے' وہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہنے لگتا ہے وہ اس جستجو میں رہتا ہے کہ کوئی افضل اور بے مثل عمل سے گزرنے کا اسے موقع ملے اور وہ اس

عمل پر دل وجان سے عمل کر کے بے پایاں رحمتوں کا سزاوار ٹھہرے' یہی آرزو اور جستجو صحابہ ؓ کو مضطرب رکھتی اور وہ نیکی کے کاموں میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے ایثار و قربانی میں بھی ایک دوسرے سے بڑھنے کی کوشش کرتے مسابقت کے اس جذبے سے معاشرے میں صحت مند روایات فروغ پذیر ہوتی ہیں' نیکی کی اس دوڑ میں خیر کے پہلو کے سوا کچھ بھی نہیں' حضرت کثیر بن مرۃ ؓ' حضرت ابو فاطمہ ؓ کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں کہ انہوں نے تاجدار کائنات ﷺ کی خدمت اقدس میں عرض کیا:

یا رسول اللہ! حدثنی بعمل استقیم علیہ واعملہ' قال لہ رسول اللہ ﷺ: علیک بالھجرۃ فانھا لا مثل لھا (سنن نسائی: باب الحدیث علی الھجرۃ من کتاب البیع من المجتبیٰ مسند احمد بن حنبل' ۲:۳۱۵ / ۳:۴۷۰)

یا رسول اللہ (میرے ماں باپ آپ پر قربان) مجھے ایسے عمل کے بارے میں ارشاد فرمائیں جس پر میں استقامت اختیار کروں (اور ثابت قدمی کے ساتھ) اس پر عمل کروں' اس پر آقائے دوجہاں ﷺ نے ارشاد فرمایا "تم ہجرت کو لازم پکڑ لو کیونکہ اس کا بلاشبہ کوئی مثیل و نظیر نہیں ہے"

ہجرت کے عملی اور نظری پہلوؤں کو نظرانداز کرنے کا نتیجہ

ہجرت کو لازماً پکڑنے کا حکم دیا جا رہا ہے کیونکہ فرمان مصطفیٰ ﷺ کے مطابق ہجرت ایک ایسا عمل ہے جس کی نہ کوئی نظیر ہے اور نہ کوئی مثیل' بدقسمتی سے ہم نے ہجرت کو اپنے وسیع تر تناظر میں دیکھنے کی بجائے عملاً اسے محض نقل مکانی تک محدود کر لیا ہے اور اسے اپنی سوچ کی تنگناؤں میں محصور کر رکھا ہے۔ ہجرت کے عملی اور نظری پہلوؤں کو نظر انداز کر کے اسے قصے کہانیوں کی ذیل میں شامل کر رکھا ہے۔ حالانکہ ہجرت ایک تحریک کا نام ہے اور اسے ہر شعبہ زندگی میں زندہ کر کے ہم ان گنت فیوض

وبرکات سے فیض یاب ہو سکتے ہیں' عظمت رفتہ کی بازیابی کا خواب ہجرت کو عملاً اپنی زندگیوں کا عنوان بنائے بغیر شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ مسلم امہ آج دور زوال وانحطاط میں سے گزر رہی ہے اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہم نے ہجرت کا باب بند کر رکھا ہے۔ جہاد کو اپنی عملی زندگی سے خارج کر کے ہم نے بے توقیری کی زندگی کو اپنے گلے کا ہار بنالیا ہے۔ فلسفہ ہجرت کو موٹی موٹی کتابوں میں بند کر کے ہم نے اپنے ہر عمل کو زنگ آلود کر لیا ہے' ہجرت اور جہاد کے راستوں پر چل کر ہی ہم احیائے اسلام اور غلبہ دین حق کی بحالی کا کارنامہ سرانجام دے سکتے ہیں۔ اگر ہم عالم اسلام کے افق پر ایک بار پھر مصطفوی انقلاب کے سورج کو طلوع ہوتے دیکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں ہجرت اور جہاد کے مقفل دروازوں کو کھولنا ہو گا۔

ہجرت ایک مسلسل امتحان کا نام

ابتلاء و آزمائش کے مراحل سے گزرے بغیر گوہر مقصود ابھی تک کسی کے ہاتھ نہیں آیا' ہجرت بھی ایک امتحان ہے' سفر ہجرت میں قدم قدم پر حوصلوں کو آزمایا جاتا ہے' انسان کی استقامت کو پرکھا جاتا ہے کہ وہ مصائب و آلام کی گھٹا ٹوپ رات میں کس حد تک ثابت قدم رہتا ہے' ہوائے مخالف کے تھپیڑوں کا کس مردانگی اور جرأت سے مقابلہ کرتا ہے ایثار و قربانی کا وقت آئے تو وہ کس طرح خندہ پیشانی سے اپنا سب کچھ راہ حق میں قربان کرنے پر تیار ہو جاتا ہے اور میدان جہاد میں ماتھے پر ایک شکن ڈالے بغیر کس طرح اپنا سر اپنی ہتھیلی پر سجا کر نکل آتا ہے۔ قدم قدم پر اس کی جذباتی وابستگیوں پر چوٹ پڑتی ہے۔

(ا) اسے اپنے وطن کو خیرباد کہنا پڑتا ہے' اپنی مٹی سے قطع تعلق کرنا پڑتا ہے' جذباتی وابستگیوں اور ثقافتی بندھنوں سے دامن چھڑانا پڑتا ہے۔

(ب) اپنے اس گھر کے درودیوار کو خدا حافظ کہنا پڑتا ہے جو اس کے بچپن سے جوانی تک اور جوانی سے بڑھاپے تک ایک ایک لمحے اور ایک ایک ساعت کے عینی گواہ

ہوتے ہیں۔

(ج) فکری اور روحانی رشتوں کو خون کے رشتوں پر ترجیح دینا پڑتی ہے' اپنے والدین' اپنے بہن بھائیوں' اپنے بچوں اور اپنے عزیز و اقارب سے ناطہ توڑ کر ایک نیا جہاں آباد کرنا پڑتا ہے۔

(د) اپنی دوستیوں کو قربان کرنا پڑتا ہے' اپنے بچپن کے ساتھیوں سے کنارہ کشی اختیار کرنا پڑتی ہے۔

(ہ) یہ معلوم نہیں ہوتا کہ ہجرت اختیار کرنے کے بعد ذریعہ معاش کا کیا بنے گا' کوئی روزگار ملے گا بھی یا نہیں'

(و) سفر ہجرت پر روانہ ہوتے وقت یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ نئے علاقے یا نئی جگہ میں سر چھپانے کے لئے کوئی چھت میسر آئے گی یا نہیں۔

یہ سب باتیں ہجرت کو ایک مشکل عمل بنا دیتی ہیں' اس لئے ہجرت کو ایک کڑی آزمائش سے تعبیر کیا گیا ہے' اپنی کشتیاں جلا کر راہ حق میں نکلنا اور پھر ثابت قدم رہنا' ہر قسم کے مشکل حالات کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کرنا ایک جرات رندانہ کا متقاضی ہے۔ ہر انسان اس جرات رندانہ کا حامل نہیں ہوتا۔ کشتیاں جلا کر سمندر میں چھلانگ لگانا ہر کسی کے بس میں نہیں ہوتا کیونکہ ہجرت میں مصائب' مسائل اور آلام کا ایک لمبا سفر طے کرنا پڑتا ہے اس لئے ہجرت کی فضیلت بھی اس قدر بیان کی گئی ہے' ہجرت کی فضیلت بیان کر کے اہل ایمان کو ہجرت کی ترغیب دی گئی ہے' ہجرت چونکہ ایک مسلسل امتحان کا نام ہے اور ہر کوئی اس امتحان پر پورا نہیں اتر سکتا اس لئے بعض افراد کو ہجرت سے روک بھی دیا گیا۔ حضرت ابو سعید سے مروی ہے ایک اعرابی نے حضور ﷺ کی بارگاہ بیکس پناہ میں ہجرت سے متعلق سوال عرض کیا تو آقائے دو جہاں ﷺ نے فرمایا:

ویحک! ان شان الهجرة لشديد فهل لک من ابل؟ قال نعم: قال فهل تو تی صدقتها؟ قال نعم: قال فاعمل	ویحک! بے شک ہجرت کا معاملہ بہت شدید ہے کیا تمہارے پاس کوئی اونٹ ہے' عرض کرنے لگا ہاں' فرمایا "کیا تم

وراء البحار فان اللہ عزوجل لن یترک من عملک شیئا

(صحیح البخاری: کتاب مناقب الانصار' حدیث: ۳۹۲۳)
(صحیح المسلم: کتاب الامارۃ' حدیث: ۱۸۶۵)
(النسائی' باب شان الہجرۃ)

اس کا صدقہ دیتے ہو (زکوٰۃ دیتے ہو) عرض کیا ہاں' (آقا علیہ السلام نے اس پر) ارشاد فرمایا کہ پھر تم گاؤں / دیہاتوں سے پرے (یعنی دوردراز کے اپنے گاؤں یا علاقے میں رہو اور وہیں) محنت مزدوری کرو۔ کیونکہ بلاشبہ اللہ تمہارے (نیک) عمل میں سے کسی بھی شئے کو ضائع نہیں کرے گا (اس کے اجر میں نقص یا کمی بھی نہیں ہو گی۔

حدیث مذکورہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہجرت اہل ایمان کا ایک غیر معمولی عمل ہے بعض لوگ آلام و مصائب کے پہاڑ دیکھ کر حوصلہ ہار بھی بیٹھتے ہیں اس لئے ہر شخص ہجرت کی سختیاں برداشت نہیں کر سکتا' ہجرت مومنین کا عظیم الشان عمل ہے خصوصاً وہ ہجرت جو حضور ﷺ کی سنگت میں اختیار کی جائے کہ اس سفر ہجرت کا ایک ایک لمحہ سعادت دارین کا حامل ہے' یہ دیوانہ وار ہجرت وہ عظیم اصحاب رسول ہی اختیار کر سکتے تھے جو شمع رسالت پر پروانوں کی طرح جل جانے کا شوق اپنے سینوں میں چھپائے پھرتے تھیں۔

ہجرت: سفر ارتقاء کا سنگ میل

ہجرت کڑے امتحان کا اور ابتلا و آزمائش کے ایک پر خار راستے سے گزرنے کا نام ہے۔ یہ امتحان ہے خوئے تسلیم و رضا کا' یہ آزمائش ہے جوہر صبرو تحمل کی اور یہ مرحلہ دشوار ہے حرف استقامت کے جملہ مراحل کامیابی سے طے کرنے کا' ہجرت سفر ارتقاء کا سنگ میل' اہل ایمان کے لئے مینارہ نور' سپاہ انقلاب کے لئے مصطفوی

انقلاب کے اجالوں کا استعارہ اور ظلمت شب میں روشنی کی علامت' ہجرت کا ثقافتی' تمدنی حوالہ بھی بڑا توانا' جاندار اور معتبر ہے' معاشرہ شہروں' قصبات اور دیہات میں آباد افراد سے مل کر بنتا ہے اس اعتبار سے ایک شہری اور ایک دیہاتی کی ہجرت میں بھی فرق ہے۔

شہری اور دیہاتی زندگی میں فرق

شہروں اور دیہات کا ثقافتی پس منظر بعض حوالوں سے ایک دوسرے سے مختلف بلکہ متضاد ہوتا ہے ان کے اجتماعی اور انفرادی رویے بھی مختلف ہوتے ہیں زبان وادب سے لے کر رہن سہن اور زندگی گزارنے کے رنگ ڈھنگ تک مختلف ہوتے ہیں۔

(۱) دیہاتیوں کی مجلسی زندگی میں ایک ٹھہراؤ سا ہوتا ہے' ماحول شہروں کی ہنگامہ خیز زندگی کی نسبت پرسکون ہوتا ہے' دیگر ممالک اور دیگر تہذیبوں کا اثر بلاواسطہ اہل دیہات پر نہیں پڑتا جبکہ شہروں کے لوگوں کو اپنی سیاسی اور معاشی زندگی میں بیرون ملک روابط استوار کرنا پڑتے ہیں اور یہ لوگ براہ راست دوسروں کی ثقافتی سیاسی اور معاشرتی یلغار کا ہدف بنتے ہیں' ان کی زبان اور ان کا ادب بھی متاثر ہوتا ہے جبکہ دیہات کی زبان دیگر زبانوں کے اختلاط سے بڑی حد تک محفوظ رہتی ہے یہی وجہ تھی کہ شہروں میں بسنے والے عرب قبائل اپنے بچوں کو دیہات میں بھیج دیا کرتے تھے تاکہ ان کی زبان فصاحت و بلاغت کے جواہر سے بھی آراستہ ہو اور ان کی نشوونما بھی نسبتاً کھلی آب وہوا میں ہو۔

(۲) دیہات کا ماحول شہروں کی نسبت سادہ ہوتا ہے شہروں کی پر آسائش زندگی تصنع و بناوٹ کا شکار ہو کر اپنے قدرتی حسن سے محروم ہو جاتی ہے۔ شہروں کی فضا اپنے پرپیچ تمدنی مراسم کی وجہ سے بوجھل اور معاشی روابط اور ہنگامہ خیزی کی وجہ سے آلودہ رہتی ہے انسان اس ماحول میں قدرتی بے ساختہ پن کا جوہر کھو دیتا ہے۔ طبعی بے تکلفی مفقود

ہو جاتی ہے، شہری زندگی مفادات کی گرفتِ ناروا میں سسکتی رہتی ہے جبکہ دیہاتی ماحول اپنی سادگی کی بنا پر خلوص و محبت کا گہوارہ بنا رہتا ہے۔

(۳) شہروں کا پر آسائش ماحول شہریوں کو آرام طلب بنا دیتا ہے جبکہ دیہاتی بنیادی طور پر جفاکش ہوتے ہیں یہی جفاکشی انہیں شجاعت اور بہادری کے جواہر سے آراستہ کرتی ہے، دماغی قوتیں بیدار رہتی ہیں شہریوں کے اعصاب ہمیشہ شل رہتے ہیں ان کے چہروں پر تھکن کے آثار نمایاں ہوتے ہیں۔

(۴) شہروں میں بسنے والے افراد دیہات میں بسنے والے لوگوں کی نسبت معاشی لحاظ سے آسودہ ہوتے ہیں شہری تجارت اور صنعت و حرفت میں دیہاتیوں سے بہت آگے ہوتے ہیں۔ آگے بڑھنے کے وسائل بھی شہریوں کو زیادہ میسر آتے ہیں اور وہ زندگی کی دوڑ میں اپنے دیہاتی بھائیوں سے بہت آگے نظر آتے ہیں اقتصادی پس ماندگی کل بھی دیہات کا مقدر تھی اور آج بھی ان کی زندگی کو سوہان روح بنائے ہوئے ہے۔عرب تمدن میں بھی شہر خصوصاً مکہ معظمہ ایک بہت بڑا تجارتی مرکز تھا جہاں سے قافلے شام اور دیگر ممالک کی طرف سامان تجارت لے کر جاتے اور واپسی پر ضروری اشیاء لا کر مکہ کی تجارتی منڈیوں میں فروخت کرتے۔

(۵) شہر کے لوگوں کی نسبت دیہات کے لوگ آسانی سے نقل مکانی کرنے کی پوزیشن میں ہوتے ہیں لیکن شہروں میں شہری جائیدادیں نقل مکانی کرنے میں رکاوٹ بنتی ہیں۔ دیہات سے شہروں کی طرف آبادی کا انتقال آج بھی جاری ہے اور عرب معاشرے میں بھی روزگار کی تلاش میں دیہات کا مرکزِ نگاہ شہری آبادیاں ہی ہوا کرتی تھیں یہ اس لئے بھی کہ دیہاتی آسانی سے نقل مکانی کے مرحلے سے گزر جاتے ہیں بلکہ بعض تو مستقل نقل مکانی اختیار کر لیتے ہیں اور خانہ بدوش قبائل کی صورت میں شہروں کے مضافات میں عارضی سکونت اختیار کر کے نئے آشیانوں کی تلاش میں رہتے ہیں' تن آسانی، کسل مندی، سستی، سہولت پسندی اور آرام طلبی شہری زندگی کی عطا ہے اس کے برعکس جفاکشی دیہاتی زندگی کا جوہر ہے ان کی یہی طبعی جفاکشی انہیں شدید حالات

میں بھی ثابت قدم رہنے کے قابل بنا دیتی ہے یہ لوگ مفاد پرستی سے دور رہتے ہیں اور ایثار و قربانی کو اپنا شعار بنائے رکھتے ہیں۔

(۶) شہروں کے لوگ تعلیمی میدان میں دیہات کے لوگوں سے آگے ہوتے ہیں، تعلیمی پس ماندگی اہل دیہہ کے ہر میدان میں پیچھے رہ جانے کا باعث بنتی ہے، وہ کسی فلسفیانہ بحث میں نہیں الجھتے جو بات سمجھ میں آ گئی اس پر سختی سے کاربند رہتے ہیں، نظریے سے گہری وابستگی اور صاحب نظریہ کے ساتھ غیر مشروط اور غیر متزلزل وابستگی اور وفاداری ان کا ایمان بن جاتا ہے۔ ان کے قصر ایمان کو منہدم کرنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ قبول حق کی راہ میں یہ کسی مصلحت کو دیوار نہیں بننے دیتے۔ شہری زندگی ایمان کے ان جواہر کو سمیٹنے میں عموماً بہت پیچھے رہ جاتی ہے۔ شہری لوگ اندیشہ ہائے دور دراز میں مبتلا ہو جاتے ہیں، اپنے لئے غیر ضروری تحفظات کے طلب گار ہوتے ہیں۔ ان کے سیاسی و معاشی اور قبائلی مفادات ان کے پاؤں کی زنجیر بن جاتے ہیں اور انہیں حرفِ حق قبول کرنے سے روکتے ہیں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ اور حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ کے درجے کے لوگ بہت کم تھے۔ چنانچہ ہجرت تو دور کی بات ہے یہ لوگ قبول حق میں بھی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کر رہے تھے سوائے "**اَلسَّابِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهَاجِرِيْنَ**" یا "**مُسْتَضْعَفِيْنَ**" کے،

اعلان نبوت اور پھر ہجرت مدینہ کے وقت عرب معاشرے میں شہری اور دیہاتی زندگی کا یہ وہ منظر نامہ تھا جو عربوں کے سماجی، سیاسی، ثقافتی اور معاشی رویوں کا آئینہ دار تھا۔ سیدنا عبد اللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ ایک شخص حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں حاضر ہوا اور عرض پرداز ہوا کہ آقا ارشاد فرمایئے۔

ای الهجرة افضل؟ قال ان تهجر ما كره ربک عز وجل وقال رسول الله ﷺ الهجرة هجرتان هجرة الحاضر و هجرة البادی، فاما البادی	کونسی ہجرت افضل ہے؟ (تو آپ ﷺ نے) ارشاد فرمایا (افضل ہجرت یہ ہے کہ) تم اس شئے کو چھوڑ دو جو اللہ کو ناپسند ہو اور رسول خدا ﷺ نے

فیجیب اذا دعی و یطیع اذا امر و اما الحاضر فھو اعظمھما بلیۃ و اعظمھما اجرا

(سنن النسائی: کتاب البیعۃ باب ہجرۃ البادی ۱۷۹: ۲ / مسند احمد حنبل، ۲: ۱۹۱)

ارشاد فرمایا ہجرت دو طرح کی ہوتی ہے متمدن شہری کی ہجرت اور دیہاتی کی ہجرت' جہاں تک دیہاتی کا تعلق ہے تو (اس کی تو حالت یہ ہے کہ) جب اسے دعوت دی جائے تو قبول کرتا ہے اور جب اسے حکم دیا جائے تو اطاعت کرتا ہے' (اس طرح ہجرت اس کے لئے طبعاً کوئی مشکل بات نہیں رہتی) اور جہاں تک شہری کا تعلق ہے اس پر سختی بہت زیادہ ہے اور سب سے بڑھ کر ثواب بھی اسے ہے۔

ظاہر ہے شہری زندگی کو خیرباد کہہ کر ہجرت کا سفر اختیار کرنا' دیہاتی زندگی سے ترک تعلق کر کے ہجرت کے راستے پر نکل آنے سے زیادہ مشکل ہے اور زیادہ ایثار و قربانی کا متقاضی ہے۔ چنانچہ حدیث پاک میں اس ہجرت کو افضل قرار دیا جا رہا ہے جو زیادہ آزمائشوں کا باعث ہو۔

ہجرت کی بابت آقا علیہ السلام کی دعا

اگرچہ سفر ہجرت اختیار کرنا بھی کوئی اتنا آسان کام نہیں لیکن سفر ہجرت کو اس کے جملہ تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے پایہ تکمیل تک پہنچانا یقیناً ایک ایسا اعلیٰ و ارفع عمل ہے جس میں قدم قدم پر ان گنت مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ زمین سے وابستگی پاؤں کی زنجیر بن جاتی ہے۔ مفادات کا ایک لامتناہی سلسلہ رستے میں پہاڑ بن کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ خونی رشتوں کا تقدس دامن دل کو کھینچتا ہے جذباتی وابستگی اٹھتے ہوئے قدموں کو روک دیتی ہے' معاشی اور سیاسی مفادات پر خط تنسیخ پھیر کر آزمائش و ابتلاء کی زنجیر کو گلے کا ہار بنا لینا غیر معمولی انسانوں کا غیر معمولی فیصلہ ہے۔ خود ہادی برحق ﷺ سفر ہجرت میں نکلنے

والے مسافران راہ حق کے لئے ثابت قدم رہنے کی دعا فرما رہے ہیں۔ حضرت امام بخاریؒ ایک طویل حدیث حضرت عامر بن سعد بن مالکؓ کے والد مکرم حضرت سعد بن وقاصؓ سے روایت کرتے ہیں کہ حضور ﷺ ان کی عیادت کے لئے تشریف لے گئے تو دوران گفتگو تاجدار کائنات ﷺ نے فرمایا:

اللھم امض لاصحابی ھجرتھم ولا تردھم علی اعقابھم لکن البائس سعد ابن خولہ	اے اللہ! میرے ساتھیوں (اصحاب) کی ہجرت (کے اجر) کی تکمیل فرما اور انہیں الٹے پیروں نہ پھیر، لیکن بے چارہ غریب سعد بن خولہ

(صحیح البخاری: کتاب مناقب الانصار)
(صحیح المسلم: کتاب الوصیہ)

آں خنک شہرے کہ آنجا دلبر است

نور و نکہت کے سوتے نقوش کف پائے حضور ﷺ کی اترن سے پھوٹتے ہیں، جمال و جلال کی ہر کیفیت اسی در اقدس کی چاکری پر مامور ہے، رعنائی خیال کا ہر جھونکا حضور ﷺ کی چوکھٹ پر سجدہ ریز ہے، محبت و عقیدت کی ہر شاہراہ غبار شہر تمنا میں جا کر گم ہو جاتی ہے اور رنگ، روشنی اور خوشبو کا ہر راستہ دہلیز مصطفیٰ ﷺ پر جا کر ختم ہو جاتا ہے، کہکشاؤں کے جھرمٹ ازل سے شہر خنک کی جانب رواں دواں ہیں اس شہر دل آویز کے ذرے ذرے میں عشاق مصطفیٰ ﷺ کے دل دھڑکتے ہیں، ایک ایک لمحہ حرف سپاس بن کر طاق فصیل شہر نبی میں روشن رہتا ہے، ہوائے مشکبار درودوں اور سلاموں کی لاکھوں کروڑوں ڈالیاں لے کر در حضور ﷺ پر شرف باریابی کی منتظر رہتی ہے، فرشتے قطار اندر قطار اترتے ہیں تو زمین رشک فردوس بن جاتی ہے۔ جذبات کا ایک سیل بناہ ہر طرف موجزن ہے۔ یہ شہر نبی ہے اور عہد رسالت مآب ہے، والی کون ومکان ﷺ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ میں آباد ہونے والے

اصحاب کے بارے میں فرما رہے ہیں کہ باری تعالیٰ' انہیں الٹے پیروں نہ پھیر' گویا فرما رہے ہیں یا اللہ انہیں اسی شہر نور کی حدود میں رکھ انہیں اس شہر خنک میں قیام پذیر ہونے کا شرف عطا فرما' مذکورہ حدیث پاک میں حضرت سعد بن خولہؓ کا ذکر ہوا ہے' حضور ﷺ نے اپنے اصحاب کے اجر ہجرت کی تکمیل کی دعا کے بعد فرمایا: "لیکن بے چارہ سعد بن خوالہ رضی اللہ عنہ "حضرت سعد بن خولہؓ کے بارے میں محدثین میں اختلاف پایا جاتا ہے لیکن اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ ان کا وصال فتح مکہ کے بعد ہوا تھا کتب تاریخ میں مذکور ہے کہ حضرت سعد بن خولہ ہجرت حبشہ ثانیہ میں بھی شامل تھے۔

ہجرت مدینہ کا اعزاز بھی آپ نے حاصل کیا اور غزوات میں شریک ہوئے' لیکن فتح مکہ کے بعد واپس مکہ چلے گئے تھے' وہیں مستقل سکونت اختیار کی اور وصال کے بعد وہیں مدفون ہوئے' ہجرت مدینہ کے بعد وہ دوبارہ مکہ میں آباد ہو گئے تھے' حضور رحمت عالم ﷺ ان کی مکہ واپسی پر اکثر افسوس فرمایا کرتے تھے کہ اللہ رب العزت نے انہیں ہجرت کی فضیلت عطا کی اگر وہ مدینہ منورہ میں مقیم رہتے تو انہیں موت بھی اس شہر عظیم میں نصیب ہوتی' مدینہ منورہ کی موت کے بارے میں ارشاد نبوی ہے کہ جس کسی نے مدینہ کی تکالیف' آلام و مصائب اور شدائد پر صبر اور استقامت کے ساتھ ثابت قدمی اختیار کی اور یہ سوچ کر وبائے شہر خنک کو بھی سینے سے لگا لیا کہ یہ وبا حضور ﷺ کے شہر مقدس کی وبا ہے اور بالآخر اسے موت بھی اس شہر میں آگئی تو قیامت کے روز حضور ﷺ اس کے شفیع ہوں گے' تاجدار کائنات ﷺ نے یہ بھی فرمایا اس کے گواہ نگہبان اور مددگار شہید ہوں گے (ترمذی وغیرہ) یہ وہ مرکز دیدہ و دل ہے جس کے بارے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ مولا! تو مجھے اپنی راہ میں شہادت دے اور اپنے حبیب ﷺ کے شہر میں موت نصیب فرما۔

حضرت سعد بن خولہؓ اس سعادت سے محروم ہو گئے جس کا حضور ﷺ کو افسوس تھا لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز ہرگز نہیں کہ حضرت سعد بن خولہؓ جان بوجھ کر اور اس سعادت سے منہ موڑ کر مکہ میں آبا ہو گئے تھے بلکہ ممکن ہے وہ اس سعادت کے اعلان سے پہلے ہی واپس مکہ مکرمہ چلے گئے ہوں' حضور ﷺ نے ہجرت کے بعد واپسی

کو اس لئے بھی ناپسند فرمایا کہ ہجرت کا اصل تحقق تب ہوتا ہے جب مہاجر حضور ﷺ کے شہر دلپذیر سے ایسی محبت کرے کہ اپنے سابقہ وطن میں آباد ہونے کا تصور بھی اس کے دل میں نہ آئے اور وہ شہر پیغمبر میں ہی پیوند خاک ہو جائے۔حضرت سعد بن خولہؓ کی مدینہ منورہ سے نقل مکانی پر حضور ﷺ کے اظہار افسوس کی ایک تیسری وجہ بھی تھی اور وہ وجہ یہ تھی کہ انہوں نے حضور ﷺ کی دائمی سنگت' قربت اور صحبت پر اپنے آبائی شہر کو ترجیح دی تھی (غالباً' نادانستہ طور پر) جس سے ان کی ہجرت الی الرسول ﷺ کا مقصد ہی فوت ہو گیا تھا۔ لہٰذا ان کی ہجرت کا اصل اجر باقی نہیں رہا تھا بلکہ بمنزلہ صرف دربار اقدس کی حاضری ہی کے رہ گیا تھا۔

ہجرت کب تک؟

کیا ہجرت کے حکم کی نوعیت دائمی ہے یا امتداد زمانہ کے ساتھ اس میں تغیر بھی رونما ہو سکتا ہے' اس باب میں اہل علم کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے حتیٰ کہ بعض روایات میں بھی اختلاف ہے' روایات کے اس اختلاف کی بنا پر بظاہر یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہجرت کا حکم ایک خاص وقت تک کے لئے تھا لیکن حقیقت یہ نہیں' اگر ہم حالات و واقعات کا بغور تجزیہ کریں اور انہیں اپنے پس منظر کی تمام تر جزئیات کی روشنی میں نقد و نظر کی کسوٹی پر پرکھیں تو ہمیں اس نتیجہ پر پہنچنے میں قطعاً کوئی دشواری نہیں ہوگی کہ ہجرت کا حکم مختلف مواقع پر مختلف رہا ہے۔ چنانچہ ہجرت کبھی واجب ہوتی ہے اور کبھی مستحب' عام ہجرت دو طرح کی ہوتی ہے' **دارالکفر** سے دارالسلام کی طرف اور دارالسلام سے (دعوت حق لے کر) **دارالکفر** کی طرف' ایک ہجرت خاص بھی ہے اور وہ ہجرت' ہجرت مدینہ ہے۔

شہر پیغمبر کی طرف ہجرت

سنت نبوی کی اتباع کرتے ہوئے حضور ﷺ کے نقش قدم پر سفر ہجرت اختیار کرنا بذات خود ایک بہت بڑی سعادت ہے انہی راستوں کی گرد میں اپنے وجود کو گم کر دینا جن راستوں سے حضور ﷺ اپنے یار غار کے ساتھ عازم سفر ہوئے تھے ہر

دور میں غلامان رسول ہاشمی کا محبوب طریق رہا ہے وہ سر کے بل چل کر دیار حبیب تک پہنچتے رہے ہیں-قدم قدم پر اپنی عقیدتوں کے چراغ روشن کرتے رہے ہیں-تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ شہر پیغمبر کی طرف ہجرت کا حکم مختلف ادوار میں مختلف افراد کے لئے مختلف رہا ہے-

فتح مکہ سے پہلے

فتح مکہ سے پہلے جزیرہ نمائے عرب عمومی طور پر کفار و مشرکین کے زیر تسلط تھا- کسی مرکزی حکومت کا کوئی وجود نہ تھا- پوری قوم مختلف قبائل میں بٹی ہوئی تھی اور یہ قبائل اکثر آپس میں بر سرپیکار رہتے' یہود و نصاریٰ اور کفار و مشرکین سب اسلام دشمنی میں اندھے ہو رہے تھے' یہ قدر مشترک انہیں ایک دوسرے کے قریب لے آئی اور وہ اپنے اختلافات بھول کر شمع حق کو بجھانے کی تدبیریں سوچنے لگے' اس مخالفانہ اور معاندانہ فضا میں اسلام کے پیروکاروں کی نہ تو جان محفوظ تھی اور نہ مال' مسلمان عدم تحفظ کا شکار تھے جن قبائل کے ساتھ انہوں نے مختلف معاہدہ جات کئے تھے وہ بھی مفسدین کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے معرض خطر میں پڑے رہتے' مسلمانوں کے پاس تحفظ کی کوئی سماجی ضمانت بھی موجود نہیں تھی' اہل اسلام جس ماحول میں سانس لے رہے تھے اور اسلام کی حقانیت کا پرچم لے کر مرحلہ وار آگے بڑھ رہے تھے وہ دو طرح کا تھا-

i- شدید مخالفانہ' ظالمانہ اور فاسقانہ ماحول

ii- قدرے اعتدال پسندانہ ماحول لیکن ناموافق

پہلی صورت میں مدینہ منورہ کی طرف سفر ہجرت اختیار کر کے شہر میں سکونت اختیار کر لینا واجب تھا سوائے ان لوگوں کے جو ایسا کرنے پر قادر ہی نہ تھے- مثلاً کمزور اور محکوم لوگ' لیکن دوسری صورت میں یعنی جس ماحول میں تحریک اسلامی کی مزاحمت اتنی شدید نہ تھی لیکن ماحول پھر بھی ناموافق تھا ایسے علاقے یا خطے سے حکم ہجرت افراد کے اعتبار سے قدرے مختلف تھا-

مسلمان اکثریت کے علاقے

ایسے علاقے جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہو وہاں قدرتی طور پر سماجی اعتبار سے ماحول پر ان کی گرفت بھی مضبوط ہوگی بالعموم وہاں سے ہجرت کی اجازت نہیں دی گئی کیونکہ مسلم اکثریت والے علاقوں سے ہجرت سیاسی اور عسکری طور پر اجتماعی خودکشی کے مترادف ہوتی ہے۔ عرب معاشرے میں مسلم اکثریت کے علاقے تحریک اسلامی کے لئے استحکام اور اعتماد کا باعث بنتے ہیں۔ انہی علاقوں میں دعوت کا کام ٹھوس بنیادوں پر استوار ہوتا ہے۔ انہی علاقوں سے تحریک اسلامی کو افرادی قوت فراہم ہوتی ہے۔ برصغیر کے سیاسی اتار چڑھاؤ کا جائزہ لیں اور قیام پاکستان کے پس منظر کو تاریخی تناظر میں دیکھیں تو یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ مسلم اکثریت والے علاقے کو تحریک اسلامی کے استحکام کے لئے جس حکمت کے ساتھ عہد رسالت مآب میں خصوصاً فتح مکہ کے بعد استعمال کیا گیا تھا بعینہ وہی حکمت عملی ہندوستان میں مسلم اکثریت کے علاقوں پر مشتمل اسلامی ریاست کے قیام کی جدوجہد میں بھی کارفرما نظر آتی ہے اور کون نہیں جانتا کہ اسلامیان ہند نے پاکستان کا عظیم کارنامہ سات سال کے قلیل عرصے میں سرانجام دے کر دو قومی نظریہ کے مخالفین کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ترک موالات کی تحریک میں بھی صاحب الرائے ارباب فکر و نظر نے یہی موقف پیش کیا تھا کہ ہندوستان میں ہم کروڑوں کی تعداد میں ہیں، ہمیں اپنی منتشر قوت کو مجتمع کر کے اس سرزمین پر رہ کر کفر کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ اس وقت ہندوستان سے ہجرت ایک جذباتی فیصلہ تھا جس کے مطلوبہ نتائج نہ حاصل ہو سکتے تھے اور نہ ہوئے۔ حضور ﷺ کے عہد مبارک میں جب مسلم اکثریت والے علاقوں کی بات کی جاتی تو دراصل یہ دو قومی نظریے کی بات ہوتی کیا یہ ایک تاریخی حقیقت نہیں کہ ریاست مدینہ کو مضبوط بنیادیں اسی دو قومی نظریے نے فراہم کیں اور یہی دو قومی نظریہ پاکستان کے قیام کی بنیاد بنا اور یہ اساسی نظریہ پاکستان کی بقا اور سلامتی کا ضامن ہے اس سے سرمو انحراف بھی وطن عزیز کی بنیادوں کے انہدام کے مترادف ہوگا۔

مسلم اکثریت والے علاقوں سے اہل ایمان کو اس لئے بھی حکم ہجرت نہیں دیا جاتا کہ مسلمانوں پر کفار کے حملے کی صورت میں مسلمانوں کو نہ صرف اخلاقی مدد ملتی ہے بلکہ ان کی عسکری قوت میں بھی اضافہ ہوتا ہے تاکہ لشکر کفار کا حملہ پوری طاقت سے روکا جائے ان علاقوں سے کفار کی مدد کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا تاہم ہر اعتبار سے مسلم اکثریت والے علاقے مجاہدین کے لئے تقویت کا باعث بن سکتے تھے اور بن سکتے ہیں' دوسرے یہ بھی تھا نبی آخر الزماں ﷺ کفار پر جوابی حملہ کرکے اسلام کی سیاسی اور عسکری قوت کا عملی مظاہرہ کریں تو کفار و مشرکین پر ہر لحظہ یہ نفسیاتی دباؤ بھی پڑتا رہے کہ وہ اسلامی قوتوں کے حصار میں ہیں یہی وہ تاثر ہے جو آج امت مسلمہ اسرائیل کے یہودیوں کو دینے میں ناکام رہی ہے۔اگر اسرائیل کو یہ یقین ہو جائے کہ وہ چاروں طرف سے اسلامی ریاستوں کے نرغے میں ہے اور یہ ریاستیں متحد ہوکر اسے اپنے پاؤں کی ٹھوکر سے اڑا دیں گی تو وہ کبھی بھی فلسطینیوں پر ظلم کے پہاڑ نہ توڑے اور نہ بیت المقدس میں اپنے غاصبانہ قبضے کو طول دینے کے لئے یہودی بستیاں تعمیر کرے' نہ عظیم اسرائیل کے نقشے میں مدینہ منورہ کو شامل کرنے کی جرأت کرے۔ اسرائیل کی دہشت گردی میں اس لئے شدت آتی جارہی ہے کہ وہ مسلم امہ کی کمزوریوں سے خوب واقف ہے اسے یقین ہے کہ مسلم ممالک ایک متحدہ انقلابی قوت کا روپ کبھی نہیں دھار سکیں گے وہ یہ بھی جانتا ہے کہ مسلمان جہاد کا راستہ چھوڑ کر مغرب کے پروپیگنڈے کی ثقافتی یلغار اور مغرب کی عسکری برتری سے مرعوب ہو چکے ہیں' اسے معلوم ہے کہ عریانی اور فحاشی کا زہر مسلمانوں کی نئی نسل کی رگوں میں سرایت کر چکا ہے۔ اس کی تخلیقی صلاحیتیں مفلوج ہو چکی ہیں' اسلامی بلاک کا تصور خود مسلمان حکمرانوں اور مغرب زدہ طبقات کی سوچ کے ملبے تلے دفن ہو چکا ہے۔ اس لئے اس کی وحشت' بربریت اور درندگی میں شدت آتی جارہی ہے' وہ چاروں طرف سے اسلامی ممالک میں گھرا ہوا ہونے کے باوجود خود کو تنہا محسوس نہیں کرتا اور وہ علاقے کا تھانیدار بن کر مسلم حکمرانوں کے ذہنوں پر حکمرانی کر رہا ہے ہجرت مدینہ کے وقت اور ہجرت مدینہ کے بعد حضور ﷺ نے جو حکمت عملی اپنائی اس کی کامیابی کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے

کہ فتح مکہ کے وقت مکہ کے کفار و مشرکین خود کو تنہا محسوس کرنے لگے تھے' سپہ سالار مدینہ حضور رحمت عالم ﷺ کو سفارتی سطح پر بھی زبردست فتح حاصل ہوئی' عرب کے کفار و مشرکین بتدریج اسلام کی سیاسی اور عسکری قوت سے مرعوب ہوتے چلے گئے' کفار مکہ نے سوائے ہتھیار پھینکنے کے کسی اور شئے کا تصور ہی نہ کیا۔ دنیائے سیاست کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں اور ماہرین حرب انگشت بدنداں رہ گئے کہ ایک ایسا مرکزی شہر جس پر قبضہ پورے ملک پر قبضے کے مترادف تھا حضور رحمت عالم ﷺ نے اس حکمت عملی سے فتح کیا کہ عساکر اسلام کو اپنی تلواریں نیام سے باہر نکالنے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی' برائے نام مزاحمت کو جنگی جھڑپ تو کہا جا سکتا ہے اسے باقاعدہ تصادم کا نام نہیں دیا جا سکتا۔

مسلمان اقلیت کے علاقے

اگر کسی قبیلے کا کوئی فرد اسلام قبول کرتا اور دعوت حق کے کام کو آگے بڑھاتا تو صورت حال دو رخ اختیار کر سکتی تھی' ایک یہ کہ اسے کفار و مشرکین کی طرف سے مزاحمت کا سامنا کرنا پڑتا اور اکثر صورتوں میں یہی ہوا دوسرے یہ کہ مزاحمت اتنی شدید نہ ہوتی اور مسلمان اپنے قبائل میں اقلیت ہوتے ہوئے بھی احکام شریعت پر پابندی کرنے میں آزاد ہوتے' پہلی صورت میں انہیں ہجرت کرنے کی اجازت تھی اور دوسری صورت میں اپنے قبائل میں رہ کر تبلیغ دین کا فریضہ سرانجام دینے کو ترجیح دی گئی۔ اور یہی حکمت و دانش کا تقاضا تھا۔ اس حکمت عملی کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک تو مسلمانوں کی قوت مدینہ منورہ میں مجتمع ہونے لگی اور انہیں ایک ایسا Base Camp میسر آگیا جہاں وہ مستقبل کی بہتر منصوبہ بندی کر کے دشمن کی سازشوں کا مقابلہ کر سکتے تھے اور پھر ایمان کے چراغ پورے جزیرہ نمائے عرب میں بھی جلنے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے پورا منظر نامہ روشنیوں سے بھر گیا۔

فتح مکہ کے بعد کوئی ہجرت نہیں

ہجرت مدینہ ایک طویل منصوبہ بندی کا حصہ تھی اور ہجرت حبشہ اس منصوبہ

بندی کی ایک کڑی' جب مہمات اور غزوات کے بعد اسلامی ریاست کو داخلی اور خارجی سطح پر استحکام ملا۔ جزیرہ نمائے عرب میں مسلمانوں کی ثقافتی' سیاسی اور عسکری بالادستی قائم ہونے لگی اور دشمنان اسلام کی طرف سے اسے عملاً تسلیم بھی کیا جانے لگا تو عملاً ہجرت کی ضرورت بتدریج کم ہونے لگی۔ حتی کہ جب مکہ فتح ہوا اور کفار و مشرکین کی سازشوں کا آخری دروازہ بند ہو گیا اور قوت کا توازن واضح طور مسلمانوں کے حق میں ہو گیا تو مسلمانوں کو پورے عرب میں سماجی اور سیاسی تحفظ ملنے کے بعد اصلاً مدینہ کی طرف ہجرت کرنے کی حاجت نہ رہی۔ لہٰذا وجوب کا حکم اٹھا لیا گیا آقائے دو جہاں ﷺ نے فرمایا۔

لا ھجرۃ بعد الفتح — فتح (مکہ) کے بعد کوئی ہجرت نہیں

دوسرے مقام پر ہے۔

انقطعت الھجرۃ منذ فتح اللہ علی نبیہ ﷺ مکۃ — اس وقت سے ہجرت کا عمل منقطع ہو گیا جب سے اللہ نے اپنے نبی ﷺ کو مکہ پر فتح عطا فرمائی۔

(مسند احمد بن حنبل' ۵: ۷۰-۷۱)

(صحیح البخاری: کتاب الجہاد والسیر) (صحیح المسلم: کتاب الامارۃ)

فتح مکہ کے بعد کوئی ہجرت نہیں اس کا یہ مطلب نہیں کہ اب ہجرت کا دروازہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا ہے اور اب دنیا کے کسی خطے میں اگر غلامان رسول ہاشمی پر عرصہ حیات تنگ کیا جا رہا ہو' ان کو عبادات کی ادائیگی سے روکا جا رہا ہو' ان کی تہذیب و ثقافت کے ہر نشان کو مٹایا جا رہا ہو تو انہیں اس قریہ جبر سے ہجرت کی اجازت نہیں' اس حدیث پاک میں فتح مکہ کے بعد ہجرت مدینہ کا وجوب (واجب ہونا) اٹھا لیا گیا ہے استحباب نہیں' ہر کسی کیلئے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کرنا جواز کی حد تک باقی رہا بلکہ یہ عمل خیر مستحب کے درجے میں ہے' فتح مکہ کے بعد کے سیاسی و سماجی اور اقتصادی حالات اور ثقافتوں کے پیش نظر ہجرت کے رجحان کی بالعموم حوصلہ شکنی (Discourage) کی گئی اگر ایسا نہ کیا جاتا اور جزیرۃ العرب کے سارے مسلمان مدینہ منورہ میں مستقل سکونت اختیار کرنے کے لئے رخت سفر باندھ لیتے تو انتظامی

مشکلات کے علاوہ کیا کیا گھمبیر سیاسی' اقتصادی اور سماجی مسائل سر نہ اٹھاتے' اس خاص پس منظر میں حکمت و دانش کا یہی تقاضا تھا کہ ہجرت سے عوام الناس کو روک دیا جائے اس لئے بھی کہ اب ہجرت مدینہ سے وہ مقاصد حاصل نہیں کئے جاسکتے تھے جو دس سال قبل مرحلہ ہجرت سے گزرنے کے بعد کامیابی سے حاصل کر لئے گئے تھے۔

نفس ہجرت قیامت تک کے لئے

فتح مکہ کے بعد کے معروضی حالات میں بوجوہ ہجرت مدینہ سے منع فرمادیا گیا کہ فی الحال نقل مکانی کی صعوبتیں برداشت کرکے مدینہ منورہ میں سکونت اختیار کرنے کی ضرورت نہیں رہی کیونکہ جن مقاصد کے حصول کے لئے ہجرت کا سفر اختیار کیا گیا تھا وہ مقاصد یا تو بڑی حد تک حاصل ہو چکے تھے یا مرحلہ وار تیزی سے حاصل کئے جا رہے تھے' رہی بات اصل ہجرت اور نفس ہجرت کی تو ہجرت کا یہ حکم اس وقت تک کے لئے ہے جب تک اہل حق و باطل کے درمیان معرکہ آرائی جاری ہے' حق و باطل کے درمیان جنگ کی نوعیت تبدیل ہوتی رہتی ہے یہ جنگ سرد جنگ کی صورت میں بھی لڑی جاسکتی ہے۔ حق و باطل کی آویزش میں ہجرت کا حکم جوں کا توں موجود رہتا ہے یہ آویزش صدیوں پر محیط ہے۔ اندھیرے قیامت تک روشنی کے ساتھ الجھتے رہیں گے اور ہجرت کا یہ حکم جبینوں میں خوئے تسلیم و رضا بن کر جگمگاتا رہے گا باطل کے ساتھ معرکہ آرائی بیک وقت ایک یا ایک سے زائد محاذوں پر ممکن ہے۔ مثلاً جغرافیائی' ثقافتی' تعلیمی روحانی' فکری' سائنسی' مذہبی' معاشرتی اور قانونی محاذ پر آج بھی امت مسلمہ کو ان محاذوں پر باطل کی زبردست مزاحمت کا سامنا ہے۔ ہجرت ایک دائمی عمل ہے اور شریعت محمدی ﷺ کے عین مطابق ہے جب تک حق کو اپنا وجود برقرار رکھنے اور اپنے تشخص کے تحفظ کے لئے وقت کی باطل استحصالی اور طاغوتی طاقتوں سے کسی بھی محاذ پر معرکہ آرائی جاری رکھنا پڑے گی ہجرت کا حکم بھی غیر منقطع اور دائماً قائم رہے گا۔ حضرت عبداللہ بن وقدان السعدیؓ فرماتے ہیں کہ ہم ایک روز حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں حاضر ہوئے' ہر شخص خدمت عالی میں اپنی حاجت پیش کر رہا تھا ہر

سائل کی جھولی پھیلی ہوئی تھی اور آپ ﷺ ہر سائل کے دامن آرزو کو حاجت روائی اور مشکل کشائی کے پھولوں سے بھر رہے تھے، سوال کرنے والے کو اپنے ہر سوال کا جواب مل رہا تھا اور وہ ذہنی آسودگی سے ہمکنار ہو رہا تھا۔

و کنت اخرھم دخولا فقال حاجتک فقلت یا رسول اللہ! متی تنقطع الھجرۃ قال رسول اللہ ﷺ لا تنقطع الھجرۃ ما قوتل الکفار
(سنن نسائی : کتاب البیعۃ من المجتبیٰ)
(مسند احمد بن حنبل، ۱: ۱۹۳)

میں سب سے آخر میں حاضر ہوا۔ فرمایا "تمہاری حاجت (کیا ہے)" میں نے عرض کیا "اے رسول خدا! ہجرت کب منقطع ہوگی؟" رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہجرت (اس وقت تک) منقطع نہیں ہوگی جب تک کفار کے ساتھ جنگ کی جاتی رہے گی۔

حکم ہجرت کی آخری غلبے تک مشروعیت

عصر نو میں ہر طرف سے اسلام پر حملے ہو رہے ہیں، کیمونزم کی موت کے بعد پروپیگنڈے کا رخ اسلامیان عالم کی طرف کر لیا گیا ہے۔ شکوک و شبہات کی گرد سے فضا پہلے ہی آلودہ تھی اب فکری مغالطوں، علمی موشگافیوں اور تحقیقی ہیرا پھیریوں سے ذہنوں کو مزید الجھا دیا گیا ہے، تحقیق و جستجو کے نام پر کشت دیدہ و دل میں بدگمانیوں کی فصل بوئی جا رہی ہے، مسلمانوں کی نئی نسل کی تخلیقی صلاحیتوں کو مفلوج کرنے کے لئے تاریخ اسلام اور تعلیمات اسلامی کا چہرہ مسخ کرکے پیش کیا جا رہا ہے، مشاہیر اسلام کی کردار کشی کی جا رہی ہے۔ مقصد یہ ہے کہ ان کی معتبر حیثیت کو غیر معتبر بنا دیا جائے اور دلوں سے اپنے آباء کے احترام کا جذبہ کھرچ کھرچ کر نکال دیا جائے، ایسا ماحول پیدا کر دیا جائے کہ مسلمانوں کی نئی نسل اپنے آباء کے کارناموں اور اپنی شاندار ثقافتی روایات پر فخر کرنے کی بجائے یہودیت اور نصرانیت سے مرعوب ہو کر شرمساری کے پانی میں ڈوب ڈوب جائے، چنانچہ حکم ہجرت قرب قیامت میں حق کے آخری غلبے تک جاری رہے گا، حکم ہجرت جاری رہے گا تو جہاد کے دروازے بھی کھلے رہیں گے، جہاد بھی کسی

ایک محاذ پر نہیں مختلف محاذوں پر ہو گا اس لئے امت مسلمہ کو ہمہ وقت چوکس و تیار رہنا ہو گا تاکہ ہر محاذ پر دشمن کو شکست دے کر وہ اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کر سکے۔

اجرائے ہجرت میں فلسفہ انقلاب کا نکتہ

اسلام ہر شعبہ زندگی میں انقلابی تبدیلیوں کا داعی ہے۔ایسی تبدیلیاں جو احکامات خداوندی کے مطابق ہوں اور فرسودگی اور جہالت کی ہر شکل کو مٹانے کا باعث بنیں' ہجرت بذات خود ایک بہت بڑا انقلابی قدم تھا اور ہے' اجرائے ہجرت میں "ماقوتل الکفار" (جب تک کفار سے جنگ و قتال کیا جاتا رہے) کے کلمات اس امر کی طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ حضور نبی اکرم ﷺ ہجرت کو بطور ایک انقلابی جنگ کے بھی لیتے تھے۔ہجرت مدینہ مصطفوی انقلاب کے باب کا عنوان بنی قاتل معروف کا صیغہ ہے اس کا مطلب ہے اس نے قتال کیا' یہ لفظ فاعل پر دلالت کرتا ہے یعنی اس کے ساتھ لگایا جاتا ہے جس نے جنگ کی ہو بالفاظ دیگر یہ لفظ جنگ کرنے والے کی بابت استعمال کیا جاتا ہے' قوتل مجہول کا صیغہ ہے جس کا معنی ہے "اس کے ساتھ قتال کیا جاتا ہے جس کے خلاف جنگ کی گئی ہو بالفاظ دیگر یہ لفظ جنگ کرنے والے کی بابت نہیں بلکہ جس کے خلاف جنگ کی گئی ہو اس کی بابت استعمال ہوتا ہے۔

جنگ کرنے والا کون؟

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ جنگ کا آغاز کون کرتا ہے؟ انسانی معاشروں میں تباہی و بربادی کو کون دعوت دیتا ہے۔ بستیوں کو نذر آتش کرنے کے اسباب کون پیدا کرتا ہے۔ امن و امان کو پامال کرکے زمین پر ابن آدم کے روز و شب کو دست خزاں کے سپرد کون کرتا ہے اور ذہنوں میں فتنوں اور سازشوں کی پرورش کرکے دکھوں کی مالا کون بنتا ہے' اہل حق یا اہل کفر؟ اس سوال کا جواب تاریخ سے پوچھتے ہیں کیونکہ تاریخ سچ کا آئینہ ہوتی ہے۔ وقت کی عدالت سے کبھی غلط فیصلے صادر نہیں ہوتے اس لئے لمحوں کی گواہی سب سے معتبر گواہی ہے' تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ اہل حق تو صرف حق

کی تلاش میں نکلتے ہیں، دنیا بھر کے انسانوں کے لئے امن اور عافیت کی بشارت بن کر افق دیدہ و دل پر طلوع ہوتے ہیں، معاشرے میں خیر کی قوتوں کو استحکام بخشتے ہیں، جنگ، نفرت اور تعصب کی گرد سے فضا کو پاک کرکے دائمی امن کے پیام بر بنتے ہیں لیکن کفر اور باطل کے علمبردار ہی امن عالم کو تباہ و برباد کرکے سفر زندگی میں مشکلات کے پہاڑ کھڑے کرتے ہیں، نفرت کی آگ لگا کر محبت کی کونپلوں کو جلا دینے کے درپے ہوتے ہیں، اپنی انا کی تسکین کے لئے انسانی کھوپڑیوں کے مینار تعمیر کرتے ہیں، ہر اخلاقی قدر کو پائے حقارت سے ٹھکرا کر شرف انسانی کی دھجیاں فضائے بسیط میں بکھیر دیتے ہیں اور دکھ، مصائب اور مسائل سے اولاد آدم کا مقدر تحریر کرتے ہیں، یہ بات امور مسلمہ میں سے ہے کہ حق نہ تو جنگ کو پسند کرتا ہے اور نہ بدامنی ہی سے کوئی تعلق رکھتا ہے بلکہ ہدایت ربانی کا مقصد وحید ہی یہ ہوتا ہے کہ خوف کی پرچھائیوں کو امن کی خنک چھاؤں سے بدل دیا جائے زمین پر عدل و انصاف کی حکمرانی ہو، انسان کے لئے خیر کی راہیں تلاش کی جائیں، اسے اطمینان قلب کی دولت نصیب ہو، امن سلامتی اور سکون کی ایک ایسی فضا اسے ملے جس میں وہ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر خود کو بھی اپنی ذات پر منکشف کرے اور اپنے اردگرد بھی انکشافات کی ایک نئی دنیا آباد کرے، تحقیق و جستجو کے پھول کھلائے اور تعمیر شخصیت سے تکمیل شخصیت تک کے مراحل احکامات خداوندی کی روشنی میں طے کرکے دنیا میں بھی آبرومندانہ اور باوقار زندگی بسر کرے اور اپنی عاقبت کو بھی روشنیوں سے منور کرے۔ اسکے داخل سے خارج تک کا سفر روشنیوں کے سفر سے تعبیر ہو اور وہ چار دانگ عالم میں انسانی معاشروں کے لئے سفیر امن کے طور پر اپنی شناخت کرائے کہ اس کے تشخص اور اس کی پہچان کا یہی پہلو انسانی تہذیب و تمدن کی بقاء و سلامتی کا ضامن ہے۔

ارشاد خداوندی ہے۔

وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ؕ (النور ۲۴:۵۵)	اور ان کے اس خوف کے بعد (جس سے وہ قومی و معاشرتی زندگی میں دوچار ہیں) ان کو امن بخشے گا۔

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا۔

فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِّنِّي هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (البقرہ ۲:۳۸)

پھر اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت پہنچے تو جو بھی میری ہدایت کی پیروی کرے گا نہ ان پر کوئی خوف (طاری) ہو گا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

مستشرقین مسلمانوں کو جنگجو ثابت کرکے انہیں دہشت گرد قرار دینے کی سازشوں میں مصروف ہیں تصور جہاد کو اپنے تعصبات کی گرد میں گڈ مڈ کرکے یہ لوگ علم اور تحقیق کے نام پر بدگمانیوں کی ایک ایسی فصل کاشت کر رہے ہیں جسے کاٹتے کاٹتے ذہن جدید ان گنت شکوک و شبہات کا شکار ہو جاتا ہے۔ اگر وہ قرآن سے رہنمائی حاصل کرے تو نہ صرف اسے ہدایت کا نور عطا ہو گا بلکہ اعتماد اور یقین کی ایک ایسی دولت بھی ہاتھ آئے گی جس کے ہوتے ہوئے کوئی دشمن ایمان کی دیوار میں نقب لگانے کی جرأت نہیں کر سکے گا۔ جس ہدایت کا اولین مقصد ہی جنگ کی بجائے امن کا قیام ہو تو وہ ہدایت انسانی تہذیب و تمدن کی سلامتی کا باعث نہیں بنے گی تو اور کون سی ہدایت یہ فریضہ سر انجام دے گی؟ لہٰذا اصلاً جنگ مسلط کرنا دین کا ہرگز ہرگز مقصد نہیں' نہ جنگ کو پسندیدگی کی نظروں سے دیکھا گیا ہے' بلکہ بار بار یہی کہا جا رہا ہے کہ یہ کفار و مشرکین ہی ہیں جو جنگ کی آگ کو بھڑکاتے ہیں اور اپنے مفادات کی خاطر امن عالم کو داؤ پر لگا دیتے ہیں۔

ارشاد خداوندی ہے۔

فَمَنِ اعْتَدَىٰ عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدَىٰ عَلَيْكُمْ (البقرۃ' ۲:۱۹۴)

پس اگر تم پر کوئی زیادتی کرے تم بھی اس پر زیادتی کرو مگر اسی قدر جتنی اس نے تم پر کی۔

ایک دوسرے مقام پر ہے۔

وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عُوقِبْتُمْ بِهِ ط (النحل' ۱۶:۱۲۶)

اور اگر تم سزا دینا چاہو تو اتنی ہی (سخت) سزا دو جس قدر (سخت) تکلیف تمہیں دی گئی تھی۔

اعلان جنگ کا مفہوم

آتش و آہن کی بارش کرکے امن عالم کو تہ و بالا کرنا اور نسل انسانی کو دکھوں اور مصائب کی ہوائے بے امان کے سپرد کرنا اور بات ہے اور ظلم' کفر' ناانصافی اور فتنہ و شر کے خلاف اعلان جنگ کرکے مفسدین پر ضرب کاری لگانے کے لئے تلوار بے نیام کرنا الگ بات ہے' ظلم' کفر' ناانصافی اور فتنہ و شر کے خلاف اعلان جنگ سفر انقلاب پر اپنے سر اپنی ہتھیلیوں پر سجا کر نکلنے والے وہی جاں نثار سپاہی کرتے ہیں جو انقلاب کی مبادیات سے بھی واقف ہوتے ہیں اور مابعد انقلاب پیش آنے والے مسائل سے نبرد آزما ہونے کے لئے ذہنی' فکری اور عملی حوالے سے بھی تربیت یافتہ ہوتے ہیں' سپاہ انقلاب کا پہلا اعلان جنگ فرسودہ نظام کی فرسودگی کے خلاف ہوتا ہے' انقلابی ایک نئے نظام کے نفاذ کے لئے نیا نظریہ پیش کرکے اس نظام کو قبول کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ بالفاظ دیگر کسی انقلابی تحریک کا (یقیناً وہ ایک نظریاتی تحریک بھی ہوگی) اپنے مرحلہ دعوت میں داخل ہونا ہی انقلاب دشمن طاقتوں کے خلاف اعلان جنگ ہوتا ہے ضروری نہیں کہ انقلاب دشمن طاقتوں کے ساتھ مسلح تصادم کی صورت بھی فوری طور پر پیش آجائے اس کے لئے مناسب وقت کا تعین بھی سپاہ انقلاب ہی کرتی ہیں' یہ ممکن ہی نہیں کہ حق کی دعوت دی جائے اور اہل باطل کی طرف سے اس دعوت کی مزاحمت نہ ہو' رجعت پسند' مفاد پرست عناصر اور صاحبان اقتدار اپنی سیاسی' اقتصادی اور عسکری قوت کے نشے میں کسی نہ کسی طرح اس مزاحمت کو جاری رکھتے ہیں خواہ یہ مزاحمت سرد جنگ کے محاذ پر ہو یا گرم جنگ کے محاذ پر' اسے جاری رکھنا باطل استحصالی طاقتوں کے اپنے مفاد میں ہوتا ہے اور وہ اسے جاری رکھتی بھی ہیں' باطل کی اس مزاحمت کی مسلسل اور غیر مصالحانہ مزاحمت کا نام انقلابی عمل ہے' بحث مذکور سے ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ!

i۔ مرحلہ دعوت کسی بھی انقلابی تحریک کا نقطہ آغاز ہوتا ہے اس نقطہ آغاز کو ایک مسلسل جنگ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے' نظریاتی جنگ کا آغاز نظریاتی سطح پر خود قافلہ انقلاب کے سپاہی کرتے ہیں' رفتہ رفتہ تحریک انقلاب کو وہ عملی سطح تک لے جاتے ہیں'

باطل کے ساتھ مسلح تصادم کی نوبت آتی ہے اور معرکہ آرائی کا یہ مرحلہ عموماً فیصلہ کن ثابت ہوتا ہے۔

ii۔ جب دعوت حق کا آغاز ہوتا ہے تو باطل کے ایوانوں میں زلزلہ آجاتا ہے' صاحبان اقتدار کا مفاد پرست ٹولہ اپنے پورے وسائل کے ساتھ مزاحمت کرتا ہے' سرد جنگ سے گرم جنگ جنم لیتی ہے' حق باطل کے ساتھ ٹکرا جاتا ہے' پروپیگنڈے کے محاذ پر بھی استحصالی طاقتیں سرگرم عمل ہو جاتی ہیں اور حق کی کردار کشی سے باطل کے دامن کی سیاہی کچھ اور بھی بڑھ جاتی ہے' باطل کا ردعمل حق کی انقلابی جدوجہد کا آغاز ہوتا ہے اس لئے کہ حق کی اس انقلابی جدوجہد کا نقطہ آغاز مرحلہ دعوت ہوتا ہے' باطل کا ردعمل بظاہر جارحانہ کارروائی کا اولین آغاز ہونے کی بنا پر باطل کا حملہ ہوتا ہے لیکن دراصل یہ اس حملے کا جواب ہے جو ان کے مفاد پر زد کی صورت میں اہل حق کی دعوت کی صورت میں ان پر ہوتا ہے۔

iii۔ انقلابی اس مزاحمت کے نتیجے میں مسلح تصادم ہونے کی صورت میں نئے عزم کے ساتھ اپنی انقلابی جدوجہد کا آغاز کرتے ہیں' یہ باقاعدہ مزاحمت کہلاتی ہے اور جوابی جنگ کا درجہ پاتی ہے اس اعتبار سے یہ انقلابی تحریک کا ایک مرحلہ ہے اصلاً جواب نہیں بلکہ جواب الجواب ہے کیونکہ اس جنگ کا آغاز وہ اعلان انقلاب کے ساتھ خود کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن بعض مقامات پر فلسفہ انقلاب سے ناآگاہ افراد کے درجے پر گفتگو فرماتے ہوئے اسے جوابی جنگ کہہ کر دفاعی رنگ دیتا ہے' پھر جب فلسفہ انقلاب سے آگاہی کے درجے پر گفتگو کرتا ہے تو اسے حملے کی صورت میں بیان کرتا ہے اور اہل کفر کو اس درجے میں رکھتا ہے جن کے ساتھ جنگ کی گئی ہو۔

ہر لحظہ مومن کی نئی شان ہے نئی آن ہے اس کے انقلابی رویے بھی ہر آن تغیر پذیر ہوتے ہیں اور اپنے عہد کے تقاضوں کے مطابق نئے سانچوں میں ڈھلتے رہتے ہیں اگر ایسا نہ ہو تو یہ رویے جمود کا شکار ہو کر بہت جلد اپنی افادیت کھو دیتے ہیں۔ حرکت اور تغیر کے بغیر انقلاب بے معنی سی چیز ہو کر رہ جاتا ہے' حرکت اور تغیر چونکہ انقلاب

کی روح ہے اس لئے ہجرت بھی حرکت اور تغیر کے بغیر نامکمل ہے۔ قرآن مجید اور حدیث پاک کی روشنی میں ہجرت کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لینے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ہجرت جہاد کی بنیاد ہے اسے مصطفوی فلسفہ انقلاب میں ایک اہم اساسی رکن کی حیثیت حاصل ہے، غرض کہ جس طرح ہجرت کا لغوی معنیٰ اور ہجرت کے فکری انطباقات ہجرت کے باقاعدہ مرحلہ تحریک میں داخل ہونے کی بنیاد تھے اسی طرح قرآن و سنت میں بھی اسے مرحلہ تحریک اور مرحلہ جہاد کا نقطۂ آغاز قرار دیا گیا ہے۔

حِصّہ چہارم

فضائل مہاجرین و انصار

باب ۔ ۱

فکری اور روحانی رشتوں کی فتح

گذشتہ باب میں ہم نے دیکھا کہ سفرِ ہجرت ایک اساسی اور دائمی عمل کا نام ہے۔ اس سفرِ عظمت کی تکمیل سے ہی جہاد فی سبیل اللہ کے حکم کو عملی بنیادیں فراہم ہوتی ہیں۔ ہم اس نتیجہ پر بھی پہنچے تھے کہ جہاد قوتِ نافذہ کے حصول کا سب سے موثر ذریعہ ہے' قوت نافذہ کے بغیر استحکام ایمان اور تحفظِ ایقان کے جواہر کا حصول تقریباً ناممکن ہو جاتا ہے۔ عصر حاضر میں بھی جہادی تحریکیں عملاً اسی قوت نافذہ کے حصول کے لئے راہ حق میں علم و عمل کے چراغ روشن کرتی ہیں' خلعتِ شہادت کو اپنا پرچم بناتی ہیں اور اپنے نصب العین کو پانے اور اپنے مطلوبہ اہداف تک پہنچنے کے لئے کارخانۂ قدرت کے نشیب و فراز سے گزرتی ہیں' مجاہدین اسلام کو کتنے ہی ہفت خواں طے کرنا پڑتے ہیں' کتنی ہی دشوار گزار گھاٹیوں کو عبور کرنا پڑتا ہے' مسائل و مصائب کی کتنی ہی چوٹیوں کو سر کرنا پڑتا ہے' ظلماتِ شب کے سمندر میں گھوڑے دوڑانا پڑتے ہیں اور اپنے داخل اور خارج دونوں سے بیک وقت نبرد آزما ہونا پڑتا ہے' ہجرت ایک ایسا عمل صالح ہے جس نے نہ صرف فرد کی سماجی' نفسیاتی اور روحانی بیماریوں کا علاج کیا ہے بلکہ مسلمانوں کو ایک ثقافتی اکائی کے طور پر عالمگیر سطح پر متعارف بھی کرایا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ وقار و تمکنت کی مسند جلیلہ پر رونق افروز ہو کر مسلمانوں نے اسلامی تعلیمات کے عملی نفاذ کا ہی فریضہ سرانجام نہیں دیا بلکہ فروغ دین اور اشاعت اسلام کے نئے امکانات کے مقفل دروازوں کو کھولنے کا ہنر بھی سیکھا۔ ذہنوں میں علم و آگہی کے چراغ روشن ہوئے' جدید علوم کو فروغ ملا اور سائنسی علوم کی بنیاد رکھی گئی' تحقیق و جستجو کے سفر کا آغاز ہوا اور انسان کو کائنات کی تسخیر کی ترغیب بھی ملی اور اس تسخیر کا شعور بھی عطا ہوا۔ یوں اللہ کا دین تمام ادیان باطلہ پر غالب آکر رہا اور دیکھتے ہی دیکھتے شرق سے غرب تک پرچم توحید لہرانے لگا۔

فضائل ہجرت کا تفصیل سے جائزہ لینے کے بعد قدرتی طور پر ذہنوں میں یہ سوال ابھرتا ہے کہ تحریک اسلامی کے وہ بے لوث کارکن جو اللہ کے حکم اور رسول

ﷺ کی اتباع میں فریضہ ہجرت ادا کرتے ہیں، اپنے آبائی وطن کو خیرباد کہتے ہیں، سفر کی صعوبتیں برداشت کرتے ہیں، فکری اور روحانی رشتوں کو خونی رشتوں پر ترجیح دیتے ہیں، اپنے کاروباری مفادات کو پس پشت ڈال کر غلبۂ دین حق کے لئے اللہ کی راہ میں سربکف نکلتے ہیں، قریۂ جبر سے رخت سفر باندھ کر کفر کی چیرہ دستیوں کے خلاف خاموش صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں اور بالآخر جہاد کے دروازوں سے گزر کر یا تو خلعت شہادت سے سرفراز ہوتے ہیں یا غازی بن کر میدان جنگ سے لوٹتے ہیں، ان پیکران وفا کی فضیلت کیا ہوگی، بارگاہ خداوندی سے انہیں کن انعامات اور اعزازات سے نوازا جائے گا؟

فضائل مہاجرین: قرآن مجید کی روشنی میں

وہ جانثاران مصطفےٰ جنہوں نے آقائے دو جہاں ﷺ کی اتباع میں مرحلۂ ہجرت طے کیا اور سرزمینِ مکہ کو چھوڑ کر مدینہ منورہ میں آباد ہوئے قرآن مجید نے ان خوش بختوں کو دستارِ فضیلت سے نوازا ہے، اپنے آقا ﷺ کے نقشِ پا کو نشانِ منزل بنا کر ہجرت کا سفر اختیار کرنے والے اصحاب رسول کے اپنے نقوش قدم بھی مسافران راہ حق کے لئے مینارۂ نور بن گئے، روزِ حشر تک جتنے بھی قافلے کاروانِ عشق کی گردپا کی تلاش میں نکلیں گے انہیں اصحاب رسول کی ہجرت کا فیض ضرور حاصل ہوگا اور کامیابی وکامرانی کی ہر منزل ان کے قدموں کو بوسہ دینے کا اعزاز حاصل کرے گی۔

۱۔ مہاجرین: سنگت رسول ﷺ کے حق دار

نقوشِ کفِ پائے حضور ﷺ کی تلاش کا تصور ہی عشاقِ مصطفےٰ کو بے قرار کر دیتا ہے اور وہ فراق رسول ﷺ میں ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپنے لگتے ہیں، شب کے پچھلے پہر کتنے ہی آنسو اس التجا کے ساتھ سپرد ہوا کرتے ہیں کہ اے جانبِ طیبہ سفرِ ہجرت کی منزلیں طے کرتی ہوئی ہوا! آنسوؤں کے یہ چراغ دہلیزِ مصطفےٰ ﷺ پر سجا کر عرض کرنا کہ یا رسول اللہ! آپ کے غلام اور آپ کی کنیزیں دست بستہ سلام کہتی تھیں،

حضور ﷺ! آپ کے دیوانے، آپ کی گلیوں کے مستانے اذن حضوری کے طلب گار ہیں، حضور ﷺ! ان کے دامنِ آرزو کو عطا و کرم کے موتیوں سے بھر دیجئے، ان کے آنسوؤں کو شرفِ قبولیت بخشئے اور انہیں چادرِ رحمت سے نوازیے۔ صدیاں گزر جانے کے بعد بھی دیار ہجر نبی ﷺ کی یہ شب خیزیاں کم نہیں ہوئیں بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ آتش شوق کچھ مزید بھڑکتی جا رہی ہے۔ قافلہ ہائے رنگ و بو کو جستجوئے رسول ﷺ نجانے کہاں کہاں لئے پھرتی ہے۔ یہ کیفیت تو ان عاشقان مصطفے ﷺ کی ہے جنہوں نے ظاہری زندگی میں چہرہ اقدس کی زیارت نہیں کی، بن دیکھے ہی محبوب کبریا کے دیوانے ہوئے جاتے ہیں، بن دیکھے ہی جان و دل سرکار کے قدموں پر نثار کرتے ہیں اور بن دیکھے ہی آمنہؓ کے لال کے قدموں میں گر کر جان جان آفریں کے سپرد کر دینے کی آرزو کرتے ہیں۔ ارباب نظر اندازہ کر سکتے ہیں کہ وہ خوش بخت اصحاب رسول جنہوں نے حضور ﷺ کا زمانہ پایا، جنہیں والی کون و مکان ﷺ کی قربت نصیب ہوئی، جنہیں تاجدار کائنات ﷺ کی سنگت ملی، آقائے دوجہاں ﷺ کے ساتھ سفر و حضر کی سعادت نصیب ہوئی، سرور کونین ﷺ کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کا شرف حاصل ہوا، سپہ سالار مدینہ حضور رحمت عالم ﷺ کی معیت میں میدان جہاد میں اترنے اور کفار و مشرکین کے ساتھ جنگ میں شمولیت کا اعزاز ملا ان کے اضطراب عشق کا عالم کیا ہو گا؟ ان کے دیدہ تر میں آرزوئے جلوہ محبوب کے سلگنے کا منظر کیسا ہو گا؟ ہوائے شہر مدینہ سے ہمکلامی اور گنبد خضرا کی ایک جھلک دیکھ لینے کی آرزو کو ارباب عشق اپنے ذوق کی معراج قرار دیتے ہیں۔ وہ اصحاب رسول ﷺ کتنے خوش بخت ہو نگے جن سے نبی اکرم ﷺ خود ہمکلام ہوا کرتے تھے اور جنہیں حضور ﷺ کے ساتھ یا حضور ﷺ کی اتباع میں ہجرت مدینہ کی توفیق ہوئی۔ ہجرت شرعیہ اصل میں ہجرت الی اللہ و الی الرسول ہے۔ جب ہجرت کا معنی ہجرت الی الرسول ہوا تو اس کا مطلب آقا علیہ الصلوۃ والسلام کی سنگت ہوا، حدیث شریف میں آتا ہے کہ

فهجرته الی ماهاجر الیه	اس کی ہجرت اسی (شخص) کی طرف ہے
(صحیح البخاری، ۱: ۲)	جس کی طرف اس نے ہجرت کی ہے۔

یعنی جس بات کی نیت کی ہے وہی اسے نصیب ہو گا اس لئے جو کوئی بھی ہجرت کرے گا اور اس کی نیت اتباع رسول ہو گی تو وہ ہجرت کرنے والا رسول اللہ ﷺ کی سنگت حاصل کرے گا۔ بالفاظ دیگر وہ خوش بخت حضور ﷺ کی سنگت کا حق دار ہو گا' عہد رسالت مآب میں یہ سنگت جسمانی تھی جبکہ آج یہ سنگت روحانی ہو گی اور اس کا حاصل کرنے والا اپنی اہلیت کے مطابق اسے حاصل کرے گا اور یہ بھی عین ممکن ہے کہ اس روحانی سنگت کو حاصل کرنے کی بجائے اپنی نیت کے فتور کی بنا پر کھو دے لیکن عہد نبوی میں ہجرت کرنے والوں کو آقائے نامدار ﷺ کی ظاہری صحبت بھی نصیب ہوئی' جسمانی سنگت بھی حاصل ہوئی۔ اس وقت بھی قرب و حضوری کا پیمانہ جدا جدا تھا' ہر شخص کو اپنے ظرف کے مطابق ملا کوئی مجلس کا ساتھی بنا تو کوئی گھر تک آنے کا حق دار ٹھہرا حتی کہ بخت والے گھر میں رہنے والے بن گئے' ارشاد خداوندی ہے:۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَحْلَلْنَا لَكَ أَزْوَاجَكَ اللَّاتِي آتَيْتَ أُجُورَهُنَّ وَمَا مَلَكَتْ يَمِينُكَ مِمَّا أَفَاءَ اللَّهُ عَلَيْكَ وَبَنَاتِ عَمِّكَ وَبَنَاتِ عَمَّاتِكَ وَبَنَاتِ خَالِكَ وَبَنَاتِ خَالَاتِكَ اللَّاتِي هَاجَرْنَ مَعَكَ۔

(الاحزاب' ۳۳:۵۰)

اے نبی! ہم نے آپ کے لئے آپکی بیویاں' جن کو آپ مہر دے چکے ہیں حلال کر دی ہیں اور وہ عورتیں بھی جو آپکی ملک ہیں جن کو اللہ نے آپکو (کفار سے بطور مال غنیمت کے) دلوایا ہے۔ اور آپکے چچا کی بیٹیاں' اور آپکی پھوپھیوں کی بیٹیاں اور آپکے ماموں کی بیٹیاں اور آپکی خالاؤں کی بیٹیاں جنہوں نے آپکے ساتھ وطن چھوڑا۔

نبی کریم ﷺ کو اللہ رب العزت کی طرف سے تین قسم کی نساء رکھنے کی خصوصی اجازت مرحمت فرمائی جا رہی ہے۔

۱۔ وہ ازواج مطہرات جن کے مہر دیے گئے ہیں۔

۲۔ وہ جو مال غنیمت میں آئی ہیں۔

۳۔ ماموں زاد' پھوپھی زاد' خالہ زاد' چچازاد' لیکن یہ سب نہیں ان میں سے صرف وہ جنہوں نے آقا علیہ الصلوۃ والسلام کی سنگت میں ہجرت کا فریضہ ادا کیا ہو۔

معلوم ہوا کہ تاجدار کائنات ﷺ کی تاحیات ظاہری دائمی سنگت صرف ان قریشی عورتوں کے مقدر میں آئی جنہوں نے آقائے نامدار ﷺ کے ساتھ ہجرت کی۔ اگرچہ انہیں یہ شرف حضور ﷺ سے نسبی تعلق کی بنا پر حاصل ہوا یعنی وہ حضور ﷺ کی ماموں زاد' پھوپھی زاد' خالہ زاد یا چچا زاد تھیں لیکن شرط معیت دائمہ' ان کا ہجرت کرنا ہے کہ صفت بمنزلہ شرط کے بھی ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے بجاطور پر کہا جاسکتا ہے کہ یہ شرف معیت اس بنا پر تھا کہ انہوں نے ہجرت کی' ہجرت کے بغیر محض نسبی تعلق انہیں اس اعزاز سے یکسر محروم رکھتا' اس بحث کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہجرت سنگت رسول کے اعزاز کا باعث بنی۔

۲۔ مہاجرین: رحمت کے حق دار

ہجرت انقلاب کا پیش خیمہ ہے' سماجی' ثقافتی' مجلسی' اور تہذیبی سطح پر نئے امکانات کے طلوع ہونے کا استعارہ ہے اور ان علامتوں میں سے ایک واضح علامت ہے جو لوح وقت پر کتاب انقلاب کے ہر باب کا عنوان بنتی ہے' مہاجرت خود اعتمادی کی بھی علامت ہے' ہجرت میں سرداری کی اصطلاح اپنے اندر معانی کا ایک سمندر لئے ہوئے ہے' مہاجر حقیقی معنوں میں رحمت حق کے سزاوار ہیں۔ یہ رحمت حق سیاسی بالادستی سے عسکری اور اقتصادی برتری تک ان گنت حوالوں سے مہاجروں کی زندگیوں میں انقلاب آفریں تبدیلیوں کی وجہ بنی' یوں تو اہل ایمان اللہ کی رحمت کے حق دار ہیں ہر لحہ اس کی برکتیں اپنے فرمانبردار بندوں پر نازل ہوتی ہیں لیکن بعض صفات ایسی ہوتی ہیں جن کی بدولت انسان خصوصی طور پر رحمت خداوندی کا حق دار بنتا ہے' ابر کرم ٹوٹ کر برستا ہے اور چادرِ رحمت بندوں کو اپنی وسعتوں میں سمیٹ لیتی ہے۔ انہی صفات میں سے ایک صفت ہجرت ہے۔ مرحلہ ہجرت سے گزرنے والے مسلمانوں پر رحمتوں اور برکتوں کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ ان کا کشکولِ آرزو کرم کے سکوں سے لبریز

ہو جاتا ہے اور انہیں اللہ کی رحمت کا خصوصی استحقاق حاصل ہوتا ہے۔قرآن مجید میں ہے:

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ يَرْجُونَ رَحْمَتَ اللَّهِ ۚ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ○ (البقرہ، ۲:۲۱۸)

بے شک جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے اللہ کے لئے وطن چھوڑا اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔ یہی لوگ اللہ کی رحمت کے امیدوار ہیں اور اللہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔

اس آیتِ مقدسہ میں رحمت خداوندی کے حق دار لوگوں کا ذکر دوبار کیا گیا ہے، وہ لوگ جو ایمان لائے اور وہ لوگ جنہوں نے ہجرت کی اور جہاد کیا، سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ہجرت اور جہاد کی راہ اختیار نہ کی جائے تو کیا صرف ایمان پر اللہ کی رحمت کی امید نہیں کی جا سکتی؟ اس سوال کے ساتھ دوسرا یہ سوال ذہن انسانی میں گردش کرنے لگتا ہے کہ ایمان کے بغیر سفرِ ہجرت اختیار کرنے اور کفار کے خلاف لڑنے پر رحمت خداوندی کی امید کی جا سکتی ہے؟ پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ ایمان پر اللہ کی رحمت کی امید کی جا سکتی ہے بلکہ اللہ کی رحمت صاحبانِ ایمان کے لئے ضروری ہو جاتی ہے۔ دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ ایمان کے بغیر ہجرت اور جہاد کے الفاظ کوئی معنی نہیں رکھتے۔ انسان صاحب ایمان ہو اور پھر ہجرت کرے اور اللہ کی راہ میں جہاد کرے تو اس صورت میں وہ رحمت خداوندی کا حق دار ٹھہرے گا۔ اس سے ظاہر ہوا کہ رحمت کی امید صرف ایمان پر ہوتی ہے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر ایمان نہ ہو تو محض ہجرت اور جہاد کے ذریعہ انسان رحمت حق کا امیدوار نہیں بنتا۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ دونوں کو جدا جدا بیان کرنے میں کیا کیا حکمتیں کار فرما ہیں۔

سوال کا پہلا جواب

سو پہلے سوال کا پہلا جواب بڑا واضح اور روشن ہے۔ اس میں نہ کوئی گھنجلک پن ہے اور نہ کوئی ابہام، سیدھی سی بات ہے کہ رحمت کی امید محض ایمان پر

بھی بندھ جاتی ہے لیکن جب ایمان کی دولت کے ساتھ ہجرت کے جواہرپارے شامل ہو جائیں تو سونے پر سہاگے والی بات ہو جاتی ہے۔ اب صاحب ایمان جس رحمت خداوندی کا سزاوار ٹھہرے گا وہ اللہ کی خاص رحمت ہو گی۔ اس خصوصی رحمت کے حق دار صاحبان ایمان کے مقدر کی بلندیوں پر ستارے بھی رشک کرتے ہیں۔ اللہ کی راہ میں ترک وطن کرنے والے مہاجرین کو اللہ کی خصوصی رحمت کی چادر عطا ہوتی ہے۔ یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ رحمت حق کی امید تو ابتدائًصرف ایمان پر ہی ہو جاتی ہے مگراس کا تحقق ہجرت کے بعد ہوتا ہے۔ پس مہاجر رحمت خداوندی کا ایک ایسا امیداوار ہے جس کے لئے امید رحمت قوی اور رحمت حق متحقق ہو چکی ہے یہی وجہ ہے کہ اس خصوصی رحمت اور پھراس خاص رحمت کے عظیم الشان ہونے کے ساتھ متحقق ہو جانے کو اللہ تعالی نے بیان فرمایا تو لفظ "رحمۃ" نہیں فرمایا بلکہ فرمایا "رحمۃ اللہ" یعنی رحمت کی نسبت و اضافت اپنی جانب کی۔

سوال کا دوسرا جواب

سوال زیر بحث کا دوسرا جواب یہ ممکن ہے کہ ہجرت ایمان و نفاق کے مابین وجہِ امتیاز ہے۔ اس حوالے سے تفصیلی بحث گذشتہ ابواب میں گزر چکی ہے یہاں اس نکتے کی وضاحت ضروری ہے کہ ایمان کے اعلان سے ایمان کا اظہار تو ہو جاتا ہے مگر اس کے درست' کامل اور عمدہ ہونے کی علامت پہلے ہجرت اور پھر جہاد ہے۔ سورہ نساء کی روشنی میں اس حوالے سے بھی بحث آچکی ہے۔ بہرحال ہم ان مباحث سے اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اگرچہ ہجرت کے بغیر صرف اعلانِ ایمان انسان کو رحمت کا امیدوار تو بنا سکتا ہے لیکن اس امیدِ رحمت کا تحقق ہجرت کے ساتھ مختص کر دیا گیا ہے کیونکہ ہجرت ہی

اس دور میں ایمان کے عملی تحقق کی ظاہری شہادت کی قائم مقام تھی' ہجرت کے اس پہلو کی تشریح کے بعد یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ امید رحمت (یعنی نفس امید کا) تحقق بھی (جو بر بنائے ایمان ہے) ہجرت کے ساتھ مشروط ہے یعنی نفسِ ایمان کا تحقق عملی جس طرح ہجرت پر موقوف ہے' رحمتِ حق کی امید بھی اسی طرح ہجرت پر موقوف

ب۔
غفور و رحیم کے معانی و مطالب

غفور اور رحیم اللہ جل مجدہ کی دو صفات ہیں۔ دونوں کے معانی و مطالب مختلف ہیں' غفور کے معنی ہیں بہت بخشش دینے والا' معاف کر دینے والا' مغفرت و بخشش والا' رحیم کا معنی ہے نہایت اور ہمیشہ رحمت فرمانے والا' دائماً رحم کرنے والا' ایمان کا تعلق مغفرت سے ہے اور رحمت دائمہ کا تعلق ہجرت و جہاد سے ہے' یعنی ایمان پر مغفرت نصیب ہوتی ہے جبکہ ہجرت پر جنت کے اعلیٰ درجات کا تحقق ہوتا ہے گویا مہاجر کے فضائل میں یہ بھی شامل ہے کہ وہ جنت کے اعلیٰ درجات کا حق دار ہوا یعنی نفس ہجرت و جہاد ہر درجات اعلیٰ کا سزاوار ٹھہرا' مذکورہ بالا سوال کے دوسرے جواب میں ایمان کا عملی تحقق ہی ہجرت پر ہوتا ہے پس خود مغفرت کا تحقق بھی ہجرت پر ہوا اور رحمت دائمہ کی امید بھی ہجرت پر موقوف ہوئی۔ یعنی اصلاً مہاجر کہلانے کا حق دار وہ ہوگا جس نے اپنی ہجرت کے ذریعہ خود کو اللہ کی بارگاہ سے مغفرت کا بھی حق دار بنالیا اور بارگاہ ایزدی سے اعلیٰ درجات پر بھی متمکن ہوا۔

۳۔ مہاجرین:خصوصی ثواب کے حاملین

ہر صاحب ایمان کو نیک عمل کرنے پر ثواب ملتا ہے' عمل صالح ضائع نہیں ہوتا' ہر نیکی پر اجر دیا جاتا ہے لیکن مہاجر کی ایک فضیلت یہ بھی ہے کہ اعمال صالحہ پر اسے ثواب ہی نہیں بلکہ خصوصی ثواب عطا کیا جاتا ہے۔ نیکی کرنے والے کو اپنی نیکی پر بدلہ تو اللہ کے گھر سے ملتا ہی ہے بلکہ ہر کسی کو اس کی نیکی کے درجے کے مطابق ثواب ملتا ہے۔ چھوٹی نیکی پر اس کا دس گنا اور بڑی نیکی پر اس کا دس گنا بلکہ بعض نیکیوں کا ثواب تو سو گنا اور سات سو گنا تک بھی ملتا ہے لیکن ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ اللہ اور اسکے رسول ﷺ کسی ثواب کو خاص طور پر اللہ کی طرف سے ثواب یا اس کے گھر کا ثواب کہہ کر پکاریں لیکن ہجرت اور اس کے پس منظر میں طے پانے والے امور اور رونما

ہونے والے واقعات کو خصوصی اہمیت دی گئی ہے' ہجرت میں اللہ پاک نے بہت سارے اجور کو جمع بھی فرمایا دیا ہے اور ان اجور کو اللہ کی طرف سے ثواب کہہ کر خصوصی اہمیت بھی دی ہے' قرآن پاک میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ إِنِّي لَا أُضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنكُم مِّن ذَكَرٍ أَوْ أُنثَىٰ بَعْضُكُم مِّن بَعْضٍ فَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَأُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِمْ وَأُوذُوا فِي سَبِيلِي وَقَاتَلُوا وَقُتِلُوا لَأُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَلَأُدْخِلَنَّهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ثَوَابًا مِّنْ عِندِ اللَّهِ وَاللَّهُ عِندَهُ حُسْنُ الثَّوَابِ

(آل عمران' ۳:۱۹۵)

پھر ان کے رب نے ان کی دعا قبول فرما لی (اور فرمایا) یقیناً میں تم میں سے کسی محنت والے کی مزدوری ضائع نہیں کرتا خواہ مرد ہو یا عورت تم سب ایک دوسرے میں سے (ہی) ہو پس جن لوگوں نے (اللہ کے لئے) وطن چھوڑ دیئے اور (اسی کے باعث) اپنے گھروں سے نکال دیئے گئے اور میری راہ میں ستائے گئے اور (میری خاطر) لڑے اور مارے گئے تو میں ضرور ان کے گناہ ان کے (نامۂ اعمال) سے مٹادوں گا اور انہیں یقیناً ان جنتوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی' یہ اللہ کے حضور سے اجر ہے اور اللہ ہی کے پاس (اس سے بھی) بہتر اجر ہے۔

اس آیہ مبارکہ سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کسی مرد یا عورت کے عمل کو ضائع نہیں ہونے دیتا بلکہ ہر نیک عمل پر اس کا مقررہ اجر مل کر رہتا ہے لہٰذا جنہوں نے ہجرت کی' انہیں اپنے گھروں سے نکالا گیا' راہ خدا میں انہیں ستایا گیا' انہیں طرح طرح کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں' اللہ کی راہ میں انہوں نے جہاد کیا اور راہ حق میں جان جان آفریں کے سپرد کردی اور راہ حق میں ہجرت اور خروج عن الدیار سے

جدوجہد کا آغاز کرنے والے اپنے اجر میں اپنے گناہوں کی مکمل معافی پائیں گے' راہ حق کے ان سپاہیوں کو صرف معافی ہی نہیں بلکہ انہیں جنت میں داخلہ ملے گا' پھر اللہ کے گھر کا ثواب انہیں عطا ہو گا۔ آیت مذکورہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ اپنے ان فرمانبردار بندوں کو سب سے اچھے اجر' سب اجور سے زیادہ اجر سے نوازے گا۔

۴۔ مہاجرین: دوستی کے حق دار

وہ لوگ جو اللہ کی راہ میں اپنا سب کچھ قربان کر دیتے ہیں' دین حق کی سربلندی کے لئے ترک وطن جیسے مشکل مرحلے سے گزرتے ہیں' اطاعت رسول کو اپنا شعار بنا کر اپنے عزیز و اقارب سے ناطہ توڑ لیتے ہیں' فکر و نظر کی نئی بستیاں آباد کرتے ہیں' زمینی رشتوں کو روحانی اور فکری رشتوں پر عملاً بھی ترجیح دیتے ہیں اور سفر انقلاب میں خندہ پیشانی سے مشکلات کا سامنا کرتے ہیں یہ جانتے ہوئے بھی کہ انقلاب کا راستہ کوئی پھولوں کی سیج نہیں' یہ جانتے ہوئے بھی کہ اقامت دین کا راستہ طائف کی وادیوں سے ہو کر گزرتا ہے' ابتلاء و آزمائش کے ہر مرحلے میں ثابت قدم رہتے ہیں' رضائے الٰہی کو اپنا مقصود ٹھہراتے ہیں' ان کے پائے استقلال میں ذرا سی بھی لغزش نہیں آتی اور وہ سود و زیاں سے بے نیاز ہو کر سوئے کربلا بڑھنے کی خوئے دلنواز کو زندہ و تابندہ رکھتے ہیں تو قرآن پاک نے سفر ہجرت اختیار کرنے والے ان مجاہدین اسلام کو دوستی کا حق دار قرار دیا ہے بلکہ دوستی کے مستحق اور غیر مستحق افراد کے درمیان فرق و امتیاز کا معیار ہی ہجرت کو قرار دیا ہے اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ قرآن مجید ہجرت کو ایمان و نفاق کے درمیان وجہ امتیاز قرار دیتا ہے۔ گزشتہ ابواب میں اس حوالے سے تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے' ارشادات خداوندی کی روشنی میں دوستی کا حق دار وہی ہو گا جس کا ایمان متحقق اور نفاق معدوم ہونا ثابت ہو چکا ہو گا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے :۔

إِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا بِأَمْوَالِهِمْ وَ أَنْفُسِهِمْ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّ نَصَرُوْا أُولٰٓئِكَ	بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے (اللہ کے لئے) وطن چھوڑ دیئے اور اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے اللہ کی

بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاءُ بَعْضٍ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يُهَاجِرُوْا مَالَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا

(الانفال ۸: ۷۲)

راہ میں جہاد کیا اور جن لوگوں نے (مہاجرین) کو جگہ دی اور (ان کی) مدد کی وہی لوگ ایک دوسرے کے وارث ہیں اور جو لوگ ایمان لائے (مگر) انہوں نے اللہ کے لئے گھربار نہ چھوڑے تو تمہیں انکی دوستی سے کوئی سروکار نہیں یہاں تک کہ وہ ہجرت کریں۔

اہل ایمان کے درمیان دوستی کا معیار ہجرت کو قرار دیا جارہا ہے' ہجرت اللہ اور اسکے رسول ﷺ کی رضا کے حصول کا وسیلہ ہے۔ فرمایا جارہا ہے کہ اہل ایمان اگر دوستی کرنا چاہیں تو وہ صرف اور صرف ان مسلمانوں کے ساتھ دوستانہ مراسم استوار کریں جو ہجرت کرکے ان تک آجائیں اور اگر وہ ہجرت کی راہ اختیار نہ کریں تو وہ ہرگز ہرگز دوستی کے حق دار نہیں۔ اس سے قبل یہ بھی واضح کردیا گیا کہ سفر ہجرت کے مصائب کو سینے سے لگانے والے اور راہ حق کے ان مسافروں کی مدد کرنے والے آپس میں ایک دوسرے کے مددگار اور دوست ہیں۔ مختصر یہ کہ انصار کی دوستی کے حق دار صرف مہاجرین ہیں اور مہاجر ہونا ایک ایسی صفت ہے جو انصار کی مدد و نصرت کا حق دار بناتی ہے۔ بالفاظ دیگر یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ انصار کی مدد چونکہ حضور ﷺ کی حکمت عملی کی بنا پر تھی نیز دین اسلام کے تعلق پر مبنی تھی اور مہاجرین کی یہ مدد خالصتاً اللہ کی مدد تھی اس لئے مہاجرین وہ لوگ ہیں جو اللہ اور اسکے رسول ﷺ کی مدد و نصرت کے سب سے زیادہ حق دار ہیں اور چونکہ انصار کی ان سے دوستی اللہ اور اسکے رسول ﷺ سے تعلق اور دوستی کی بنا پر تھی اس لئے مہاجرین انصار کے ساتھ اللہ اور اسکے رسول ﷺ برحق کے دوست بھی ہوئے۔

۵۔ مہاجرین کا امتیازی مقام

دنیائے اسلام میں مہاجرین کو منفرد اور امتیازی مقام حاصل ہے۔ عظمت کا

تاج انہی کے سروں پر سجتا ہے جو اللہ کی راہ میں اپنا سب کچھ قربان کر دینے کے لئے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔ جو اپنی جبین شکن آلود کئے بغیر اللہ کی رضا کے آگے **سربسجود** ہو جاتے ہیں رضائے الٰہی کا حصول ان کا مقصد حیات ٹھہرتا ہے' اطاعت رسول جن کی زندگیوں کا مرکز و محور قرار پاتا ہے' عشق الٰہی اور محبت رسول ﷺ کے چراغ جن کے سینوں میں فروزاں ہوتے ہیں اور ان کے شب و روز نقوش کف پائے مصطفیٰ ﷺ کی تلاش میں بسر ہونے لگتے ہیں' تاجدار کائنات ﷺ کی غلامی کا احساس جن کی شخصیت کی تعمیر میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ قرآن مجید میں بھی اللہ کی راہ میں سفر ہجرت اختیار کرنے والی اس سپاہ انقلاب کو امتیازی مقام عطا کرتا ہے۔

أَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَاجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَجَاهَدَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا يَسْتَوُونَ عِنْدَ اللَّهِ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ○ الَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ أَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللَّهِ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَائِزُونَ ○

(التوبہ' ۹:۱۹۔۲۰)

کیا تم نے (محض) حاجیوں کو پانی پلانے اور مسجد حرام کی آبادی و مرمت کا بندوبست کرنے (کے عمل) کو اس شخص کے (اعمال) کے برابر قرار دے رکھا ہے جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لے آیا اور اس نے اللہ کی راہ میں جہاد کیا' یہ لوگ اللہ کے حضور برابر نہیں ہو سکتے اور اللہ ظالم قوم کو ہدایت نہیں فرماتا۔ جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنے اموال اور اپنی جانوں سے جہاد کرتے رہے وہ اللہ کی بارگاہ میں درجہ کے لحاظ سے بہت بڑے ہیں اور وہی لوگ ہی مراد کو پہنچے ہوئے ہیں۔

ان دو آیات مقدسہ میں بعض غلط فہمیوں کا ازالہ کرکے اہل ایمان کی اہمیت

کو اجاگر کیا گیا ہے۔ اللہ رب العزت نے کفار و مشرکین (بالخصوص قریش مکہ) کا تقابل اہل ایمان سے کرایا ہے' قریش مکہ کا گمان یہ تھا کہ چونکہ وہ ہر سال اطراف و اکناف سے آنے والے زائرین کعبہ اور حاجیوں کے لئے خصوصی اہتمام کرتے ہیں' ان کی میزبانی کے فرائض سرانجام دیتے ہیں' انہیں پانی پلاتے ہیں اور انکے قیام و طعام کا خیال رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ مسجد حرام کی تعمیر اور اس کی مرمت کا فریضہ بھی ادا کرتے ہیں۔ یہ سارے کام بذات خود ایک بہت بڑی نیکی ہیں لہٰذا یہ نیکی انہیں آخرت میں کافی ہوگی اور ان کی نجات کا باعث بنے گی۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کفار و مشرکین تو آخرت پر یقین ہی نہیں رکھتے تھے' نجات کا یہ تصور کیسا؟ ہمیں معلوم ہے کہ عرب بنیادی طور پر دین براہیمی پر کاربند تھے لیکن امتدادِ زمانہ کے ساتھ دین براہیمی کی آفاقی تعلیمات کا چہرہ بڑی حد تک مسخ ہو چکا تھا اور بت پرستی کی روایات اتنی مستحکم ہو چکی تھیں کہ جزیرہ نمائے عرب کا ثقافتی منظرنامہ پوری طرف کفار و مشرکین کی گرفت میں تھا۔ تاہم دین براہیمی کی چند ایک باقیات ابھی باقی تھیں' کعبہ کی تولیت بھی انہی باقیات میں سے تھی اور اسکے ساتھ منسلکہ تصورات بھی اپنی مسخ شدہ صورت کے ساتھ باقی رہ گئے تھے۔ کفار و مشرکین خانہ کعبہ کا طواف بھی کرتے اور پتھر کے بتوں سے امیدِ کرم بھی رکھتے۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ اعلان نبوت سے پہلے قریشِ مکہ زائرینِ کعبہ کی خدمت پر مامور تھے۔ جس سے وہ بطریقِ احسن عہدہ برا ہو رہے تھے یہ ایک بہت بڑا اعزاز تھا پورے عرب میں انہیں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور انہیں خصوصی سماجی مرتبہ دیا جاتا تھا۔ اس خدمت کی بدولت وہ عرب معاشرے میں دیگر افراد سے افضل و برتر قرار پائے۔ برتری کا احساس ان کی شخصیت کا حصہ بن چکا تھا۔ یہ احساس برتری انہیں نسلی تفاخر کی بنا پر حاصل تھا۔ زائرین کے قافلوں اور مسجد حرام کا تمام انتظام و انصرام ان کے ہاتھ میں تھا جس سے انہیں دوسرے طبقات پر ایک ثقافتی برتری حاصل تھی۔ یہ اپنی اس برتری کا اظہار بھی کرتے رہتے' اس برتری نے ان کے اس گمان کو تقویت دی تھی کہ وہ نیکی کا کام سرانجام دے رہے ہیں۔ یہ جہد مسلسل کبھی سعیٔ

رائیگاں میں شمار نہیں ہوگی لیکن اللہ رب العزت نے ان کے اس گمان باطل کو رد فرما دیا۔ دوسری طرف ایمان لانے والوں میں اکثریت غریب لوگوں کی تھی' معاشرے کے کچلے ہوئے لوگوں نے سلامتی اور امن کے دین کو بڑی تعداد میں قبول کیا' سفر ہجرت اختیار کیا اور اللہ کی راہ میں تلواریں بے نیام کیں۔ فرمایا جارہا ہے کہ حاجیوں کو پانی پلانے والے اور اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے اور باطل کے خلاف علم جہاد بلند کرنے والے ہرگز ہرگز برابر نہیں ہوسکتے۔ یہ اس طرف بھی اشارہ ہے کہ اسلام باطل کے ساتھ کسی سطح پر بھی سمجھوتے کا روادار نہیں۔ یہ بھی کھول کھول کر بیان کردیا گیا ہے کہ بارگاہ الوہیت سے عظمت و رفعت کا پروانہ صرف اور صرف ایمان اور تقویٰ کی بنا پر جاری ہوتا ہے۔

إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ ○ (الحجرات' ۴۹: ۱۳)

بے شک اللہ کے نزدیک تو تم میں زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہو بے شک اللہ سب کچھ جاننا باخبر ہے۔

یہاں کامیابی اور عظمت کی اساس تین چیزوں کو قرار دیا جارہا ہے' ایمان' ہجرت اور جہاد۔ اس معیار پر پورا اترنے والے خوش بختوں کے بارے میں فرمایا جارہا ہے کہ یہ عظیم ترین لوگ ہیں' کامیابی انہی بخت والوں کے مقدر میں لکھی گئی ہے' یہی لوگ اللہ کی خصوصی رحمت کے حق دار ہیں' اللہ کی رضا اور خوشنودی انہی کے حصے میں آئی ہے' اور یہی وہ لوگ ہیں جو ابدی نعمتوں کے حق دار ہونگے اور جنت کے باغوں میں ہمیشہ کے لئے رہیں گے اور انعامات و اعزازات سے نوازے جائیں گے۔ جنت میں داخلے اور وہاں کی ابدی نعمتیں پالینے کے بعد بھی ایک اجر عظیم باقی رہ جاتا ہے۔ اس اجر عظیم کی توضیح و تشریح الفاظ میں ممکن ہی نہیں' اجر عظیم کا مفہوم الفاظ و تراکیب کی بندشوں میں مقید ہو ہی نہیں سکتا' سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ اجر عظیم ہے کیا؟ جو جنت جیسی نعمت پالینے کے بعد بھی انسان کی نظر میں عظیم سے عظیم تر رہتا ہے۔ یہ اجر عظیم

قرب الٰہی اور دیدار الٰہی کے خاص مقامات کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ وہ مقامات جو اللہ کی رضا کے خاص مظاہر ہیں۔

اس ساری بحث کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ یہ تمام اجور جن تین اعمال پر مرتب ہوتے ہیں وہ اگرچہ بادی النظر میں تین جدا اعمال دکھائی دیتے ہیں لیکن حقیقت میں ان کا باہمی ربط ایک دوسرے کے لئے لازم قرار دیتا ہے اگر دیکھا جائے تو یہ اعمال اپنی جداگانہ حیثیت اور اہمیت کے باوجود ہجرت پر ہی مرتب ہو رہے ہیں۔ اس کا بیان فضائل ہجرت کے باب میں تفصیل سے ہو چکا ہے۔ یہاں بتانا یہ مقصود ہے کہ ایمان اگرچہ اصل نعمتوں کی بنیاد ہے اور ایمان کے بغیر ہجرت اور جہاد جیسے عظیم اعمال بھی بے معنی سے ہو کر رہ جاتے ہیں' ہجرت اور جہاد کے ثمرات بھی اہل ایمان ہی کے حصہ میں آتے ہیں لیکن ان کا بھی عملی تحقق ہجرت ہی سے ہوتا ہے جبکہ دوسری طرف جہاد کی بنیاد اور خود جہاد کی ایک صورت ہجرت بھی ہے لہٰذا ہجرت ایمان کا اظہار اور جہاد کی اساس ہونے کی بنا پر اس مقام پر ان اولین مہاجرین کے لئے بڑا مرکزی عمل تھا جو خاص رضائے الٰہی کا باعث ہوا اور راہ حق میں سفر ہجرت اختیار کرنے والوں کے لئے قرب الٰہی اور دیدار خداوندی تک لے جانے والا عمل ٹھہرا۔

۶۔ مہاجرین: بہتر ٹھکانوں کے سزاوار

ارشاد ہوا کہ اللہ بہتر صلہ دینے والا ہے۔ وہ اپنے بندوں کی نیکیوں کے اجر کو ضائع نہیں ہونے دیتا اور وہ ان کا اچھا صلہ دیتا ہے۔ اپنے متقی اور پرہیزگار بندوں کو جو اس کی راہ میں مصائب ہجرت برداشت کرتے ہیں' اسکے دین کی سربلندی اور زمین پر عدل و انصاف کی حکمرانی کے لئے باطل استحصالی قوتوں سے جہاد کرتے ہیں حتیٰ کہ شہادت گہ الفت میں قدم رکھتے ہیں اور قدم قدم پر اپنے لہو کے چراغ روشن کر کے ظلمت شب کا دامن تار تار کرتے ہیں وہ اپنے ان بندوں پر اعزازات و انعامات کی بارش کر دیتا ہے اور انہیں ابدی نعمتوں سے نوازتا ہے' اللہ نے مہاجرین سے ان کی مجبوریوں' محرومیوں اور صعوبتوں کے مطابق دو وعدے فرمائے ہیں اور ان وعدوں کو ابتلاء

و آزمائش میں کامیاب و کامران رہنے والے بندوں کو اپنی بے پایاں رحمتوں اور نوازشوں سے نواز کر پورا فرمایا۔ تاریخ گواہی دے گی کہ مہاجرین حق کی راہ میں مزاحم ہونے والی منفی قوتوں کا ہدف بنے اور انہیں قبول حق کی خاطر ان گنت مصائب سہنا پڑے' بے انتہا سختیاں جھیلنا پڑیں' خود پیغمبر انقلاب حضرت محمد ﷺ کو مقامات جبر سے گزرنا پڑا۔ آزمائش کی ان گنت گھڑیاں آئیں' ہم وطن اور ہم قبیلہ جان کے دشمن بن گئے' قدم قدم پر سازشوں کے جال بچھائے گئے' کردار کشی سے قتل تک ان گنت منصوبے شیطانی ذہنوں میں پرورش پاتے رہے' شعب ابی طالب میں سماجی مقاطعے نے سانس لینا تک دوبھر کر دیا۔ طائف کی وادیوں میں پتھروں کی بارش میں اعلان حق کرتے رہے' خدائے وحدہ لاشریک کی طرف بلاتے رہے' حضور ﷺ خود فرماتے ہیں کہ جتنی اذیت مجھے دی گئی اتنی کبھی کسی کو نہ دی گئی۔ رب کائنات کا اصول ہے کہ

فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝ (الم نشرح' ۹۴:۵-۶)

سو بے شک ہر دشواری کے ساتھ آسانی (آتی) ہے۔ یقیناً (اس) دشواری کے ساتھ (بھی) آسانی ہے۔

تاریک رات کے بعد افق پر سپیدہ سحر کا نموار ہونا اور طلوع آفتاب پر قریہ شب کا منور ہونا قانون فطرت ہے۔ ہر مشکل کے بعد آسانی اور ہر تنگی کے بعد فراخی کا دروازہ کھلتا ہے۔ اگر لغوی باریکی میں جائیں تو معنی یہ ہوئے کہ ہر مشکل کے بعد دوہری آسانی اور ہر تنگی کے بعد دو فراخیاں ہیں۔ اس کی تشریح یوں ہو گی کہ ہر ایک نعمت کے عدم پر دو نعمتیں ملیں گی۔ اب یہ دو نعمتیں اس دنیا میں بھی مل سکتی ہیں یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک نعمت اس دنیا میں اور دوسری نعمت آخرت میں۔ ایک ممکنہ صورت یہ بھی ہے کہ دونوں فراخیاں اس دنیا میں مل جائیں اور آخرت کی فراخی ایک الگ نعمت ہو' غرض معنی جو بھی اخذ کئے جائیں ایک بات مسلم ہے اور وہ یہ کہ اس دنیا میں اجر اور فراخی ضرور ملے گی' اور یہ کہ اگر کوئی مرحلہ آزمائش ہی میں رہے تو اس کا اجر آخرت میں اور زیادہ ہو گا۔ اس لئے کہ اللہ کسی کے نیک عمل کو ضائع نہیں کرتا اور وہ اس کا

پورا پورا صلہ دیتا ہے۔

تاریخ ہجرت مدینہ کا سرسری سا مطالعہ کرنے کے بعد بھی قاری اس حقیقت تک پہنچ جاتا ہے کہ اللہ نے ہجرت کرنے اور مشکلات برداشت کرنے والوں سے روحانی اور جسمانی ہر دو اعتبار سے اچھا بدل اور اچھا ٹھکانہ عطا کرنے کا وعدہ فرمایا۔ یہ وعدہ بعد ازاں اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ پورا بھی ہوا۔ وہ مہاجرین جو بے سرو سامانی کے عالم میں اپنے گھروں سے نکلے تھے اور جو بے مائیگی اور بے چارگی کی کیفیت سے دو چار تھے ان سے یہ وعدہ فرمایا گیا کہ۔

وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مَاظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَلَأَجْرُ الْاٰخِرَةِ أَكْبَرُ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ٥ (النحل ۱۶:۴۱)

اور جنھوں نے اللہ کی راہ میں ہجرت کی اس کے بعد کہ ان پر (طرح طرح کے) ظلم توڑے گئے تو ہم ضرور انہیں دنیا (ہی) میں بہتر ٹھکانا دیں گے اور آخرت کا اجر تو یقیناً بہت بڑا ہے۔ کاش وہ (اس راز کو) جانتے ہوتے۔

اکیسویں صدی..... اسلام کی صدی

مہاجرین کی مظلومیت کی گواہی خود قرآن دے رہا ہے' واضح طور کہا جا رہا ہے کہ جن لوگوں نے اللہ کی راہ میں مصائب ہجرت برداشت کئے انہیں اسکے صلہ میں اچھے ٹھکانے عطا فرمائے جائیں گے۔ ہجرت کے بعد مہاجرین کو باعزت سماجی حیثیت حاصل ہوئی۔ انہیں سیاسی اقتصادی اور ثقافتی طور پر پورے جزیرہ نمائے عرب پر بالادستی حاصل ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے مسلمان پرچم توحید لے کر اطراف و اکناف عالم میں پھیل گئے' اندلس سے ہند تک شوکت اسلام کے پرچم لہرانے لگے' تہذیب و تمدن کے ارتقاء اور علوم جدیدہ کے حصول کے لئے پوری دنیا دنیائے اسلام کی طرف پر امید نظروں سے دیکھنے لگی' علمی' ثقافتی اور فکری برتری نے مسلمانوں کو اس مسند عظمت پر متمکن کیا جس کی آرزو آج بھی شاہان وقت کرتے ہیں اور غیر مسلم تک یہ کہنے پر مجبور

ہو جاتے ہیں کہ اگر ہمیں حکومت ملی تو ہم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد مبارکہ کی تقلید کریں گے اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے آثار حکومت پر اپنی حکومت کی بنیادیں استوار کریں گے۔ یہ مہاجرین ہی تھے جو اسلام کا نور لے کر اپنے تجارتی قافلوں کے ساتھ دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچے۔ وسط ایشیاء کی اسلامی ریاستیں کیمونزم کی طویل رات کے بعد بھی اپنا اسلامی تشخص برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ مسلمانوں پر زوال و انحطاط ضرور طاری ہے لیکن اسلام آج بھی ایک مضبوط اور توانا ضابطہ حیات کے طور پر زندہ و سلامت ہے اور اس گئے گزرے دور میں بھی ایک مکمل ضابطہ حیات کے طور پر اسکے نفاذ کے امکانات روشن ہی نہیں بلکہ روشن تر ہیں۔ پوری دنیا اپنے وضع کردہ نظام ہائے حیات کی فرسودگی اور بے ہودگی سے نجات حاصل کرنے کے لئے ایک بار پھر حضور ﷺ کے در اقدس سے دریوزہ گری کرنے کے لئے بے تاب نظر آتی ہے۔ یہ وہی مقام عظمت ہے جس کی طرف آیت مقدسہ میں اشارہ کیا گیا کہ تم نے اللہ کی راہ میں مصائب برداشت کئے ہم اس دنیا میں بھی تمہیں بہتر ٹھکانہ دیں گے' ٹھکانہ سے مراد محض جگہ یا مقام نہیں بلکہ وہ سیاسی' اقتصادی' ثقافتی اور علمی بالادستی بھی ہے جسے ہم نے اپنی حماقتوں سے کھو دیا ہے اسلامی تحریکیں آج اسی عظمت رفتہ کی بازیابی کے لئے سرگرم عمل ہیں۔ اگر حالات سازگار رہے اور امت مسلمہ کے حکمرانوں نے بھی اپنی ملی ذمہ داریوں کو محسوس کیا اور اپنے وسائل کو یکجا کر کے عالم کفر کے خلاف سیسہ پلائی دیوار بن گئے تو اکیسویں صدی اسلام کی صدی ہو گی اور اللہ کا وہ وعدہ پورا ہو کر رہے گا جس کا ذکر اس نے آیت مذکورہ میں اپنے ان بندوں سے کیا ہے جو ہجرت کی مشکلات کو برداشت کرتے ہیں اور اس کی راہ میں جہاد کرتے ہیں۔ آخرت کے اجور کے بعد جو اجر عظیم ملے گا وہ ان دنیاوی اعزازات اور انعامات سے الگ ہے اور اللہ اہل ایمان کو نیکیوں کا پورا پورا صلہ دینے والا ہے' یہ چیزیں چونکہ عوام کی نگاہوں سے اوجھل ہوتی ہیں اس لئے فرمایا کاش کہ لوگ کسی طرح سمجھتے اور معلوم کرتے یعنی یہ امر قابل دید اور لائق بیان ہے کہ مہاجرین مدینہ کو اتنا بڑا رتبہ دیا گیا اور انہیں اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی بہتر ٹھکانوں سے نوازا گیا اور انہیں پوری دنیا کی حکمرانی کا سزاوار ٹھہرایا گیا۔

۷۔ مہاجرین: سزاوار مغفرت

ہجرت بنائے عظمت ہے' اساسِ مغفرت ہے اور وجہِ رحمتِ خالقِ دوجہاں ہے۔ انسانی تہذیب و تمدن کے ارتقاء میں مسلمانوں کا حصہ (Contribution) ہر لحاظ اور ہر حوالے سے قابل صد افتخار ہے' سائنسی ترقی اور علوم جدیدہ کی بنیاد اسلامی مفکرین کی علمی اور تحقیقی کاوشوں کی مرہون منت ہے' اسی لحاظ اور حوالے سے ہجرت کرنے والوں کے فضائل کا احاطہ تقریباً ناممکن ہے۔ اس دنیا میں عظمت اور کامیابی نے قدم قدم پر ان کے قدم چومے اور آخرت میں بھی کامیابی کی بشارتیں ان کیلئے لوح وقت پر تحریر ہوتی رہیں۔ مہاجرین کے فضائل میں یہ بھی شامل ہے کہ وہ اللہ کی مغفرت کے سزاوار ٹھہرائے گئے ہیں' ہجرت مدینہ کا اعزاز حاصل کرنے والے خوش بختوں کا ایک لازوال اعزاز یہ بھی ہے کہ وہ آقائے مدینہ ﷺ کے صحابی تھے۔ حضور ﷺ کا صحابی ہونا خود ایک ایسی نعمت ہے جس کی بناء پر ان نفوس قدسیہ کو مغفرت خودبخود حاصل ہو جاتی ہے۔ یہی وہ مقدس گروہ پاکبازاں ہے جسے اس دنیا میں ہی یہ نوید سنا دی گئی کہ اللہ ان کے استحکام ایمان اور جذبہ ایثار و قربانی پر ان سے راضی ہوا۔ جس پر اللہ راضی ہو جائے اس کی عظمت کا کیا کہنا اس کے روحانی مدارج کا کون احاطہ کر سکے گا۔ یہ نعمت ان کے علاوہ کسی اور کو نہیں مل سکتی' ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ إِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِي قُلُوْبِهِمْ فَأَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَأَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًاO وَمَغَانِمَ كَثِيْرَةً يَّأْخُذُوْنَهَا وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًاO
(الفتح' ۴۸: ۱۸-۱۹)

یقیناً اللہ مومنوں سے خوش ہوا جب وہ درخت کے نیچے آپ سے (جہاد کے لئے) بیعت کر رہے تھے پس اللہ نے (وہ صدق و خلوص) جو ان کے دلوں میں تھا جان لیا پھر ان (کے دلوں) پر تسکین نازل فرمائی اور ان کو (حدیبیہ سے آنے کے بعد ہی خیبر کی) جلد ہی ایک فتح انعام

فرمائی اور بہت سی غنیمتیں بھی (عطا کیں) جن سے وہ سرفراز ہوتے رہے اور اللہ زبردست حکمت والا ہے۔

رضائے الٰہی کا حصول مومن کا مقصود و مطلوب ہوتا ہے اور جس بندے سے خود خالق کائنات راضی ہو جائے اس کے مقام و مرتبے کو فرشتے بھی رشک سے دیکھتے ہیں' اس آیہ کریمہ میں صحابہؓ کی جماعت سے اللہ جل شانہ کا راضی ہونا معلوم ہوا اور ظاہر ہے کہ راضی ہونا مغفرت فرما دینے کو بھی مستلزم ہے چنانچہ معلوم ہوا کہ صحابہؓ کا اصحاب رسول ہونا خود ایک ایسی نعمت ہے جس میں کوئی دوسرا ان کا ثانی نہیں اور جس کی بنا پر انہیں مغفرت حاصل ہوئی اور اگر کوئی صحابی رضی اللہ عنہ مہاجر بھی ہو تو اس کے فضائل کی حد کیا ہوگی؟ مہاجر وہ ہستی ہے جو اللہ کی راہ میں مصائبِ ہجرت اور آلامِ سفر برداشت کرتا ہے۔ اس کی ماقبل کی مغفرت کیلئے ہجرت کی آزمائش اور دین حق پر استقامت ہی کافی ہے' ہجرت چونکہ خود جہاد کی ایک صورت ہے اور جہاد کی بنیاد بھی ہے نیز آزمائش اور صبر و استقامت کے پیکر تراشنے میں اپنا ایک مقام بھی رکھتی ہے لہٰذا مغفرت کی دولت سے مہاجرین کا کشکول تمنا ہمیشہ لبریز رہتا ہے۔ قرآن مجید میں اللہ رب العزت نے مہاجرین السابقین الاولین کی بابت ارشاد فرمایا:

ثُمَّ إِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِينَ هَاجَرُوا مِنْ بَعْدِ مَا فُتِنُوا ثُمَّ جَاهَدُوا وَصَبَرُوا إِنَّ رَبَّكَ مِنْ بَعْدِهَا لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ ○

(النحل' ۱۶:۱۱۰)

پھر آپ کا رب ان لوگوں کے لئے جنہوں نے آزمائشوں (اور تکلیفوں) میں مبتلا کئے جانے کے بعد ہجرت کی (یعنی اللہ کے لئے اپنے وطن چھوڑ دیئے) پھر جہاد کئے اور (پریشانیوں پر) صبر کئے تو (اے حبیب مکرم) آپ کا رب اس کے بعد بڑا بخشنے والا نہایت مہربان ہے۔

ایمان کے ساتھ اللہ کی راہ میں ثابت قدم رہنا یقیناً ایک غیر معمولی خوبی

ہے۔ اللہ کی راہ میں ترک وطن کرنے والوں کو نوید سنائی جا رہی ہے۔ اے محبوب! تمہارا رب مہاجرین کیلئے کافی ہے۔ گویا مہاجرین کو یہ بشارت دی جا رہی ہے کہ اللہ کی راہ میں سفر ہجرت کے مرحلے سے گزرنے والے فرمانبردار بندو! کچھ غم نہ کرو' یہ مصائب اور آلام عارضی ہیں' اللہ تمہارے ساتھ ہے' تمہیں ستایا گیا' تمہیں اذیتیں دی گئیں' تمہیں بے گھر کیا گیا' تمہیں بے وطن کیا گیا لیکن تم نے اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور ثابت قدم رہے' نہ جھکے نہ بکے' اپنے نصب العین کی سچائی پر غیر متزلزل یقین رکھنے والوں کو نوید سنائی جا رہی ہے کہ اللہ بخشنے والا اور مہربان ہے' تم اس کی مہربانیوں کے سزاوار ہو' تم اس کی مغفرت کے حق دار ہو' مغفرت اور بخشش کا مژدۂ جانفزا تمہارے لئے ہے' رب العالمین کی رحمتیں مسلسل بارش کی طرح تم پر برستی رہیں گی' ہر قدم پر اس کی رحمت ابرِ کرم بن کر تمہارے ساتھ رہے گی اور صحرائے زیست کے ہر مرحلے پر تمہاری جسمانی اور روحانی پیاس بجھائے گی۔

۸۔ مہاجرین کیلئے اچھی برزخی زندگی کی بشارت

درج بالا آیات سے معلوم ہوا کہ اللہ کی راہ میں مصائب برداشت کرنے اور ثابت قدم رہنے والوں کیلئے ہر دو جہاں میں آسانیاں فراہم کرنے کی ضمانت دی گئی ہے۔ اللہ جل مجدہ اپنی خاص رحمت کے طفیل اچھے ایمان اور اعمال صالحہ کے حامل افراد کو قبر اور عالم برزخ میں اچھی اور نہایت عمدہ زندگی عطا فرمائیں گے۔ ارشاد خداوندی ہے:۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ (النحل' ۱۶:۹۷)

جو کوئی نیک عمل کرے (خواہ) مرد ہو یا عورت جبکہ وہ مؤمن ہو تو ہم اسے ضرور پاکیزہ زندگی کے ساتھ زندہ رکھیں گے اور انہیں ضرور ان کا اجر (بھی) عطا فرمائیں گے ان اچھے اعمال کے عوض جو

وہ انجام دیتے تھے۔

اس آیت مقدسہ میں اللہ جل شانہ نے نیک عمل کرنے والے اہل ایمان سے وعدہ فرمایا ہے کہ انہیں مرنے کے فوراً بعد یعنی قبر میں ایک بہت عمدہ زندگی عطا فرمائیں گے۔

مذکورہ بالا آیہ کریمہ میں فَلَنُحْيِيَنَّهُ میں "فا" تعقیب کیلئے ہے اور ایک عمل کے فوراً بعد دوسرے عمل کے شروع ہونے پر دلالت کرتی ہے یعنی اس کا مابعد اس کے ماقبل کے فوراً بعد واقع ہوتا ہے۔ لہٰذا آیہ کریمہ کا مفہوم یہ ہوا کہ یہ زندگی نیک عملوں کے فوراً بعد ہوگی جبکہ نیک اعمال موت پر اختتام پذیر ہوں گے' پس موت کے فوراً بعد کی زندگی قبر کی زندگی ہوگی اور بہت عمدہ زندگی ہوگی' یہ زندگی شہدا کے مثیل ہوگی اگرچہ ان جیسی نہ ہوگی' اسی پر موقوف نہیں بلکہ جس زندگی (برزخی) کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والے مہاجرین سے اس سے بھی اچھی زندگی کا وعدہ کیا گیا ہے' قرآن مجید نے مہاجرین کی برزخی زندگی شہدا کے ساتھ ملا کر بیان کی ہے تاکہ واضح ہو کہ دونوں کی برزخی زندگیاں ایک جیسی ہونگی ارشاد ربانی ہے :۔

وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ قُتِلُوْٓا اَوْ مَاتُوْا لَيَرْزُقَنَّهُمُ اللّٰهُ رِزْقًا حَسَنًا وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ○ لَيُدْخِلَنَّهُمْ مُّدْخَلًا يَّرْضَوْنَهٗ وَاِنَّ اللّٰهَ لَعَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ○ (الحج ۲۲:۵۸-۵۹)

اور جن لوگوں نے اللہ کی راہ میں اپنا گھر بار چھوڑا پھر وہ مارے گئے یا مر گئے تو یقیناً اللہ ان کو اچھی روزی دے گا اور بے شک اللہ ہی ہے جو سب سے بہتر رزق دینے والا ہے اور (اللہ) یقیناً ان (مومنین) کو ایسے مقام میں داخل کرے گا جسے وہ (بہت) پسند کریں گے اور بے شک اللہ سب کچھ جانتا ہے اور بڑا تحمل والا (بھی) ہے۔

یہاں یہ نکتہ قابل غور ہے کہ اہل ہجرت میدان جنگ میں کفار و مشرکین سے

قتال کرتے ہوئے خلعتِ شہادت سے سرفراز ہوں یا غازی بن کر لوٹیں اور طبعی موت پائیں دونوں صورتوں میں انہیں یکساں برزخی زندگی عطا ہوگی' انہیں ایک جیسا اجر اور ایک جیسا رزق حسن ملے گا' ایک ہی طرح کے درجات والے مقامات پر پہنچیں گے گویا اجر اور رزق حسن کی اصل بنا شہادت پر نہیں ورنہ اس اجر اور رزق حسن میں غیر شہید کو ہرگز ہرگز شامل نہ کیا جاتا بلکہ اجر اور رزق حسن کی اصل بنا ہجرت پر ہے کیونکہ ہجرت دونوں میں قدر مشترک ہے۔ معلوم ہوا کہ مہاجر اس فضیلت کا مالک ہے کہ وہ عالم برزخ میں بھی شہید کے ہم پایہ زندگی حاصل کرتا ہے۔ اہل ایمان کو یہ اجر آج بھی نصیب ہو سکتا ہے شرط یہ ہے کہ ہم ہجرت کے تقاضے پورے کریں اور اللہ کی راہ میں ثابت قدم رہیں تاکہ ہماری ہجرت' ہجرت شرعیہ بن سکے۔ افسوس! جہاد کے ساتھ ہم نے ہجرت کے دروازوں کو بھی مقفل کر رکھا ہے یہی وجہ ہے کہ عظمت و شوکت کی مشعل ہمارے ہاتھ سے چھین لی گئی ہے۔ جب تک ہم ہجرت اور جہاد کو اپنی انقلابی جدوجہد کا عنوان نہیں بنائیں گے' جب تک ہم مصائبِ ہجرت کو خندہ پیشانی سے قبول کر کے سفر انقلاب پر روانہ نہیں ہونگے' جب تک ہم دین کی سربلندی کیلئے عالم کفر کے ساتھ قتال نہیں کریں گے عظمت رفتہ کی بازیابی کا ہر خواب اندھیروں میں لپٹا رہے گا' احیائے اسلام کی ہر کوشش سعیِ نامشکور ثابت ہوگی اور ایک مکمل ضابطہ حیات کے طور پر نفاذ اسلام کا ہر امکان وقت کی گرد میں گم ہو کر رہ جائے گا۔

۹۔ دامن احترام و پناہ بھی مہاجرین کیلئے

اسلامی سلطنت مہاجرین کو پناہ دینے اور عزت و احترام سے ان کی آباد کاری کے امور سرانجام دینے کی پابند ہے۔ قرآن مجید نے بھی مہاجرین کو پناہ کا حق دار ٹھہرایا ہے۔ عدل و انصاف کا تقاضا بھی یہ ہے کہ وہ لوگ جو اللہ کی راہ میں ترک وطن کر کے اپنا گھر بار چھوڑ کر اسلامی ریاست کی حدود میں آجائیں ان کی ہر طرح سے دلجوئی کی جائے' انہیں نہ صرف پناہ دی جائے بلکہ ان کی آباد کاری کیلئے بھی کوئی دقیقہ

فروگزاشت نہ کیا جائے اور ان کی عزت نفس کا پورا پورا خیال رکھا جائے کیونکہ مہاجرت کی صعوبتیں سہہ کر دارالامن میں آنے والوں کے جذبات کے آبگینے بڑے نازک ہوتے ہیں یہ ذرا سی ٹھیس سے ٹوٹ جاتے ہیں۔ مواخات مدینہ انہی آبگینوں کے تحفظ کی ایک شعوری کوشش تھی، محبت اور اخوت کا عنصر ہی ہر زخم کا مرہم ہے، اللہ جل مجدہ کا حکم ہے کہ جو لوگ ہجرت الی الرسول کے ذریعہ اسلامی مملکت میں داخل ہو جائیں انہیں پناہ دی جائے اور ان کی بھرپور مدد کی جائے۔ گزشتہ ابواب میں بیان ہو چکا ہے کہ قرآن مجید نے اہل ہجرت اور ان کی مدد کرنے والوں کو **بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاءُ بَعْضٍ** کہہ کر ایک کو دوسرے کا دوست قرار دیا ہے نیز (**وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّ نَصَرُوْا۔** جنہوں نے پناہ دی اور مدد دی) فرما کر مہاجرین کو پناہ اور مدد ونصرت کا حق دار قرار دیا ہے پناہ کی مناسبت سے مہاجرین کو پناہ گزین بھی کہا جا سکتا ہے یعنی کفار ومشرکین کی چیرہ دستیوں سے تنگ آ کر جو سفر ہجرت اختیار کریں اور بالآخر اسلامی ریاست میں پناہ کے طالب ہوں تو انہیں نہ صرف پناہ دی جائے بلکہ ان کے جان ومال کا تحفظ بھی کیا جائے اور ان کے باعزت روزگار کا اہتمام کر کے انہیں اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے میں مدد بھی دی جائے اور انہیں اسلامی معاشرے کا اس طرح حصہ بنا لیا جائے کہ وہ عملی طور پر بھی اپنے نئے وطن کو اپنے آبائی وطن پر ترجیح دیں، انہیں اتنی محبت دی جائے کہ وہ تمام رشتوں کو بھول کر محبت الٰہی کی سرشاریوں میں گم ہو جائیں۔

قیام پاکستان کے وقت جب مہاجرین کے لٹے پٹے قافلے سرزمین پاکستان میں داخل ہوئے تو مقامی لوگوں نے اپنے بھائیوں کو سینے سے لگایا۔ ایثار وقربانی کی لازوال مثالیں قائم کیں اور مواخات مدینہ کی یاد تازہ کر دی، ہزاروں خواتین نے ان گنت لاوارث بچوں کی پرورش کا ذمہ لیا، انہیں رہائش اور خوراک مہیا کی، انہیں زیور تعلیم سے آراستہ کیا اور انہیں معاشرے کا کارآمد شہری بنانے کیلئے ہر وہ کام کیا جو وہ اپنے بچوں کیلئے کر سکتی تھیں، مہاجرین کی آبادکاری کیلئے ہنگامی بنیادوں پر کام ہوا، مہاجرین کیلئے روزگار کی فراہمی کو یقینی بنا کر انہیں معاشی آسودگی سے ہمکنار کرنے کی پوری

کوشش کی گئی اور نوزائیدہ مملکت نے اپنے محدود وسائل کے باوجود مہاجرین کو گلے سے لگایا اور ہر ممکن طریقے سے ان کی کفالت کرکے احکام خداوندی کی پیروی کو اپنا شعار بنایا۔ ان پر ملازمتوں کے دروازے کھول دیئے گئے' کاروبار شروع کرنے کیلئے انہیں ضروری سہولتیں بہم پہنچائی گئیں' بے آباد زمینیں ان میں تقسیم کی گئیں کہ انہیں آباد کرکے اپنے لئے اور اپنے نئے وطن کیلئے آسودہ لمحوں کے حصول کو یقینی بنائیں۔ حتیٰ کہ اعتبار واعتماد کی ہر دولت سے انہیں نوازا گیا اور مملکت خداداد پاکستان کی عنان اقتدار ان کے ہاتھ میں تھما دی گئی۔ دوئی کے ہر زاویئے کو مٹا دیا گیا اور آج مہاجرین مقامی آبادی کا ایک حصہ بن کر وطن عزیز کی تعمیر و ترقی میں مصروف ہیں۔

مشکوک عورتوں کے ایمان کی پرکھ

ریاست جموں و کشمیر میں ڈوگرہ راج اور پھر بھارتی استعمار کے مظالم کا ہدف بننے والے لاکھوں کشمیریوں کو اس خطۂ دیدہ و دل نے اپنے دامن میں پناہ دی۔ افغانستان جب روسی جارحیت کا نشانہ بنا تو لاکھوں مہاجرین پاکستان میں داخل ہوگئے۔ حکومت ہی نہیں بلکہ پاکستانی عوام نے بھی اپنے افغان بھائیوں کی میزبانی کا شرف حاصل کیا۔ اسی طرح فلسطین کے مہاجرین کی کئی نسلیں مہاجر کیمپوں میں پل کر جوان ہوئیں اور اسلامی ممالک نے ان کی بھرپور کفالت کی اور ان کی جنگ آزادی میں اخلاقی اور مالی مدد دی۔ دخترِ فلسطین کے برہنہ سر پر احترام کی چادر دی' بوسنیا کے مہاجرین کو گلے سے لگا کر اخوت اسلامی کا عظیم مظاہرہ کیا۔ قرآن مجید کی سورہ ممتحنہ میں بھی ہجرت کرنے والی خواتین اسلام کی بابت انہیں پناہ دینے کا حکم دیا گیا ہے۔ مکہ سے ہجرت کرکے آنے والی عورتوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے ایک وہ جو سچے دل سے ایمان لاکر اللہ کی رضا کیلئے اپنے گھربار چھوڑ کر آئی تھیں' دوسری وہ خواتین جو ممکن ہے ایمان نہ لائی ہوں بلکہ کسی ایمان والے سے تعلق کی بنا پر اسے بہکانے کی غرض سے مدینہ منورہ آگئی تھیں۔ چنانچہ قرآن مجید نے اولاً ان کے ایمان کی پرکھ کا حکم ارشاد فرمایا پھر ان کا ایمان

متحقق ہونے پر ان کو پناہ دینے اور انہیں معاشرے کا حصہ بنالینے کا حکم دیا گیا۔ فرمان باری تعالیٰ ہے:۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا جَاۗءَكُمُ الْمُؤْمِنٰتُ مُهٰجِرٰتٍ فَامْتَحِنُوْهُنَّ ۭ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِهِنَّ ۚ فَاِنْ عَلِمْتُمُوْهُنَّ مُؤْمِنٰتٍ فَلَا تَرْجِعُوْهُنَّ اِلَى الْكُفَّارِ ۭ لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّوْنَ لَهُنَّ ۭ وَاٰتُوْهُمْ مَّآ اَنْفَقُوْا ۭ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ ۭ

(الممتحنہ ۶۰:۱۰)

اے ایمان والو! جب تمہارے پاس مسلمان عورتیں (جو اپنے کو صاحب ایمان کہتی ہیں) ہجرت کرکے آئیں تو ان کو جانچ لیا کرو (کہ واقعی مسلمان ہیں یا نہیں) اللہ ان کے ایمان کو خوب جانتا ہے۔ پھر اگر تم کو ان کے ایمان کا یقین ہو جائے تو انہیں کفار کی طرف واپس نہ کرو (اس لئے) کہ یہ عورتیں نہ ان کفار کے لئے حلال ہیں اور نہ وہ (کافر) ان کے لئے حلال ہیں اور ان (کافروں) کو جو کچھ ان کا (ان عورتوں پر) خرچ ہوا ہو دے دو۔ اور تم کو ان عورتوں سے نکاح کرنے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں جبکہ تم ان کا مہران کو ادا کردو۔

آیہ کریمہ میں مشکوک عورتوں کے ایمان کی پرکھ کا حکم دیا گیا ہے کہ کہیں یہ اہل ایمان کو ورغلانے پر تو مامور نہیں کی گئیں۔ آج عصر حاضر میں ہم دیکھتے ہیں کہ عورتیں جاسوسی کے لئے استعمال کی جاتی ہیں، خصوصاً عمائدین مملکت کی قربت حاصل کر کے حساس معاملات پر اہم دستاویزات کی ترسیل خوبرو خواتین کے ذریعہ ہوتی ہے، یہ عورتیں باقاعدہ خفیہ اداروں کی ملازمت اختیار کرتی ہیں۔ دوسری جنگ عظیم میں بھی جاسوس عورتوں نے جنگ کا نقشہ پلٹنے میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ امریکہ، بھارت اور اسرائیل عورتوں کے ذریعہ دوسرے ممالک کے عسکری منصوبوں اور ان کی ایٹمی

تنصیبات کے متعلق دستاویزات کی چوری کے لئے خواتین کے منظم گروہوں کی خدمات حاصل کرتے ہیں۔ عرب اسرائیل جنگ میں یہودی عورتوں نے بعض مسلمان جرنیلوں اور سیاستدانوں کے عشرت کدوں کی زینت بن کر وہ وہ راز اگلوا لئے جو عام حالات میں دشمن کے ہاتھ نہیں لگ سکتے تھے اور جو میدان جنگ میں عربوں کی شکست کا باعث بنے۔ آج بھی یہ یہودی عورتیں بعض مسلمانوں کے اعصاب پر سوار ہیں اور مسلم امہ کے اتحاد میں ایک رکاوٹ بنی ہوئی ہیں۔ اس آیت مقدسہ میں مہاجر عورتوں کے بارے میں واضح حکم دیا گیا ہے کہ ان کے ایمان کا امتحان لو یعنی مشکوک صورتوں میں خوب چھان بین کر لیا کرو اور انہیں پناہ دو' افضل یہ ہے کہ (اگر ممکن ہو تو) ان سے نکاح کر لو' انہیں چراغِ خانہ بنا کر عزت و احترام اور معاشرے میں انہیں بلند مقام دو۔ بالفاظ دیگر مہاجر عورتیں اس بات کی حق دار ہیں کہ انہیں پناہ دی جائے اور انہیں سماج میں لائق تعظیم سمجھا جائے۔ وسیع تر مفہوم میں مہاجرین خواہ وہ مرد ہوں یا عورتیں جب سفر ہجرت اختیار کریں تو انہیں پناہ دینا اور ان کے لئے معاشرے میں عزت و احترام کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا اہتمام کرنا اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے۔

۱۰۔ اہل ہجرت اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کے حق دار

ابتلاء و آزمائش کے مراحل سے گزر کر ہی رضائے الٰہی حاصل ہوتی ہے' مقام رضا کا حصول احکامات خداوندی کی پیروی اور محبت و اتباع رسول ﷺ کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ یہ وہ مقام عظمت ہے جس کی تمنا سینوں میں پلتی تو ہے لیکن یہ مقام اللہ کے خاص فضل و کرم سے ہی ملتا ہے۔ مہاجرین ان خوش نصیبوں میں سے ہیں جنہیں بارگاہ الوہیت سے رضا و خوشنودی کا مژدہ جانفزا سنایا جا چکا ہے۔ گزشتہ صفحات میں بیان ہو چکا ہے کہ صحابہؓ کی جماعت ایسی خوش نصیب جماعت ہے جسے ایک سے زیادہ مواقع پر اللہ کی بارگاہ سے رضا و خوشنودی کا پروانہ مل جانے کی سعادت حاصل ہوئی ہے۔ ایک موقع تو وہ تھا جب اصحاب رسول نے درخت کے نیچے بیعت رضوان کی تھی

(بیعت رضوان سے مراد ہی رضا و خوشنودی والی بیعت ہے) ایک مقام وہ بھی تھا جب مہاجرین نے ہجرت اور انصار نے مدد و نصرت کی تھی۔ اس وقت بارگاہ خداوندی سے اپنے ان مقرب بندوں کے لئے رضا و خوشنودی کی بشارت دی گئی تھی' بلکہ یہ صفت تو اتنی منفرد ہے جو اس موقع پر صرف انہیں لوگوں کے مقدر میں لکھی گئی جو مہاجرین میں سے بھی "سابقون" (اولین لوگ) تھے اور انصار میں بھی اولین لوگ ہی تھے' یعنی سبھی مہاجرین بھی اور سبھی انصار بھی اس اعزاز کے حق دار نہیں ٹھہرائے گئے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

وَالسَّابِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهَاجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ وَ اَعَدَّلَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَاۤ اَبَدًا ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ○ (التوبہ '۹:۱۰۰)

اور مہاجرین اور ان کے مددگار (انصار) میں سے سبقت لے جانے والے' سب سے پہلے ایمان لانے والے اور نیک کاموں میں ان کی پیروی کرنے والے' اللہ ان (سب) سے راضی ہو گیا اور وہ (سب) اس سے راضی ہو گئے اور اس نے ان کے لئے جنتیں تیار فرما رکھی ہیں۔ جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں' وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہنے والے ہیں۔ یہی زبردست کامیابی ہے۔

واضح اور روشن الفاظ میں اللہ جل مجدہ کی رضا و خوشنودی کا اعلان فرمایا جا رہا ہے نہ صرف راضی ہو جانے کا اعلان ہو رہا ہے بلکہ باغات جنت کی جھلک بھی دکھائی جا رہی ہے کہ ان مقامات پر تم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رہو گے اور پھر ان مقامات عظمت و رفعت کے حصول کو مومنین کے لئے ایک بہت بڑی کامیابی بھی قرار دیا جا رہا ہے۔ رضائے الٰہی کا حصول اور پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے اطاعت گزار بندوں پر انعامات و اعزازات کی بارش یقیناً ایک بہت بڑی سعادت اور کامیابی ہے جو اس کے

بے پایاں فضل و کرم کی مرہون منت ہے۔

۱۱۔ مہاجرین: اللہ کی رحمتوں کا مرکز توجہ

اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والے' گھربار کو خیرباد کہنے والے' ترک وطن کر کے مدینے کو اپنا مسکن بنانے والے' سفر کی صعوبتیں برداشت کر کے پرچم صبر و شکر بلند کرنے والے اللہ کی بے پایاں رحمتوں کے حق دار ٹھہرے' ہر عظمت پیغمبر انقلاب ﷺ کے ان عظیم ساتھیوں کے قدموں پر نثار ہو گئی جیساکہ ذکر ہوا' یہ مقام رضا پر متمکن ہوئے۔ مہاجرین مدینہ وہ لوگ تھے جنہیں نسبت رسول ﷺ کی خلعت عطا ہوئی' محبت رسول ﷺ کا خزانہ ملا' اطاعت پیغمبر ﷺ کی سعادت نصیب ہوئی' عشق رسول ﷺ کی بدولت تمام سعادتیں ان کے حصے میں آئیں حتی کہ اللہ ان سے راضی ہو گیا' یہ اسی سنگت رسول ﷺ کا فیض تھا جن کی طرف انہوں نے ہجرت کی تھی' یہ اسی محبوب عالم ﷺ کے قدموں کا صدقہ تھا جن کے نقوش پا کو چوم کر وہ سفر ہجرت پر نکلے تھے' یہ اسی معیت کی بہاریں تھیں کہ جو معیت قرآن مجید نے ان صاحبان معیت کے تعارف کے لئے ہزار صفات میں سے ایک منتخب فرمائی تھی' یہ انہی کا مقدر تھا کہ جہاں ان کے کشکول تمنا کو رحمت کے سکوں سے بھر دیا گیا وہاں یہ بھی کرم ہوا کہ اللہ رب العزت نے اپنے ان نیک اور برگزیدہ بندوں کو اپنی رحمتوں کا مرکز توجہ بھی بنا لیا' رحمت حق کی بارش غزوہ تبوک کے موقع پر بھی ہوئی تھی' سپاہ محمد ﷺ رومیوں سے نبرد آزما ہونے کے لئے عازم سفر تھی' راستے میں مصائب کے پہاڑ کھڑے تھے' تنگی اور مشکل کی گھڑی تھی' بے سروسامانی کا یہ عالم تھا کہ ایک سپاہی کے حصے میں روزانہ آدھی کھجور آتی تھی' پھر نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ کئی کئی سپاہی ایک کھجور کو چوس کر پانی پی لیتے تھے لیکن ان پیکران وفا کے پائے استقلال میں ذرا سی بھی لغزش نہ آئی۔ گمان کی وادیوں میں تشکیک کی نہ کوئی آندھی اٹھی اور نہ ان کا ایمان کسی ابہام کا شکار ہوا۔ وہ استقامت کے کوہِ گراں بن کر تاریخ حریت کا ایک نیا باب رقم کر رہے تھے'

جاں سپاری اور اطاعت امیر کی لازوال مثالیں قائم کی جا رہی تھیں، نظم وضبط اور ایثار و قربانی کی نئی تاریخ رقم ہو رہی تھی۔ صحبت مصطفیٰ ﷺ میں دشت و صحرا کی کٹھن منزلیں طے ہو رہی تھیں لیکن کرم مصطفیٰ ﷺ کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ اہل محبت بے سرو سامانی کے عالم میں ایمان کی دولت اپنے دونوں ہاتھوں سے سمیٹ رہے تھے، چشمہ فیض جاری تھا، فیض یافتگانِ صحبت نے بھی اخذِ فیض کا حق ادا کر دیا۔ آزمائش کے اس مرحلے پر صحابہؓ کو جو ملا سو ملا مگر مہاجر صحابہؓ کو جو نصیب ہوا اس کا کیا کہنا، قرآن مجید نے اس خاص لمحے کو بصد افتخار یوں بیان فرمایا ہے :۔

لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝ (التوبہ، ۹:۱۱۷)

یقیناً اللہ نے نبی (معظم) پر رحمت سے توجہ فرمائی اور ان مہاجرین اور انصار پر (بھی) جنہوں نے (غزوہ تبوک) کی مشکل گھڑی میں (بھی) آپ کی پیروی کی اس (صورت حال) کے بعد کہ قریب تھا کہ ان میں سے ایک گروہ کے دل پھر جاتے، پھر وہ ان پر لطف و رحمت سے متوجہ ہوا۔ بے شک وہ ان سے نہایت شفیق، نہایت مہربان ہے۔

آیت مقدسہ میں رحمتوں کا مرکز توجہ مہاجرین بھی ہیں اور انصار بھی دونوں کو رحمت ،فیضان رسالت ﷺ ہی ملی۔ تاہم مہاجرین کو دو اعتبار سے امتیاز حاصل ہے، ایک یہ کہ اللہ پاک نے مہاجرین کا ذکر پہلے فرمایا ہے اور انصار کا ذکر مہاجرین کے بعد آیا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ رحمت حق متوجہ تو دونوں کی طرف تھی، مہاجرین بھی اس سے فیض یاب ہو رہے تھے اور انصار بھی کرم کی ان ساعتوں کو اپنے دامنِ دل میں سمیٹ رہے تھے لیکن رحمت کا مرکزِ توجہ پہلے مہاجرین بنے اور ان کے بعد انصار۔ رحمت حق بوسیلہ نبی اکرم ﷺ دونوں کی طرف متوجہ ہوئی لیکن آقائے نامدار

ﷺ سے اخذِ فیض میں قرب و اولیت بھی مہاجرین (سابقین اولین) ہی کو حاصل ہوئی۔

۱۲۔ مال و متاع مہاجرین کے قدموں پر

مہاجرین جب اللہ کی رحمتوں اور برکتوں کے حق دار ٹھہرے' انہیں مناصبِ عظمت ملے اور جنت میں انہیں باغات (جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں) کی بشارت دی گئی ان انعامات و اعزازات کے سامنے دنیاوی جاہ و حشم اور مال و متاع کی کیا حیثیت باقی رہ جاتی ہے۔ تاہم دنیاوی مال و متاع بھی مہاجرین کے قدموں پر ڈھیر کر دیا گیا۔ مواخات مدینہ ان کی معاشی کفالت کا نقطۂ آغاز تھا لیکن یہ سب انتظامات عبوری دور کے لئے تھے۔ اصل مقصد مہاجرین کو اقتصادی و معاشی اعتبار سے خود کفیل بنانا تھا تاکہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر ریاست مدینہ کے اقتصادی اور سیاسی استحکام کا باعث بنیں' انہیں عضو معطل بنا کر ہمیشہ کے لئے دوسروں کی کفالت میں دینا مقصود نہیں تھا' اگر ایسا ہو تا تو ریاست مدینہ آگے چل کر خوفناک معاشی تعطل کا شکار ہو جاتی اور سماجی اور ثقافتی ڈھانچہ درہم برہم ہو جاتا۔ بہرحال ہجرت مدینہ کے حالات اس فیصلے کا تقاضا کر رہے تھے کہ مہاجرین جو اپنا گھربار چھوڑ کر اللہ کی راہ میں نکلے ہیں ان کی فوری کفالت کا انتظام کیا جائے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ انصار نے اپنی جائیدادوں میں بھی اپنے مہاجر بھائیوں کو شریک کر لیا اور انہیں عارضی طور پر بھی معاشی بحران کا شکار نہیں ہونے دیا۔ قرآن مجید نے جہاں اہل ثروت کو اس بات کا حکم دیا ہے کہ وہ اپنے رشتہ داروں پر اپنا ہاتھ تنگ نہ کیا کریں مثلاً منافقین نے حضرت ام المومنین حضرت سیدہ عائشہ صدیقہؓ پر بہتان تراشی کی اور خود ساختہ الزامات کو خوب ہوا دی۔ (پروپیگنڈے کا ہتھیار ایک خطرناک ہتھیار ہے' حرم رسول ﷺ پر بہتان تراشی سے جو اذیت رسول خدا ﷺ کو پہنچ سکتی تھی وہ کسی سے مخفی نہ تھی) اس پروپیگنڈے کے نتیجے میں پیدا ہونے والی ذہنی آلودگی سے جو فرحت و راحت منافقین کو پہنچ سکتی تھی اگرچہ وہ عامۃ الناس سے مخفی

تھی لیکن اہل نظر پر وہ سب آشکار تھی۔ پروپیگنڈے اور کردار کشی کی مہم سے فضا مکدر ہو گئی، سادہ لوح مسلمان بھی منافقین کی اس سازش کا شکار ہو گئے اور تشکیک کی ضربیں سوچ کے دروازوں پر پڑنے لگیں، ان سادہ لوح مسلمانوں نے اپنی طبعی سادگی کی بنا پر بغیر تحقیق کے اس بہتان تراشی پر صاد کیا۔ بلا تحقیق دشمن کے منفی پروپیگنڈے کو من و عن تسلیم کرلینا اور اس کا منفی اثر لے کر اپنے اعصاب کو شل کرلینا تحریکی کارکنوں کے لئے زہر ہلاہل کا درجہ رکھتا ہے۔

آج بھی اسلام دشمن طاقتیں پروپیگنڈے کا یہ ہتھیار عالم اسلام کے خلاف استعمال کر رہی ہیں اور آج بھی بعض سادہ لوح مسلمان دشمنانان اسلام کے اس منفی پروپیگنڈے کا اثر قبول کر کے فضا میں تشکیک کی آلودگی کا باعث بن رہے ہیں۔ عہد رسالت مآب ﷺ میں بھی منافقین کا پروپیگنڈہ رنگ لایا اور سادہ لوح مسلمان ان کے دام فریب میں آ گئے، پروپیگنڈے کا شکار ہونے والوں میں حضرت مسطحؓ بھی تھے، اس واقعہ کے بعد جب قرآن مجید کی دس آیتیں حضرت ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کی برات کے لئے نازل ہوئیں (سورہ نور، ۲۴:۱۱) تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بے اختیار فرمایا کہ میں آئندہ حضرت مسطح رضی اللہ عنہ کی کفالت نہیں کروں گا۔ حضرت مسطحؓ، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عزیز تھے، اس قرابت داری کی وجہ سے انہوں نے ان کی کفالت کا ذمہ لیا ہوا تھا۔ جب یہ آیات نازل ہوئیں تو ان کے دو قصور سامنے آئے، ایک تو یہ تھا کہ انہوں نے اپنے محسن کی بیٹی پر الزام تراشی کی، دوسرے یہ کہ انہوں نے حرم رسول ﷺ کے خلاف جھوٹے بے بنیاد اور شرانگیزی پر مبنی منافقین کے پروپیگنڈے میں حصہ لیا، اس پر سیدنا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان کا مزید خرچہ برداشت کرنے سے انکار کردیا اور اس پر قسم اٹھالی، قرآن نے ارشاد فرمایا۔

وَلَا يَأْتَلِ أُولُوا الْفَضْلِ مِنكُمْ	اور جو لوگ تم میں سے صاحب فضل
وَالسَّعَةِ أَن يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبَىٰ	اور (صاحب) مقدرت ہیں وہ اس بات
وَالْمَسَاكِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ فِي سَبِيلِ	کی قسم نہ کھائیں کہ اپنے عزیزوں اور

اللّٰہِ وَ لْیَعْفُوْا وَ لْیَصْفَحُوْا اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ یَّغْفِرَ اللّٰہُ لَکُمْ وَ اللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ○ (النور ۲۴: ۲۲)

مسکینوں اور اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کو (اب) کچھ نہ دیں گے (اگر قسم کھالی ہے تو کفارہ دیں لیکن اعانت بند نہ کریں) اور وہ ان کو معاف کر دیں اور ان سے درگزر کریں۔ کیا تم اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ اللہ (بھی) تم کو بخش دے اور اللہ تو بڑا ہی بخشش والا (اور) رحم فرمانے والا ہے۔

حضرت مسطح رضی اللہ عنہ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کے ننھیالی رشتہ دار تھے اور تنگدستی کے باعث مال و متاع دیئے جانے کے حق دار تھے لیکن اللہ جل شانہ نے ان کے معاشی استحقاق اور اقتصادی طور پر مال و متاع پانے کے حق کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ دو اور مدات بھی گنوا دیں جو اللہ کے نزدیک دنیاوی مال و متاع کی حق دار ہیں' ان میں ایک مہاجرین بھی ہیں۔ اسلامی ریاست مہاجرین کے معاشی استحکام اور ان کی اقتصادی بحالی کی ذمہ دار ہے۔ اس کا ذکر تفصیل سے پہلے ہو چکا ہے' اتنی بڑی بہتان تراشی اور اتنے سنگین جرم میں شریک ہونے کے باوجود ان کی کفالت سے ہاتھ اٹھانے سے منع کر دیا گیا ہے۔ اس سے ایک نکتہ تو یہ اخذ ہوتا ہے کہ اسلام ذاتی عناد کو جرم و سزا کے باب میں رکاوٹ نہیں بننے دیتا۔ مومن کا ہر فعل اللہ کی رضا کے تابع ہوتا ہے اور اسے راضی برضا رہنے کا حکم دیا گیا ہے۔

تحریکی زندگی میں ذاتی پسند یا ناپسند کوئی وزن نہیں رکھتی اپنے متعینہ اہداف کو حاصل کرنے کے لئے جذباتی نہیں حقیقت پسندانہ انداز میں سوچنا چاہیے' دوسرا نکتہ یہ سامنے آتا ہے کہ اسلام انفرادی اور اجتماعی کسی سطح پر بھی معاشی تعطل کو گوارا نہیں کرتا اور وہ ہر مرحلے پر معاشی تعطل کو توڑنے کی ہدایات جاری کرتا ہے' اگرچہ مہاجرین نے ہجرت کی صعوبتیں کسی دنیاوی لالچ میں آکر برداشت نہیں کی تھیں' نہ مدینہ منورہ کوئی

تجارتی مرکز تھا جو مہاجرین کے لئے کسی کاروباری منفعت کی ترغیب بنتا۔ انہوں نے صرف اللہ کے لئے اپنے گھربار چھوڑے اللہ کی خاطر ترک وطن کیا اور حضور کی سنگت کے لئے نقل مکانی کی' مہاجرین رضائے الٰہی اور قرب رسول ﷺ کے آرزومند تھے' تاہم مادی ضروریات کے پیش نظر مہاجرین کو دنیاوی مال ومتاع کا حق دار بھی ٹھہرایا گیا اور ایک منصوبہ بندی کے تحت ان کے معاشی استحکام کے لئے عملی اقدامات اٹھائے گئے تاکہ وہ ریاست مدینہ کے مفید شہری بن کر اس کے داخلی اور خارجی استحکام کی خشت اول ثابت ہوں۔

۱۳۔ مہاجرین: بحرِاجور کے غواص

ہجرت کے مادی اور روحانی فیوض وبرکات کا احاطہ ممکن نہیں' اسی طرح مہاجرین کے فضائل بھی اس قدر زیادہ ہیں کہ انہیں حیطۂ تحریر میں لانا کسی کے بس کی بات نہیں' یوں سمجھئے کہ مہاجرین بحرِاجور کے غواص ہیں وہ نیکی کے ایک ایسے عمل سے گزرتے ہیں جو ان گنت نیک اعمال کا دروازہ کھولتا ہے اور مزید نیکیوں کی راہ ہموار کرتا ہے۔ ہجرت کی حیثیت ایک جہت سے ان مستحبات کی سی ہے جو خود مستحب ہونے کے باوجود واجبات کے روحانی فیوضات وبرکات حاصل کرنے کے لئے انسان کی روحانی زندگی کا جزو لاینفک ہے۔ مثلاً روزے صرف رمضان میں فرض ہیں لیکن ان کے فیض کو اور ان کی روحانی تاثیر کو قائم رکھنے کے لئے زندگی کا باقاعدہ حصہ بنالینے کے لئے لازم ہے کہ سال بھر نفلی روزے بھی رکھے جائیں' خود تاجدار کائنات ﷺ سال بھر ہر سوموار کو روزہ رکھتے۔ علاوہ ازیں ہر قمری مہینے کی تیرہ' چودہ اور پندرہ تاریخ کو تین ماہانہ روزوں کی ترغیب دی گئی ہے۔ مختلف مواقع پر روزوں کی مشروعیت قائم فرمائی مثلاً شوال کے روزے' محرم کے روزے' شعبان میں روزے وغیرہ۔ فرض نمازیں اگرچہ پانچ ہیں لیکن ان سے حاصل کردہ فیوضات اور روحانی تاثیرات کی باقاعدہ حفاظت اور ان کی ترقی کے لئے فرائض کے ساتھ سنتیں اور نوافل بھی مسنون ہیں' باقاعدہ نفلی عبادتوں کی مشروعیت بھی اسی اصول پر مبنی ہے' مثلاً تہجد' اشراق' چاشت اور اوابین

کے نوافل وغیرہ بلکہ تہجد تو حضور ﷺ کی ذات مقدسہ کے لئے واجب کے درجے پر تھی نیز باقاعدہ "قیام اللیل" اور رمضان المبارک میں بالخصوص "صلوٰۃ التراویح" اس سے بڑھ کر ہے۔ زکوٰۃ فرض صرف اڑھائی فیصد ہے اور وہ بھی سال میں صرف ایک بار ادا کرنا ہوتی ہے لیکن اس کے روحانی فیوض و برکات و تاثیرات کو برقرار رکھنے اور نفس کو بخل سے بچانے کے لئے دیگر صدقات مثلاً صدقہ فطر وغیرہ بھی ہیں۔ ان سب کے علاوہ حکم انفاق اپنی ایک جدا حیثیت رکھتا ہے جس میں صدقات کی بہت سی مدات آتی ہیں۔ وضو ایک ایسی طہارت ہے جو ہر نماز کے لئے ضروری ہے لیکن اس طہارت کو دائمی شکل دینے کے لئے وضو پر وضو کو نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ قرار دیا گیا ہے اور یہ بات ہے بھی حق' اگر انسان باوضو رہے اور اس کا احساس بھی قائم رہے تو باطنی طہارت کے اَن گنت انوار اس پر ظاہر ہوں گے۔ بہت ساری عبادات ایسی ہیں جن کی اپنی فقہی حیثیت اگرچہ مستحب کے درجے میں ہے لیکن روحانی اعتبار سے فرائض کی طرح اہم ہیں کیونکہ فرائض کے فوائد کی (Restoration) ان مستحبات پر مبنی ہے۔ اس اعتبار سے یہ اعمال خود تو مستحب ہوتے ہی ہیں لیکن جب اجر کی نسبت دیکھتے ہیں تو ان کا اجر بھی عام درجے سے اٹھ کر نہایت اوپر چلا جاتا ہے اور ایسا استقامت کی بناپر ہوتا ہے گویا ان کا اپنا اجر تو فرائض کے برابر نہیں ہوتا (اور نہ فرائض کے بغیر یا انہیں چھوڑ کر ان پر عمل سے کوئی اجر ملتا ہے) لیکن نتائج کے اعتبار سے اجور فرائض میں بھی ان کی وجہ سے اضافے کے باعث یہ بے شمار اجور کا باعث بنتے ہیں کہ اب فرائض کا اجر بھی ان کے اجر کے ساتھ شامل ہو گیا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ مکہ جیسا روحانی مرکز کفار و مشرکین کی وجہ سے **دارالکفر** میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اس مکدر فضا میں واجبات تو واجبات ٹھیک طرح سے فرائض کی بجا آوری بھی ممکن نہ رہی تھی۔ لہٰذا جب اہل ایمان نے ہجرت کی تو صرف ہجرت کی نیکی ہی ان کے نامہ اعمال میں نہیں لکھی گئی بلکہ دیگر بے شمار نیکیوں کے لئے راہ ہموار ہو گئی اس بناپر ہجرت کرنے والوں نے ایک ہجرت کی نیکی ہی نہیں بے شمار نیکیاں کمائیں' ہجرت کا اجر عظیم ہی نہیں سمیٹا بلکہ دوسرے اجور بھی اپنے

دامن میں جمع کئے' اس ساری بحث کے بعد ہم یہ برملا کہہ سکتے ہیں کہ مہاجرین بے حساب اجر جمع کرنے والے خوش قسمت ہیں ارشاد باری تعالیٰ ہے :۔

قُلْ يٰعِبَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوْا رَبَّكُمْ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ وَاَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةٌ اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ○
(الزمر' ۳۹:۱۰)

آپ (میری طرف سے) فرما دیجئے کہ اے میرے بندو! جو ایمان لے آئے ہو اپنے رب سے ڈرتے رہو (یاد رکھو کہ) جن لوگوں نے اس دنیا میں نیک کام کئے ان کے لئے (آخر کار) بھلائی ہے اور اللہ کی زمین (ان کے لئے) کشادہ ہے بلاشبہ صبر کرنے والوں ہی کو ان کے صبر کا پورا (اور) بے شمار اجر ملے گا۔

۱۴۔ مہاجرین: سفرائے امن

مہاجرین کی ایک فضیلت یہ بھی ہے کہ وہ قریہ جبر سے قریہ امن کی طرف ہجرت کرتے ہیں' شعوری اور لاشعوری دونوں سطحوں پر امن کی بشارت بن کر طلوع ہوتے ہیں' وہ عالمی سطح پر قیام امن کی تحریک کا حصہ اور ظلم کے خلاف ایک فطری رد عمل کے علمبردار بن جاتے ہیں' چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ مہاجرین اور انصار کی مشترکہ انقلابی جدوجہد کے نتیجے میں فتنہ و شر کے تمام مراکز کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور ایک قلیل عرصے میں پورے جزیرہ نمائے عرب میں طوائف الملوکی کا خاتمہ ہو کر نہ صرف ایک مرکزی حکومت قائم ہو جاتی ہے بلکہ پورے عرب میں امن و امان کی حالت حیرت انگیز طور پر بہتر ہو جاتی ہے اور انسانی حقوق کی پاسداری کا شعور عوامی سطح پر بھی ابھر کر سامنے آتا ہے۔ گذشتہ صفحات پر تفصیل سے ذکر ہو چکا ہے کہ ہجرت ایک زمانے تک نفاق و ایمان کے مابین ایک امتیاز کا ذریعہ بنی رہی۔ جو مرحلہ ہجرت سے گزر جاتا اسے سچا مؤمن سمجھ کر اس سے بہتر سلوک کیا جاتا اور جو ہجرت سے اجتناب کرتا اس کے ساتھ

بالعموم ایسا امتیازی سلوک باقاعدہ روا نہ رکھا جاتا جیساکہ کسی صاحب ایمان کے ساتھ ہجرت کے بعد روا رکھا جاتا۔ اس تفریق کی وجہ صاف ظاہر تھی وہ یہ کہ جو شخص وسعت اور طاقت کے باوجود ہجرت نہیں کرتا اس کا مطلب تھا کہ وہ شخص بلاوجہ و بے عذر شرعی کفر اور عالم کفر کے ساتھ سمجھوتے کو روا رکھتا ہے اور اس پر عامل ہے لہٰذا اسے بجا طور پر منافق گردانا جاتا اور اس سے منافقوں والا برتاؤ کیا جاتا۔ اس وقت ہجرت نہ کرنا' کفر کے ہاتھ مضبوط کرنے کے مترادف تھا اور ادھر مدینہ میں مسلمانوں کو اپنی محدود افرادی قوت کو مجتمع کر کے مستقبل قریب کے لئے منصوبہ بندی کا مرحلہ بھی درپیش تھا اس وقت ہجرت سے اجتناب Muslim Cause سے غداری کے مترادف تھا اور اس وقت کے معروضی حالات میں ہجرت نہ کرنے والوں کے ساتھ منافقوں جیسا سلوک بالکل بجا تھا۔ یہ کفر کے ساتھ ایک غیر تحریری سمجھوتہ تھا جبکہ اسلام کسی سطح پر بھی عالم کفر کے ساتھ کسی سمجھوتے کا روادار نہیں اس کے برعکس جو شخص سفر ہجرت اختیار کرتا اور مدینہ منورہ کو اپنا مسکن بناتا اس کے ایمان کی پختگی کی بدولت اسے دوستی کا حقدار سمجھا جاتا۔ یہ اس کی دلجوئی اور اس کا اعتماد بحال رکھنے کے لئے ضروری بھی تھا۔ یہ وہ بنیاد تھی جس پر اہل ہجرت امن' سلامتی اور دوستی کے سزاوار ٹھہرتے اور دوسرے اس کے اہل نہ سمجھے جاتے' ان میں سے ایک تو منافق تھے اور دوسرے ایسے لوگ تھے جو منافق تو نہ تھے یعنی ظاہرا ابھی ایمان نہ لائے تھے لیکن اہل ایمان سے دوستی کا معاملہ رکھتے تھے اور ان سے محبت کے مراسم استوار کئے ہوئے تھے' اس محبت بھرے میل جول سے مومن اپنی طبعی سادگی کی بنا پر سمجھتے کہ اگر ان سے مزید تعلقات بڑھائے جائیں تو ممکن ہے وہ دائرہ اسلام میں شامل ہو جائیں حالانکہ وہ اس تاک میں رہتے کہ اہل ایمان سے تعلقات مضبوط بنا کر ان پر ایک نفسیاتی دباؤ ڈالا جائے تاکہ وہ ایمان سے ہاتھ دھو کر دوبارہ کفر و شرک کے قعرِ مذلت میں جا گریں۔ اس پر قرآن مجید نے صراحتاً مسلمانوں کو ایسے کفار و مشرکین سے مراسم استوار کرنے اور تعلقات مضبوط بنانے سے روک دیا اور اپنا حتمی فیصلہ سنا دیا کہ ان لوگوں سے ایمان کی طمع نہ رکھو بلکہ ان کا ہمیشہ کفر پر قائم رہنا ایک واضح اور اٹل حقیقت ہے کیونکہ ایمان کی

امید تو اسی سے کی جاسکتی ہے جو حق کو سمجھتا تو نہ ہو بلکہ اس بارے میں کسی غلط فہمی کا شکار ہو تو میل جول سے ممکن ہے اس کی غلط فہمی دور ہو جائے اور سچ بات اس کی سمجھ میں آجائے اور وہ حق کو قبول کرنے کا شرف حاصل کرلے لیکن جہاں حق کی پہچان بھی ہو اور وہ دانستہ طور پر اسے قبول کرنے سے گریزاں ہو اور اس انتظار میں رہے کہ کب اسے موقع ملے اور وہ اہل ایمان کے ایمان کی بنیادوں کو متزلزل کرے تو ایسے لوگوں سے حق قبول کرنے کی امید رکھنا فضول سی بات ہوگی۔ یہ لوگ حق تو کیا قبول کریں گے الٹا سادہ لوح مسلمانوں کو گمراہ کریں گے' وسوسہ انگیزی سے ان کے اذہان کو پراگندہ کریں گے اور اہل حق کو دین سے برگشتہ کریں گے جبکہ یہ عمل شنیع ایک فتنہ ہے اور فتنہ کی ہر حال میں بیخ کنی ہونی چاہیے قرآن مجید نے اس بارے میں اصولی ہدایت جاری فرمادی ہے کہ:-

وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ۝

(النساء، ۴: ۸۹)

وہ (منافق تو) یہ تمنا کرتے ہیں کہ تم بھی کفر کرو جیسے انہوں نے کفر کیا تاکہ تم سب برابر ہو جاؤ سو تم ان میں سے (کسی کو) دوست نہ بناؤ' یہاں تک کہ وہ اللہ کی راہ میں ہجرت (کرکے اپنا ایمان اور اخلاص ثابت) کریں پھر اگر وہ روگردانی کریں تو انہیں پکڑ لو اور جہاں بھی پاؤ انہیں قتل کر ڈالو اور ان میں سے (کسی کو) دوست نہ بناؤ اور نہ مددگار۔

اس آیہ کریمہ سے واضح ہے کہ ہجرت ایمان کی کسوٹی ہے اگر کوئی فریضہ ہجرت سرانجام نہیں دیتا تو وہ سرے سے ایمان ہی کے لائق نہیں' کھول کھول کر بیان کیا جارہا ہے کہ معاشرے میں فتنوں کو پنپنے کا موقع نہیں ملنا چاہیے' سماج دشمن عناصر' معاشرے کا امن تباہ کرنے والے اور فتنوں کی پرورش کرنے والے جہاں ملیں انہیں

وہیں ختم کر دینا چاہیے یعنی ایک اسلامی ریاست میں امن دشمن عناصر کیلئے کوئی جائے امان نہیں۔ یہ امان مہاجرین کا حق ہے گویا مہاجر امان والے اور سفراء امن ہیں۔

۱۵۔ کشادگی اور فراخی مہاجرین کا مقدر

ہجرت سے قبل مکہ میں اہل ایمان پر عرصہ حیات تنگ کر دیا گیا تھا۔ خوف کے سائے ہر وقت ان کے تعاقب میں رہتے' ماحول میں گھٹن کا احساس شدید سے شدید تر ہوتا جا رہا تھا' اسلام سے وابستگی کفار و مشرکین کے غیظ و غضب کو دعوت دینے کیلئے کافی تھی' کشادگی اور فراخی کے جواہر ان کی زندگیوں سے کشید کر لئے گئے تھے لیکن ان کے حوصلے پست نہیں ہوئے تھے' وہ دشمنان اسلام کی چیرہ دستیوں کا ڈٹ کر مقابلہ کر رہے تھے' ہر ظلم کو سہہ رہے تھے لیکن لب پر کوئی حرف شکایت نہ تھا' جبین کسی قسم کی شکنوں سے نا آشنا تھی' صبر و استقامت کے پیکر اللہ کی رضا پر صابر و شاکر تھے۔ مہاجر سے فراخیٔ رزق اور وسعتِ ارض دونوں چیزوں کا وعدہ کیا گیا ہے کیونکہ جب کوئی ترکِ وطن کا ارادہ کرتا ہے تو اسے اَن گنت سوال آگھیرتے ہیں۔ مثلاً

۱۔ گھر بار چھوڑ کر جہاں جا رہے ہو کیا وہاں سر چھپانے کو جگہ بھی ملے گی؟
۲۔ کاروبار بند کر کے جا رہے ہو کیا وہاں کمائی کا کوئی وسیلہ بھی میسر آئے گا؟

قرآن پاک نے ذہنِ انسانی میں پیدا ہونے والے تمام سوالوں کے تسلی بخش جواب دے کر موضوع کو مکمل اور مہاجر کو اپنی ہجرت پر شرح صدر عطا فرمایا ہے یعنی واضح کر دیا کہ:

۱۔ اگر نقل مکانی کر رہے ہو تو آگے اچھی جگہ تمکن کے لئے ملے گی۔
۲۔ اگر روزگار چھوٹ رہا ہے تو وہاں معاشی فراخی تمہارا انتظار کر رہی ہے۔

یہ بھی فرمادیا کہ شاہراہ ہجرت پر اٹھنے والے ہر قدم کا اجر ملے گا۔ اگر کوئی شخص راہ خدا میں ہجرت کرے اور سفر مکمل نہ کر سکے یعنی راستے ہی میں اس کا آخری وقت آجائے تو پھر بھی اسے مکمل ہجرت کا بھرپور ثواب ملے گا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي — اور جو کوئی اللہ کی راہ میں گھر بار چھوڑ کر

الْاَرْضِ مُرٰاغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً ؕ وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ○ (النساء، ۴:۱۰۰)

نکلے وہ زمین میں (ہجرت کے لئے) بہت سی جگہیں اور (معاش کے لئے) کشائش پائے گا اور جو شخص بھی اپنے گھر سے اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہجرت کرتے ہوئے نکلے، پھر اسے (راستے میں ہی) موت آ پکڑے تو اس کا اجر اللہ کے ذمے ثابت ہو گیا اور اللہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔

آیہ مبارکہ سے واضح ہوا کہ مہاجر فراخیٔ مکان (جگہ کی کشائش) فراخی رزق (روزی کی کشائش) اور فراخیٔ اجر و ثواب کا استحقاق رکھتا ہے۔ اس دنیا میں بھی فراخی اور کشادگی سے نوازا جائے گا اور آخرت میں بھی کشادگی اور فراخی کا حق دار ہو گا۔ ہجرت ایک ایسا عمل ہے جو دونوں جہاں میں فراخی اور کشادگی کا ضامن ہے۔

۱۶۔ مہاجرین: نجاتِ اخروی کے حامل

مہاجرت سنت انبیاء علیہم السلام بھی ہے، قرآن مجید میں ہجرت انبیاء علیہم السلام کا ذکر بھی ملتا ہے، گویا ہجرت ایک عظیم عمل ہے اور پیغمبرانہ جدوجہد کا انقلابی پہلو اجاگر کرتا ہے، قسّامِ ازل نے مسافرانِ راہِ ہجرت کے مقدر میں عذاب سے نجات لکھ دی ہے چنانچہ مہاجرین نجات اخروی کے حامل ٹھہرے، آیئے قرآن سے اس کی تفصیل پوچھیں۔

○ قومِ نوح کے مہاجرین

ایک سے زیادہ مقام پر قرآن حکیم نے اس امر پر گواہی دی ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے کم و بیش ساڑھے نو سو برس تک تبلیغِ دینِ حق کی لیکن اس طویل دعوتی جدوجہد کے نتیجے میں ان کی قوم کے محدودے چند افراد ہی ایمان کی دولت سے

سرفراز ہوئے' پھر ان کی قوم پر طوفان کی صورت میں عذاب نازل ہوا اور ان کے تمدن کے ہر نشان کو خس و خاشاک کی طرح بہا لے گیا۔ طوفان سے پہلے اللہ جل مجدہ نے حضرت نوح علیہ السلام کو کشتی بنانے کا حکم دیا جس پر کفار ان کا مذاق اڑاتے رہے' طوفان آیا تو حضرت نوح علیہ السلام اور ان کے ایمان دار ساتھیوں اور اطاعت گزار بندوں نے کشتی میں ہجرت کی یہ وہ مہاجرین تھے جنہیں عذاب الٰہی سے بچالیا گیا۔ قرآن میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ قُلْنَا احْمِلْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَاَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ وَمَنْ اٰمَنَ ؕ وَمَآ اٰمَنَ مَعَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلٌ ○ وَقَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا ؕ اِنَّ رَبِّىْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○ وَهِىَ تَجْرِىْ بِهِمْ فِىْ مَوْجٍ كَالْجِبَالِ وَنَادٰى نُوْحُ ِۨابْنَهٗ وَكَانَ فِىْ مَعْزِلٍ يّٰبُنَىَّ ارْكَبْ مَّعَنَا وَلَا تَكُنْ مَّعَ الْكٰفِرِيْنَ ○

(ھود'۱۱:۴۰۔۴۲)

یہاں تک کہ جب ہمارا حکم (عذاب) آ پہنچا اور تنور (پانی کے چشموں کی طرح) جوش سے ابلنے لگا (تو) ہم نے فرمایا (اے نوح) اس کشتی میں ہر جنس میں سے (نر اور مادہ) دو عدد پر مشتمل جوڑا سوار کرلو اور اپنے گھر والوں کو بھی (لے لو) سوائے ان کے جن پر (ہلاکت کا) فرمان پہلے صادر ہو چکا ہے اور جو کوئی ایمان لے آیا ہے (اسے بھی ساتھ لے لو) اور چند (لوگوں) کے سوا ان کے ساتھ ایمان کوئی نہیں لایا تھا اور نوح نے کہا تم لوگ اس میں سوار ہو جاؤ اللہ ہی کے نام سے اس کا چلنا اور اس کا ٹھہرنا ہے۔ بیشک میرا رب بڑا ہی بخشنے والا نہایت مہربان ہے اور وہ کشتی پہاڑوں جیسی (طوفانی) لہروں میں انہیں لئے چلتی جا رہی تھی کہ نوح نے اپنے بیٹے کو پکارا اور وہ ان سے

الگ (کافروں کے ساتھ کھڑا) تھا۔ اے
میرے بیٹے! ہمارے ساتھ سوار ہو جاؤ اور
کافروں کے ساتھ نہ رہ۔

حضرت نوح علیہ السلام کا اپنا بیٹا کشتی میں سوار نہ ہوا تو اس سے مکالمہ ہوا جس میں حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا:۔

لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ (ھود'۱۱: ۴۳)

آج اللہ کے عذاب سے کوئی بچانے والا نہیں ہے۔ مگر اس شخص کو جس پر وہی (اللہ) رحم فرمادے۔

آیت کا مضمون بڑا واضح اور روشن ہے کہ جن کے نصیب میں نجات تھی وہ کشتی پر سوار ہو کر ہجرت کر گئے اور جن کی قسمت میں غرق ہو کر عذاب میں مبتلا ہونا لکھا تھا وہ اعزازِ ہجرت حاصل نہ کر سکے' وہ مہاجرت کی راہ پر نہ چل سکے' مہاجر ہونے کی سعادت انہیں نہ مل سکی اور نہ عذاب کے وقت انہیں کوئی بچانے والا ہی تھا۔

○ قومِ موسیٰ کے مہاجرین

پیغمبرانہ جدوجہد نام ہی انقلابی جدوجہد کا ہے' وقت کے فرعونوں سے ٹکر لینا' باطل استحصالی طاقتوں کو للکارنا' فرسودہ نظام حیات کے انہدام کے لئے سعی کرنا اور فروغِ دینِ حق کے لئے سرگرم ہونا کارِ نبوت میں شامل ہے' حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ کے برگزیدہ پیغمبر تھے' ہجرت ان کے سفرِ نبوت کا بھی مرکز و محور رہی اور اس ہجرت کے نتیجے میں انہیں مصر جیسی سپرپاور کے مقابلے میں حیرت انگیز کامیابیاں حاصل ہوئیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خدائی کے دعویدار فرعون سے جو مطالبہ کیا اسے قرآن مجید میں یوں بیان کیا گیا ہے :۔

فَاْتِيٰهُ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ ط (طہٰ'۲۰: ۴۷)

پس اس (فرعون) کے پاس جاؤ پھر اس سے کہو کہ ہم دونوں تمہارے پاس تمہارے رب کے بھیجے ہوئے آئے

ہیں۔ پس بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ بھیج دو اور ان کو تکلیفیں نہ دو۔

آیت مذکورہ سے معلوم ہوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون سے پہلا مطالبہ ہی اپنی قوم کی ہجرت کا کیا' آپ نے اپنی قوم کے ساتھ ہجرت اختیار کی اور بنی اسرائیل کو لے کر دریا عبور کر لیا گویا راہ ہجرت اختیار کرنے والے زندہ و سلامت رہے جبکہ فرعون کے ساتھیوں کو دریا کی موجیں بہا کر لے گئیں' قرآن نے اس واقعہ کو ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:۔

وَجَاوَزْنَا بِبَنِيٓ إِسْرَآئِيلَ الْبَحْرَ فَأَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ وَجُنُودُهُ بَغْيًا وَّعَدْوًا ۖ حَتّٰىٓ إِذَآ أَدْرَكَهُ الْغَرَقُ قَالَ اٰمَنتُ أَنَّهُ لَآ إِلٰهَ إِلَّا الَّذِيٓ اٰمَنَتْ بِهِ بَنُوٓا إِسْرَآئِيلَ وَأَنَا مِنَ الْمُسْلِمِينَ ○ (یونس' ۱۰:۹۰)

اور ہم بنی اسرائیل کو دریا کے پار لے گئے پس فرعون اور اس کے لشکر نے سرکشی اور ظلم وتعدی سے ان کا تعاقب کیا یہاں تک کہ جب اسے (یعنی فرعون کو) ڈوبنے نے آلیا وہ کہنے لگا کہ میں اس پر ایمان لے آیا کہ کوئی معبود نہیں سوائے اس (معبود) کے جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں اور میں (اب) مسلمانوں میں سے ہوں۔

بنی اسرائیل نے اپنے پیغمبر کی سنگت میں ہجرت کی سعادت حاصل کی' سفر کی صعوبتیں برداشت کیں' سر ہتھیلی پر رکھ کر اپنے نبی کے ساتھ قریۂ جبر و استبداد سے نکلے' مہاجرت کا اعزاز حاصل کیا' اور عذاب الٰہی سے نجات پائی' ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

وَكَأَيِّن مِّن قَرْيَةٍ هِيَ أَشَدُّ قُوَّةً مِّن قَرْيَتِكَ الَّتِيٓ أَخْرَجَتْكَ أَهْلَكْنَاهُمْ فَلَا نَاصِرَ لَهُمْ ○ (محمد' ۴۷:۱۳)

اور (اے رسول) کتنی ہی بستیاں تھیں جو قوت میں آپکی اس بستی سے کہیں زیادہ تھیں جس (کے رہنے والوں) نے آپ کو (وہاں سے) نکالا۔ (نتیجہ یہ ہوا کہ) ہم نے ان کو غارت کر دیا پھر ان کا کوئی (معاون و) مددگار نہ ہوا۔

اس آیہ کریمہ میں اللہ رب العزت واضح فرما رہے ہیں کہ اے محبوب ﷺ آپ کی بستی (مکہ) سے پہلے بھی ایسی بستیاں موجود تھیں جن میں انبیاء علیہم السلام کی تحریکوں کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کی گئیں' ہر قدم پر کفر راہِ حق میں مزاحم ہوا۔ اللہ کے برگزیدہ نبیوں اور رسولوں کو ابتلاء و آزمائش کے مراحل سے گزرنا پڑا ان پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا گیا اور جب جدوجہد بظاہر نتیجہ خیز ہوتی نظر نہ آئی تو وسائل اور وقت کے ضیاع سے بچنے کے لئے اللہ کے نبیوں اور رسولوں نے سرزمین کفر سے ہجرت کی اور ایسے مقامات کو اپنی تبلیغی سرگرمیوں کا مرکز بنایا جہاں کے سیاسی' سماجی' ثقافتی اور معاشی حالات اقامت دین اور فروغ اسلام کے لئے سازگار تھے اور جہاں وہ آزادانہ طور پر بغیر کسی جبر کے احکامات خداوندی بجالا سکتے تھے۔ کیا وہ بستیاں جن میں پیغمبروں پر ظلم و ستم کے پہاڑوں توڑے گئے بچ گئیں؟ تاریخ ہمیں بتاتی ہے اور قرآن اس پر گواہ ہے کہ جونہی اللہ کے انبیاء علیہم السلام اور انکی قوموں کے اہل ایمان نے اس جگہ سے ترکِ سکونت اختیار کی وہ بستیاں عذابِ الٰہی کی لپیٹ میں آگئیں' دوسری صورت یہ ہوئی کہ جونہی عذاب آیا انبیاء علیہم السلام اور اہل ایمان کی ہجرت کا سامان فراہم کر دیا گیا اور یوں یہ گروہِ پاکبازاں عذاب الٰہی سے محفوظ رہا۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب حضور ﷺ نے مکہ سے ہجرت کی اور مدینہ کو اپنی تبلیغی سرگرمیوں کا مرکز بنایا تو مکہ پر عذاب کیوں نازل نہ ہوا اور کفار و مشرکین کو تحریک اسلامی کے خلاف سازشیں کرنے اور اسکے خلاف عسکری قوت مجتمع کرنے کے لئے کیوں کھلا چھوڑ دیا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حضور ﷺ کو تمام جہانوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا گیا تھا' آپ سرتا پا رحمت تھے' عفو و درگزر کے پیکر تھے' طائف کی وادی میں جب اوباش لڑکوں کی سنگ باری سے آپ ﷺ زخمی ہو گئے اور پہاڑوں کے فرشتے نے حاضر ہو کر کہا کہ حضور! اجازت مرحمت فرمائیں تو اس بستی کو دو پہاڑوں کے درمیان پیس کر رکھ دوں تو حضور رحمت عالم ﷺ نے پہاڑوں کے فرشتے کو ایسا کرنے سے منع فرما دیا تھا' لبِ مصطفےٰ ﷺ پر اس وقت بھی دعا کے پھول کھل رہے تھے' سفرِ ارتقاء جاری تھا' تہذیب اپنے

نقطہ کمال کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ذہنِ انسانی میں شعور و آگہی کے چراغ روشن ہو رہے تھے' اسلام کے نیو ورلڈ آرڈر کے اجراء کے لئے زمین ہموار ہو رہی تھی۔ حقوق انسانی کے اولین اور دائمی چارٹر کا اعلان ہونے والا تھا' محفل انسانی کو دلائل کے ذریعہ توحیدِ ربانی کا قائل کرنے کا موسم بساط روز و شب پر اتر چکا تھا۔ اب عذابِ الٰہی کے ذریعہ حق کی صداقت کے اعلان کا وقت نہیں رہا تھا۔ کردار کی عظمت سے دل مسخر ہو رہے تھے' انسان کا ظاہر و باطن حرفِ حق کی گواہی دے رہا تھا۔ حق و باطل کا فیصلہ عذاب الٰہی سے نہیں کردار کی مضبوطی اور نصب العین کی سچائی پر غیر متزلزل یقین کی قوت سے ہو رہا تھا' اس لئے مکہ کی بستی پر عذاب الٰہی نازل نہ ہوا' ہم دیکھتے ہیں کہ تقریباً نو سال بعد جب مکہ فتح ہوا تو دل بھی فتح ہو چکے تھے اور پھر یہی مکہ اہل ایمان کی امیدوں کا مرکز بنا اور خانہ کعبہ مسلمانوں کا قبلہ قرار پایا' مکے کی مرکزیت اگر آج بھی بحال ہو جائے تو منتشر امت مسلمہ کی شیرازہ بندی کا فریضہ سرانجام دینا ممکن ہو سکے گا۔

۱۷۔ مہاجرین: فضل ربی کے متلاشی

مہاجرین راہ حق کے وہ مسافر ہیں جو فضلِ ربی کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں' مال غنیمت کی تمنا نہ کشور کشائی کی ہوس' مال و دولت کی آرزو نہ کسی جاگیر کی جستجو' دنیا کی طلب نہ طاؤس و رباب کی احتیاج صرف رضائے الٰہی ہی گوہرِ مقصود اور مقصدِ حیات' قرآن مجید اہل ہجرت کے احوال قلبیہ سے بھی پردہ اٹھاتا ہے کہ وہ مصائبِ ہجرت محض اللہ کی رضا کے لئے برداشت کرتے ہیں اپنے ہر مفاد کو دین کے مفاد پر قربان کر دیتے ہیں' اپنی ہر تمنا کو دین حق کے فروغ کی خواہش کے تابع کر لیتے ہیں وہ تو بارگاہ حق سے صرف اس کی رضا مانگتے ہیں' وہ اپنے عظیم مقاصد کے حصول کے لئے شرق سے غرب تک سفر ہجرت اختیار کرتے ہیں' مزاحمتی قوتوں سے نبرد آزما ہوتے ہیں' نظریاتی محاذ پر سینہ سپر رہتے ہیں اور فکری محاذ کو کبھی کھلا نہیں چھوڑتے بلکہ اہل شر کے پیدا کردہ ہر فکری مغالطے کا علمی اور عملی سطح پر جواب دیتے ہیں اور اپنے قول و عمل سے دلوں کو مسخر کرتے ہیں' اور جب تلواریں بے نیام کرنے کا وقت آئے تو اللہ کی راہ میں جہاد

کرنے سے نہیں گھبراتے' اس جدوجہد کا ایک ہی مقصد ہوتا ہے کہ اللہ کا دین سربلند ہو اللہ کے دین کے دشمن ذلیل و رسوا ہوں اور اس ذات کی طرف سے رضا حاصل ہو جائے جس کے قبضۂ قدرت میں ہماری جان ہے' جو ہماری ہر سانس کا مالک ہے' جس کے حکم سے کالی گھٹائیں بنجر زمینوں کی طرف سفر کرتی ہیں اور پیاسی زمینوں کی پیاس بجھاتی ہیں وہ جو زمین پر سبزے کی چادر بچھاتا ہے اور انسان سے توقع رکھتا ہے کہ وہ اسکے احکام کی پابندی کرتے ہوئے زمین پر عدل قائم کرے کیونکہ عدل ہی ہر امن کی اساس ہے۔ انصاف ہی ہر معاشرے کی آبرو ہے اور یہی منشائے الٰہی ہے' مہاجرین بھی منشائے الٰہی کی تلاش میں رہتے ہیں' طے شدہ امر ہے کہ جس کی ہجرت اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی طرف ہے وہ اللہ کی رضا اور اس کے بے پایاں فضل و احسان کا بھی حق دار ہے۔

ارشاد ربانی ہے۔

وَمَا اٰتَاكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ○ لِلْفُقَرَاءِ الْمُهَاجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ○

(الحشر ۵۹: ۷-۸)

اور جو کچھ رسول تم کو دیں وہ لے لو اور جس سے منع فرمادیں اس سے رک جاؤ اور اللہ سے ڈرتے رہو (یاد رکھو کہ) بے شک اللہ کا عذاب سخت ہے۔ ان مفلس مہاجروں کے لئے (اجر) ہے جو اپنے وطن اور مال سے جدا کر دیے گئے (اور) جو اللہ کے فضل اور اسکی رضا کی تلاش میں ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی مدد کرتے ہیں۔ یہی لوگ (آزمودہ) سچے (مسلمان) ہیں۔

آیات قرآنی کی روشنی میں مہاجرین کے بارے میں ارشاد فرمائے گئے فضائل اور حقائق کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ مہاجرین مال و متاع کے حق دار ہیں وہ اللہ کے فضل اور اس کی رضا کے متلاشی رہتے ہیں' وہ اللہ اور اسکے رسول کی مدد کرنے والے ہیں اور یہ کہ وہ قول و فعل کے سچے ہوتے ہیں۔

باب۔ ۲

فضائلِ مہاجرین: حدیثِ رسول کی روشنی میں

قرآن مجید فرقان حمید میں مہاجرین کے فضائل کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد ہم اس باب میں دیکھیں گے کہ حدیث رسول مقبول ﷺ میں مہاجرین کے جذبۂ ایثار و قربانی کو کس نظر سے دیکھا گیا ہے' حضور ﷺ جو خود ہجرت کا مرکز و محور تھے اہلِ ہجرت کے بارے میں کیا ارشاد فرماتے ہیں اور آج سے چودہ سو سال قبل کے عرب معاشرے میں اس وقت کے سیاسی' اقتصادی اور روحانی پس منظر میں ہجرت کی کیا اہمیت تھی اور مہاجرین کو عظمت کے کس منصب جلیلہ پر رونق افروز کیا گیا ہے۔

مہاجر کون ہے؟ اور اس بارے میں سرکار دوعالم ﷺ کا ارشاد گرامی کیا ہے؟ حدیث پاک میں آتا ہے:۔

المسلم من سلم المسلمون من لسانہ ویدہ والمهاجر من هجر مانهی اللہ عنہ

مسلمان وہ ہے کہ جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں اور مہاجر وہ ہے جو ہر اس شے کو چھوڑ دے جس سے اللہ تعالیٰ نے روکا ہے۔

(صحیح البخاری: کتاب الایمان' باب العلم)

مسلمان کی تعریف کے ساتھ مہاجر کی تعریف کر کے مہاجر کو دستار فضیلت عطا کی گئی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تاجدار کائنات ﷺ کے نزدیک مصائب ہجرت برداشت کرنے ، اللہ کے لئے اپنا گھر بار لٹانے اور عزیز و اقارب کو چھوڑنے والوں کا کیا مقام و مرتبہ ہے۔ ذیل میں ان لوگوں کو بھی مہاجرین کی صف میں شامل کر لیا گیا ہے جو ابتداً اور اصلاً مہاجرین کے زمرے میں نہیں آتے:۔

قال ابن عباس ان رسول اللہ ﷺ و ابابکر و عمر کانوا من المهاجرین لانهم هجروا المشرکین و کان من الانصار مهاجرون لان المدینة کانت دار شرک فجاؤا الی رسول

حضرت عبداللہ بن عباسؓ ارشاد فرماتے ہیں کہ رسول خدا ﷺ ابوبکر رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ مہاجر تھے کیونکہ انہوں نے مشرکین کو چھوڑ دیا تھا اور انصار میں سے بھی (بعض) مہاجرین (ہی) تھے'

الله ﷺ ليلة العقبى
(النسائی، كتاب البيعة على العقبى باب تفسير الهجرة)

کیونکہ مدینہ (اس وقت کا یثرب) بھی کفار و مشرکین کا گڑھ تھا۔ لہٰذا (یہ لوگ یعنی انصار) عقبی کی رات (بیعت عقبہ کے لئے) رسول ﷺ کی بارگاہ (بیکس پناہ) میں حاضر ہوئے۔

اس حدیث مبارکہ کی رو سے صرف مہاجرین وہ اہل مکہ ہی نہیں تھے جنہوں نے مکہ سے مدینہ ہجرت کی بلکہ انصار میں سے بھی "سابقون اولون" اور وہ لوگ جو بیعات عقبی میں شامل ہوئے انہیں بھی مہاجرت کی خلعتِ فاخرہ سے نوازا گیا کیونکہ اس وقت یثرب بھی کفار و مشرکین کا گڑھ تھا۔

۱۔ جنت میں سب سے پہلے مہاجرین اور فقراء کا داخلہ

تاج عظمت اس دنیا میں بھی مہاجرین کے سر پر سجایا گیا اور آخرت میں بھی کامیابی کا سہرا انہی کے سر پر بندھے گا اس لئے کہ مہاجرت بساطِ انقلاب پر جہدِ مسلسل کی علامت ہے، ظلمتِ شب میں امید اور روشنی کا استعارہ ہے، سفر اگر وسیلۂ ظفر ہے تو ہجرت ہر سفر کا عنوان ہے، ہر کامرانی کی کلید ہے، مہاجر کے ہر نقش قدم سے رجائیت کے سورج طلوع ہوتے ہیں اور یہی رجائیت نئی دنیاؤں کی تعمیر میں اینٹ اور گارے کا کام دیتی ہے۔ مہاجر کی ایک فضیلت یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ جنت میں سب سے پہلے مہاجرین اور فقراء داخل ہوں گے، حدیث پاک میں ہے :۔

ان اول ثلة تدخل الجنة لفقراء المهاجرين ... وان الله عز وجل يدعو يوم القيامة الجنة فتاتى بزخرفها وزينتها فيقول اى عباد الذين قاتلوا فى سبيلى وقتلوا واوذوا فى سبيلى وجاهدوا فى

بے شک پہلا گروہ جو جنت میں داخل ہوگا فقراء و مہاجرین ہی کا ہوگا اور اللہ عزوجل قیامت کے روز جنت کو پکارے گا تو وہ اپنی تمام تر رعنائیوں اور زیب و زینت کے ساتھ آجائے گی تو فرمائے گا کہ اے میرے وہ بندو! جنہوں نے میری

سبیلی ادخلوا الجنۃ فید خلو نھا بغیر حساب و لا عذاب۔
(مسند احمد ' ۲: ۱۶۸)

راہ میں قتال کیا اور قتل (شہید) کر دیئے گئے اور میری راہ میں جہاد کیا۔ جنت میں داخل ہو جاؤ پس وہ جنت میں بغیر حساب اور بلاعذاب داخل ہو جائیں گے۔

اس حدیث پاک میں مہاجرین کی چند ایک خصوصیات بھی بیان کر دی گئی ہیں وہ یہ کہ انہوں نے اللہ کی راہ میں جہاد کیا' مجاہدہ نفس کیا وہ اللہ کی راہ میں مارے گئے' انہیں راہ حق میں طرح طرح کی اذیتیں دی گئیں' انہوں نے کمال صبر و استقامت کا ثبوت دیا' اور یہ کہ جنت میں داخل ہونے والے ان مہاجرین اور فقراء سے نہ کوئی حساب لیا جائے گا اور نہ ان پر عذاب ہو گا۔

۲۔ جنت میں فقراء و مہاجرین کی کثرت

مومنین میں سے سب سے پہلے مہاجرین جنت میں داخل ہونگے لیکن ان مہاجرین میں سے فقراء' اغنیاء سے زیادہ تعداد میں ہوں گے بالفاظ دیگر یہ کہا جاسکتا ہے کہ مہاجرین بالعموم صاحبان فقر تھے' صاحب ثروت اصحاب کی تعداد بہت کم تھی کہ جنت میں تو سبھی مہاجرین ہونگے کوئی ایک بھی ان سے خارج نہیں ہو گا اس کا مطلب ہے کہ جن کی اکثریت وہاں ہو گی ان کی اکثریت یہاں بھی تھی حدیث پاک میں ہے کہ

فاذا اکثر اھل الجنۃ فقراء المھاجرین و ذراری المسلمین و لم ارا حدا اقل من الاغنیاء و النساء.....
(مسند احمد ' ۲: ۲۵۹)

جنتی لوگوں میں سے اکثر مہاجرین کے فقراء تھے اور مسلمانوں کی اولادیں تھیں اور میں نے کسی کو بھی امیر لوگوں اور عورتوں سے کم نہیں دیکھا۔۔۔

حدیث پاک سے معلوم ہوا کہ جہاں جنت الفردوس میں مرد عورتوں سے زیادہ ہونگے وہاں فقراء بھی اہل ثروت سے زیادہ ہوں گے اور پھر بالخصوص فقراء مہاجرین اغنیاء مہاجرین سے تعداد میں زیادہ ہونگے (درجے میں کوئی غنی افضل ہو تو یہ الگ معاملہ ہے یہاں بات تعداد کی ہو رہی ہے درجے اور مرتبے کی نہیں) اس سے ضمناً

یہ بات بھی ثابت ہوئی کہ مہاجرین کی اکثریت اصحاب فقر پر مشتمل تھی۔

۳۔ فقراء و مہاجرین کا اغنیاء سے پانچ سو برس پہلے جنت میں داخلہ

مہاجرین کی فضیلت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ جنت میں ان کا داخلہ بھی اغنیاء سے پانچ سو سال قبل ہو گا جب کہ اغنیاء ان سے پانچ سو سال بعد جنت میں داخل ہوں گے (یہ ان کے فقر و صبر کا درجہ ہو گا، ان کے درجے اور مرتبے کی بلندی نہیں) حضرت ابو سعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ حضور رحمت عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا:۔

فقراء المهاجرين يدخلون الجنة قبل اغنيائهم بخمسمائة عام
(جامع ترمذی: کتاب ابواب الزهد عن رسول الله ﷺ، **باب ما جاء ان الفقراء**)

فقراء مہاجرین، اہل ثروت مہاجرین سے پانچ سو سال پہلے جنت میں داخل ہو جائیں گے۔

ایک اور حدیث پاک میں ہے کہ

ان فقراء المهاجرين يدخلون الجنة قبل اغنيائهم بمقدار خمسمائة سنة
(سنن ابن ماجہ: کتاب الزهد، باب منزلة الفقراء)

بے شک مہاجر فقراء مالداروں سے پانچ سو سال پہلے جنت میں داخل ہونگے۔

حدیث پاک میں آتا ہے:۔

ابشروا ! صعاليک المهاجرين بالفوز يوم القيامة على الاغنياء بخمسمائة احسبه قال "سنة"
(مسند احمد، ۳:۹۶)

اے فقیر مسکین مہاجرو! تمہیں خوشخبری ہو قیامت کے دن امیر لوگوں پر (ان سے) پانچ سو (سال) پہلے کامیابی حاصل کرنے کی (مبارک ہو)۔

۴۔ حوض کوثر پر سب سے پہلے مہاجرین کی آمد

اہل ہجرت کو قدم قدم پر نوازا جا رہا ہے انہیں جنت میں سب سے پہلے داخل ہونے کی نوید سنائی جا رہی ہے' عظمت و فضیلت کی دستاران کے سر پر رکھی جا رہی ہے۔ حضور ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ حوض کوثر پر سب سے پہلے مہاجرین آنے کا اعزاز حاصل کریں گے۔ حضرت ثوبانؓ آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام سے حوض کوثر کی بابت روایت فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:۔

و اول من یردہ علی فقراء المہاجرین الدنس ثیابا و الشعث رووسا الذین لاینکحون المنعمات ولا یفتح لھم السدد

(سنن ابن ماجہ: کتاب الزھد' باب ذکر الحوض)

میرے پاس حوض پر سب سے پہلے جو لوگ آئیں گے وہ فقراء مہاجرین ہوں گے (وہ فقراء و مساکین) جو کپڑوں کے میلے اور سروں کے پریشان و پراگندہ بال' وہ جو نہ تو مالدار عورتوں سے شادی کرتے ہیں اور نہ ان کے لئے (انکی راہ کی) رکاوٹیں کھول (کر دور کر) دی جاتی ہیں۔

معلوم ہوا کہ حوض کوثر پر سب سے پہلے جن کی تشنگی کا مداوا کیا جائے گا اور جنہیں سیراب کیا جائے گا وہ فقراء مہاجرین ہی ہوں گے۔ ایک اور طویل حدیث مسند امام احمد بن حنبل میں ہے' جس میں حوض کوثر کی تفصیلات بھی ہیں:۔

عن عبداللہ ابن عمر یقول ان رسول اللہ ﷺ قال حوضی کما بین عدن و عمان ابرد من الثلج و احلی من العسل و اطیب ریحا من المسک' اکوابہ مثل نجوم السماء من شرب منہ شربۃ لم یظما بعدھا ابدا اول الناس علیہ ورود صعالیک

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میرا حوض ایسے (وسیع) ہے جیسے عدن اور عمان کے درمیان (کا وسیع علاقہ) برف سے زیادہ ٹھنڈا ہے' شہد سے زیادہ میٹھا ہے' خوشبو میں مسک سے زیادہ پسندیدہ (عمدہ پاکیزہ) ہے اس کے پیالے

المهاجرين ...... (الحديث)

(مسند احمد، ۲: ۱۳۲)

آسمان کے ستاروں جیسے ہیں۔ جس نے اس میں سے ایک گھونٹ پیا اسکے بعد کبھی ابدالاباد تک پیاس محسوس نہیں کرے گا۔ اس پر لوگوں میں سے سب سے پہلے مہاجرین میں سے فقیر اور مساکین آکر وارد ہونگے۔

۵۔ مہاجرین بہترین گروہ

حدیث پاک میں آتا ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ کی معیت مقدسہ میں ہجرت کرنے والے صحابہ کرام کائنات کے بہترین گروہ کی حیثیت رکھتے ہیں اور یہ گروہ پاکبازاں ہر مقام پر نمایاں رہے گا۔

عن ابن عباس رضی اللہ عنہ فی قوله (کنتم خیر امة اخرجت للناس) قال اصحاب محمد ﷺ الذین هاجروا معه الی المدینة

(مسند احمد، ۱: ۳۲۴)

حضرت سیدنا ابن عباسؓ سے اس آیت مبارکہ کے بارے میں کہ "تم وہ بہترین گروہ ہو جو لوگوں (کی بھلائی اور ہدایت کے لئے) نکالا گیا ہے" ارشاد فرمایا کہ وہ حضرت محمد ﷺ کے ساتھی اصحاب ہیں جنہوں نے آپ کے ساتھ مدینہ کی طرف ہجرت کی تھی۔

مہاجرین نفوسِ قدسیہ پر مشتمل کائنات کا وہ عظیم گروہ ہے جنہوں نے حضور ﷺ کے ساتھ ہجرت مدینہ کا اعزاز حاصل کیا اور ساری انسانیت کے لئے باعث رشد و ہدایت ہیں۔ ایک اور مقام پر یوں ارشاد ہوا:۔

عن ابن عباس رضی اللہ عنہ فی قوله کُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (الاٰیة) قال هم الذین هاجروا مع النبی ﷺ

حضرت ابن عباسؓ سے قرآن مجید کی اس آیت کُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ ...... کے بارے میں مروی ہے کہ فرمایا یہ وہی

من مکة الی المدینة
(مسند احمد بن حنبل، ۱: ۳۵۴)
لوگ ہیں جنہوں نے نبی اکرم ﷺ کی معیت میں مکہ سے مدینہ کی طرف نقل مکانی کی۔

درج بالا دونوں تفسیری روایات اس بات پر واضح دلالت کرتی ہیں کہ آقائے نامدار ﷺ کے صحبت یافتگان میں بھی بعض کو بعض پر فضیلت حاصل تھی۔ یوں تو اصحاب رسول کا یہ سارے کا سارا گروہ ہی منارۂ نور کی حیثیت رکھتا ہے اور ان کے نقوش قدم رشد و ہدایت کے مراکز کی حیثیت رکھتے ہیں کہ ان کے بارے میں ارشاد ہے کہ جس کی بھی اقتدا کرو گے ہدایت پاؤ گے لیکن ان میں بھی اولیت مہاجرین سابقین اولین کو حاصل ہے جو حیثیت ان کی ہے وہ کسی اور کی نہیں۔

۶۔ مہاجرین: مانند آفتاب روشن

حشر کا دن ہزار حشر سامانیوں کے ساتھ طلوع ہو گا' جگر دوز و جگر سوز' پچاس ہزار سال کے برابر' سوا نیزے پر سورج آگ برسا رہا ہو گا' ہر طرف نفسا نفسی کا عالم ہو گا' کسی کو کسی کی کچھ خبر نہ ہو گی' ایک سخت ترین اور طویل ترین دن۔ اس دن میزان عدل قائم ہو گی لیکن میدان حشر میں بھی نیک روحوں کو نور کے منبر عطا ہونگے اور وہ فخر کے ساتھ ان پر رونق افروز ہوں گے۔ نفوس قدسیہ ایمان کے نور والے ہونگے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے :۔

نُورُهُمْ يَسْعَىٰ بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَبِأَيْمَانِهِمْ
(التحریم' ۶۶: ۸)
انکا نور (ایمان) انکے آگے اور انکی داہنی طرف دوڑتا چلا جاتا ہو گا۔

کثرت سے ذکر الٰہی کرنے والوں کا نور انہیں قیامت کے دن نور کے منابر پر متمکن کرے گا اور ان کے چہرے نور کے ہوں گے۔ یہ مضمون احادیث میں کثرت سے آیا ہے۔ اسی طرح کثرت سے وضو کرنے اور باوضو رہنے والوں کے اعضائے وضو قیامت کے دن چمک رہے ہونگے ان کا نور ان کی پہچان اور شناخت بن جائے گا۔ ان احادیث کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر نیک عمل کا اپنا ایک نور ہوتا ہے جس کی

کوئی نہ کوئی تشبیہ ہے جو اس نور کی قوت کو ظاہر کرتی ہے۔ اسی طرح مہاجرین کی ہجرت کا اپنا ایک نور ہے جو قیامت کے دن مصائب ہجرت برداشت کرنے والے عظیم انسانوں کے چہروں سے چمکے گا۔ اسی طرح فقر بھی ایک نور ہے جو قیامت کے روز اہل فقر کی پہچان بن جائے گا۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ فقراء مہاجرین میں فقر اور ہجرت دونوں جمع ہیں۔ حشر کے دن انہیں فقر کا نور بھی ملے گا اور مہاجرت کا نور بھی انہیں عطا ہو گا۔ یہ دونوں نور مل کر آفتاب روشن کی مانند چمکیں گے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ فرماتے ہیں کہ

قال رسول اللہ ﷺ یوما حین طلعت الشمس ..... سیاتی اناس من امتی یوم القیامۃ نورھم کضوء الشمس قلنا ومن اولئک یارسول اللہ ﷺ ؟ فقال فقراء المہاجرین

(مسند احمد '۲:۱۷۷)

ایک روز جب سورج طلوع ہوا تو نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے روز میری امت میں سے ایسے لوگ آئیں گے جن کا نور سورج کی روشنی کی مانند ہو گا ہم نے عرض کیا یارسول اللہ وہ لوگ کون ہوں گے؟ اس پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا (وہ لوگ) فقراء المہاجرین (ہیں)

آقائے نامدار حضرت محمد ﷺ کی یہ حدیث پاک واضح طور پر مہاجرین کی عظمت کی گواہی دے رہی ہے' اہل ہجرت کی ہجرت بھی ایک نور ہے اور یہ نور نہایت طاقتور نور ہے۔ میدان حشر میں ہجرت کا یہ نور مہاجرین سابقین اولین کے چہروں سے ایسے چمکے گا جیسے سورج کی کرنیں نگاہوں کو خیرہ کر دیتی ہیں۔

۷۔ مہاجرین بے ضرر انسان

نبی رحمت ﷺ کے دامن رحمت میں تربیت پانے والے خوش نصیب اصحاب بھی ایک دوسرے کے لئے سرتاپا رحمت و شفقت بن گئے' فضائل مہاجرین میں

یہ بھی ہے کہ وہ بے ضرر انسان تھے۔ کسی کو نقصان پہنچانا ان کی فطرت میں شامل ہی نہ تھا کیونکہ وہ براہ راست بارگاہ رسالت مآب کے تربیت یافتہ تھے۔ مسلمان کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ اس کی زبان اور ہاتھ سے دیگر مسلمان محفوظ رہتے ہیں یعنی مسلمان بنیادی طور پر امن پسند ہوتا ہے وہ دوسروں کے لئے خلوص و محبت کا پیکر دلنواز ہوتا ہے۔ وہ ریاست کا مفید ترین شہری ہوتا ہے جو اپنے فرائض کے ساتھ دوسروں کے حقوق کا بھی خیال رکھتا ہے۔ حدیث پاک میں آتا ہے کہ بدترین شخص وہ ہے جس کے شر سے ڈر کر اس کا احترام کیا جائے۔ اسکے برعکس مومن احترام آدمیت کے اعلیٰ مناصب پر فائز ہوتا ہے' محبت کی خوشبو بانٹنے والا ہوتا ہے' دوسروں کے دکھ درد میں شریک ہوتا ہے اور کسی کی دل آزاری کا باعث نہیں بنتا۔ مہاجرین کی تربیت تو خود حضور ﷺ نے فرمائی تھی۔ جن خوش بختوں کے معلم پیغمبر آخر الزماں ﷺ ہوں' جو **انما بعثت معلما** کی شان کے حامل ہوں' جو ارشاد فرمائیں کہ میں تو بھیجا ہی اس لئے گیا ہوں کہ اخلاق کے اعلیٰ ترین نمونے کی تکمیل کر دوں۔ وہ خوش بخت کسی کے لئے کیا نقصان کا باعث بنیں گے۔ ان پیکرانِ صبر و رضا اور حاملانِ اخلاقِ کریمہ کا تعارف آقائے دو جہاں ﷺ ان الفاظ میں فرماتے ہیں کہ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنی حاجت بھی کسی سے نہیں کہتے کجا یہ کہ کسی کی حق تلفی کریں۔ ایک حدیث پاک کے آخری کلمات یہ ہیں:۔

الذین یتقی بھم المکارہ یموت احدھم و حاجتہ فی صدرہ ......

(مسند احمد' ۲:۱۷۷)

(مہاجرین) وہ لوگ ہیں کہ جن کے مکارہ (شر) سے بچاؤ ہے (جن کے ساتھ شر سے بچا جا سکتا ہے) ان میں سے بعض ایسے ہیں کہ اگر انہیں موت آئے تو اس حالت میں دنیا سے رخصت ہوتے ہیں کہ ان کی اپنی حاجت (کسی سے کہہ نہ دینے کی وجہ سے) ان کے دل ہی میں رہتی ہے۔

مہاجرین کے بارے میں علم ہوا کہ ان کے ذہن میں کوئی فتور نہیں ہوتا' ان کی سوچیں فتنہ و شر سے پاک ہوتی ہیں' ان کے کسی قول و فعل سے شر نہیں پھوٹتا اس لئے یہ معاشرے کے بے ضرر لوگ ہوتے ہیں۔ یہ اپنے سماج کو فائدہ تو پہنچا سکتے ہیں لیکن نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ یہی لوگ کسی نظام حیات کی بقاء و سلامتی کے ضامن ہوتے ہیں۔ انسانی معاشرہ انہی کے طرز عمل سے روشنی کشید کرکے باہمی روابط کے ضابطے مدون کرتا ہے۔ یہی لوگ اپنے عہد کی پہچان ہوتے ہیں' خود تاریخ بھی ان کے نقوش پا سے اکتساب شعور کرکے اپنی راہیں متعین کرتی ہے۔ یہ اپنے عصر کی آبرو ہوتے ہیں اور اپنی نسلوں کے لئے ایک محفوظ اور باوقار مستقبل کی ضمانت ہوتے ہیں۔ افسوس ہم عظمت کے ان میناروں سے روشنی لینے کی بجائے یورپ کی مصنوعی روشنیوں سے مرعوب ہو چکے ہیں۔ سچے اور سچے جذبات کی جگہ بناوٹ اور تصنع نے لے لی ہے۔ ہمارا ہر کام دکھاوے کا ہوتا ہے حتی کہ ہماری عبادات بھی خلوص اور احساس بندگی کی خوشبو سے عاری ہو چکی ہیں۔ ہم اپنی نسلوں کی تربیت اور ان کی شخصیت کی تعمیر کے لئے اپنے عظیم ماضی سے رہنما اصول لینے کی بجائے متعصب مغربی مفکرین کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں اور اسلام و پیغمبر اسلام کے بارے میں انکے فکری اور علمی مغالطوں کی گرد میں گم ہو چکے ہیں' اسلامی تعلیمات کا نام معذرت کے ساتھ لیتے ہیں' جہاد کے نام پر منہ چھپانے لگتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ عوام تو عوام خواص بھی اسلام کے بارے میں خواہ مخواہ شدید احساس کمتری کا شکار ہو گئے ہیں' اعتماد کی دولت کیا چھنی روایت علمی کی مشعل بھی ہمارے ہاتھ سے چھین لی گئی۔ آج ہم علم' حکمت اور دانائی کے لئے شہر علم کی طرف نہیں لندن' واشنگٹن اور ماسکو کی طرف دیکھنے کے سنگین جرم کا ارتکاب کر رہے ہیں' مکین گنبد خضرا کی غلامی کا پٹہ گلے سے اتار کر ہم نے سامراجی طاقتوں اور بین الاقوامی غنڈوں کی غلامی کا ہار گلے میں پہن لیا ہے اور سیاسی و اقتصادی غلامی پر کلمہ شکر کہہ کر اپنی نسلوں کے مستقبل کو گروی رکھ چکے ہیں۔ ذکر مہاجرین کی عظمت کردار کا ہو رہا ہے۔ یہ لوگ اتنے غیرت مند تھے کہ اپنا حق بھی دوسروں سے مانگنا پسند نہ کرتے بلکہ

اسکی طلب کئے بغیر دنیا سے رخصت ہو جاتے۔ ارشاد خداوندی ہے :-

لَا يَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا
(البقرہ، ۲: ۲۷۳)

وہ لوگوں سے بالکل سوال ہی نہیں کرتے (یعنی حالت جہاد میں ہونے کی بنا پر اپنی حاجتیں پوری نہیں کرسکتے اور خودداری کی وجہ سے مانگنا تو درکنار کسی پر ظاہر بھی نہیں کرسکتے)

اور ایک ہم ہیں کہ کشکول گدائی لئے دردر کی ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔ امت مسلمہ کا ہر شخص قرض کے بوجھ تلے دبا ہوا ہے۔ ہماری "احسان مندی" اور "نیاز مندی" کا یہ حال ہے کہ بین الاقوامی امور و مسائل پر ہم اپنی آزادانہ رائے کا اظہار بھی نہیں کرسکتے، ہمارے پاؤں میں مصلحت کی زنجیریں پڑی ہیں اور ہمارے ہونٹوں پر خاموشی کے قفل چڑھا دیئے گئے ہیں، قوموں کی برادری میں سر اٹھا کر چلنے کی روایت ہم کیا زندہ رکھتے ہم تو اپنے داخلی معاملات میں بھی آزادانہ طور پر فیصلے کرنے کے مجاز نہیں۔ آج امت مسلمہ بے توقیری کے جہنم میں جل رہی ہے محض اس وجہ سے کہ ہم نے اپنی ملی غیرت کا سودا چند چمکتے ہوئے سکوں کے عوض کر رکھا ہے۔ افسوس امت مسلمہ پر مسلط حکمرانوں کو عزت کی موت بھی گوارا نہ ہوئی، ہجرت مدینہ آج بھی ہمیں بھولا ہوا سبق یاد دلا سکتی ہے۔ بھٹکے ہوئے آہو کو سوئے حرم لے کر چلنے کے سامان بھی موجود ہیں ضرورت اس امر کی ہے کہ ملت اسلامیہ کے ارباب دانش بطور نظام حیات اسلام کے عملی نفاذ کے امکانات کا جائزہ لے کر مصطفوی انقلاب کو اپنا نصب العین بنا لیں اور عشق رسول ﷺ کے نکتے پر اسلامیان عالم کو حکومتی اور عوامی سطح پر متحد کرکے عالم کفر کے خلاف ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن جائیں، یہ دیوار یقیناً ایک ناقابل تسخیر دیوار ثابت ہوگی۔ علم و حکمت اور دانائی کی گمشدہ میراث کے لئے قافلہ ہائے رنگ و بو صحرائے زیست میں نکلیں، خلوص ہمسفر ہو تو حرف حق کی تلاش ناممکن نہیں اور جس قوم کو حق کی پہچان نصیب ہو جائے دنیا کی کوئی طاقت اس پر ذہنی اور فکری برتری حاصل نہیں کر سکتی۔ ذہنی اور فکری آزادی کے لئے ہر سطح پر فروغ علم

کے لئے اپنی تمام تخلیقی صلاحیتوں کو وقف کر دینا ہو گا۔ اکیسویں صدی علم کی صدی ہے۔ یہ ٹیکنالوجی کا دور ہے اور حصول علم کے بغیر جدید تر ٹیکنالوجی کا حصول ممکن نہیں۔ اکیسویں صدی اسلام کی صدی اسی صورت میں بنے گی جب تک ہم اپنے اسلاف خصوصاً اصحاب رسول ﷺ کی خودداری اور غیرت ملی کو اپنے قول و فعل کی سچائی کو پرکھنے کا معیار مقرر نہ کر لیں۔

۸۔ مہاجرین دوسروں کا حق انہیں لوٹانے والے

اہل ہجرت کی تقلید دین و دنیا میں ہماری کامیابی کا باعث بن سکتی ہے اگر ہم اصحاب رسول کی زندگیوں کو مشعل راہ بنالیں اور انکے نقوش قدم پر چلنے کی خوئے دلنواز اپنالیں تو عظمت رفتہ کی بازیابی کی منزل کو قریب سے قریب تر لانے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ ہمارے اسلاف زندگی کے نشیب و فراز میں ہر مرحلہ پر عزت نفس کو مقدم رکھتے' خودداری اور غیرت سے گری ہوئی کوئی بات نہ کرتے' اپنا تشخص اور وقار بحال رکھتے' اخلاق کے منافی کوئی بات نہ کرتے ، شائستگی اور متانت سے معاملات زندگی طے کرتے اور دوسروں کے حقوق کی پاسداری کرتے تھے ظاہر ہے جو شخص اپنا حق مانگنا بھی پسند نہ کرے وہ دوسروں کے حق کا خیال کتنی شدت سے رکھتا ہو گا۔ کچھ یہی حال ان عظیم مہاجرین کا بھی تھا وہ کسی سے اپنا حق تو نہ مانگتے تھے البتہ کسی کا حق اپنے اوپر ہرگز ہرگز نہ رہنے دیتے بلکہ اپنی اولین فرصت میں اپنا فرض ادا کرتے اور دوسرے کا حق ادا کرکے سرخرو ہوتے۔ یہی اعتدال اور توازن کی وہ راہ ہے جس کو اگر آج کے بے سکون معاشرے اپنالیں تو افراد معاشرہ نہ صرف سماجی روابط میں ایک خوشگوار تبدیلی محسوس کریں گے بلکہ عوامی فلاح و بہبود کے اس تصور کی عملی صورت بھی سامنے آئے گی۔ عوامی فلاح و بہبود کے جس تصور پر ریاست مدینہ کی بنیادیں استوار ہوئیں اور آج کی ترقی یافتہ اقوام اپنے تمام تر وسائل کے باوجود جس تصور کی گرد پا کو بھی نہیں پہنچ سکیں' آقا علیہ الصلوۃ والسلام مہاجرین کی اس اخلاقی برتری کا صلہ یوں دیتے ہیں کہ میرے حوض پر سب سے پہلے مہاجرین آئیں گے۔ سوال ہوا کہ

ومن هم يارسول الله ﷺ قال الشعثة رووسهم الشحبة وجوهم الدنسة ثيابهم لايفتح لهم السدد ولاينكحون المتنعمات الذين يعطون كل الذى عليهم ولا ياخذون الذى لهم
(مسند احمد '۲: ۱۳۲)

یا رسول اللہ! وہ کون ہیں؟ ارشاد ہوا جن کے سر پراگندہ' چہرے پھیکے (اور گرد آلود) اور کپڑے میلے ہوں' ان کے لئے دروازے نہ کھولے جائیں۔ نہ وہ نرم و نازک (مالدار) لڑکیوں سے نکاح ہی کریں۔ وہ لوگ کہ جو کچھ ان کے ذمے ہو سب دے دیں اور جو کچھ ان کا (کسی پر) ہو وہ نہ لیں۔ (یعنی قصداً چھوڑ دیں)

حدیث مذکورہ میں مہاجرین کے فضائل بیان کئے گئے ہیں اور ان کے ظاہری احوال کی نشاندہی کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ یہ عظیم لوگ کسی نمود و نمائش کے طلب گار نہیں ہوتے۔ اپنے من کی دنیا میں ڈوب کر سراغ زندگی پانے والے ہوتے ہیں' اپنے حال میں مست رہتے ہیں' یہ لوگ اپنے اوپر دوسروں کا حق انہیں پہنچائے بغیر نہیں رہتے یعنی ہر حال میں اپنا فرض ادا کرتے ہیں اور دوسروں کا حق ادا کرکے اپنے لئے ذہنی آسودگی کا اہتمام کرتے ہیں اسکے برعکس یہ اتنے قناعت پسند ہوتے ہیں کہ انکا حق دوسرے پر ہو تو معاف کرنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔

۹۔ مہاجرین: پیکر سمع و طاعت

اطاعت کو اپنے عمل کی اساس بنائے بغیر ڈسپلن قائم نہیں ہو سکتا۔ صحابہ کرامؓ سید انس و جان حضور رحمت عالم ﷺ کے تربیت یافتہ افراد تھے۔ نظم و نسق میں بھی یہ اپنی مثال آپ تھے یہی وجہ تھی کہ تھوڑے ہی عرصہ میں قیصروکسریٰ جیسی سپرپاورز غلامانِ رسولِ ہاشمی کے گھوڑوں سے اٹھنے والی گرد کو بوسہ دینے کو اپنا افتخار سمجھنے لگیں' دیکھتے ہی دیکھتے ان کے قصرِ اقتدار زمین بوس ہو گئے اور شاہانہ ٹھاٹھ باٹھ دھرے کا دھرا رہ گیا۔ ہم گزشتہ ابواب میں دیکھ آئے ہیں کہ اس گروہِ سرفروشاں میں

سمع و طاعت کا جذبہ کس قدر شدید تھا' یہ سمع و طاعت ہی اصل میں کمال ایمان کی سب سے بڑی ظاہری دلیل ہے۔ ایمان اور محبت میں جس قدر پختگی ہوگی اسی قدر سمع و طاعت (اطاعت و فرمانبرداری) زیادہ مضبوط ہوگی۔ مہاجرین کی ایک انتہائی اہم خصوصیت یہ بھی تھی کہ ان میں اطاعت اور فرمانبرداری کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ تاجدار کائنات ﷺ سے اپنے صحابہؓ کی یہ صفت پوشیدہ نہ تھی۔ حضور ﷺ نے کئی ایک مقامات پر اس کا تذکرہ بھی فرمایا' حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ آقائے نامدار ﷺ نے ایک مرتبہ ارشاد فرمایا:۔

انہ اول ثلۃ تدخل الجنۃ لفقراء المهاجرين الذين يتقى بهم المكاره و اذا امروا سمعوا و اطاعوا و اذا كانت لرجل منهم حاجة الى السلطان لم تقض له حتى يموت و هى فى صدره (الحديث)

(مسند احمد' ۲: ۱۶۸)

بے شک جنت میں جو پہلا گروہ داخل ہوگا وہ فقراء مہاجرین ہی ہوں گے وہ جن کے مکارہ (شر) سے بچا جاتا ہے اور جب انہیں حکم دیا جاتا ہے تو فقط سنتے ہیں اور اطاعت کرتے ہیں اور اگر ان میں سے کسی شخص کی کوئی ضرورت ہو تو (کسی سربراہ مملکت کی طرف) پوری نہ کی جاتی ہے یہاں تک کہ وہ اس حال میں دنیا سے چلا جاتا ہے کہ وہ حاجت اس کے سینے میں (ان کہی) رہ جاتی ہے۔

حدیث پاک سے معلوم ہوا کہ مہاجرین کے فضائل میں یہ بھی شامل ہے کہ وہ پیکران سمع و طاعت ہوتے ہیں اور سلاطین زمانہ کے درباروں میں اپنی حاجتیں لے کر نہیں جاتے بلکہ اللہ اور اللہ کا رسول ہی ان کے لئے کافی ہوتا ہے۔

۱۰۔ جنت میں مہاجرین کی اولین ضیافت

اللہ رب العزت نے اپنی راہ میں مصائب ہجرت اٹھانے والے جانثاران

مصطفےٰ ﷺ کے لئے ان گنت انعامات و اعزازات کا اعلان کیا ہے اور جنت میں ان سے ان باغات کا وعدہ کیا ہے جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں، حضور رحمت عالم ﷺ نے ایک یہودی کے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے مہاجرین کے بارے میں بہت سی باتوں کا ذکر کیا۔ ایک سوال کے جواب میں آپ ﷺ نے فرمایا:۔

قال ضمن اول الناس اجازة قال فقراء المهاجرين قال اليهودى فما تحفتهم حين يدخلون الجنة قال زيادة كبدالنون قال فما غداؤهم على اثرها قال ينحرلهم ثور الجنة الذى كان ياكل من اطرافها قال فما شرابهم عليه قال من عين فيها تسمى سلسبيلا (صحیح المسلم)

یہودی کے اس سوال پر کہ "کسے سب سے پہلے اجازت ملے گی کہ پل صراط پار کر جائیں" فرمایا مہاجرین کے فقراء کو۔ عرض کیا کہ پھر ان کا تحفہ کیا ہوگا جب وہ جنت میں داخل ہوں گے؟ فرمایا مچھلی کے جگر سے بڑھا ہوا حصہ، عرض کیا پھر ان کی اس کے فوراً بعد غذا (ناشتہ) کیا ہوگا؟ فرمایا ان کے لئے جنت کا وہ بیل ذبح کیا جائے گا جو جنت کے اطراف سے کھاتا رہا ہوگا۔ عرض کیا پھر اس کے اوپر کیا پئیں گے؟ فرمایا کہ جنت کے اس چشمے سے پئیں گے جس کا نام سلسبیل ہے۔

مہاجرین جب جنت میں داخل ہونگے تو ان کی دعوت کی جائے گی اور ان کے مراتب میں اضافہ کر کے انہیں عزت اور احترام دیا جائے گا۔

۱۱۔ مہاجرین کے لئے بنو نضیر کے باغات

سنگت رسول ﷺ میں ہجرت کرنے والے اس دنیا میں نوازے گئے اور اس دنیا میں بھی انہیں اعزازات و انعامات کا حق دار گردانا گیا۔ حضور نبی اکرم ﷺ

نے بنونضیر جو مدینے کے یہود کا ایک قبیلہ تھا، کے باغات مہاجرین کو عطا فرما دیئے۔ اس موقع پر حضور ﷺ نے دیگر حاجت مندوں پر مہاجروں کو فضیلت اور اولیت دی۔ ان پر آقا علیہ السلام کی خصوصی شفقت کا اظہار ہوتا۔ اس سلسلہ میں سنن ابی داؤد میں ایک طویل حدیث آئی ہے جس کا خلاصہ درج کیا جا رہا ہے۔

حضرت عبدالرحمٰن بن کعب بن مالکؓ ایک صحابی سے روایت کرتے ہیں کہ جب حضور ﷺ مکہ سے ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لائے تو کفار قریش نے عبداللہ بن ابی اور اوس و خزرج قبائل کے مشرکین جو عبداللہ بن ابی کے ساتھی تھے، کو غزوہ بدر سے پہلے ایک خط میں لکھا کہ تم نے ہمارے آدمی کو پناہ دی ہے ہم قسم کھاتے ہیں کہ یا تم ضرور اس سے جنگ کرو گے (ختم کر دو گے) یا اسے نکال دو گے ورنہ ہم سارے مل کر رم پر چڑھ دوڑیں گے یہاں تک تمہارے لڑنے والوں سے لڑیں گے اور تمہاری عورتوں کو اپنے لئے حلال کر لیں گے۔ عبداللہ بن ابی اور اسکے ساتھیوں پر کفار و مشرکین کی یہ دھمکی کارگر ثابت ہوئی اور وہ حضور ﷺ سے لڑنے کے لئے تیار ہو گئے۔ آپ ﷺ ان کے پاس تشریف لے گئے اور کمال فراست ایمانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ بے شک تم تک قریش کی دھمکی بڑے رنگ کے ساتھ پہنچی ہے وہ تمہیں اتنا بڑا دھوکہ نہیں دے سکتے تھے جتنا بڑا دھوکہ تم خود اپنے آپ کو دینا چاہتے ہو کہ اپنے ہی بھائیوں اور بیٹوں سے لڑو۔ انہوں نے جب یہ بات سنی تو اپنے ارادے باز آ گئے۔ قریش تک یہ بات پہنچی تو انہوں نے غزوہ بدر کے بعد جل بھن کر یہودیوں کو لکھا کہ تم فوج اور قلعوں والے ہو، تم یا تو ہمارے آدمی (حضور ﷺ) سے لڑو یا پھر ہم تمہارا ستیاناس کر دیں گے اور ہمارے اور تمہاری بیویوں کے زیورات کے درمیان کوئی چیز بھی رکاوٹ نہیں بن سکے گی۔ ادھر یہ بات حضور ﷺ تک پہنچی ادھر بنونضیر نے مسلمانوں کے ساتھ عہد توڑنے کا فیصلہ کر لیا اور اس نیت سے حضور ﷺ کی طرف پیغام بھیجا آپ تیس صحابہؓ کے ساتھ فلاں مقام پر تشریف لے آئیں ادھر ہم بھی تیس علمائے یہود کے ساتھ وہاں پہنچتے ہیں۔ وہ آپ ﷺ کی گفتگو

اور دعوت کو سنیں گے اگر وہ آپ کی گفتگو سے متاثر ہو کر ایمان لے آئے تو ہم بھی آپ ﷺ کی تصدیق کر کے ایمان لے آئیں گے۔ حضور ﷺ کو اس منافقانہ چال کے پیچھے کار فرما سازش کا علم ہو گیا۔ چنانچہ آپ نے اگلے روز فوجی دستے کے ساتھ ان کا محاصرہ کر لیا اور بنو نضیر کو پیغام بھیجا کہ تم ہمارے نزدیک قابل امن صرف ایک ہی صورت میں ہو سکتے ہو اور وہ یہ ہے کہ ہمارے ساتھ معاہدہ کرو۔ یہودیوں نے مجوزہ معاہدے سے انکار کر دیا تو اسلامی دستے نے اس روز ان سے جنگ کی اور دوسرے روز بنو نضیر کا محاصرہ چھوڑ کر بنو قریظہ پر حملہ کر دیا اور انہیں بھی ایک معاہدے کی دعوت دی جسے انہوں نے قبول کر لیا۔ اس سے اگلے روز اسلامی دستے نے دوبارہ بنو نضیر پر حملہ کر دیا جنگ ہوئی اور دشمن اپنا علاقہ چھوڑنے پر راضی ہو گیا۔ جب بنو نضیر جلا وطن ہوئے تو اپنا جس قدر سامان اونٹوں پر لاد کر لے جا سکتے تھے لے گئے حتیٰ کہ اپنے گھر کے دروازے بھی اکھاڑ کر لے گئے۔ بنو نضیر کے کھجور کے باغات خاص طور پر حضور ﷺ کے ساتھ خاص تھے اللہ نے وہ آپ کو عطا فرمائے تھے لیکن وہ باغات مہاجرین کو دے کر ان کے وقار اور مرتبے میں اضافہ کیا گیا' اللہ کے رسول ﷺ کو مہاجرین کی دلجوئی مقصود تھی جو بنو نضیر کے باغات انہیں دے کر کی گئی۔

باب۔ ۳

فضائل انصار

(قرآن کی روشنی میں)

ہجرت کا ذکر انصار کی خدمات جلیلہ کا اعتراف کئے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ انصار کا جذبہ ایثار و قربانی اسلامی تاریخ کے مقدر کا وہ ستارا اور مرکزی نقطہ ہے جس سے پھوٹنے والی شعاعوں کی ہمہ گیریت کا ادراک کئے بغیر اس ثقافتی پس منظر کی عملاً تفسیر ممکن ہی نہیں جس پس منظر میں اسلام کے عظیم الشان فکری اور روحانی نظام کی بنیادیں استوار ہوئیں اور تمدن عرب تہذیب انسانی پر ہر زاویے سے اثر انداز ہوا کہ پوری دنیا کے آئینی و انتظامی ڈھانچے کی تجدید نو کا باعث بنا۔

بیعت عقبہ کتاب ہجرت کا دیباچہ

یمن سے اوس اور خزرج کی آمد سے قبل یثرب میں یہودی آباد تھے۔ اوس اور خزرج شروع میں یہودیوں کی صنعت و تجارت میں بطور کارکن شریک ہوئے۔ ظاہر ہے اجیر اپنے آجر کے زیر تسلط ہوتا ہے۔ پھر وہ وقت بھی آیا کہ اوس اور خزرج یہودیوں کے چنگل سے آزاد ہو گئے۔ یہودیوں کی سیاسی اور اقتصادی بالادستی سے نجات ملی تو اوس اور خزرج نفاق کا شکار ہو گئے اور قبائلی جنگوں کے ایک طویل سلسلے کا آغاز ہو گیا۔ یہودی اوس اور خزرج میں اختلافات کی خلیج وسیع کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ اوس اور خزرج ابھی تک ذہنی اور فکری طور پر یہودیوں کے زیر اثر تھے اور چاہتے تھے کہ کسی صاحب کتاب نبی پر ایمان لا کر یہودیوں کی نظریاتی اور ثقافتی برتری پر بھی کاری ضرب لگائیں لیکن انہیں آپس کی خانہ جنگیوں سے ہی فرصت نہ ملتی تھی۔ یہودی ذہن نے ان دونوں قبائل کو اس طرح الجھا دیا تھا کہ صلح کی خواہش کے باوجود یہ ایک دوسرے کے خلاف تلواریں نیام سے باہر نکالنے میں ذرا بھی تامل سے کام نہ لیتے۔ انہوں نے یہودیوں ہی سے سن رکھا تھا کہ نبی آخر الزماں ﷺ کا ظہور ہونے والا ہے اور وہ اپنے آبائی وطن سے ہجرت کر کے کھجوروں والے شہر یثرب میں تشریف لائیں گے۔ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ یہودی نسل در نسل اس نبی آخر الزماں ﷺ کی آ

کے منتظر ہیں۔ انہیں امید تھی کہ جب رسول آخر ﷺ تشریف لائیں گے تو وہ دونوں قبیلوں کے درمیان صلح کرا دیں گے۔ اس طرح غیر محسوس طریقے سے ہجرت کے لئے راہ ہموار ہو رہی تھی۔ اوس کی سوچ یہ بھی تھی کہ قریش مکہ کو اپنا حلیف بنا کر یہودیوں کی اقتصادی و سیاسی گرفت ہی کو کمزور نہ بنایا جائے بلکہ خزرج سے مقابلے کی صورت میں خود کو بہتر پوزیشن میں بھی لایا جائے۔ اعلان نبوت کے بعد اہل یثرب انفرادی طور پر حضور ﷺ سے رابطہ رکھے ہوئے تھے' مقصد اسلام کے بارے میں معلومات حاصل کرنا ہوتا۔ اسلام کے ابتدائی دنوں میں یہ حج کے موقع پر طواف کعبہ کے لئے مکہ آتے اور تحریک اسلامی سے تھوڑی بہت شناسائی حاصل کرنے کے بعد لوٹتے' مراسم کی یہی استواری ہجرت کی بنیاد بنی' بیعت عقبہ اولیٰ تو باقاعدہ انصار میں تبلیغ دین کا وسیلہ جلیلہ ثابت ہوئی۔ قبیلہ خزرج کے ۶ یا ۸ آدمی حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ فروغ اسلام کے نئے امکانات کا سورج طلوع ہوا۔ ان مسلمانوں نے حضور ﷺ کو اپنے ہاں تشریف لانے کی دعوت دینے کا وعدہ کیا۔ یہ نبوت کا نواں سال تھا۔ بنو خزرج کے ان مسلمانوں کے توسط سے اہل یثرب تک اسلام پہنچا۔ نبوت کے گیارہویں سال میں تہتر (۷۳) انصاری مسلمانوں نے حج کے موقع پر عقبہ کے مقام پر دست اقدس پر بیعت کی اور سرکار دوعالم ﷺ سے عہد کیا کہ وہ ہر طرح سے آپ کی حفاظت کریں گے۔ ہجرت مدینہ کے لئے باقاعدہ منصوبہ بندی کے آغاز کی بنیاد پڑی۔ گویا بیعت عقبہ ثانیہ میں کتاب ہجرت کا دیباچہ تحریر ہوا۔ اس بیعت کو اہل دانش عرب و عجم کی جنگ پر بیعت کے نام سے بھی موسوم کرتے ہیں۔ نبی آخر الزماں ﷺ کو یہ یقین دہانی بھی کرائی گئی کہ ہم آپ ﷺ اور آپ کے ساتھیوں کی حفاظت اپنی جانوں کی طرح کریں گے۔ یثرب میں اسلام ایک شجر سایہ دار کی طرح پھیل رہا تھا۔ اب تبلیغ اعلانیہ ہونے لگی' مسلمانوں کی استقامت اور ایمان پر پختگی ملاحظہ کرنے کے بعد اور اپنے ہاتھ سے تراشے ہوئے بتوں کی بے بسی دیکھ کر انصار کے مشرکین کا سارا دم خم ہرن ہو گیا' ان کی قوت مدافعت دم توڑ گئی اور فروغ اسلام کے لئے فضا تیزی سے ہموار ہونے لگی۔

حرب احمر و اسود

ہجرت کا مرحلہ انصار کے بھرپور تعاون اور مدد کے بغیر طے نہیں ہو سکتا تھا۔ گروہ انصار نے بیک وقت تین طرح کی مدد کی۔ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی مدد (حالانکہ اللہ کسی کی مدد کا محتاج نہیں اور رسول ﷺ بھی اللہ کے سوا کسی مخلوق کے محتاج نہیں' یہ نسبت نصرت انصار کی طرف ان کی حوصلہ افزائی اور جہاد کی قبولیت کے لئے ہے) انصار نے اللہ کے دین کی مدد کی یعنی فروغ اسلام میں بھرپور حصہ لیا' مرحلہ دعوت کے لئے فضا سازگار بنائی اور آزادانہ تبلیغ کی راہ میں رکاوٹوں کو دور کیا چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہجرت مدینہ کے بعد تحریک اسلامی کا پیغام عالمگیر سطح پر اکناف عالم میں پہنچایا گیا اور دعوت کے کام کو بین الاقوامی حوالے سے پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لئے اس وقت کے ذرائع ابلاغ سے بھرپور استفادہ کیا گیا' انصار کی مدد کا تیسرا مرحلہ مہاجرین کی مدد ہے' ایثار و قربانی کی ایسی لازوال مثالیں انصار نے پیش کیں کہ تاریخ جن کا جواب دینے سے قاصر ہے۔ مواخات مدینہ حقوق انسانی کی پاسداری کے ایک دل آویز اظہار کا نام ہے۔ ارتقائے انسانی کے باب میں مواخات مدینہ کو معاشرتی انصاف قائم کر کے اعتدال اور توازن کی راہوں پر چراغ جلانے کی سعی مشکور سے تعبیر کیا جا سکتا ہے' اگر غور کیا جائے تو اندازہ ہو گا کہ مدد و نصرت کی یہ تینوں صورتیں اپنے اندر ایک جہادی فطرت رکھتی ہیں۔ اس کا صاف مطلب تھا کہ عالم کفر کے خلاف اعلان جنگ کیا جا رہا ہے اور پورے عالم عرب کی مزاحمتی تحریکوں کا چیلنج قبول کیا جا رہا ہے۔ بیعت عقبہ کے موقع پر اسے بجا طور پر حرب احمر و اسود کا نام دیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ بیعت عقبہ کا نام اپنے قریبی عزیزوں سے جنگ و قتال بھی رکھا گیا تھا۔

عشاق صادقین کا جذب دروں

ہم نے گذشتہ ابواب میں دیکھا کہ ہجرت جہاد کا دروازہ ثابت ہوئی۔ مدینہ منورہ میں حضور ﷺ کی تشریف آوری کے ساتھ ہی اسلام کی اولین نظریاتی ریاست

کی بنیاد پڑ گئی۔ اگرچہ حضور ﷺ کی آمد سے قبل ہجرت مدینہ کا آغاز ہو چکا تھا اور مسلمان ایک ایک دو دو کر کے سرزمین مکہ سے ترک سکونت کر رہے تھے' مدینے کی فضا ہر لحاظ سے تحریک اسلامی کے لئے سازگار ثابت ہو رہی تھی۔ یہ چیز قریش کے سینے پر مونگ دل رہی تھی۔ وہ مدینہ منورہ پر حملہ کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ وہ اللہ کے دین کی ہر نشانی کو مٹا دینا چاہتے تھے۔ انصار عاشقین صادق کی وہ جماعت تھی جنہوں نے نامساعد حالات میں آقائے نامدار حضرت محمد ﷺ کو اپنے ہاں ہجرت کر کے آ جانے کی باقاعدہ دعوت دی اور عہد کیا کہ یارسول اللہ! (ہمارے ماں باپ آپ پر قربان) ہم آپ اور آپ کے ساتھیوں کی دل و جان سے حفاظت کریں گے۔ اہل مدینہ اپنے قول کے سچے ثابت ہوئے اور جب حکم جہاد ملا' مسلمانوں نے اپنے دفاع میں تلواریں بے نیام کیں یا فتنہ و شر کے مراکز کو ختم کرنے کے لئے آگے بڑھ کر کارروائی کی ضرورت محسوس ہوئی یا امن قائم کرنے کے لئے جنگ کو ناگزیر پا کر قتال کرنا پڑا تو انصار نے ہر مرحلے پر حضور ﷺ کا ساتھ دیا اور اپنے جان و مال سے تحریک اسلامی کے گرد اپنے لہو کی دیواریں چن دیں اور تاجدار کائنات ﷺ پر آنچ تک نہ آنے دی' مؤاخات مدینہ سے اخوت کی نئی طرح ایجاد کی اور عملی طور پر ثابت کر دیا کہ ایک فلاحی ریاست میں ایک باشعور شہری کے فرائض کیا ہوتے ہیں' کس طرح ایثار و قربانی سے کام لے کر ایک نظریاتی ریاست کے داخلی استحکام کو مضبوط بنایا جاتا ہے اور عسکری لحاظ سے کس طرح خون کے چراغ روشن کر کے اپنی نوزائیدہ مملکت کی نظریاتی اور جغرافیائی سرحدوں کی حفاظت کی جاتی ہے اور کس طرح فصیل ارض وطن پر پہرہ دے کر اپنے ہر گھر کے آنگن میں اطمینان اور عافیت کی خوشبو کو بکھیرا جاتا ہے۔ ہجرت کے بعد انصار نے حضور رحمت عالم ﷺ کے سچے جاں نثار ہونے کا عملی ثبوت دیا۔ مہاجرین مکہ کو نہ صرف پناہ دی بلکہ فقراء و بے یار و مددگار مہاجرین کے لئے عمدہ ٹھکانہ بھی فراہم کیا۔ یہ ان عشاق صادقین کا جذب دروں تھا کہ انہوں نے اپنے جان و مال کا سودا وجود مسعود رسول ﷺ کے بدلے میں کرا لیا۔ یہ ان کی کیفیت و سرشاری تھی جو ان کو سرکار ﷺ کے قدموں پر

اپنا تن من لٹانے کی ترغیب دے رہی تھی اور انہوں نے ایسا کیا بھی' جاں نثاران رسول ﷺ کا یہی جذب دروں ہجرت مدینہ کی ظاہری بنیاد بنا۔ بہت سی سعادتیں ازل ہی سے انصار کے مقدر میں لکھی جا چکی تھیں۔ اس سے بڑی سعادت اور کیا ہو گی کہ ساری کائنات کی دولت خلاصہ خلائق اور حبیب خدا ﷺ کو وہ اپنے گھر بلانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ وہ رسول معظم ﷺ جن کے ہر نقش پا پر دولت کونین لٹا دی جائے تو بھی کم' ہم نے مہاجرین کے فضائل درج کئے ہیں کہ انہوں نے ہجرت مدینہ کی سعادت حاصل کی اور چار دانگ عالم میں اسلام کے فروغ کا بنیادی پتھر بنے۔ درج ذیل سطور میں ہم یہ بھی دیکھیں گے کہ جن کی طرف ہجرت کی گئی' جنہیں اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کی میزبانی کا شرف حاصل ہوا وہ کون لوگ تھے۔ کیا وہ واقعی میزبانی رسول ﷺ کے سچے اور حقیقی حقدار تھے اور اللہ جل شانہ نے انہیں اپنے آخری رسول ﷺ کا مددگار و معاون بنانا کیوں پسند فرمایا۔

اصل مدد اللہ ہی کی ہے

ظاہری طور پر انصار نے مہاجرین کو پناہ دی اور ہر حوالے سے ان کی مدد کی حتیٰ کہ اپنی جانیں بھی اپنے نظریہ کے تحفظ کے لئے اللہ کی راہ میں قربان کر دیں لیکن اصل مدد اللہ ہی کی ہے۔ وہی اپنے بندوں کی دستگیری فرماتا ہے وہی اپنے بندوں کی مدد کو پہنچتا ہے' وہی مشکل لمحات کو آسان بناتا ہے۔ قرآن مجید نے حضرت طالوت اور جالوت کے مابین جنگ کا تذکرہ کیا ہے۔ جب دونوں فوجوں کا آمنا سامنا ہوا تو حضرت طالوت علیہ السلام کو فتح نصیب ہوئی حالانکہ ان کی فوج قلیل تعداد میں تھی اور بظاہر لڑائی کے قابل بھی نہ تھی۔

قرآن کہتا ہے کہ اس موقع پر مومنین نے کہا:

قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَ جُنُوْدِهٖ ؕ قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ

کہنے لگے آج ہم میں جالوت اور اس کی فوجوں سے مقابلے کی طاقت نہیں' جو

مُّلٰقُوا اللّٰہِ کَمْ مِّنْ فِئَۃٍ قَلِیْلَۃٍ غَلَبَتْ فِئَۃً کَثِیْرَۃً ۢ بِاِذْنِ اللّٰہِ ؕ وَاللّٰہُ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ ○ (البقرہ ۲:۲۴۹)

لوگ یہ یقین رکھتے تھے کہ وہ شہید ہو کر (یا مرنے کے بعد) اللہ سے ملاقات کا شرف پانے والے ہیں' کہنے لگے کئی مرتبہ اللہ کے حکم سے تھوڑی سی جماعت (خاصی) بڑی جماعت پر غالب آ جاتی ہے اور اللہ صبر کرنے والوں کو اپنی معیت سے نوازتا ہے۔

جنگ ہوئی اور اہل حق اللہ کی مدد و نصرت سے کامیاب و کامران ٹھہرے' قرآن کہتا ہے۔

فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰہِ (البقرہ ۲:۲۵۱)

پھر انہوں نے ان (جالوتی فوجوں) کو اللہ کے حکم سے شکست دی۔

آیات ربانی سے واضح ہو رہا ہے کہ اصل مدد اللہ ہی کی ہے اگرچہ حضرت طالوت علیہ السلام کی فوج تعداد میں تھوڑی تھی اور پھر لڑنے کے قابل بھی نہ تھی پھر بھی جیت انہی کے حصہ میں آئی۔ یہ محض تائید خداوندی اور اللہ کی مدد و نصرت کی وجہ سے ہوا۔ ایک اور مقام پر ارشاد ہوا۔

وَاللّٰہُ یُؤَیِّدُ بِنَصْرِہٖ مَنْ یَّشَآءُ (آل عمران ۳:۱۳)

اور اللہ اپنی مدد کے ذریعے جسے چاہتا ہے تقویت دیتا ہے۔

ایک اور مقام پر صراحتاً فرمادیا۔ غزوہ بدر میں اللہ ہی کی مدد تھی جس نے حق کو حق ثابت کر کے باطل کے مقدر میں شکست لکھ دی۔

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ (الانفال ۸:۱۰)

(حقیقت میں تو) اللہ کی بارگاہ سے مدد کے سوا کوئی (اور) مدد نہیں۔

ایک اور مقام پر خداوند قدوس نے اس سے بھی زیادہ واضح الفاظ میں تنبیہہ کی ہے۔

اِنْ یَّنْصُرْکُمُ اللّٰہُ فَلَا غَالِبَ لَکُمْ وَاِنْ

اگر اللہ تمہاری مدد فرمائے تو تم پر کوئی

يَخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْ بَعْدِهٖ ۗ وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ○ (آل عمران '۳:۱۶۰)

غالب نہیں آ سکتا اور اگر وہ تمہیں بے سہارا چھوڑ دے تو پھر کون ایسا ہے جو اس کے بعد تمہاری مدد کر سکے اور مومنوں کو اللہ ہی پر بھروسہ رکھنا چاہئے۔

حقیقی معنوں میں اللہ ہی اپنے بندوں کی مدد کرتا ہے۔ آیت مذکورہ میں انتہائی وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ اللہ ہی کی مدد اصل مدد ہے اور اگر اس کی مدد نہ مل سکے تو کائنات بھر میں اور کون ہے جو تمہاری مدد کو آئے گا۔

اسباب نصرت

اللہ رب العزت نے مدد و نصرت کے دو طرح کے اسباب پیدا فرمائے ہیں۔ مادی و ظاہری اسباب ' دوسرے ملکوتی و باطنی اسباب

۱۔ مادی و ظاہری اسباب

یہ مدد طبعی اور فطری انداز کی ہوتی ہے جو ظاہری و مادی آلات کے ذریعہ کی جاتی ہے ' افرادی قوت ' سامان حرب ' حکمت عملی یہ سب چیزیں مادی و ظاہری اسباب میں آتی ہیں اور مدد و نصرت کی ظاہری اور مادی توجیہہ قرار پاتی ہیں۔

۲۔ ملکوتی و باطنی اسباب

یہ مدد طبعی نہیں بلکہ مابعد الطبیعاتی ہوتی ہے اس کا ادراک روحانی سطح پر ہوتا ہے۔ یہ مدد غیر مادی وسائل و ذرائع سے کی جاتی ہے۔ مثلاً دشمن پر رعب طاری ہو جانا ' ملائکہ کا قطار اندر قطار اتر کر دشمنان اسلام کے خلاف صف آرا ہو جانا۔ یہ فضل الٰہی کی خاص صورتیں ہیں۔

نصرت دین --- خاص توفیق و رحمت خداوندی ہے

اللہ ہی اپنے دین کی حفاظت کرتا ہے وہی اپنے حبیب ﷺ کا مددگار ہے ' ارشاد ربانی ہے:

وَاللّٰہُ یَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ
(المائدہ، ۵ : ۶۷)

اور اللہ (مخالف) لوگوں سے آپ (کی جان) کی (خود) حفاظت فرمائے گا۔

ایک اور مقام پر فرمایا:

اِلَّا تَنْصُرُوْہُ فَقَدْ نَصَرَہُ اللّٰہُ اِذْ اَخْرَجَہُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا (التوبہ ۹:۴۰)

اگر تم ان کی (یعنی رسول اللہ ﷺ کی غلبہ اسلام کی جدوجہد میں) مدد نہ کرو گے (تو کیا ہوا) سو بے شک اللہ نے ان کو (اس وقت بھی) مدد سے نوازا تھا جب کافروں نے انہیں (وطن مکہ سے) نکال دیا تھا۔

فَاَنْزَلَ اللّٰہُ سَکِیْنَتَہٗ عَلَیْہِ وَ اَیَّدَہٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْھَا (التوبہ ۹:۴۰)

پس بے شک اللہ نے ان پر اپنی تسکین نازل فرما دی اور انہیں (فرشتوں کے) ایسے لشکر کے ذریعے قوت بخشی جنہیں تم نہ دیکھ سکے۔

اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو کسی مدد کی حاجت نہیں۔ ان کا دین بھی کسی کی مدد کا محتاج نہیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَنْ یَّرْتَدَّ مِنْکُمْ عَنْ دِیْنِہٖ فَسَوْفَ یَاْتِی اللّٰہُ بِقَوْمٍ یُّحِبُّھُمْ وَ یُحِبُّوْنَہٗ اَذِلَّۃٍ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اَعِزَّۃٍ عَلَی الْکٰفِرِیْنَ (المائدہ ۵:۵۴)

اے ایمان والو! تم میں سے جو شخص اپنے دین سے پھر جائے گا تو عنقریب اللہ (ان کی جگہ) ایسی قوم کو لائے گا جن سے وہ (خود) محبت فرماتا ہو گا اور وہ اس سے محبت کرتے ہوں گے وہ مومنوں پر نرم (اور) کافروں پر سخت ہوں گے۔

آیہ کریمہ سے معلوم ہوا کہ اللہ رب العزت اپنے رسول ﷺ اور اپنے دین کی حفاظت کے لئے تنہا ہی کافی ہے۔ وہ اس کے لئے کسی فرد یا قوم کا محتاج نہیں۔

ایک سوال اور اس کا جواب

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اللہ جل مجدہٗ اپنے رسول ﷺ اور اپنے دین کی حفاظت کے لئے تنہا ہی کافی ہے اور یقیناً تنہا ہی کافی ہے اور کسی فرد یا قوم کا محتاج نہیں تو پھر اقامت دین اور نصرت رسول ﷺ کے لئے امت مسلمہ کو تلقین کیوں کی گئی ہے اور اسے ہم پر واجب کیوں قرار دیا گیا ہے؟ اس سوال کا جواب بڑا واضح اور روشن ہے۔ اس میں نہ ابہام ہے اور نہ کوئی الجھاؤ۔ سیدھا سا جواب یہ ہے کہ اللہ رب العزت نہ تو محتاج عبادت ہے نہ محتاج اطاعت۔ وہ تو ہر چیز سے بے نیاز ہے سو پھر ہم سے اپنی اطاعت کا کیوں تقاضا کیا جا رہا ہے۔ اقامت صلوٰۃ پر زور کیوں دیا جا رہا ہے۔ اسلام کو تمام ادیان پر غالب آنے کے لئے جہادی قافلوں کو شاہراہ انقلاب پر گامزن ہونے کی ہدایت کیوں دی جا رہی ہے۔ عمل صالح کی ہدایت فرما کر اسلامی تعلیمات کے عملی نفاذ پر کیوں زور دیا جا رہا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تو ان چیزوں سے بے نیاز ہے۔ وہ ہماری بندگی کا محتاج نہیں البتہ ہماری نظریاتی اکائی کی سلامتی کے لئے اس احساس بندگی کا زندہ و تابندہ رہنا ضروری ہے۔ یہ ساری ترغیبات ہماری بھلائی اور نجات کے لئے ہی دی جا رہی ہیں۔ خدمت دین کی توفیق ہم پر اللہ کا بہت بڑا انعام ہے۔ ہم گنہگاروں' سیاہ کاروں اور خطاکاروں پر اس کا احسان عظیم ہے۔ خدمت دین کی توفیق حاصل ہو جائے' اس کی بارگاہ میں سربسجود ہونے کی مہلت مل جائے' اس کی رضا کے لئے عمل کرنے کی سعادت حاصل ہو جائے تو اور کیا چاہئے۔ اُس کی رضا کا حصول ہی مقصود بندگی ہے۔ وہ اگر بندے کے سجدوں کو شرف قبولیت بخش دے' اس کے آنسوؤں' ہچکیوں اور التجاؤں کو اپنی بارگاہ میں قبول فرمالے تو بندے کی نجات کے لئے رضائے خداوندی کافی ہے۔

ارادہ الٰہی' نصرت دین اور انصار کی فضیلت

ارادہ الٰہی کیا ہے' منشائے فطرت کسے کہتے ہیں' مشیت ایزدی کا تقاضا کیا ہے؟

سب سے پہلے دو باتیں ذہن نشین کر لی جانی چاہئیں۔ پہلی یہ کہ اللہ سب ادیان باطلہ پر اپنے دین کو غالب دیکھنا چاہتا ہے۔ دوسرے اللہ رب العزت اپنے حبیب ﷺ کی مدد کرنا اور ہر مشکل وقت میں اپنے محبوب ﷺ کی دلجوئی کرنا پسند کرتا ہے۔ امر اول کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:-

وَ یُرِیْدُ اللّٰہُ اَنْ یُّحِقَّ الْحَقَّ بِکَلِمٰتِہٖ وَ یَقْطَعَ دَابِرَ الْکٰفِرِیْنَ (الانفال' ۸:۷)

اور اللہ یہ چاہتا تھا کہ اپنے کلام سے حق کو حق ثابت فرما دے اور (دشمنوں کے بڑے مسلح لشکر پر مسلمانوں کی فتح یابی کی صورت میں) کافروں کی (قوت اور شان و شوکت کی) جڑ کاٹ دے۔

امر الٰہی کا رخ اس طرف ہے کہ دین حق کی مدد کی جائے اور دین حق کو غالب کیا جائے' اس مقصد کے لئے لازم ہے کہ وہ اپنے رسول ﷺ کی مدد و نصرت فرمائے کیونکہ دین کو غالب کرنے کی ذمہ داری اس نے اپنے رسول ﷺ پر رکھی ہے' دوسروں پر یہ ذمہ داری تبعاً ہے اصالتاً نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امام یا امیر اللہ کے رسول کا خلیفہ ہوتا ہے اور یہ ذمہ داری خلیفہ کے طور پر نیابتاً ادا کرتا ہے۔ اس تصور کو قرآن مجید میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

وَ اِنْ یُّرِیْدُوْا اَنْ یَّخْدَعُوْکَ فَاِنَّ حَسْبَکَ اللّٰہُ ھُوَ الَّذِیْٓ اَیَّدَکَ بِنَصْرِہٖ وَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ (الانفال' ۸:۶۲)

اور اگر وہ چاہیں کہ آپ کو دھوکہ دیں تو بے شک آپ کے لئے اللہ کافی ہے جس نے آپ کو اپنی مدد کے ذریعے اور اہل ایمان کے ذریعے طاقت بخشی۔

اللہ رب العزت نے اس آیہ مبارکہ میں صراحتاً ارشاد فرمایا ہے کہ اصل مقصود (تمکن دینی کے لئے) رسول اللہ ﷺ کی مدد کرنا ہے۔ اپنے نبی ﷺ کی مدد کرنا مؤمنین کے لئے سعادت کا باعث ہے اور پھر یہ مدد اقامت دین کے لئے' کلمہ حق کی سربلندی کے لئے ہے۔ اقامت دین کا راستہ پھولوں کا راستہ نہیں۔ اطاعت گزار بندوں کو پتھروں پر چل کر رضائے الٰہی کی منزل تک پہنچنا ہوتا ہے اور یہی مقصود بندگی

ہے۔ مزید فرمایا جا رہا ہے۔

یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَ مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ (الانفال ۸:۶۴)

اے نبی (معظم ﷺ)! آپ کے لئے اللہ کافی ہے اور وہ مسلمان جنہوں نے آپ کی پیروی اختیار کرلی ہے۔

پیغمبر آخر الزماں ﷺ کی ذات اقدس اللہ کے سوا کسی فرد یا قوم کی مدد کی محتاج نہیں۔ حضور ﷺ کو ہماری اطاعت کی بھی حاجت نہیں۔ اگر ہمیں اتباع رسول یا اطاعت پیغمبر کا حکم دیا گیا ہے تو اس سے مقصود دین و دنیا میں ہماری اپنی فلاح اور نجات ہے۔ فرمایا جا رہا ہے کہ اے پیارے حبیب ﷺ! وہ لوگ جو اہل ایمان میں سے ہیں وہ اگر تمہاری اتباع کریں، تمہاری مدد کو پہنچیں تو اے محبوب ﷺ ان کے لئے بھی اللہ ہی کافی ہے۔ اللہ اپنے رسول ﷺ کی مدد کرتا ہے اور مومنین کی مدد مقصود اصلی نہیں، مومنین میں سے بھی ان کی مدد قبول ہو گی جو نصرت رسول کے لئے سر پر کفن باندھ کر نکلیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ انصار دین کے انصار نہیں اللہ کے رسول ﷺ کے انصار کہلائے۔

انصار اور ارادہ الٰہی کی تکمیل

انصار کی یہ فضیلت سب سے معتبر ٹھہری کہ وہ اللہ کے رسول ﷺ کے مددگار ہیں۔ اللہ کے رسول ﷺ کی ساری انقلابی جدوجہد یہ تھی کہ اللہ کا دین تمام ادیان باطلہ پر غالب آ جائے یہی بعثت رسول کا مقصد وحید تھا۔ اس کار نبوت میں انصار بھی اللہ کے رسول ﷺ کے معاون ہوئے۔ گزشتہ سطور میں بیان ہوا ہے کہ اللہ کا ارادہ اس سمت میں ہے کہ اس کے محبوب ﷺ کی مدد کی جائے کیونکہ نصرت رسول ﷺ کے بغیر ہرگز ہرگز غلبہ دین کا کوئی دوسرا طریق رب ذوالجلال نے وضع نہیں فرمایا۔ اس لئے مؤمنین کو بھی اس مقصد کے لئے منتخب فرمایا گیا کہ وہ نصرت رسول میں شامل ہو کر اپنے دامن میں رحمتیں، برکتیں اور عظمتیں سمیٹ لیں۔ انصار کو یہ فضیلت حاصل ہے کہ وہ ارادہ الٰہی کی تکمیل میں وسیلہ بنے۔ انہیں یہ بلند مقام بھی حاصل ہوا کہ

اللہ جل شانہ نے جس اولین گروہ کو نصرت رسول ﷺ کے عظیم مقصد کے لئے منتخب فرمایا وہ انصار کا گروہ ہی تھا۔ اس اعتبار سے انصار اللہ کے منتخب اور چنے ہوئے برگزیدہ افراد کا گروہ ہے۔

انصار کامیاب و کامران ہیں

جن جاں نثاران مصطفےٰ ﷺ کو اللہ بھی منتخب فرمالے اور اسے چنے ہوئے برگزیدہ افراد کا گروہ بھی قرار دے دیا جائے تو ان کی کامیابی و کامرانی میں کوئی شک باقی نہیں رہ جاتا۔ انصار مومنین کی وہ خوش قسمت جماعت ہے جسے دنیا میں بھی کامیابی ملی اور آخرت کی کامرانی بھی ان کے حصے میں آئی۔ خود قرآن نے انصار کو کامیاب لوگوں کا گروہ کہا ہے۔ طلوع اسلام کے وقت کفار و مشرکین مکہ نہ تو کسی آسمانی کتاب پر ایمان رکھتے تھے نہ کسی نبی پر یقین رکھتے تھے۔ اس کے برعکس یثرب کے یہود و نصاریٰ چونکہ آسمانی کتابوں پر یقین رکھتے تھے اس لئے انہیں نبی اکرم ﷺ کے بارے میں بہت کچھ معلوم تھا اور وہ نسل در نسل نبی آخر الزماں ﷺ کی آمد کے منتظر تھے' انہوں نے اپنی الہامی کتابوں میں درج نشانیوں کے مطابق حضور ﷺ کو پہچاننے میں ذرا بھی غلطی نہ کی' ارشاد خداوندی ہے۔

اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْكِتٰبَ یَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَھُمْ (البقرہ' ۲:۱۴۶)

اور جن لوگوں کو ہم نے کتاب عطا فرمائی ہے وہ اس رسول (آخر الزماں حضرت محمد ﷺ اور ان کی شان عظمت) کو اسی طرح پہچانتے ہیں جیسا کہ بلاشبہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔

جب حضور ﷺ کی ولادت باسعادت کا وقت آیا تو یہودی علماء بے قرار ہو گئے۔ انہیں معلوم ہو گیا کہ آج شب نبی آخر الزماں ﷺ دنیا میں تشریف لے آئے ہیں۔ ایک یہودی حضور ﷺ کی پشت مبارک پر مہر نبوت دیکھ کر بے ہوش ہو گیا تھا اور مکے کی گلیوں میں دہائی دیتا پھرتا تھا کہ آج نبوت بنی اسرائیل کے گھر سے رخصت

ہوئی۔ سیدہ آمنہ علیہا السلام جب اپنے چاند کو لے کر اپنے میکے گئیں تو یہودیوں کے تیور دیکھ کر ان کے بھائیوں نے انہیں بحفاظت مکہ رخصت کر دیا تھا کہ یہود آمنہ کے لال کے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں۔ حلیمہ سعدیہؓ کو بھی یہودیوں کے اس ذہنی فتور کا اندازہ ہوا تو وہ مزید چوکنا ہو گئیں۔ یہودیوں کو اپنی اولاد کے بارے میں شک ہو سکتا تھا لیکن حضور ﷺ کے نبی برحق بلکہ نبی آخر الزماں ہونے میں انہیں رتی برابر شک نہ تھا۔ ارشاد باری تعالٰی ہے:

وَ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ
(البقرہ ۲:۸۹)

حالانکہ اس سے پہلے وہ خود (نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ اور ان پر اترنے والی کتاب قرآن کے وسیلے سے) کافروں پر فتح یابی (کی دعا) مانگتے تھے۔ سو جب ان کے پاس وہی نبی (حضرت محمد ﷺ اپنے اوپر نازل ہونے والی کتاب قرآن کے ساتھ) تشریف لے آیا جسے وہ (پہلے ہی سے) پہچانتے تھے تو اسی کے منکر ہو گئے۔ پس (ایسے دانستہ) انکار کرنیوالوں پر اللہ کی لعنت ہے۔

تاریخ شاہد ہے اور احادیث میں بھی آیا ہے کہ یہود اوس اور خزرج سے لڑائی کی صورت میں کہا کرتے تھے کہ ہم اپنے رسول ﷺ کے ظہور کا انتظار کر رہے ہیں۔ جب ہمارے نبی آخر الزماں ﷺ آئیں گے تو ہم تم پر فتح حاصل کر کے تم سے بدلہ لیں گے۔

یہی سبب تھا کہ اوس اور خزرج مشرک ہونے کے باوجود حضور رحمت عالم ﷺ کے بارے میں نرم گوشہ رکھتے تھے۔ محبت رسول ﷺ کی چنگاری ان کے سینوں میں بھی سلگ رہی تھی۔ نبی آخر الزماں ﷺ کے ظہور کے بارے میں یہودیوں سے انہوں نے بہت کچھ سن رکھا تھا۔ ایک اشتیاق سا ان کے دلوں میں مچل رہا تھا۔ اس

جذباتی وابستگی کا یہ نتیجہ نکلا کہ اوس اور خزرج کو اولین انصار ہونے کا لازوال اعزاز حاصل ہوا۔ درج ذیل آیت زبانی میں اگرچہ اوس اور خزرج براہ راست داخل نہیں ہیں لیکن بالواسطہ یہ بھی ان لوگوں میں شامل ہیں جن کا تذکرہ اس آیت میں آ رہا ہے۔

اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَہٗ مَکْتُوْبًا عِنْدَھُمْ فِی التَّوْرٰاتِ وَالْاِنْجِیْلِ ز یَاْمُرُھُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَ یَنْھٰھُمْ عَنِ الْمُنْکَرِ وَ یُحِلُّ لَھُمُ الطَّیِّبٰتِ وَ یُحَرِّمُ عَلَیْھِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَ یَضَعُ عَنْھُمْ اِصْرَھُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ کَانَتْ عَلَیْھِمْ فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِہٖ وَ عَزَّرُوْہُ وَ نَصَرُوْہُ وَ اتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مَعَہٗٓ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ

(الاعراف‘ ۷:۱۵۷)

(یہ وہ لوگ ہیں) جو اس رسول کی پیروی کرتے ہیں جو امی (لقب) نبی ہیں (یعنی دنیا میں کسی شخص سے پڑھے بغیر منجانب اللہ لوگوں کو اخبار غیب اور معاش و معاد کے علوم و معارف بتاتے ہیں) جن (کے اوصاف و کمالات) کو وہ لوگ اپنے پاس تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں‘ جو انہیں اچھی باتوں کا حکم دیتے ہیں اور بری باتوں سے منع فرماتے ہیں اور ان کے لئے پاکیزہ چیزوں کو حلال کرتے ہیں اور ان پر پلید چیزوں کو حرام کرتے ہیں اور ان سے ان کے بار گراں اور طوق (قیود) جو ان پر (نافرمانیوں کے باعث مسلط) تھے‘ ساقط فرماتے (اور انہیں نعمت آزادی سے بہریاب کرتے) ہیں۔ پس جو لوگ اس (برگزیدہ رسول) پر ایمان لائیں گے اور ان کی تعظیم و توقیر کریں گے اور ان کے (دین) کی مدد و نصرت کریں گے اور اس نور (قرآن) کی پیروی کریں گے جو ان کے ساتھ اتارا

گیا ہے وہی لوگ ہی فلاح پانے والے
ہیں۔

نبی مکرم ﷺ کے مددگاروں کو کامیاب و کامران قرار دیا جا رہا ہے۔ ان کے سینے پر کامیابی کا تمغہ سجانے کے بعد ان صاحبان فوز و فلاح کی دیگر خصوصیات بھی بیان کی جا رہی ہیں۔ یہ صاحبان ایمان بالرسول لوگ ہیں' ادب و تعظیم رسول میں فنا ہیں' قرآن کی اتباع کرتے ہیں اور قرآن کو صرف اس لئے مانتے ہیں کہ وہ حضور نبی اکرم ﷺ کی ذات مقدسہ پر نازل ہوا۔ کسی صاحب ایمان کے یہ اوصاف یقیناً دین و دنیا میں کامیابی و کامرانی کے ضامن ہیں اور انصار مدینہ خوش قسمت لوگ ہیں کہ انہیں قرآن میں حضور ﷺ کے مددگاروں کی حیثیت سے یاد کیا جا رہا ہے اور انہیں اہل ایمان کے لئے نمونہ بنا کر پیش کیا جا رہا ہے۔

انصار کی دوستی' ایمان اور نفاق کے مابین وجہ امتیاز

حضور رحمت عالم ﷺ کے مددگاروں کی دوستی لائق صد احترام اور باعث صد افتخار ہے۔ انصار کی دوستی اہل ایمان اور اہل نفاق کے مابین وجہ امتیاز ہے۔ ایمان والوں کی ایک نشانی یہ بھی ہے کہ وہ انصار رسول ﷺ کو اپنا دوست رکھتے ہیں اور ان کا ادب و احترام کرتے ہیں۔ اس کے برعکس جو لوگ سچے ایمان والے نہیں ان کا تیقن غبار تشکیک میں لپٹا رہتا ہے۔ ان کے سینوں میں نفاق کی آگ سلگ رہی ہوتی ہے۔ اس صورتحال میں منافقت کے خوگر لوگوں کی دیگر علامتوں کے ساتھ ایک علامت یہ بھی ہے کہ یہ بدبخت لوگ انصار رسول کے بارے میں دل میں تنگی محسوس کرتے ہیں۔ انصار رسول کا ادب واحترام ملحوظ خاطر نہیں رکھتے۔ یہ بدقسمت لوگ ان پاکباز اور وفا شعار افراد کے متعلق اپنے دلوں میں بغض و عناد رکھتے ہیں اور انصار رسول کی کھلی دشمنی پر اتر آتے ہیں' ان کی زبانیں ان نیکو کاروں کی بابت زہر اگلتی ہیں۔ ان پر بہتان باندھتے ہیں' ان کی شان میں گستاخی اور بے ادبی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے جن حضرات کی بابت اچھے ایمان اور سچے اعمال و

انکار کی گواہی دے کر انہیں اجر و ثواب کا حق دار ٹھہرایا ہے۔ انہیں انصار کے دوست اور انصار کو ان کے دوست قرار دیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ هَاجَرُوْا وَ جَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّ نَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ
(الانفال ۸:۷۲)

بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے (اللہ کے لئے) وطن چھوڑ دیئے اور اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور جن لوگوں نے (مہاجرین کو) جگہ دی اور (ان کی) مدد کی وہی لوگ ایک دوسرے کے وارث ہیں۔

آیہ کریمہ میں ایمان والوں کے دو طبقات کی نشاندہی کی گئی ہے۔ وہ لوگ جنہوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور وہ لوگ جنہوں نے اللہ کے آخری رسول ﷺ اور ان کے ساتھیوں کو پناہ دی ان کے مددگار ثابت ہوئے اور قدم قدم پر ان کی معاونت کی' ان دونوں جماعتوں کے دو دو عمل بیان کئے گئے ہیں جو اس طرح ہیں:

(الف) ایک گروہ نے مہاجر بن کر ہجرت کی' دوسرے گروہ نے ہجرت کرنے والوں کو پناہ دی' آباد کاری میں معاونت کی' کاروبار میں ان کو شریک کیا اور اپنی جائیدادوں میں انہیں حصہ دار بنایا۔

(ب) ایک گروہ نے جہاد کیا تو دوسرے گروہ نے ان کی بھرپور مدد کی اور ان کے ساتھ شریک جہاد بھی رہے۔

آخر میں فرمایا کہ دونوں گروہ ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس دوستی کی بنیاد کیا ہے۔ ایمان' ہجرت یا جہاد؟ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ لَمْ يُهَاجِرُوْا مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا
(الانفال ۸:۷۲)

اور جو لوگ ایمان لائے (مگر) انہوں نے (اللہ کے لئے) گھر بار نہ چھوڑے تو تمہیں ان کی دوستی سے کوئی سروکار

نہیں یہاں تک کہ وہ ہجرت کریں۔

قرآن نے اس سوال کا جواب کھول کھول کر بیان کر دیا کہ دوستی کی بنیاد کیا ہے۔ ایمان' ہجرت یا جہاد۔ قرآن کا فیصلہ ہے کہ دوستی کی بنیاد ہجرت ہے جبکہ ہجرت کو ابتداء زمانہ میں ایمان و نفاق کے مابین وجہ امتیاز قرار دیا گیا تھا۔ اب انصار کی دوستی کو ایمان اور نفاق میں وجہ امتیاز قرار دیا جارہا ہے اور فرمایا جارہا ہے کہ انصار کی دوستی کے حقدار وہی لوگ ہیں جن کا دامن منافقت کی سیاہی سے آلودہ نہیں ہوا۔ منافقین اور انصار کے مابین دوستی کا رشتہ قائم نہیں ہو سکتا۔ دوسری بات جو اس آیت سے معلوم ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ انصار مومنین ہیں' مجاہد ہیں اور جہاد میں برابر کے شریک ہیں اور یہ کہ انصار پناہ دینے والے اور اہل ایمان کی خبر گیری کرنے والے نیک صالح اور عمدہ اخلاق و کردار کے مالک ہیں' آیت مذکورہ سے یہ بات بھی ہمارے علم میں آئی کہ انصار اہل ایمان کی مدد کے لئے بے چین رہتے تھے ورنہ انہیں ہجرت تک کے لئے باقاعدہ روکا نہ جاتا کیونکہ اس کی حاجت نہ تھی۔

انصار سچے ایمان والے ہیں

انصار مدینہ چونکہ ہجرت مدینہ کا باعث تھے اور عقبہ اولیٰ اور ثانیہ میں اس عظیم ہجرت کی عظیم منصوبہ بندی کا ابتدائیہ مرتب ہوا تھا اور ہجرت مدینہ اسلامی تاریخ میں ایک عظیم روحانی' سیاسی' اقتصادی' علمی اور ثقافتی انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہوئی تھی چونکہ ہجرت نے جہاد کے دروازوں کو وا کیا تھا اور جہاد کے ذریعہ قوت نافذہ حاصل ہوئی اور اسی قوت نافذہ نے غلبہ دین حق کے لئے عالمگیر سطح پر ایک سازگار فضا تیار کی اس لئے ہجرت مدینہ میں رسول خدا ﷺ کے مددگار ثابت ہونے والوں کے فضائل کا احاطہ بھی ممکن نہیں۔ ان کی عظمت و رفعت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کی دوستی کو ایمان اور نفاق کے درمیان وجہ امتیاز قرار دیا گیا ہے۔ قرآن مجید کی درج بالا آیت کے بعد ایک آیت چھوڑ کر دوسری آیت مقدسہ میں ایک اور حقیقت بیان کی گئی ہے اور وہ یہ ہے کہ انصار نہایت سچے ایمان والے ہیں اور یہی حقیقی ایمان

والے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں مدد و نصرت کو ایمان اور نفاق کے درمیان وجہ امتیاز کہا جا رہا ہے جس طرح گذشتہ آیت میں انصار کی دوستی کو یہ مقام عطا کیا گیا تھا لیکن یہاں خود نصرت کو یعنہ انصار ہونے کی خصوصیت کو ایمان اور نفاق کے مابین وجہ امتیاز قرار دیا گیا ہے۔ عنوان بالا کے تحت اور گذشتہ دو مقامات پر کی جانے والی مباحث کے بعد تین ایسی خصوصیات سامنے آتی ہیں جو منافقین میں نہیں پائی جاسکتیں۔ یہ اوصاف حمیدہ صرف سچے ایمان والوں ہی میں ملتے ہیں۔ آقائے نامدار حضور رحمت عالم ﷺ کے عہد مبارک میں ایک وقت ایسا بھی گزرا ہے کہ کسی شخص میں بیک وقت بلا عذر اگر یہ تینوں اوصاف نہیں پائے جاتے تھے تو اسے منافق سمجھا جاتا تھا جبکہ ایمان کامل کے لئے مومنین میں حسب حال ان تینوں اوصاف کا پایا جانا ضروری تھا۔ وہ تین امتیازات ہیں۔ ہجرت، نصرت اور مہاجرین اور انصار کی محبت، ان تینوں میں سے پہلی دو شرطیں پائی جائیں تو آج بھی ایمان اور نفاق کے مابین وجہ امتیاز ہیں جبکہ تیسری شرط آج بھی اور قیامت تک کے لئے بھی ہمہ وقت ہر کسی کے لئے غیر مشروط طور پر منافقت یا ایمان کی پہچان کا ذریعہ ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

والذین اٰمنوا و ھاجروا وجاھدوا فی سبیل اللہ والذین اٰووا ونصروا اولٰئک ھم المؤمنون حقا ط لھم مغفرۃ و رزق کریمo
(الانفال، ۸:۷۴)

اور جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور جن لوگوں نے (راہ خدا میں گھر بار اور وطن قربان کر دینے والوں کو) جگہ دی اور (ان کی) مدد کی، وہی لوگ حقیقت میں سچے مسلمان ہیں۔ انہی کے لئے بخشش اور عزت کی روزی ہے

اس آیت کریمہ میں بھی اہل ایمان کے دونوں گروہوں کے وہی دو دو عمل بتائے گئے ہیں یعنی مہاجرین اور انصار کے اعمال ہجرت و جہاد اور پناہ دہندگی اور مدد و نصرت مذکور ہیں۔ آخر میں ان افراد یعنی دونوں گروہوں کے لئے تین چیزوں کا اعلان

فرمایا جا رہا ہے جن میں سے ایک مغفرت اور دوسری عمدہ رزق ہے جبکہ اولین ان تینوں میں سے یہ ہے کہ یہ لوگ سچے اور پکے ایمان والے ہیں اور ان کا ایمان ہر قسم کے شک و شبے سے بالاتر ہے۔

انصار: رضا و جنت کے حق دار

انصار وہ خوش نصیب گروہ پاکبازاں ہے جس کا ذکر جمیل خود قرآن پاک میں ہو رہا ہے۔ انصار مدینہ کا شمار خوش بخت لوگوں میں ہوتا ہے جنہیں اللہ رب العزت نے اسی دنیا میں اپنی ابدی رضا کے عطا کئے جانے کی خوشخبری سنا دی تھی بلکہ اس خوشخبری کے سنگ سنگ ان کامیاب و کامران لوگوں کو جنت کی بشارت بھی اسی دنیا کی ظاہری حیات میں دے دی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اللہ رب العزت نے انہیں کامیابی والے اور فوز و فلاح کے حامل افراد قرار دیا ہے۔ ان کے فضائل جلیلہ میں یہ بھی ہے کہ انہیں دیگر افراد امت کے لئے بہترین نمونہ بنا کر پیش کیا گیا اور انہیں پوری انسانیت کے لئے مقتدیٰ و پیشوا قرار دے کر ہمیں بھی یہ خوشخبری سنائی گئی کہ اگر ان کی راہ پر چلو گے' اگر ان کے نقوش پا سے اکتساب شعور کرو گے تو یہ امتیازات تمہیں بھی حاصل ہوں گے' کامیابی تمہارے مقدر میں بھی لکھی جائے گی۔ ارشاد خداوندی ہے:

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ وَ اَعَدَّلَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَاۤ اَبَدًا ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ

(التوبہ '۹:۱۰۰)

اور مہاجرین اور ان کے مددگار (انصار) میں سے سبقت لے جانے والے' سب سے پہلے ایمان لانے والے اور نیک کاموں میں ان کی پیروی کرنے والے' اللہ ان (سب) سے راضی ہو گیا اور وہ (سب) اس سے راضی ہو گئے اور اس نے ان کے لئے جنتیں تیار فرما رکھی ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں۔ وہ ان

میں ہمیشہ ہمیشہ رہنے والے ہیں۔ یہی
زبردست کامیابی ہے۔

آیت مقدسہ میں انصار کے فضائل بیان کئے گئے ہیں کہ اللہ جل شانہ ان سے راضی ہے وہ بھی اللہ رب العزت سے ہر حال میں راضی ہیں۔ کبھی کوئی حرف شکوہ حاشیہ خیال میں نہیں آیا۔ کبھی سوچ کے صحراؤں میں تشکیک کی آندھی نہیں اٹھی' ہوائے مخالف نے کبھی قصر ایمان کو متزلزل نہیں کیا' یہ خوشخبری سنائی جارہی ہے کہ اللہ نے ان کے لئے جنت تیار کر رکھی ہے جس میں وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رہیں گے اور ابدی زندگی پائیں گے۔ جنت کے باغات کے بارے میں ارشاد فرمایا جارہا ہے کہ ان کے نیچے نہریں رواں ہیں۔ بتایا جارہا ہے کہ یہ لوگ بڑی کامیابی والے ہیں انہیں کامل نمونہ بنایا گیا ہے یہی لوگ لائق تقلید اور قابل اتباع ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ اللہ رب العزت نے اپنے خاص فضل و کرم سے انہیں یہ خصوصیت بھی عطا فرمائی ہے کہ اگر کوئی عمل رسول کا نمونہ دیکھنا چاہے تو ان اصحاب رسول کو دیکھ لے اور ان کے اوصاف حمیدہ کو دیکھ کر اور ان کے نقوش پا کو شاہراہ حیات پر اپنے لئے مینارہ نور بنا کر اپنی زندگی آئینہ مصطفےٰ کے مطابق کرلے۔ آیت مذکورہ درج بالا وقتی خوشخبریوں تک محدود نہیں بلکہ رہتی دنیا تک جو شخص بھی ان کے راستے پر چلے گا اسے بھی یہ سب نعمتیں نصیب ہو جانے کی پیشگی خوشخبری دی جارہی ہے۔ یہ ایک ایسی صفت بلکہ خصوصیت ہے کہ جو کائنات ہست و بود میں انبیائے کرام کے بعد ان اصحاب رسول کو حاصل ہوئی اس کے بعد یہ خصوصیت کسی اور کو نصیب نہیں ہو سکی اور نہ یہ مرتبہ قیامت تک کسی اور انسان کو مل سکتا ہے۔

انصار مدینہ کے لئے رحمت ہی رحمت

اللہ رب العزت کی بے پایاں رحمت اس کائنات رنگ و بو کی ہر شئے پر محیط ہے۔ ابر کرم بنجر اور شاداب زمینوں پر یکساں برستا ہے لیکن خالق ارض و سما کی یہ

رحمت اہل ایمان پر خاص طور پر امڈ کر آتی ہے اور انہیں اپنے دامن میں چھپالیتی ہے' گنہگار اور نیکو کار کے مابین فرق ہے۔ پھر عام پرہیز گار اور کاملین میں فرق ہے۔ ان پرہیزگاروں' نیکوکاروں اور کاملین پر اللہ کی رحمت نازل ہوتی ہے لیکن مہاجرین اور انصار پر جو رحمتیں نازل ہوئیں وہ اس بھرپور انداز سے نازل ہوئیں کہ ان کے سوا کسی اور پر اس انداز سے ابر کرم ٹوٹ کر نہیں برسا کیونکہ جو رحمتیں کسی بڑے بڑے غوث پر ہوتی ہیں ادنیٰ سے ادنیٰ صحابی پر بھی اس سے کہیں زیادہ رحمتوں کا نزول ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ صحابہؓ پر رحمت حق معیت مصطفےٰ ﷺ کی بدولت تھی۔ اس سنگت کی بنا پر صحابہؓ پر نری رحمت نہیں بلکہ رحمت خاصہ تھی۔ یہ مہاجرین و انصار "**السابقون الاولون**" تو بالخصوص بے پایاں رحمتوں کے حقدار تھے' ان کی قربانی بھی نور علی نور تھی بالخصوص غزوہ تبوک کے موقع پر جب ایک ایک اونٹ دس دس مجاہدین کے حصہ میں آ رہا تھا۔ یہ حالات اتنے شدید تھے جن میں لامحالہ تکلیف ناقابل برداشت ہو جاتی ہے اور غزوہ تبوک میں ایسا ہوا بھی' بعض صحابہؓ نے تو یہ مشورہ بھی دے ڈالا کہ جنگ کو کسی اور وقت کے لئے ملتوی کر دینا چاہئے۔ ارشاد ربانی ہے۔

لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِیِّ وَ الْمُهٰجِرِیْنَ وَ الْاَنْصَارِ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُ فِیْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ یَزِیْغُ قُلُوْبُ فَرِیْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَیْهِمْ ؕ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ (التوبہ' ۹:۱۱۷)

یقیناً اللہ نے نبی (معظم) پر رحمت سے توجہ فرمائی اور ان مہاجرین اور انصار پر (بھی) جنہوں نے (غزوہ تبوک کی) مشکل گھڑی میں (بھی) آپ کی پیروی کی اس (صورتحال) کے بعد قریب تھا کہ ان میں سے ایک گروہ کے دل پھر جاتے' پھر وہ ان پر لطف و رحمت سے متوجہ ہوا۔ بے شک وہ ان سے نہایت شفیق نہایت مہربان ہے۔

اس آیت مقدسہ میں بتایا جا رہا ہے کہ انصار بھی اس گروہ میں شریک ہیں

جن پر اللہ جل شانہ ایک بار نہیں بار بار رحمتیں نازل فرماتا ہے۔ انہیں نگاہ التفات سے نوازتا ہے اور ان پر ایک سے زیادہ مرتبہ رحمت بھری توجہ فرماتا ہے۔ اس امر کا قرآن پاک میں اعلان فرمایا جا رہا ہے کہ اللہ کے ان نیکوکار بندوں کو رحمتوں پر رحمتیں نصیب ہوتی ہیں اور وہ خدائے بزرگ و برتر کے بے پایاں فضل و کرم سے نوازے جاتے ہیں۔

انصار پیکران ایثار و قربانی

حضور رحمت عالم ﷺ نے مدنی زندگی کو جن جدید اور ترقی پسندانہ خطوط پر استوار کیا اور مواخات مدینہ کے ذریعہ نوزائید اسلامی مملکت کی مرکزی ثقافتی، مجلسی، سیاسی اور اقتصادی فضا میں جس طرح اخوت و محبت کے چراغ روشن کر کے انسانی رشتوں کو ایک نئے زاویہ نگاہ سے دیکھنے کی بنیاد ڈالی اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تھوڑے ہی عرصہ میں اسلامی مملکت کو نہ صرف داخلی استحکام نصیب ہوا بلکہ سازشی ذہن بھی حالات کا رخ دیکھ کر اپنی منقار زیرِ پر رکھنے پر مجبور ہو گیا۔ وسوسہ انگیزی کی مہم کا اگرچہ مکمل طور پر خاتمہ تو نہ ہو سکا۔ منافقین مدینہ درپردہ اپنی سازشوں میں مصروف رہے لیکن وہ اعلانیہ اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے خلاف شرانگیزی سے بڑی حد تک باز آ گئے۔ محبت کی خوشبو نے ایمان والوں کے دلوں پر دستک دی اور دلوں کے بند کواڑ کھلتے چلے گئے اور چشم فلک نے روحانی، ذہنی، فکری اور دینی رشتوں کی مضبوطی کا مشاہدہ کیا، مہاجرین کو اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے اور فوری طور پر انہیں معاشی دباؤ سے آزاد کرنے کے بھی خوشگوار نتائج برآمد ہوئے۔ ان ہنگامی اور وقتی اقدامات سے مدینہ کے افق پر اقتصادی بدحالی کے چھائے ہوئے بادل رفتہ رفتہ چھٹنے لگے اور ایک نئی صبح کا جگمگاتا ہوا سورج حالات کی گرد کی دبیز تہہ سے جھانکنے لگا۔ انصار سچ مچ پیکران ایثار و قربانی تھے، ایثار و قربانی کا یہی جذبہ ریاست مدینہ کی بنیادوں کا بنیادی پتھر ثابت ہوا، انصار کے جس قدر بھی فضائل بیان کئے جائیں کم ہیں، اللہ کے ہاں انصار کے جذبہ ایثار و قربانی کا مقام کیا تھا۔ قرآن پاک میں وضاحت کے ساتھ اس کا بیان موجود ہے۔ قرآن پاک میں ان

اخلاق فاضلہ کا بیان بذات خود ایک بہت بڑا اعزاز ہے۔ مثلاً یہ کہ انصار محنت و ریاضت میں اپنی مثال آپ تھے۔ سخاوت ان کے خون میں رچ بس گئی تھی۔ بارگاہ نبوی سے براہ راست فیض یافتہ تھے۔ متقی پرہیزگار اور اللہ پر توکل اور بھروسہ رکھنے والے، دوسروں کی ضروریات کا خیال رکھنے والے اور ان پر اپنا مال قربان کرنے والے تھے۔ ہر نعمت جو انہیں ملتی اس میں دوسروں کو بھی شریک کرتے لیکن دوسروں کو ملنے والی نعمتوں پر نظر نہ رکھتے بلکہ دلی مسرت کا اظہار کرتے کہ ان کے کسی بھائی کو اللہ نے بے پناہ نعمتوں سے نوازا ہے۔ یہ صفات محض انسان کی شعوری کوششوں سے حاصل نہیں ہوتیں۔ یہ سب محض توفیق خداوندی سے ہوتا ہے۔ یہ آقائے دوجہاں ﷺ کی صحبت مقدسہ کا فیضان تھا جس نے اللہ کے اس قدر احسان و فضل کی انصار میں ارزانی فرمائی۔

ان میں ایسے اوصاف حمیدہ پیدا ہو گئے جنہوں نے ان کے ایمان ہی کی تکمیل نہ کی بلکہ ان کی شخصیت کی تعمیر اور کردار کی تشکیل میں بھی نمایاں کردار ادا کیا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَ الْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَ لَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّا اُوْتُوْا وَ يُؤْثِرُوْنَ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ وَ مَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ

(الحشر، ۵۹:۹)

اور (یہ مال) ان لوگوں کا (بھی حق ہے) جو (ہجرت والے) گھر (یعنی مدینہ) میں پہلے سے مقیم ہیں اور ایمان میں (ثابت قدم) ہیں۔ (یعنی) جو شخص ان کے پاس ہجرت کر کے آتا ہے اس سے محبت کرتے ہیں (اس کو اپنا سمجھتے ہیں) اور جو کچھ مہاجرین کو ملتا ہے اس سے ان کے دل میں کوئی خلش (رشک یا تنگی پیدا) نہیں ہوتی اور (یہی نہیں بلکہ وہ ان کو) اپنی ذات پر مقدم رکھتے ہیں (ان کی ضروریات کو ترجیح دیتے ہیں) اور اگرچہ

خود ان کو شدید ضرورت (ہی کیوں نہ)
ہو اور (ان کا یہ مجاہدہ نفس اللہ کے یہاں
پسندیدہ ہے۔ یہ اللہ کا ان پر بڑا فضل
ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ) جس کو (توفیق الٰہی
سے) اس کے نفس کی حرص سے محفوظ
رکھا گیا تو وہی لوگ مراد پانے والے
ہیں۔

آیت مقدسہ میں انصار کے فضائل پوری شرح و بسط کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ قرآن مجید گواہی دے رہا ہے کہ انصار مہاجرین کی آمد سے پہلے ہی شہر حضور ﷺ کے شہری ہیں۔ یہ لوگ پہلے ہی صاحبان ایمان ہیں' شہر نبی کے باسیوں کو مہاجرین سے محبت ہے۔ یہ صاحبان صدق و صفا ہیں اور مہاجرین کو ملنے والی نعمت اور بزرگی پر جلن محسوس نہیں کرتے اور نہ مہاجرین کو ملنے والی شئے کا لالچ کرتے ہیں' انصار کی ایک فضیلت یہ بیان کی جا رہی ہے کہ وہ مہاجرین اور دیگر اہل ایمان کو اپنی ذات پر ترجیح دیتے ہیں۔ یہ پیکران وفا ہیں اور کسی حوالے سے بھی بخل سے کام نہیں لیتے' مطلب ہے سخاوت میں بھی ان کا کوئی ثانی نہیں اور دل کھول کر سخاوت کرتے ہیں اور اللہ کی راہ میں اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔ یہ دوسروں کے لئے تنگی اور تکلیف برداشت کرتے ہیں لیکن انہیں (مہاجرین کو) تنگی یا تکلیف کا احساس نہیں ہونے دیتے۔ دوسروں کی بھوک اور پیاس مٹانے کے لئے خود بھوکے اور پیاسے رہتے ہیں۔ یہ وہ عظیم لوگ ہیں جن کے لئے دنیا و آخرت میں کامیابی ہی کامیابی ہے۔ یہ وہ پاکیزہ صفات ہیں جو کسی شخص کو معاشرے میں معتبر بناتی ہیں اور اسے خود اعتمادی کے جوہر سے آراستہ کرتی ہیں' اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جس ریاست کے شہری ان اوصاف کے مالک ہوں وہاں انسانی حقوق کے احترام کا کس حد تک خیال رکھا جاتا ہو گا اور شہری آزادیوں کا کیا عالم ہو گا' حضور ﷺ کی براہ راست تربیت کا نتیجہ تھا کہ اصحاب رسول میں یہ

اوصاف پیدا ہوئے۔ یہ محض اللہ کا احسان اور فضل اور فیضان نبوت تھا۔ تاریخ انگشت بدنداں ہے کہ اتنے تھوڑے عرصے میں تربیت یافتہ افراد کی یہ جماعت کیسے تیار ہو گئی کہ اس جماعت نے ایک ایسے انقلاب کی بنیاد رکھی' بظاہر جس کا تصور بھی عرب کے غیر منظم معاشرے میں نہ کیا جا سکتا تھا۔ جو کل تک خود غیر مہذب تھے ساری دنیا کی تہذیب اور ذہنوں کی تطہیر کا منصب انہوں نے سنبھالا اور اس شان سے سنبھالا کہ چار دانگ عالم میں پرچم توحید لہرانے لگا اور ملوکیت کی سیاہ رات کے بطن سے انسانی حقوق کا وہ سورج طلوع ہوا جسے اب حشر تک طلوع ہی رہنا ہے اور غروب کا لفظ جس کی لغت میں درج ہی نہیں کیا گیا۔ یہ سورج مصطفوی انقلاب کا سورج ہے جو ہماری کوتاہیوں' غفلتوں اور خامیوں کی گرد میں بظاہر نظروں سے اوجھل نظر آتا ہے اور جسے ایک بار پھر اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ امت مسلمہ کے افق دیدہ و دل پر چمکنا ہے۔

جب حضور ﷺ کے تربیت یافتہ افراد کے فضائل و خصائل کا شمار ممکن نہیں تو خود حضور ﷺ کے خصائل و فضائل کا عالم کیا ہو گا۔ وہ رسول محتشم ﷺ جنہوں نے اپنے اصحاب کی شخصیتوں کو روحانیت کا پیکر بنا دیا' وہ خود کن عظیم روحانی عظمتوں کے حامل ہوں گے اور وہ انقلاب کتنا عظیم انقلاب ہو گا جس کی شروعات اس قدر عظیم روحانی اقدار سے معمور تھیں۔ نسل انسانی کو آج بھی تشکیک کے غبار میں بھٹکنے کی بجائے اپنی دونوں ہتھیلیوں پر تیقن کے چراغ جلا کر حضور ﷺ کی دہلیز کو تھام کر غلامی رسول کے عہد نامے پر اپنے دستخط ثبت کرنا ہوں گے ورنہ امن عالم کا وہ خواب جو ہر دور اور ہر عہد میں مشاہیر نسل انسانی دیکھتے رہے ہیں اور مصلحین جس کے لئے ذہنی اور فکری تطہیر کا اہتمام کر کے قلب و نظر کے دریچوں میں حقوق انسانی کی پاسداری کے چراغ روشن کرتے رہے ہیں کبھی شرمندہ تعبیر نہ ہو گا۔ مصطفوی انقلاب کی پہلی اینٹ اخلاق حسنہ اور اعلیٰ کردار کی صورت میں رکھی گئی اور تصفیہ باطن سے آغاز کر کے ہجرت اور جہاد کے مقفل دروازوں کو اپنے عمل صالح کی کنجی سے کھولا گیا اور فتنہ و شر کے مراکز کو ختم کر کے نسل انسانی کو امن عالم کی عملی تصویر دکھا دی گئی آج بھی

مصطفوی انقلاب کو نسل انسانی کا مقدر بنائے بغیر عظمت کی ان بلندیوں کو چھوا نہیں جا سکتا جن کی بنا پر انسان کو مسجودِ ملائکہ ہونے کا اعزاز بخشا گیا تھا۔

باب ـ ۴

فضائل انصار

(احادیث کی روشنی میں)

انصار سے محبت۔۔۔ایمان کی علامت

آیات مقدسہ کی روشنی میں انصار کے فضائل میں ہم نے دیکھا کہ انصار کی دوستی کو ایمان اور نفاق کے مابین وجہ امتیاز قرار دیا گیا ہے۔ حدیث پاک میں بھی انصار کے فضائل و خصائل کی خوشبو جابجا بکھری ہوئی ہے۔ ان کے نقوش کف پا پر آج بھی چراغ روشن ہے اور گردش ماہ و سال ان چراغوں کی لوؤں پر قطعاً اثر انداز نہیں ہو سکی۔ یہ چراغ پوری آب و تاب کے ساتھ آج بھی منور و تاباں ہیں۔ کوئی اگر ان سے اکتساب نور نہیں کرنا چاہتا تو یہ اس کی بدبختی ورنہ نجات کا راستہ تو ہر وقت کھلا ہوا ہے۔ عشق و مستی کے دریچوں کے اگر کوئی پردے گرا لے تو اس کی عقل پر ماتم کرنے کے سوا اور کیا بھی کیا جا سکتا ہے۔ افسوس آج امت مسلمہ کا اجتماعی رویہ اس کی عقل پر صف ماتم بچھانے کے مترادفات سے ابلاغ پاتا ہے' انصار سے محبت کو ایمان کی علامت سے تعبیر کیا گیا ہے یعنی ایمان اور انصار کی محبت ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں' بالفاظ دیگر جس کے دل میں ایمان ہو گا اس کے دل میں انصار کی محبت بھی ہو گی اور جس کے دل میں انصار کی محبت ہو گی اس کا دعوائے ایمان بھی قابل قبول ہو گا۔ یہ بات ناممکنات میں سے ہے کہ کسی کے دل میں ایمان بھی ہو اور اسی لمحے وہ انصار رسول کے ساتھ بغض و کینہ بھی رکھے۔ اس طرح یہ بھی ممکن نہیں کہ کسی کے دل میں انصار سے محبت نہ ہو اور اس "صاحب ایمان" کا دل منافقت کی کالک سے خالی بھی قرار دیا جا سکے۔ یہ وہ اصول ہے جو ہمیں آقائے نامدار ﷺ نے تلقین فرمایا ہے۔ حضرت انس ؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔

ایۃ الایمان حب الانصار ایمان کی علامت انصار سے محبت ہے۔

(صحیح البخاری' کتاب الایمان
باب علامۃ الایمان حب الانصار' ۱۷:۲)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ہی مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔

آیۃ المومن حب الانصار مومن کی علامت انصار سے محبت ہے۔

(صحیح المسلم، کتاب الایمان، ۱:۵۹)

اسی طرح ایک اور روایت کے الفاظ ہیں۔

حب الانصار آیۃ الایمان انصار کی محبت ایمان کی نشانی ہے۔

(صحیح المسلم، کتاب الایمان، ۱:۶۰)

سنن نسائی میں بھی حضرت انس رضی اللہ عنہ کے حوالے سے یہ حدیث مبارکہ درج ہے۔

حضرت براء فرماتے ہیں کہ میں نے نبی اکرم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ

الانصار لا یحبھم الا مومن انصار سے کوئی محبت نہیں کرتا سوائے اہل ایمان کے۔

(صحیح البخاری، ۱:۵۳۴، کتاب المناقب)

ان احادیث پاک کے علاوہ بھی بہت ساری احادیث ایسی ہیں جن میں اس مضمون کو کم و بیش انہی الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ درج بالا احادیث کے مطالعہ کے بعد ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ایمان کی نشانی انصار کی محبت ہے یا انصار کی محبت ایمان کی نشانی ہے۔ یہ بھی ہے کہ انصار سے محبت کرتا ہی مومن ہے۔ کیونکہ انصار اپنے قول و عمل سے استحکام دین کے لئے کام کر رہا ہوتا ہے۔ اس کا کردار معاشرے میں خیر کی قوتوں کے ہاتھ مضبوط کرتا ہے۔ بھلا وہ لوگ جو اہل ایمان میں سے نہیں بلکہ اہل ایمان کے دشمن ہیں۔ مذکورہ کردار کے حامل افراد سے کیوں محبت کرنے لگے، وہ تو ایسے افراد معاشرہ سے شدید نفرت کریں گے کیونکہ ان باکردار لوگوں کی دین پر استقامت اور دین کے فروغ کے لئے عملی جدوجہد اس باطل نظام کے انہدام کا باعث بنتی ہے۔ وہ باطل نظام کفار و مشرکین صدیوں سے جس کا حصہ بنے ہوئے تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ کوئی ان کے جھوٹے خداؤں کی اصلیت کو بے نقاب کر کے ان کے فرسودہ نظام حیات کی قلعی کھولے۔ الغرض ایمان اور عدم ایمان (نفاق) کے مابین وجہ امتیاز اور بھی بہت کچھ ہے لیکن ان میں ایک نہایت اہم بات انصار سے قلبی و حبی تعلق بھی ہے۔ بلاشبہ انصار سے

محبت ایمان کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے اور اسلامی فلسفہ زندگی کے ایک اہم پہلو کی انتہائی معتبر تشریح و توجیہہ ہے۔

انصار کا بغض --- منافقت

وہ لوگ جنہوں نے اپنا تن من دھن سب کچھ اللہ کی راہ میں قربان کر دیا در حقیقت اسلامی نیو ورلڈ آرڈر کی ثقافتی روایات کے آئینہ دار تھے اور وہ تہذیبی شعور جس کی آبیاری قرطبہ اور بغداد کے مدرسوں اور خانقاہوں میں ہوئی اور آگے چل کر پوری دنیا جو تاریک ادوار میں سے گزر رہی تھی فکری اور علمی روشنی کے لئے ان مراکز پر کشکول تمنا لئے کھڑی نظر آتی ہے انہی کے نقوش قدم سے پھوٹا۔ اس لئے انصار سے بغض ان عظیم اسلامی روایات سے انحراف کی ایک صورت ہے۔ یہ بغض اور حسد منافقت کی واضح اور روشن نشانی ہے اور اسے پہچاننے میں اہل ایمان سے کبھی کوئی غلطی سرزد نہیں ہوئی۔ جس طرح صاحب ایمان ہونے کے لئے لازمی تھا اور ہے کہ سینے میں انصار رسول کی محبت اور دل میں ان کے لئے احترام کے جذبات موجزن ہوں اسی طرح انصار سے بغض و عناد' رقابت اور حسد رکھنے والوں کے لئے لازم ہے کہ انہیں منافق قرار دیا جائے تاکہ مسلمان ان کے ذہنی فتور سے محفوظ رہنے کے لئے ضروری اقدامات کر سکیں۔ یہ ممکن نہیں کہ ایمان اور انصار کا بغض دونوں باتیں ایک ہی سینے میں جمع ہوں۔ یہ اجتماع ضدین ہے جس کی عملی صورت ممکن ہی نہیں یعنی جس دل میں ایمان ہو گا اس دل میں انصار کا بغض نہیں ہو گا اور اگر کسی دل میں انصار کا بغض ہو تو اس دل میں ایمان کی روشنی نہیں ہو گی اور وہ تاریکیوں اور ظلمتوں کا مرکز ٹھہرایا جائے گا۔ جاہلیت کی ساری تاریکیاں اس مرکز پر جمع ہوں گی اور ایمان کا دور دور تک بھی کوئی نشان نہ ہو گا۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو روشن دن کی طرح واضح اور چمکدار ہے۔ سیدھی سی بات ہے جسے دین سے محبت ہو گی' اسلامی اقدار سے ذہنی وابستگی رکھتا ہو گا اسے دین سے محبت اور اس ذہنی وابستگی کو مستحکم بنانے والوں سے بھی محبت ہو گی۔ اگر

بدقسمتی سے ایسا نہ ہو دین کی مدد کرنے اور اس سے محبت کرنے والوں کی محبت دل میں نہ ہو تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ دین سے محبت طبیعت پر غالب نہیں بلکہ سرے سے اس کا کوئی وجود ہی نہیں۔ اسی طرح جس شخص کو رسول اکرم ﷺ سے محبت ہو گی تو اسے آقائے دوجہاں ﷺ کے جاں نثار غلاموں سے بھی محبت ہو گی پھر جن سے آقا ﷺ خود محبت کا اظہار فرمائیں' ایسے افراد سے محبت کرنا اور دل میں ان کے لئے احترام کے جذبات رکھنا تو مذہب محبت میں واجب ہے ورنہ مذہب و ایمان ہی سرے سے متصور نہیں ہو سکے گا۔ اس تصور کو سامنے رکھیں اور حضور رحمت عالم ﷺ کا قول پڑھیں کہ جسے انصار سے محبت نہیں وہ میری نظر میں منافق ہے تو ساری صورتحال واضح اور روشن ہو جاتی ہے۔ حدیث پاک میں ہے۔

و آیۃ النفاق بغض الانصار
(صحیح البخاری' ۱: ۵۳۴' کتاب المناقب)

اور منافقت کی نشانی انصار سے بغض رکھنا ہے۔

صحیح مسلم میں اس مفہوم کو ان الفاظ میں ادا کیا گیا ہے۔

آیۃ المنافق بغض الانصار
(صحیح المسلم' ۱: ۵۹' کتاب الایمان)

منافق کی نشانی (یہ ہے کہ اسے) انصار سے بغض (ہو گا۔)

ایک اور روایت میں ہے۔

و بغضھم آیۃ النفاق
(صحیح المسلم' ۱: ۶۰' کتاب الایمان)

ان کا بغض منافقت کی نشانی ہے۔

ایک اور روایت کے الفاظ اس طرح ہیں۔

و لا یبغضھم الا منافق
(صحیح البخاری: کتاب المناقب' باب حب الانصار من الایمان)
(صحیح المسلم' کتاب الایمان)
(جامع الترمذی' ابواب المناقب' باب

اور ان سے بغض نہیں رکھتا سوائے منافق کے

فضل الانصار و قریش)

صحیح بخاری، صحیح مسلم اور جامع ترمذی کی یہ روایت بھی تین طرح سے آئی ہے۔
۱۔ منافقت اور منافق کی علامت انصار سے بغض رکھنا ہے۔ منافقت کی علامات کے بیان میں منافقت کی ایک علامت کے طور پر انصار کے بغض کو بھی شامل کیا گیا ہے۔
۲۔ حدیث پاک میں بار بار آیا ہے کہ انصار سے بغض رکھنا منافقت کی نشانی ہے۔ اس میں انصار سے بغض کی مذمت کا بیان ہے اور اس کی ذم کی مقدار سطح کو بیان کرنے کے لئے فرمایا کہ یہ منافق کی نشانیوں میں سے ایک ہے۔
۳۔ فرمایا کہ انصار مدینہ سے منافق کے سوا کوئی دوسرا بغض رکھ ہی نہیں سکتا۔ اس میں انصار کے بغض کو خالص نفاق والوں (منافقین) کا شعار قرار دیا گیا ہے یعنی انصار کا بغض اس قدر ذہنی پراگندگی اور فکری کثافت کا باعث ہے کہ یہ ہے ہی خالص منافقین کا طرز عمل، ورنہ یہ اہل ایمان کا ہرگز ہرگز طریق نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنے سینوں میں انصار کے بارے میں بغض، حسد اور رقابت کے جذبات پالتے پھریں۔ آقائے کائنات ﷺ نے ارشاد فرمایا

و بغض الانصار آیۃ النفاق اور انصار کا بغض منافقت کی نشانی ہے۔

(سنن النسائی، کتاب الایمان، باب علامہ الایمان)

انصار کی محبت اللہ کی محبت

یہ قانون فطرت ہے کہ کسی کی محبوب چیز سے آپ محبت کریں گے تو اس چیز کو محبوب رکھنے والا آپ سے بھی محبت کرنے لگے گا۔ اصل بات یہ ہے کہ جس شئے سے اللہ کو محبت ہو اللہ ہمیں بھی اس شئے سے محبت کی تعلیم دیتا ہے۔ اگر اس شئے سے بندہ محبت کرے تو اللہ کو اپنے بندے کے اس عمل سے محبت ہو جاتی ہے اور جس کام سے

اللہ منع فرمائے اس عمل سے اجتناب کرنے اور حکم خداوندی بجا لانے ہی سے اللہ کی رضا اور خوشنودی حاصل ہو سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ کے حلال کو حلال اور اس کے حرام کو حرام رکھنے سے ہی اللہ راضی ہوتا ہے جبکہ اس کے حلال کو حرام اور حرام کو حلال قرار دینے سے وہ ناراض ہوتا ہے۔ جب اشیاء کے ساتھ یہ معاملہ ہے وہ اشیاء جو بے جان ہیں تو انسانوں کا معاملہ کیا ہو گا جو ہمہ وقت اپنے رب کو راضی کرنے کے لئے احساس بندگی کو زندہ و سلامت رکھتے ہیں اور ہر لمحہ قرب الٰہی کے حصول کے لئے کوشاں رہتے ہیں یقیناً ایسے پرہیزگار اور متقی بندوں کا درجہ بہت بلند ہوتا ہے۔ حدیث قدسی میں ہے۔

من عادی لی ولیا فقد اذنته بالحرب
(صحیح البخاری، کتاب الرقائق)

جس نے میرے کسی ولی سے دشمنی کی میں نے اس کے ساتھ جنگ کا اعلان کر دیا۔

یعنی اللہ کے ولی سے نفرت کرنا اس کی کردار کشی کے لئے سازشوں کا جال بچھانا اور اس پر بہتان باندھنا اللہ کے غیظ و غضب کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ یہ معاملہ تو عام ولیوں کا ہے۔ اصحاب رسول اور انصار مصطفیٰ کا تو معاملہ ہی جداگانہ ہے۔ ارشاد نبوی ہے۔

فمن احبهم احبه الله ومن ابغضهم ابغضه الله
(صحیح البخاری، کتاب المناقب، باب حب الانصار من الایمان)

سو جس نے (انصار سے) محبت کی اللہ نے ان سے محبت کی اور جس نے ان سے بغض رکھا اللہ نے اس سے بغض رکھا۔

گویا انصار کے بارے میں دل میں ذرا سی بھی تنگی محسوس ہو یا ان کے ادب و احترام میں کوتاہی آئے تو ایسا کرنے والا بدبخت اللہ کے غضب کا نشانہ بنے گا، اللہ کی بارگاہ سے بغض کا شکار ہو گا، مردود ہو کر راندہ درگاہ ہو جائے گا۔ اگر بندہ اللہ کا محبوب اور اس کے قرب کا آرزومند ہے تو لازم ہے کہ وہ انصار رسول کی محبت کو اپنا شعار

بنائے اور ادب و احترام انصار کو اپنے دل میں جگہ دے کہ محبوب خدا ﷺ کے ساتھیوں کی محبت بھی انسان کو محبت الٰہی کا حقدار ٹھہراتی ہے۔

انصار سے بغض اور ایمان کا اجتماع ناممکن

بندگان خدا ازل سے رضائے الٰہی کے طلبگار رہے ہیں۔ اپنے خالق و مالک کی خوشنودی کا حصول ہی ان کے قول و عمل کا محور قرار پایا ہے۔ جب اللہ اپنے محبوب ﷺ کے رفقائے کار کی محبت کو اپنی محبت سے مشروط کرتا ہے تو کون ہو گا جو ان مقرب بندوں کی محبت کے ذریعے رضائے الٰہی کے حصول کا آرزومند نہیں ہو گا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (الذاریات' ۵۱:۵۶)

اور ہم نے جنوں اور انسانوں کو پیدا ہی عبادت کے لئے کیا ہے۔

اللہ کی معرفت اس کی رضا تک پہنچنے کا وسیلہ ہے بلکہ مضبوط ترین وسیلہ ہے۔ وہ اپنی رضا کے لئے اصحاب رسول سے محبت کی تعلیم دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھنے والا انصار مصطفےٰ سے بغض نہیں رکھ سکتا بلکہ انصار رسول کے بارے میں اس کے ذہن اور دل میں کشادگی ہو گی' احترام ہو گا اور اس کے سینے میں جاں نثاران رسول کی محبت کا سمندر موجزن ہو گا۔

مختصر یہ کہ انسانی تخلیق کا مقصد اولین اللہ کو راضی کرنا ہے۔ جو شخص اللہ پر ایمان لائے گا وہ اللہ کی رضا کے حصول کے لئے بھی کوشاں رہے گا اور ان اعمال سے اجتناب کرے گا جن سے اللہ کی ناراضی مول لینے کا خطرہ ہو۔ مطلب یہ ہے کہ پیکران تسلیم و رضا انصار سے بغض نہیں رکھ سکتے کیونکہ یہ عمل ہرگز ہرگز اللہ کی بارگاہ میں پسندیدہ عمل نہیں بلکہ اس کے حکم کی سراسر خلاف ورزی ہے اور حکم خداوندی سے انکار کرنے والے کا ٹھکانہ جہنم ہے۔ آخرت پر ایمان رکھنے والا شخص یقیناً اپنا اچھا انجام چاہے گا اور اپنے لئے بہتر ٹھکانہ پسند کرے گا۔ وہ اپنی آخرت برباد کرنے کا سوچ بھی

نہیں سکتا۔ وہ جانتا ہے کہ اصل زندگی آخرت کی زندگی ہے اور اس دنیا کے آلام و مصائب عارضی ہیں۔ آخرت کی زندگی ہمیشہ کی زندگی ہے۔ لہٰذا اس کے ایمان کا تقاضا ہو گا کہ وہ اس زندگی میں احکام شریعت کی پابندی کرے اور موت کے بعد شروع ہونے والے سفر کے لئے زاد راہ کا اہتمام کرے اور اپنے توشہ آخرت کے لئے نیک اعمال کا اجر دونوں ہاتھوں سے سمیٹ لے کہ یہ اجر وثواب اس کی اخروی زندگی میں راحت و آرام کا وسیلہ بن سکے۔ وہ ہر قدم پر دوسروں کے حقوق کی پاسداری کرتا دکھائی دیتا ہے۔ خدمت خلق کا جذبہ اس کے لہو کے ساتھ گردش کرتا ہے۔ خشیت الٰہی سے وہ ہر لحہ لرزہ براندام رہتا ہے۔ وہ اعمال صالحہ سے محبت کرتا ہے اور اعمال قبیحہ سے بغض رکھتا ہے کہ یہی فطری رویہ آسمانی ہدایت کا آئینہ ہے اور سفر آخرت میں اس کی کامیابی کا ضامن ہے وہ شخص ایسے افراد کا قرب حاصل کرتا ہے' اللہ کے جن برگزیدہ بندوں پر انعام کیا گیا ہے نہ کہ ان کا راستہ اختیار کرتا ہے جن پر اس کا غضب ہوا اور وہ مغضوب ٹھہرے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ اہل تقویٰ کون ہیں جن کی سنگت نیک اعمال کا پیش خیمہ بن کر نجات اخروی کا باعث بنتی ہے۔ ارشاد خداوندی ہے۔

اَلْاَخِلَّآءُ یَوْمَئِذٍ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِیْنَ
(الزخرف' ۴۳: ۶۷)

سب ہی (دنیاوی) دوست اس دن ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے سوائے پرہیزگاروں کے (کہ ان کی باہمی محبت اس دن بھی قائم رہے گی۔)

یہ دنیا مفاد پرستوں کی دنیا ہے۔ دوستی اور دشمنی کا معیار عشق الٰہی اور حب رسول نہیں بلکہ حب دنیا ہے۔ ہم اپنے مفادات کی خاطر دوستی کا ڈھونگ رچاتے ہیں۔ خود بھی دھوکے میں رہتے ہیں اور دوسروں کو بھی دھوکہ دیتے ہیں۔ اس دنیا میں اس شخص کو اتنا ہی "کامیاب" تصور کیا جاتا ہے جو دوسروں کو جس قدر بے وقوف بنا سکے لیکن شریعت محمدی میں لالچ اور حرص پر مبنی اس تصور کو یکسر مسترد کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ اس دنیا کے دوست قیامت کے روز ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے سوائے

ان متقی اور پرہیزگار اور خدا کے فرمانبردار بندوں کے جن کی دوستی خوف خدا کے حوالے سے ہوگی اور جن کی فکری اور نظریاتی رہنمائی میں بندگان خدا نیک اور صالح اعمال کی طرف راغب ہوں گے۔ قیامت کے روز اللہ کے ایسے ہی مقرب بندوں کی سنگت کام آئے گی۔ یہ حال تو عام اہل تقویٰ کا ہے۔ پھر وہ انصار رسول جو خاصہ خاصان ہیں ان کی سنگت کا عالم کیا ہوگا۔ ان کی محبت کیا رنگ لائے گی۔ حدیث پاک میں ہے۔

المرء مع من احب
(جامع الترمذی، ۲: ۶۱)

کہ ہر شخص (قیامت میں) اس کے ساتھ (اٹھایا جائے گا) جس کے ساتھ اس کو محبت ہوگی (وہ محبت کرے گا)

عموماً کہا جاتا ہے کہ کوئی شخص اپنے احباب سے پہچانا جاتا ہے۔ اس کے دوست کیسے ہیں۔ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکامات کی پیروی کرتا ہے یا اس کا اٹھنا بیٹھنا اخلاق باختہ لوگوں کے ساتھ ہے جن کے دل میں نہ خوف خدا ہے اور نہ انہیں پیغمبر ﷺ کی شرم ہے۔ واضح طور پر انتباہ کیا جا رہا ہے کہ اگر اس دنیا میں برے لوگوں کی سنگت اختیار کرو گے تو حشر کے دن بھی انہی لوگوں کے ساتھ اٹھائے جاؤ گے جن کا نامہ اعمال ان کے بائیں ہاتھ میں ہوگا اور اگر اس دنیا میں اللہ کے نیک بندوں کی صحبت میں رہ کر نیک اعمال کرو گے تو حشر کے دن بھی اللہ کے انہی برگزیدہ بندوں کی معیت میں اٹھائے جاؤ گے اس ساری بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انصار رسول جیسی عظیم ہستیوں سے صاحبان ایمان کبھی بغض و کینہ نہیں رکھ سکتے بلکہ ان کے نقوش پا سے اکتساب شعور کر کے اپنی آخرت کا منظر نامہ روشنیوں سے تحریر کرنے کی سعی کرتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ حضور ﷺ کے ارشاد گرامی کا مفہوم کیا ہے۔ انہیں معلوم ہے کہ اگر ہم انصار رسول سے محبت کریں گے تو حشر کے دن ہمیں ان کی رفاقت نصیب ہوگی۔ حدیث پاک میں ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

لایبغض الانصار رجل یومن باللہ

کوئی بھی شخص جو اللہ اور آخرت پر

والیوم الاخر (صحیح المسلم، کتاب الایمان)	ایمان رکھتا ہو وہ (میرے) انصار سے بغض و عناد (نفرت و کدورت) نہیں رکھ سکتا۔

گویا آخرت میں کامیابی کا انحصار اسی بات پر بھی ہے کہ آخرت اور اللہ پر ایمان رکھنے والا شخص انصار سے بغض و عناد نہ رکھتا ہو بلکہ اس کے دل میں انصار کی محبت کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہو اور وہ جاں نثاران مصطفےٰ کی الفت کے چراغ اپنے سینے میں روشن رکھتا ہو۔ سو جس کے دل میں (معاذ اللہ) انصار سے بغض اور نفرت پائی جائے اس کا ایمان اللہ اور آخرت پر ہرگز ہرگز مضبوط اور کامل نہیں اور ایسے لوگوں کا ٹھکانہ یقیناً نجات اخروی حاصل کرنے والے نیکوکاروں کے ساتھ نہیں ہو گا۔ ان موضوعات کو تخریج مسند امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ میں دیکھنا ہو تو کم از کم درج ذیل مقامات میں سے ضرور گزرنا چاہئے۔

ج۔۱: ص ۳۰۹، / ج ۲: ص ۴۱۹، ۵۰۱، ۵۲۷،

ج۔۳: ص ۳۴، ۴۵، ۷۰، ۹۳، ۱۳۰، ۱۳۴، ۲۴۹،

ج۔۴: ص ۷۰، ۱۰۰، ۲۲۱، ۲۳۸، ۲۹۲ / ج ۵: ص ۲۸۵، ۳۸۱، / ج ۶: ص ۷، ۳۸۲

انصار --- محبوبانِ محبوبِ خدا

انصار بلاشبہ محبوبان محبوب خدا تھے۔ تاجدار کائنات ﷺ اپنے انصار سے بے حد محبت فرماتے ان کی دلجوئی کا ہر لحہ اہتمام کرتے۔ اللہ کے رسول ﷺ کو روئے زمین پر جو لوگ سب سے زیادہ محبوب تھے وہ انہی انصار کے قبائل تھے۔ ان میں چھوٹے بڑے مرد و زن سبھی شامل تھے۔ انصار بنی آدم میں سب سے زیادہ حضور ﷺ کی محبت کے حقدار ٹھہرے۔ وہ لوگ جو اللہ کے رسول ﷺ کی محبت کا مرکز و محور ہوں ان کی عظمت کا اندازہ کون کر سکتا ہے۔ حضرت انسؓ روایت فرماتے ہیں۔

رای النبی ﷺ النساء والصبیان مقبلین قال حسبت انہ قال من عرس	آقائے نامدار ﷺ نے کچھ بچوں اور عورتوں کو شادی میں شرکت کے بعد

فقام النبی ﷺ ممثلا فقال اللھم انتم من احب الناس الی قالھا ثلاث مرار
(صحیح البخاری '۱: ۵۳۴ 'کتاب المناقب)

واپس آتے ہوئے دیکھا تو خوشی کے ساتھ ان کا استقبال فرماتے ہوئے اکراماً قیام فرما ہوئے اور فرمایا "یقیناً تم (دنیا بھر کے) انسانوں میں میرے لئے محبوب ترین لوگ ہو (یعنی مجھے تم سے سب سے زیادہ محبت ہے) آپ ﷺ نے یہ بات تین مرتبہ ارشاد فرمائی۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ ہی سے ایک دوسری حدیث بھی مروی ہے۔

جاء ت امراۃ من الانصار الی رسول ﷺ و معھا صبی لھا فکلمھا رسول اللہ ﷺ فقال: والذی نفسی بیدہ انکم احب الناس الی مرتین
(صحیح البخاری '۱: ۵۳۴ 'کتاب المناقب)

انصار کی ایک عورت رسول خدا ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئی جبکہ اس کے ساتھ اس کا بچہ (بھی) تھا تو رسول خدا ﷺ نے اس سے گفتگو فرمائی تو ارشاد فرمایا "قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے تم بلاشبہ میرے نزدیک تمام بنی آدم میں محبوب ترین ہو۔ (آپ ﷺ نے یہ بات) دو مرتبہ (ارشاد فرمائی۔)

احادیث مذکورہ کی روشنی میں ہم نے دیکھا کہ حضور رحمت عالم ﷺ انصار مدینہ سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ آقائے دوجہاں ﷺ کہیں دو مرتبہ اور کہیں تین مرتبہ ایک ہی بات کو زور دے کر دہرا رہے ہیں اور قسم کھا رہے ہیں اپنے پروردگار کی۔ **اللھم** کا لفظ ارشاد فرما کر بات پر زور دیا جا رہا ہے' تاکیدی کلمات لا کر اپنی امت کو انصار مدینہ سے محبت کی تعلیم دی جا رہی ہے۔ کون بدبخت امتی ہو گا جو ان لوگوں سے بغض و کینہ رکھے جو حضور ﷺ کو روئے زمین پر بسنے والے انسانوں میں سب سے

زیادہ محبوب ہوں۔ احادیث مبارکہ سے انصار کی سماجی اور مجلسی اہمیت پر بھی زور دیا جا رہا ہے اور ان کی عظمت و رفعت کو اجاگر کیا جا رہا ہے کہ اے میرے امتیو! ان چمکتے دمکتے ستاروں کو تم بھی اپنی آنکھوں کا تارا بنالو۔ اگر مجھ سے محبت کا دم بھرتے ہو تو ان سے محبت کرو۔ انہیں ادب و احترام دو جو مجھے نسل آدم میں سب سے زیادہ عزیز ہیں۔

فضیلت انصار پر ایک دلیل

غیر مشروط اور غیر متزلزل خودسپردگی (Commitment) ہی کسی نظریے کی مضبوطی کی عملی توجیہہ پیش کرتی ہے۔ انصار مدینہ ابتلاء و آزمائش کے ہر مرحلے پر ثابت قدم رہے۔ انہوں نے نبی آخر الزماں ﷺ اور ان کے ساتھیوں کو اس وقت اپنی بانہوں کے حصار میں لے لیا جب اہل مکہ اہل حق کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے۔ سرزمین مکہ اہل ایمان پر تنگ ہو رہی تھی۔ طائف کی وادی سے پتھر برس رہے تھے اور مکہ کی مٹی نفرت کا لاوا اگل رہی تھی۔ اس وقت مدینۃ النبی ﷺ میں محبت کا بیکراں سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ ایثار و قربانی کی لازوال مثالیں قائم کی جا رہی تھیں۔ انصار کے سر پر دستار فضیلت سجائی گئی۔ انہیں والیٔ کون و مکاں ﷺ کی لامحدود محبت عطا ہوئی۔ آقائے کائنات ﷺ کی حدیث مبارکہ ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ارشاد فرماتے ہیں:۔

لو ان الانصار سلکوا وادیا او شعبا ــــــــ لسلکت فی وادی الانصار ولو لا الھجرۃ لکنت امرءًا من الانصار	اگر انصار کسی وادی یا گھاٹی میں چلیں تو میں انصار کی وادی میں چلوں گا اور اگر ہجرت (مقدر من اللہ) نہ ہوتی تو میں انصار میں سے ایک فرد ہوتا۔

(صحیح البخاری، ۱: ۵۳۲، کتاب المناقب)

حضور رحمت عالم ﷺ نے انصار سے اپنی محبت کا اظہار فرماتے ہوئے ان کی فضیلت کا بھی تذکرہ فرمایا ہے۔ ارشاد گرامی ہے:۔

۱۔ یہ کہ "اگر انصار کسی وادی سے گزریں گے تو میں اس انصار والی وادی ہی میں چلنا

پسند کروں گا۔" ایک ایک حرف سے انصار کے لئے محبت کا سرچشمہ پھوٹ رہا ہے۔ گویا فرمایا جا رہا ہے میرا جینا مرنا سب انصار کے ساتھ ہو گا۔ ان الفاظ سے کمال شیفتگی اور محبت کا اظہار ہو رہا ہے۔ محبت اور بے تکلفی کا انتہائی حسین امتزاج پیش کیا جا رہا ہے۔ بلاغت کا سارا حسن، قربت کی ساری روشنی اور اپنائیت کی ساری دلکشی ان الفاظ میں سمٹ آئی ہے۔

۲۔ یہ کہ "اگر ہجرت مقدر من اللہ نہ ہوتی تو میں انصار ہی میں سے ایک فرد ہوتا۔" حضور ﷺ کے ان الفاظ پر جوں جوں غور کریں مفہوم کی نئی نئی پرتیں کھلتی جاتی ہیں۔ معلوم ہوا کہ فکری اور روحانی رشتے خونی اور نسلی رشتوں کو بہت پیچھے چھوڑ جاتے ہیں اور آخر کار فتح نظریے کی ہوتی ہے اور فتح ان باہمت انسانوں کا مقدر بنتی ہے جو اپنے نصب العین کی سچائی پر یقین کامل رکھتے ہیں۔ حضور ﷺ کا ارشاد گرامی انصار کی عظمت میں چار چاند لگا رہا ہے۔ حضور ﷺ خود قریش میں سے تھے۔ ایک طرح سے خود کو انصار میں سے شامل کرنا پسند فرما رہے ہیں۔ ارشاد نبوی سے تحریک اسلامی کے مرحلہ ہجرت کی اہمیت پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہجرت مصطفوی انقلاب کا ایک ایسا دروازہ تھی اور ہے جس سے گزر کر اسلام ہر شعبہ زندگی میں انقلابی تبدیلیوں کا باعث بنا اور چار دانگ عالم میں ایک نئے عالمی نظام کا نفاذ عمل میں آیا۔

ہجرت مقدر من اللہ

پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے کہ ہجرت تحریک اسلامی کی مرحلہ وار منصوبہ بندی کا ایک حصہ تھی۔ مستشرقین نے ہجرت کو بھی اپنے مخالفانہ پروپیگنڈے میں بطور ایک ہتھیار استعمال کیا ہے۔ اسے مکے سے فرار کہہ کر انہوں نے اپنے تعصب کا اظہار کر کے علمی دیانت کا دامن تار تار کیا ہے۔ ہجرت، مکہ میں کسی ناکامی کا نتیجہ نہیں تھی بلکہ اسلامی تحریک کی پیش رفت کے لئے ضروری تھا کہ عملی اور انقلابی جدوجہد کو مزید نتیجہ خیز بنانے اور وسائل کے ضیاع سے بچنے کے لئے نئی حکمت عملی اختیار کی جائے اور محدود وسائل میں رہتے ہوئے بہتر اور مثبت نتائج حاصل کئے جائیں۔ نگاہ نبوت دیکھ رہی تھی

کہ مسلمان پرچم توحید لے کر پوری دنیا میں پھیل جائیں گے۔ عالمی سطح پر تحریک اسلامی کے فروغ کے امکانات کو تحریک اسلامی کی عظیم قیادت نے کسی مرحلے پر بھی اپنی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیا اور ایسی بیدار مغز قیادت کا خاصہ ہے کہ وہ بہتر منصوبہ بندی کر کے اپنے اہداف کے حصول کو آسان بناتی ہے اور یہی کارنامہ تحریک اسلامی کی قیادت نے سرانجام دیا۔ ہجرت مدینہ مقدر من اللہ تھی۔ یہ اسلامی قیادت کا کوئی اضطراری فیصلہ نہیں تھا۔

تمکنِ دینی انصار کی بدولت

تاریخ بتاتی ہے کہ تمکنِ دین انصار ہی کی بدولت حاصل ہوا۔ یہی وجہ تھی کہ حضور ﷺ غزوہ بدر میں انصار کو ساتھ لے کر چلنا چاہ رہے تھے تاکہ کفار و مشرکین کی جڑ کاٹ دینے کے عمل میں شریک رہیں۔ ہم نے دیکھا اگر ہجرت مقدر من اللہ نہ ہوتی تو حضور ﷺ انصار ہی میں پیدا ہوتے اور انصار ہی میں دعوت دینی کا آغاز فرماتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ یہیں پر تمکن دینی کا آغاز ہوتا۔ معلوم ہوا کہ تمکن دینی کا اصل اولین اور مضبوط ترین وسیلہ انصار ٹھہرے۔ اب چونکہ حضور ﷺ مکہ میں تھے اور مکہ ہی میں آپ نے مرحلہ دعوت اور مرحلہ تربیت کا آغاز فرمادیا تھا للہذا ہجرت کے ذریعہ تمکن دینی انصار ہی میں آکر ہوا۔ اس اعتبار سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ تمکن دینی کا بنیادی وسیلہ انصار ہی تھے اور اس جدوجہد کا مقام پہلے ہی سے مدینہ منورہ مقرر ہو چکا تھا۔

انصار کی غلطیوں سے درگزر کا حکم

حضور ﷺ انصار پر خصوصی شفقت فرماتے ہر مرحلے پر ان کی دلجوئی کرتے، ان کو تکلیف میں دیکھ کر آزردہ ہو جاتے، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ آقائے دوجہاں ﷺ نے انصار مدینہ سے ہر حال میں نرمی اور انکی عزت افزائی کا حکم ارشاد فرمایا۔ ارشاد نبوی ہے کہ اگر انصار کی طرف سے اچھائی آئے تو بہت خوب، اسے قدر کی نگاہ سے دیکھنا چاہیے۔ اس کے برعکس اگر ان سے کوئی خطا سرزد ہو

جائے تو اس سے صرف نظر کرنے کا حکم ہے' درگزر سے کام لینے کی ہدایت ہے۔
حضرت انس بن مالکؓ روایت فرماتے ہیں کہ آقائے نامدار ﷺ نے ارشاد فرمایا۔

الانصار کرشی وعیبتی والناس سیکثرون ویقلون فاقبلوا من محسنھم و تجاوزوا عن مسیئھم
(صحیح البخاری' ۱:۵۳۶' کتاب المناقب)

انصار میرے قسیم فیض اور میرے ساز وسامان (زاد سفر) ہیں لوگ زیادہ ہو جائیں گے اور انصار کم ہو جائیں گے۔ پس ان میں اچھے عمل کرنے والوں (احسان کرنے والوں) سے قبول کرو اور برا عمل (خطا) کرنے والوں سے تجاوز (صرف نظر) کرو۔

فاقبلوا من محسنھم' محسن احسان کرنے والے کو بھی کہتے ہیں' اچھا سلوک کرنے کے معنوں میں بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے' اسی طرح دین اور اللہ کے ساتھ اخلاص وللہیت کرنے والوں کو بھی کہتے ہیں کہ وہ صاحبان احسان ہیں اس اعتبار سے محسنین وہ لوگ ہوئے جو اچھے اخلاق کے حامل ہوں دوسروں کے ساتھ حسن سلوک کا مظاہرہ کریں ان نیکی کرنے والوں کی طرف سے کئے گئے عمل کو قبول کرنے کا حکم ہے اس سے ان کی قدر افزائی کا پہلو نکلتا ہے۔

تجاوزوا عن مسیئھم یعنی ان کے برے اعمال سے درگزر کرو' اسی طرح لفظ سیئہ (بدی) برائی کے معنی میں آتا ہے اس سے مراد وہ اعمال ہیں جن سے بداخلاقی اور غصے کا اظہار ہوتا ہو' دوسرے لفظوں میں اس سے مراد خطاکار لوگ ہیں جن سے غلطی کا ارتکاب ہوگیا ہو' حکم ہے کہ ان کی غلطیوں سے بھی صرف نظر کرو۔

انصار کا احقاق حق

انصار اصحاب رسول کا وہ مقدس گروہ ہے جس نے راہ حق میں اپنا حق ادا کرکے دستار فضیلت کا اپنے آپ کو حق دار ٹھہرالیا' جس نے اللہ کی جانب سے عائد کردہ فرائض کو پوری دیانت داری اور جانفشانی سے ادا کرکے اللہ اور اسکے رسول

ﷺ کی طرف سے عائد کردہ ذمہ داری کی ادائیگی میں ذرا سی بھی کوتاہی کا ارتکاب نہیں کیا' حضور ﷺ کا یہ ارشاد گرامی کہ انصار نے اپنا حق ادا کر دیا ایک بہت بڑا اعزاز ہے بارگاہ نبوی سے جاری ہونے والی ایک ایسی سند ہے جس کے بعد کسی دوسری سند کی ضرورت ہی نہیں رہتی' یہی حوالہ سب سے بڑا حوالہ ہے' حضور نبی اکرم ﷺ کی حیات ظاہری کے آخری ایام میں جب آپ چند روز تک مجالس اصحاب میں جلوہ افروز نہ ہو سکے تو ہجر رسول نے یارانِ مصطفےٰ کو رلا دیا۔ حضور ﷺ کی سنگت کے تصور نے انہیں بے چین کر دیا' اور جذباتِ محبت اصحابِ رسول کی آنکھوں سے اشک بن کر ٹپکنے لگے۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں :۔

مر ابو بکر والعباس بمجلس من مجالس الانصار وهم يبكون فقال ما يبكيكم؟ قالوا ذكرنا مجلس النبي ﷺ منا فدخل على النبي ﷺ فاخبره بذالک قال فخرج النبي ﷺ وقد عصب على راسه حاشية برد قال فصعد المنبر ولم يصعده بعد ذالک اليوم فحمد الله واثنى عليه ثم قال اوصيكم بالانصار فانهم كرشي وعيبتي وقد قضوا الذي عليهم وبقي الذي لهم فاقبلوا من محسنهم وتجاوزوا عن مسيئهم

(صحیح البخاری' ۱:۵۳۶' کتاب المناقب)

حضرت سیدنا ابوبکرؓ اور عباسؓ انصار کی ایک مجلس کے قریب سے گزرے تو وہ رو رہے تھے۔ انہوں نے پوچھا تمہیں کون سی بات رلا رہی ہے۔ تو وہ کہنے لگے ہمیں حضور نبی اکرم ﷺ کی اپنے ساتھ مجلس یاد آگئی (اور اب پاس بیٹھ نہ سکنے کی بنا پر رونا آگیا) تو وہ حضور ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور آپ کو اس بات سے آگاہ کیا اس پر نبی اکرم ﷺ باہر تشریف لائے جبکہ آپ ﷺ نے اپنے سر اقدس کے گرد چادر مبارک کا حاشیہ لپیٹ رکھا تھا پھر آپ منبر شریف پر تشریف فرما ہوئے۔ اور اس دن کے بعد آپ منبر شریف پر تشریف فرما نہ ہوئے۔ پس اللہ کی تعریف (حمد و

ثنا) بیان کی' پھر فرمایا میں تمہیں انصار کے بارے میں نصیحت (وصیت) کرتا ہوں کیونکہ وہ میری ریش کی طرح ہیں (کہ میں ان کے ساتھ خود کو سجا ہوا سمجھتا ہوں) اور میرے سازو سامان کی طرح (میرے لئے اہم) ہیں اور انہوں نے اپنا حق ادا کردیا ہے جو ان پر تھا۔ اب ان کا (وہ حق) جو ان کے لئے (ہماری طرف ہے) رہ گیا ہے۔ پس ان میں سے اچھے عمل والوں کی طرف سے خیر کو قبول کرو اور ان کے خطاکاروں سے صرف نظر کرو۔

انصار حضور ﷺ کا زادِ سفر اور قسیم فیض

انصار حضور ﷺ کی چشم رحمت میں ستارا بن کر چمکتے ہیں' محبت رسول ان پر بارش کی طرح برستی رہی' ان کے فضائل لفظوں کے جامے میں کہاں سما سکتے ہیں۔ وہ رسول اول و آخر ﷺ' جن کے قدموں پر کونین کی ہر محبت نثار' وہ کملی والے آقا ﷺ انصار کو اپنی محبتوں کا مرکز قرار دیتے ہیں' ان کی خطاؤں سے بھی درگزر کرنے کے احکامات جاری کرتے ہیں' ان کی عزت افزائی کا کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا جاتا' حضور ﷺ نے انصار کو اپنا زاد سفر اور قسیم فیض کہہ کر پکارا۔ علاوہ ازیں انصار کو اپنی ضرب کاری بھی کہہ کر یاد کیا۔ حدیث پاک ہے:۔

عن ثابت البنانی انه سمع انسؓ ابن مالک قال' قال رسول الله ﷺ ان

حضرت ثابت البنانیؒ فرماتے ہیں کہ انہوں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ

الانصار عیبتی التی اویت الیها (مسند الامام احمد ۴: ۱۶۱)

کو یہ کہتے سنا کہ رسول خدا ﷺ نے فرمایا بے شک انصار میری وہ زنبیل (تھیلا پوٹلی) ہیں کہ جن کی طرف میں نے پناہ حاصل کی ہے۔

امام بخاریؒ کی روایت جو کہ ابھی گزری میں ہے۔

"بے شک یہ (انصار) میرے "رش" اور میری "عیبہ" کی طرح ہیں"

عربی لغت میں "رش" کے معنی ہیں پھوار یا ہلکی پھلکی بارش یہاں بارش سے مراد فیض ہوگا اور مفہوم حدیث یہ ہوگا کہ انصار حضور ﷺ کا فیض ہیں یا آقا ﷺ کا فیض بانٹنے والے ہیں لفظ "رش" کا ایک معنی تکلیف دہ ضرب بھی ہے یعنی ضرب کاری ان معانی کی روشنی میں حدیث پاک کا یہ مطلب ہوا کہ انصار آقا علیہ السلام کی ضرب کاری ہیں۔ باطل کے لئے تیغ بے نیام ہیں انصار آقا علیہ السلام کے موثر ہتھیار کی حیثیت رکھتے ہیں ایک ایسا نیزہ جو دشمن کو چیر پھاڑ کر رکھ دے ایک ایسی ضرب کاری جو جسد باطل کو پاش پاش کردے ایک ایسی آہنی ڈھال جو دشمن کے ہر وار کو روک لے۔ "عیبہ" زنبیل تھیلے یا پوٹلی کو کہتے ہیں۔ زنبیل کسی چیز کو چھپانے کے لئے استعمال ہوتی ہے اس اعتبار سے انصار حضور ﷺ کی پناہ ہوئے۔ زنبیل میں انسان اپنا سامان رکھتا ہے اس حوالے سے انصار حضور ﷺ کا زاد سفر ہوئے سفر انقلاب کا زاد راہ عملی حوالے سے تحریک اسلامی کا سرمایہ صد افتخار۔

کشتۂ عشقِ محمد ﷺ

انصار حضور ﷺ کی محبت میں سرشار تھے عشقِ پیغمبرِ کون و مکان کے چراغ ان کے سینوں میں فروزاں تھے دیار عشق و مستی کے مسافر جن کی پلکیں حضور ﷺ کے ذکر پاک پر نم آلود ہو جاتیں ہونٹوں پر درودوں کے پھول کھلتے پلکیں بہر سلامی جھک جاتی وہ سچ مچ کشتۂ عشقِ محمد ﷺ تھے پیغمبر انقلاب کی جنبش ابرو کے منتظر رہتے اور بے خطر آتش نمرود میں کود پڑتے انصار وہ مجاہدین اسلام ہیں جنہوں نے

اپنے آقا علیہ السلام کی رضا کے حصول کے لئے متاعِ دنیا کو ٹھکرا دیا۔ جاہ و چشم کو پر کاہ کی حیثیت بھی نہ دی۔ یہ وہ مخلص عاشقانِ صادق تھے کہ اللہ کے رسول ﷺ کی دائمی معیت اور سنگت کے بدلے میں انہوں نے متاع دنیا کو پاؤں کی دھول سمجھا انہوں نے دولت دنیا دے کر اللہ کے رسول ﷺ کو حاصل کر لیا اور یوں کونین کی دولت سمیٹ لی۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:۔

ان اناسا من الانصار قالوا یوم حنین حین افاء اللہ علی رسولہ من اموال هوازن ما افاء فطفق رسول اللہ ﷺ یعطی رجالا من قریش المائۃ من الابل فقالوا یغفراللہ لرسول اللہ یعطی قریشا و یترکنا و سیوفنا تقطر من دمائهم! قال انس بن مالک فحدث ذلک رسول اللہ ﷺ من قولهم فارسل الی الانصار فجمعهم فی قبۃ من ادام فلما اجتمعوا جاء هم رسول اللہ ﷺ فقال "ما حدیث بلغنی عنکم؟" فقال فقهاء الانصار اما ذوو راینا' فلم یقولوا شیئا واما اناس منا حدیثۃ اسنانهم' قالوا: یغفراللہ لرسول اللہ یعطی قریشا و یترکنا و سیوفنا تقطر من دمائهم فقال رسول اللہ ﷺ فانی اعطی رجالا حدیثی عهد بکفر

حنین کے روز جب اللہ تعالی نے رسول خدا ﷺ کو ہوازن قبیلہ کا مال عطا فرما دیا تو حضور ﷺ نے قریش کے افراد کو فی کس سو اونٹ دینا شروع کر دیئے۔ تو انصار میں سے بعض نے کہا اللہ اپنے رسول ﷺ کو معاف فرمائے (کیونکہ ان کی خطا معاذ اللہ یہ ہے کہ) آپ قریش کو عطا فرما رہے ہیں جبکہ ہمیں چھوڑ رہے ہیں جبکہ ہماری تلواروں سے ابھی تک ان کا خون ٹپک رہا ہے۔ بات حضور ﷺ تک پہنچی تو آپ نے انصار کو بلوایا اور خیمے میں انہیں جمع فرما لیا پس جب وہ جمع ہو گئے تو رسول خدا ﷺ تشریف لائے اور فرمایا' "تمہارے بارے میں مجھے کیا بات پہنچی ہے؟" سمجھدار انصار نے عرض کیا جہاں تک ہمارے اہل الرائے کا تعلق ہے تو انہوں نے تو کوئی بات نہیں کی' رہے

اتالفهم افلا ترضون ان يذهب الناس بالاموال و ترجعون الى رحالكم برسول الله؟ فوالله لما تنقلبون به خير مما ينقلبون به فقالوا: بلى يارسول الله قد رضينا قال "فانكم ستجدون اثرة شديدة فاصبروا حتى تلقوا الله ورسوله فاني على الحوض" قالوا اسنصبر (صحیح المسلم، ۱: ۳۳۸، کتاب الزکوٰۃ، مسند الامام احمد، ۳:۱۶۶)

کچھ جوان (ناسمجھ) تو انہوں نے فلاں فلاں بات کی ہے ..... اور بیان کردیا۔ اس پر رسول خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میں کفر کے زمانے کے قریب لوگوں (نئے نئے مسلمانوں) کو دے رہا ہوں کہ ان میں انسیت پیدا ہو، کیا تم اس بات پر راضی نہیں ہو کہ لوگ مال و متاع لے جائیں اور تم اپنے گھروں کو رسول خدا ﷺ کو ساتھ لے جاؤ؟ قسم ہے اللہ کی کہ جس (مبارک ہستی) کے ساتھ تم اپنے گھروں کو لوٹ رہے ہو وہ اس سے بہتر ہے جس کے ساتھ وہ اپنے گھروں کو لوٹیں گے۔ انہوں نے عرض کیا "کیوں نہیں؟" یقیناً یا رسول اللہ! ہم بلاشبہ (دنیا چھوڑ کر آپ کو اسکے بدلے میں ساتھ لے جاکر نہایت راضی ہیں) اس پر رسول خدا ﷺ نے ان سے فرمایا "عنقریب (تم سے تمہارا حق چھیننے کی) شدید تکلیف آئے گی سو تم صبر کرنا یہاں تک کہ تم اللہ اور اسکے رسول سے جاملو۔ بے شک میں حوض پر (تمہارے لئے پہلے سے تیاری کرنے والا) ہوں۔"

اس حدیث پاک سے معلوم ہوتا ہے کہ انصار حضور ﷺ سے والہانہ محبت کرتے تھے، عشق مصطفے کے سمندر میں اپنی ذات کو فنا کر چکے تھے، دولت دنیا ان کے سامنے ہیچ تھی، اسم حضور ﷺ لبوں پر مچلتا تو لہو کی ایک ایک بوند وجد میں آجاتی، خود سپردگی کی یہی کیفیت تھی جس نے انصار کو مسند عظمت عطا کی کہ ان کے مقدر کا ستارا اوج ثریا پر چمکنے لگا، انہیں حضور ﷺ کی دائمی سنگت نصیب ہوئی اور حضور ﷺ حیات ظاہری سے پردہ فرمانے کے بعد انہی کے شہر میں آرام فرما ہوئے۔ گنبد خضرا کی تابشیں آج بھی انصار کی بستی میں جھلملاتی ہیں، انہی کی بستی کی معطر، مقدس اور نورانی گلیوں کی تمنا میں خدا جانے کتنے عشاق مصطفٰے تڑپتے رہتے ہیں، قافلہ ہائے رنگ و بو انہی کی بستی کی طرف رواں رہتے ہیں، مکینِ گنبدِ خضرا ﷺ کی دہلیز پر تمناؤں کے کتنے قافلے ہر لحظ حرف سوال بن کر کھڑے رہتے ہیں، یہ وہی انصار کی بستی ہے جہاں پر دن رات اللہ کی رحمت برستی ہے۔ فرشتے درودو سلام کے گجرے لے کر صبح و شام اترتے ہیں۔ یہ شہر خنک کل بھی مرکز نگاہ تھا، آج بھی آرزو کا محور یہی ہے اور حشر تک دیدہ ودل کی ثناخوانی کا مخاطب یہی شہردل آویز رہے گا، انصار کی یہی بستی سرمایہ جان و دل قرار پائی ہے، رحمت کی گھٹائیں اسی شہر دلپذیر کے افق سے اٹھتی ہیں اور تشنہ زمینوں کی پیاس بجھاتی ہیں یہ لازوال اعزاز انصار کی بستی کو حاصل ہوا کہ حضور ﷺ ان کے ساتھ ہیں اور اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ حشر کے دن تمہیں ان لوگوں کے ساتھ اٹھائے گا جن سے تم محبت کرتے ہو گے اور حضور ﷺ سے انصار کی محبت ہر شک و شبہ سے بالاتر ہے۔

حضور ﷺ کی جنبشِ اَبرو کے منتظر رہنے والے

ممکن نہیں کہ انصار مدینہ کے فضائل کا بیان مکمل ہو قلم ان کے فضائل کو حیطۂ تحریر میں لانے سے قاصر ہے زبان ششدر ہے کہ وہ مناقب انصار میں لب کھولے تو کیا کھولے، جنہیں تاجدار کائنات ﷺ اپنی محبتوں کا مرکز ٹھہرائیں وہ لوگ کتنے خوش بخت ہونگے، کتنی فضیلتوں والے ہونگے۔ یقیناً وہ لوگ کتنے مقدر کے سکندر ہوں

گے' انصار رسول کے عشق اور اس عشق کے والہانہ پن کا کیا کہنا' ان کا کمال ایمان انہیں اس مقام پر لے گیا جہاں کوئی صاحب ایمان کم کم ہی پہنچتا ہے عشقِ رسالت مآب نے انہیں اس درجہ اپنے آپ سے بیگانہ اور از خود رفتہ کر دیا کہ حضور ﷺ کی ذات اقدس کے مقابلے میں ساری خدائی انہیں ہیچ نظر آنے لگی وہ ہر وقت حضور ﷺ کے اشارے کے منتظر رہتے' ہتھیلیوں پر اپنے سروں کے چراغ سجائے پھرتے کہ کب حکم ہو اور وہ اپنی جان حضور ﷺ کے قدموں پر نثار کر کے خلعت شہادت سے سرفراز ہوں۔ اس کی ایک جھلک ہمیں غزوہ بدر میں دکھائی دیتی ہے۔

انصار: تحریکِ اسلامی کا بازوئے شمشیرزن

ہجرت مدینہ سے قبل جو بیعاتِ عقبہ ہوئی تھیں' انصارِ مدینہ سے آقائے کائنات ﷺ کے جو معاہدہ جات ہوئے تھے ان کا اجمالی ذکر گزشتہ ابواب میں ہو چکا ہے اور اس کا تفصیلی ذکر آگے آئے گا لیکن اس موقع پر صرف اتنا عرض کر دینا ضروری ہے کہ ان میں ایک معاہدہ یہ بھی تھا کہ اگر کوئی شخص یا قبیلہ حضور علیہ الصلوۃ والسلام پر مدینہ میں حملہ کرے گا تو انصار اپنے جان' مال اور اولاد ہر شئے کی قربانی دے کر حضور علیہ الصلوۃ والسلام کی حفاظت کریں گے لیکن مدینہ سے حضور ﷺ کے باہر جا کر حملہ کرنے یا دفاعی پوزیشن اختیار کرنے کے بارے میں معاہدہ خاموش تھا' معاہدہ کی رو سے وہ آزاد تھے اور اس صورت میں حضور ﷺ کا ساتھ دینے کے پابند نہ تھے وہ ایک طرف ہو کر بیٹھ رہتے اور مہاجرین خود ہی دشمنوں سے نمٹتے رہتے' غزوہ بدر کا مرحلہ درپیش آیا۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ کفار و مشرکین اور مجاہدین اسلام کے درمیان کھلی جنگ ہو گی' یہ تاریخ اسلام کا ایک انتہائی نازک موڑ تھا' حق کا باطل کے ساتھ سامنا تھا۔ تحریک اسلامی کے آئندہ فروغ کا دارومدار بڑی حد تک اس جنگ کے نتائج پر منحصر تھا۔ اس جنگ میں فتح مستقبل کی فتوحات کا دروازہ کھولنے والی تھی' غزوہ بدر کو یوم الفرقان قرار دیا گیا' اس غزوے میں انصار کا شامل ہونا بہت ضروری تھا بلکہ غزوہ بدر میں ان کی شمولیت خود ان کے ایمان کے تحقق کے لئے بھی ضروری تھی کیونکہ ایک فیصلہ کن

معرکے میں فتح ہو جانے کے بعد جو مشاہدہ ہو تا کہ فتح حق کی ہی ہوتی یہ انصار کے ایمان بالغیب کو اس موقع پر کوئی خاص درجے کا ایمان بالغیب نہ رہنے دیتا نیز انصار اور منافقین میں حد فاصل قائم کرنے کے لئے بھی اس غزوے میں انصار کی شرکت ناگزیر تھی پھر مہاجرین کے قلیل تعداد میں ہونے کی بنا پر آقا علیہ السلام کو بھی یہ پسند تھا کہ انصار حق و باطل کے اس اولین معرکے میں شرکت کریں ان کی تلواریں باطل کے خلاف بے نیام ہوں اور یہ اللہ کی راہ میں اپنے لہو کے چراغ روشن کرکے نور ایمان کے فروغ کا باعث بنیں' یہی سبب تھا کہ ابتدا میں انصار کو ساتھ لے کر پیش قدمی کی گئی اور بظاہر اعلان بھی غزوے کا نہیں ہوا' پہلے مرحلے پر دشمن کی اقتصادی ناکہ بندی کرکے اس کی حملہ کرنے کی قوت کو مفلوج کرنا بھی مقصود تھا۔ پھر آگے چل کر جب حالات واضح ہوئے اور بظاہر ایک۔ نئی صورت حال سامنے آئی انصار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پیش قدمی کر رہے تھے تاہم سپہ سالار مدینہ حضور رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی حکمت عملی یہ تھی کہ انصار کسی قسم کا دباؤ قبول کئے بغیر رضاکارانہ طور پر جنگ میں شرکت کا خود اعلان کریں' اس کا ایک اخلاقی فائدہ تو یہ ہو تا کہ منافقین کو اس پروپیگنڈے کا موقع نہ ملتا کہ معاہدہ تو شہر کے اندر رہ کر بیرونی حملہ آور کو روکنے کا تھا اور یہ کہ انصار کو زبردستی جنگ کا ایندھن بنایا جا رہا ہے' اس کا ایک سیاسی پہلو یہ بھی تھا کہ اگر منافقین اسے بنیاد بنا کر زہریلا پروپیگنڈہ کرتے اور کردار کشی کی مہم چلاتے تو عین موقع پر خطرناک صورتحال کا پیدا ہو جانا ناممکن نہ تھا۔ لہٰذا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش نظر اس ذہنی خلفشار کا سدباب بھی کرنا تھا۔ دوسرا فائدہ خالص سیاسی نوعیت کا تھا اور وہ یہ کہ اس طرح منافقین کے لئے بہانہ بنا کر خود نکلنا دشوار ہو جاتا اور اس صورت میں یا تو وہ طوعاً و کرھاً اسلامی لشکر میں رہتے یا ان کا اجتماعی رویہ انہیں منافق ثابت کر دیتا' یہ حالت موت سے بدتر ہوتی اور انہیں شفاف آئینے کی طرح نظروں میں لے آتی اور اگر وہ ساتھ نہ رہتے تو معاملہ اور بھی آسان ہو جاتا۔

تیسرا فائدہ یہ حاصل ہو تا کہ مہاجرین کو انصار کی عملی مدد سے ایک اخلاقی

سہارا بھی ملتا اور انہیں احساس ہوتا کہ آزمائش کی اس گھڑی میں وہ تنہا نہیں ان کے حوصلے بلند ہوتے اور وہ پورے اعتماد کے ساتھ باطل سے ٹکرا جاتے۔

چوتھا اہم فائدہ یہ ہوتا کہ انصار ہمیشہ کے لئے تحریک اسلامی کا بازوئے شمشیر زن بن جاتے اگر خدانخواستہ کسی وجہ سے انصار اسلامی لشکر کے دست و بازو نہ بن سکتے تو آئندہ اسلامی عساکر میں ان کی شمولیت کی ضمانت نہیں دی جا سکتی تھی۔

پانچواں فائدہ یہ ہوتا کہ انصار کے جنگی حلیف بن جانے کی صورت میں شہر مدینہ کو داخلی اور خارجی دونوں طرح کا استحکام حاصل ہوتا اور شہر کی اندرونی سیاسی صورت حال پر مثبت اثر پڑتا اور یہود کے سازشی ذہن کی حوصلہ شکنی ہوتی' امن و امان کے قیام سے حالات پر مسلمانوں کی گرفت مضبوط ہوتی اور اسلام دشمن قوتوں کے لئے یہ صورتحال ناقابل برداشت ہوتی اور وہ ذہنی طور پر بھی پسپائی اختیار کرنے پر مجبور ہوتے۔

چھٹا فائدہ یہ ہوتا کہ منافقینِ مدینہ کے حوصلے پست ہوتے وہ مسلمانوں کی عسکری قوت سے مرعوب ہو کر وقتی طور پر ہی سہی' شرانگیزیوں سے باز رہتے اور اسلامی ریاست کو اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی مہلت ملتی۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ جب انصار نے رضاکارانہ طور پر اسلامی عساکر کا حصہ بننے اور کفار و مشرکین سے میدان جنگ میں دو دو ہاتھ کرنے کا فیصلہ کیا تو مسلمانوں کو درج بالا فوائد فوری طور پر حاصل ہو گئے جو آئندہ کا لائحہ عمل مرتب کرنے کے لئے بھی انتہائی مفید ثابت ہوئے' حالات مسلمانوں کے حق میں سازگار ہوئے اور انہیں اپنی صفیں درست کرنے کا موقع ملا۔ انکے اعتبار اور اعتماد دونوں میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ اس خود اعتمادی نے انہیں دشمن کے مقابلے میں صف آرا ہونے کا نیا حوصلہ عطا کیا اور وہ ایک نئے ولولے کے ساتھ میدان جنگ میں اتر گئے۔

ان حالات کے پیش نظر پیغمبرانہ حکمت نے مناسب سمجھا کہ کفار و مشرکین مکہ کو برسر میدان للکارا جائے چنانچہ دشمن کی سپلائی لائن کاٹنے اور اس کی اقتصادی ناکہ

بندی کے لئے اسلامی لشکر فوراً حرکت میں آگیا۔ اس موقع سے بھرپور فائدہ اٹھایا جانا ضروری تھا۔ اس حکمت عملی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابوجہل کو مکہ سے نکال لانا اتنا مشکل نہ رہا۔ سیاسی اور جنگی حکمت عملی ترتیب دیتے ہوئے دشمن کے مزاج اور اس کی نفسیات سے بھرپور آگاہی رکھنا اور اسے اپنی مرضی کے میدان میں گھسیٹ کر لے آنے کی اس سے بڑی مثال شاید پیش نہ کی جاسکے' یہ پیغمبرانہ فراست کا ایک عظیم کارنامہ تھا جو بجائے خود حضور علیہ الصلوۃ والسلام کے نبی برحق' مامور من جانب اللہ اور ہر قدم اسی کی الوہی رہنمائی میں اٹھا کر نتائج حاصل کرنے کی بھرپور دلیل ہے' یہ بھی سپہ سالار مدینہ حضور رحمت عالم ﷺ کی جنگی بصیرت اور مومنانہ فراست کا کمال ہے کہ جنگ کے منصوبے کا نہ تو اعلان کیا گیا اور نہ کسی کو اس منصوبے کی ہوا ہی لگنے دی گئی۔ اگر یہ منصوبہ تکمیل سے پہلے ہی طشت ازبام ہو جاتا تو نتائج اس کے برعکس برآمد ہوتے' کم از کم یہ تو ہوتا کہ

(ا) میدان جنگ بدر کی بجائے کوئی دوسرا مقام ہوتا جو اللہ کے دیئے گئے منصوبے کے خلاف ہوتا' وہ جنگی سہولتیں جو میدان بدر میں اسلامی لشکر کو ملیں دوسرے میدان میں ان سہولتوں کی فراہمی یقینی نہ ہوتی کیونکہ میدان بدر میں اپنی نفری' دشمن کی ممکنہ قوت اور اپنی جنگی حکمت عملی کو ترتیب دینے کے باریک اور نازک معاملات منسلک تھے ماہرین حرب جانتے ہیں کہ مسلمانوں اور کفار کی قوت اور اس قوت کی کیفیت کا تفاوت فریقین کے مابین کتنے گہرے عسکری روابط رکھتا ہے۔

(ب) اندرون مدینہ سازشوں اور فتنوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا' اسلام دشمن قوتوں کو سیاسی گٹھ جوڑ کا موقع ملتا اور مسلمانوں کے لئے مزید مشکلات پیدا ہوتیں۔ یہودی اور منافقین مدینہ اس بدلتی ہوئی صورت حال سے یقیناً فائدہ اٹھانے کی بھرپور سعی کرتے۔

(ج) ان حالات میں ممکن تھا انصار کا اس شان کے ساتھ باہر نکلنا مشکل ہو جاتا (اگرچہ اس کے امکانات بہت کم تھے)

(د) انصار سے جو اعلان کرانا مقصود تھا وہ سفارتی سرگرمیوں کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔

جوں جوں حالات میں تبدیلی آتی گئی انصار کی جنگ میں شمولیت کے اعلان کیلئے زمین خود بخود ہموار ہوتی گئی، کیونکہ جذبہ ایمان ابتلاء و آزمائش کے وقت ہی نکھر کر سامنے آتا ہے۔

تاریخ گواہ ہے کہ جنگ مسلمانوں پر مسلط کی گئی۔ اس کے برعکس اگر اعلان جنگ مسلمانوں کی طرف سے ہوتا تو سیاسی طور پر مسلمانوں کی پوزیشن کمزور ہوتی اور مخالفین کو مظلوم بننے اور مسلمانوں کو جارح ثابت کرنے کا بہانہ ہاتھ آجاتا۔ اس موقع پر مسلمانوں کی قیادت پھونک پھونک کر قدم رکھ رہی تھی۔

جب مصطفوی لشکر مدینے سے نکلا اور ظاہری صورتحال مسلمانوں کے موافق نظر آنے لگی تو دشمن تیزی سے بدر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کے خلاف جنگ کا اعلان ناگزیر ہوگیا۔ اس موقع پر حضور ﷺ نے مناسب جانا کہ انصار جنگ میں شرکت کا اعلان کریں۔ حضور ﷺ نے انہیں مشورے کے لئے بلایا لیکن روئے سخن براہ راست انصار کی طرف نہیں کیا بلکہ گفتگو انداز عمومی رکھا۔ حدیث پاک میں آتا ہے:۔

عن انس، ان رسول الله ﷺ شاور حين بلغه اقبال ابی سفيان قال فتكلم ابو بكر فاعرض عنه ثم تكلم عمر فاعرض عنه قال فقال سعد بن عبادة فقال ايانا تريد يا رسول الله ﷺ والذی نفسی بيده لو امرتنا ان نخيضها البحر لا خضناها ولو امرتنا ان نضرب اكبادها الى برك الغماد لفعلنا

(صحیح المسلم، کتاب الجہاد والسیر، باب غزوہ بدر)

حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ جب حضور ﷺ کو ابوسفیان کے آگے نکل آنے کی اطلاع پہنچی تو حضور ﷺ نے مشورہ کیا، حضرت ابوبکرؓ نے گفتگو کی تو آپ نے اعراض کیا پھر حضرت عمرؓ نے کلام کیا تو آقا علیہ السلام نے اعراض فرمایا۔ اس پر حضرت سعد بن عبادہؓ نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! کیا آپ کی مراد ہم سے (ہے کہ ہم گفتگو کریں) قسم ہے اس کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے اگر آپ ہمیں حکم فرمائیں کہ ہم اپنے ان

(گھوڑوں) کو سمندر میں ڈال دیں تو ہم
ضرور بالضرور انہیں سمندر میں ڈالیں
گے اور اگر آپ ہمیں حکم فرمائیں کہ
ہم انہیں غماد کے تالاب (دلدل) میں
گھسا دیں تو ہم ضرور بالضرور ایسا کریں
گے۔

انصار نے برملا کہا کہ یارسول اللہ! ہم آپ کے حکم پر گھوڑے سمندر میں ڈالنے کے لئے تیار ہیں گویا حضور! ہم تو آپ کی جنبشِ ابرو کے منتظر ہیں۔ آقا حکم فرمائیں یہ جان تو کیا ہزاروں جانیں آپ کے قدموں پر نثار کردیں۔ محبتِ رسول اور اطاعتِ رسول کی عملی تفسیر پیش کر کے انصار نے تاریخ میں اپنا نام آبِ زر سے رقم کروا لیا حالانکہ مدینہ سے باہر نکل کر دشمن پر حملہ آور ہونے یا اس کے حملے کا جواب دینے کے وہ پابند نہ تھے لیکن انصار کے نزدیک مرضیٔ رسول ﷺ کے سامنے کسی معاہدے کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ وہ تو رضائے حبیب کبریا ﷺ چاہتے تھے۔ وہ تو اتباع و اطاعت کے ساتھ فصیلِ دیدہ و دل پر عشقِ مصطفٰے کے چراغ روشن کرنے کے آرزومند تھے۔

انصار حضور ﷺ کے ازل کے ساتھی

حضور رحمت عالم ﷺ کی دائمی سنگت انصار کے مقدر میں لکھ دی گئی۔ یہ وہ لازوال سعادت ہے جو کسی دوسرے کے حصے میں نہیں آئی۔ انصار کی اس فضیلت اور ان کے اس امتیازی وصف کا ذکر اجمالاً پہلے بھی ہو چکا ہے۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ حضور ﷺ نے غزوہ طائف کے بعد انصار کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ کیا تمہیں یہ پسند نہیں کہ دنیا کی دولت لوگ لے جائیں اور تم اپنے گھروں کو رسول خدا ﷺ کے ساتھ لوٹو۔ فتح مکہ کے وقت حضور ﷺ نے مکہ کے اوباش نوجوانوں کے مقابل انصار کو مقرر فرمایا۔ پھر انصار کا ایک گروہ آقائے دوجہاں ﷺ کے گرد بھی ہو گیا۔ یہ صورتحال دیکھ کر ابوسفیان کی زبان پر یہ لفظ بار بار آئے کہ آج کے بعد قریش ختم ہو

جائیں گے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کیا قریش ختم ہو گئے۔ کیا ابو سفیان کے اندیشے درست نکلے۔ نہیں، اس کے برعکس حضور رحمت عالم ﷺ نے اعلان فرمایا:۔

(الف) جو ابو سفیان کے گھر میں آ گیا وہ امن میں ہے۔

(ب) جس نے ہتھیار پھینک دیئے اسے بھی امان دی جائے گی۔

(ج) جس نے اپنے گھر کا دروازہ بند کر لیا وہ بھی امن میں آ گیا۔

جب یہ اعلانات ہوئے تو بعض انصار نے کہنا شروع کر دیا:۔

اما الرجل فقد اخذتہ رافۃ بعشیرتہ و رغبۃ فی قریتہ حضور ﷺ کو اپنے خاندان کی محبت و رحمت اور اپنی بستی کی رغبت نے جکڑ لیا ہے۔

انصار میں سے بعض سوچ رہے تھے کہ حضور ﷺ اب مکہ ہی میں رہ جائیں گے۔ خدانخواستہ یہ خیال ان کے ذہن میں کسی فتور کی وجہ سے نہیں آقائے دوجہاں ﷺ سے بے پناہ محبت کی وجہ سے پیدا ہوا۔ اس پر اللہ نے حضور ﷺ پر وحی نازل فرمائی تو حضور ﷺ نے اعلان فرمادیا:۔

الا فما اسمی اذا ثلاث مرات کلا انا محمد عبداللہ و رسولہ ھاجرت الی اللہ و الیکم فالمحیا محیاکم والممات مماتکم خبردار! پھر میرا نام کیا ہے؟ تین مرتبہ دہرایا (یعنی میں اس کا رسول ہوں) ہرگز نہیں۔ میں محمد اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں۔ میں نے اللہ کی طرف اور تمہاری طرف ہجرت کی ہے پس زندگی تمہاری (سنگت والی) زندگی ہے اور موت (تمہارے پاس والی) موت ہے۔

جب حضور ﷺ نے انصار کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ میرا مرنا جینا تمہارے ساتھ ہے تو انصار اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکے۔ یہ مژدۂ جانفزا کہ حضور ﷺ ہمارے ساتھ رہیں گے، ہم ہر لمحہ آپ کے دیدار سے مشرف ہوتے رہیں گے سنا تو

انصار پر رقت طاری ہو گئی۔ ہر حرف حرفِ سپاس بن گیا۔ کلماتِ تشکر و امتنان لبوں پر آ کر مچلنے لگے کہ آقاء! ہم نے تو یہ بات محض اس لئے کی تھی کہ کہیں اللہ اور اس کا رسول ﷺ ہم سے دور نہ ہو جائیں۔ حدیث پاک کے الفاظ ہیں :-

فاقبلوا الیہ یبکون و یقولون: واللہ ما قلنا الذی قلنا الا الضن باللہ و برسولہ ﷺ

آپ کی طرف روتے ہوئے اور یہ کہتے ہوئے لپکے کہ اللہ کی قسم ہم نے جو کہا وہ نہیں سوائے اس کے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر بخل کرتے ہوئے کیا۔

کیا خوبصورت توجیہہ ہے' کیا شاندار گریز ہے' والہانہ محبت کا کیا بانکپن ہے کہ کہیں حضور ﷺ ہم سے جدا نہ ہو جائیں' کہیں یہ من موہنی صورت نظروں سے اوجھل نہ ہو جائے' کہیں ہم سایہ رحمت سے محروم نہ ہو جائیں۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:-

ان اللہ ورسولہ یصدقانکم و یعذرانکم

(صحیح المسلم' ۲: ۱۰۳۔۱۰۴' کتاب الجہاد والسیر باب فتح مکہ)

اللہ اور اس کا رسول تمہاری تصدیق کرتے ہیں اور تمہارے عذر کو قبول کرتے ہیں۔

فضیلتِ انصار اور ہجرت

اسلامی تاریخ میں ہجرت اس سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے جو نہ صرف قافلۂ عشق کی درست سمت میں رہنمائی کرتا ہے بلکہ مسافران راہ حق کے حوصلوں اور ولولوں کو تازہ بھی رکھتا ہے کہ اب منزل قدم دو قدم کی بات ہے۔ اے رہروانِ عشق' اپنے قدم اور بھی تیز کر دو۔ اب سفرِ مصائب ختم ہوا کہ ہوا۔ منزل تمہارے قدموں کو بوسہ دینے کے لئے بے تاب ہے۔ قافلے والو! بڑھے چلو۔ مہاجرین نے اس فیصلہ کن

موڑ پر جو تاریخی کردار ادا کیا اس کا تفصیلی ذکر فضائل مہاجرین کے باب میں ہو چکا ہے۔ یہ وہی عظیم لوگ ہیں جن کے نقوشِ قدم پر تاریخ بھی اپنا سفر جاری رکھتی ہے۔ ارتقاء کا ہر راستہ انہی کے نقوشِ کفِ پا کی خیرات سے منور ہوتا ہے لیکن اس ہجرت کے لئے انصار نے ہی بنیادی پتھر کا کام کیا اور بیعتِ عقبہ اولیٰ اور ثانیہ نے ہجرت کے مقفل دروازوں پر پہلی دستک دی اور چشمِ فلک نے دیکھا کہ اس پہلی دستک نے فکر و نظر کے بند کواڑ بھی کھولنے کا کارنامہ سرانجام دیا۔ تحریک اسلامی اپنی پوری تخلیقی توانائیوں اور فکری رعنائیوں کے ساتھ ذہنوں کی تہذیب کا کارنامہ سرانجام دینے لگی۔ ہجرت' مہاجرین اور انصار ایک ایسی تثلیث ہے جس کا ہر زاویہ بلندیوں کی نشاندہی کر رہا ہے۔ یہ بلندیاں تو امت مسلمہ کا مقدر بننے والی تھیں۔ انصار کے سر پر دستارِ فضیلت باندھی گئی تو اس کی وجہ ان کا اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ وہ اخلاص تھا جس کا عملی مظاہرہ انہوں نے بھرپور خود سپردگی اور گہری وابستگی (Commitment) کے ساتھ قدم قدم پر کیا اور راہ حق میں استقامت کے ایسے کوہ گراں ثابت ہوئے جنہیں ایک قدم بھی پیچھے نہ ہٹایا جا سکا اور باطل اپنی تمام سازشوں کے باوجود جن کے قصرِ ایمان میں نقب لگانے میں ناکام رہا' یہ مردانِ حق ہر میدان میں ڈھال بن کر حضور ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آگے سینہ سپر رہے۔ انہوں نے قدم قدم پر ایثار و قربانی کی ان گنت روشن مثالیں قائم کیں۔ یہ لوگ انقلابی کردار کے مالک تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بے لوث صحابی' محبت رسول اور عشق نبی میں فنا' لیکن ایک خاص بات جس نے انصار کو عظمت و رفعت کا بلند مقام عطا کیا ایسی بھی تھی جس میں ان کے کسی عمل کا دخل نہیں تھا۔ یہ محض عطیۂ خداوندی تھا وہ یہ کہ انہیں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دائمی سنگت نصیب ہوئی۔ آقائے دوجہاں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا میں اس سے جنگ کروں گا جس سے تم جنگ کرو گے اور میں اس سے صلح کروں گا جس سے تم صلح کرو گے بلکہ یہ بھی فرمایا کہ میرا خون تمہارا خون' تمہاری عزت میری عزت ہے۔ جہاں تمہارا خون گرے گا وہیں میرا خون گرے گا جس کا تم خون بہاؤ گے میں اس کا خون بہاؤں گا۔ پیغمبر انقلاب کی طرف سے یہ

بے پناہ اعتماد' یہ بے پناہ اپنائیت انصار کا مقدر بنی۔ انصار کو یہ عظمت و رفعت مہاجرین کی ہجرت الی الرسول کی بنا پر نصیب ہو سکی۔ انصار نصرت کے عمل سے بھی گزرے تھے جو ان کا اپنا عمل تھا۔ اصلاً ان کا یہ عمل نیابتاً تھا۔ اللہ اور اس کے برگزیدہ رسول ﷺ کی طرف سے جن کی طرف مہاجرین نے ہجرت کی تھی۔ گذشتہ ابواب میں بیان ہو چکا ہے کہ آقائے نامدار ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میں نے اللہ کی طرف اور تمہاری طرف ہجرت کی جس سے معلوم ہوا کہ میزبانی رسول ﷺ میں انصار خالصتاً اللہ رب العزت کے نائب ہیں کہ انہوں نے رسول خدا ﷺ کی ظاہری میزبانی کی سعادت حاصل کی۔ دیگر مہاجرین کی ہجرت چونکہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف تھی لہٰذا انصار نے ان کی میزبانی اللہ کے رسول کی طرف سے ادا کی۔ گویا یہ عظیم ہجرت انصار کو بیک وقت اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا ظاہری نائب بنا گئی۔ (ورنہ خلیفہ تو اللہ کے رسول ﷺ ہی کا نائب ہوتا ہے۔)

حصّہ پنجم

مُصطفوی ﷺ انقلاب کی ناگزیریت اور عالمی منظر نامہ

باب ۔ ۱

مصطفوی انقلاب ہی کیوں؟

ہجرتِ مدینہ بنائے انقلاب ہے اور انقلاباتِ زمانۂ ہجرت ہی کے مختلف عنوانات ہیں، ہجرت ہی کی مختلف تعبیرات ہیں۔ ہم گزشتہ ابواب میں اس امر کا تفصیل سے جائزہ لے چکے ہیں کہ ہجرت مدینہ نے انسانی تہذیب و تمدن کے ارتقاء کا رخ متعین کرنے میں بنیادی کردار ادا کیا ہے اور تاریخِ اسلام ہی نہیں تاریخ عالم بھی مصطفوی انقلاب کے لئے اس فیصلہ کن موڑ پر کئے جانے والے اقدامات سے بالواسطہ اور بلاواسطہ دونوں طریقوں سے متاثر ہوئی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہجرت مدینہ کے بعد مستقبلِ قریب یا مستقبلِ بعید میں ہر انقلاب کا پیش خیمہ ہجرت کا یہی ادارہ بنا۔ انبیاء کی پوری تاریخ ہجرت کے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ ہجرت کے بعد مدینہ کی اسلامی ریاست کی داغ بیل پڑی اور ایک فلاحی اسلامی ریاست کی اخلاقی اور قانونی حدود کے تعین کے لئے انقلابی بنیادوں پر کام کا آغاز ہوا۔ ہجرت مدینہ کے بعد ہی مسلمانوں کو ظلم کے خلاف تلوار اٹھانے کا حکم ملا۔ جب جہاد کا دروازہ کھلا تو بالآخر فتنہ و شر کے مراکز کا خاتمہ ہوا اور جزیرہ نمائے عرب میں بدامنی اور قبائلی شورشوں کا قلع قمع ہوا اور یوں عالمی سطح پر دائمی امن کے قیام کی راہ ہموار ہوئی، اسلامی ریاست کو داخلی استحکام نصیب ہوا اور خارجی سطح پر عرب کی حدود سے باہر بھی ایک ثقافتی اکائی کے طور پر مسلمانوں کو تسلیم کیا جانے لگا، جہاد قوتِ نافذہ کے حصول کا وسیلہ ہے، تاریخ گواہ ہے کہ قوتِ نافذہ حاصل کئے بغیر عموماً نہ تو نظریاتی محاذ پر کوئی کارنامہ سرانجام دیا جاسکتا ہے اور نہ محاذ جنگ پر ہی دادِ شجاعت دے کر بابِ حریت میں ملّی جاہ و حشم کی داستان رقم کی جاسکتی ہے اسی لئے ہجرت کو ''انقلاب کے دروازوں پر پہلی دستک'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ پیغمبرانہ جدوجہد ایک ہمہ گیر انقلاب بپا کرنے کے لئے آسمانی ہدایت کے مطابق انسانی معاشروں کی تشکیل اور فرد کی شخصیت کی تعمیر سے عبارت ہے، فرد کے ظاہر و باطن کا منظرنامہ روشنیوں سے تحریر کرکے اسے فرسودگی کے حصار سے باہر نکالنا، اس کے افکار و نظریات کو رجائیت کے پانیوں سے شفاف بناکر تقاضائے فطرت کی تکمیل کے

لئے اسے عزم واستقامت کے ہتھیاروں سے مسلح کرنا اور عملی سطح پر ہر شعبہ زندگی میں مثبت اور خوشگوار تبدیلیوں سے ارتقائی نتیجہ خیزی کو یقینی بنانے کا نام انقلاب ہے اور اس ضمن میں کئے جانے والے اقدامات کو انقلابی جدوجہد کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے' فکر و نظر کے انہی زاویوں اور ذہن انسانی پر نو بہ نو سائنسی انکشافات سے انقلابی رویئے ترتیب پاتے ہیں' انہی اجتماعی رویوں کی روشنی میں قافلہ ہائے رنگ وبو کو نئی منزلوں کے روشن آثار نظر آنے لگتے ہیں' آتشِ شوق کی حنا بندی ہوتی ہے' عقائد ونظریات کی پگڈنڈی پر چراغاں ہوتا ہے اور شعور کی راہداریوں میں افکارِ تازہ کے مشعل بردار جلوس نکلتے ہیں سیاسی' اقتصادی' تعلیمی' فکری' نظری' تہذیبی' ثقافتی اور روحانی انقلابات کے خدوخال واضح ہوتے ہیں' ہجرت مدینہ دراصل انقلاباتِ عالم کا وہ دیباچہ ہے جس سے اکتسابِ شعور کئے بغیر نہ تو انسانی نفسیات کا مطالعہ مکمل ہو سکتا ہے اور نہ قوموں کے اجتماعی رویوں کی نشاندہی ہی ہو سکتی ہے۔ اس لئے ہجرتِ مدینہ کے ہر ہر پہلو سے حیاتِ انسانی پر مرتب ہونے والے اثرات کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے اور یہ جائزہ اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک ہم مصطفوی انقلاب کے پس منظر کی جزئیات سے شعوری سطح پر بھی اپنے اہداف کو ہم آہنگ نہیں کرتے۔ اس کے لئے ایک بار پھر ہمیں تاریخ کے مقفل دروازوں کو کھولنا ہوگا۔ اسلام ظاہری وباطنی ہر دو صورتوں میں ایک ہمہ گیر انقلاب ہے' بہبود انسانی کا ہر راستہ اسی انقلاب کی دہلیز سے پھوٹنے والے اجالوں کا دریوزہ گر ہے۔ مصطفوی انقلاب پوری انسانیت کی ضرورت ہے' ہر عہد اور ہر دور کا تقاضا ہے۔ کسی بھی زاویۂ نگاہ سے حیاتِ انسانی کے کسی بھی گوشے کا مطالعہ کیا جائے' کسی بھی عمرانی تقاضے' سوچ کے کسی بھی واسطے اور عقل و خرد کے کسی بھی معیار کی تشریح وتوضیح کی جائے ہم ایک ہی نتیجے پر پہنچتے ہیں اور وہ یہ کہ اگر بے سکون انسانی معاشروں کو امن اور عافیت کی تلاش ہے اور وہ حرفِ حق کو قبول کرنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں تو انہیں اس عظیم انقلاب سے روشنی کشید کرنا ہوگی جو دنیا کو قانون دینے والے پیغمبر انقلاب ﷺ کی تیرہ سالہ مکی اور دس سال مدنی زندگی کی

صداقتوں اور سچائیوں سے عبارت ہے جو ایک کھلی کتاب کی مانند ہے۔ جس کا ایک ایک حرف مینارۂ نور بن کر باطنی اور خارجی ہر دو سفر میں ایمان و ایقان کی جھلملاتی روشنوں کا مظہر ہے' ہجرتِ مدینہ کے انقلابی پہلو کا تجزیاتی مطالعہ حیاتِ انسانی کی بہت سی گرہیں کھولتا ہے' بہت سے مسائل حل کرتا ہے اور انسانی نفسیات کی بہت سی گتھیاں سلجھاتا ہے' ہجرت کے حوالے سے سیرت طیبہ کا مطالعہ انسانی روابط کو مربوط بناتا ہے' صدیوں کے فاصلوں کو سمیٹتا ہے اولادِ آدم کو ذہنی' فکری اور نظریاتی طور پر بھی جغرافیائی اور علاقائی حدبندیوں سے آزاد کرکے رضاکارانہ طور پر آزادانہ ماحول میں ایک ایسے وسیع اور ہمہ گیر معاشرے کو مضبوط نظریاتی بنیادیں فراہم کرتا ہے جس میں جبر اور استحصال کی ہر شکل کا خاتمہ ہوگا جو سچ مچ فطرت کے مقاصد کی نگہبانی کرکے زمین پر نفاذِ عدل کو عملی جامہ پہنائے گا فرد کے تہذیبی اور نسلی پس منظر کو عنوان بنائے بغیر ہر فرد کی ثقافتی اکائی کو مکمل کرے گا اور نسلِ آدم کے مقدر کے افق پر آسودہ لمحوں اور شاداب ساعتوں کی ان گنت بشارتوں کے طلوع ہونے کا اہتمام کرے گا۔

مصطفوی انقلاب فطرت انسانی کی احتیاج

اس باب میں ہم اس بات کا جائزہ لیں گے کہ جس زمانے میں آنحضرت ﷺ کی بعثت مبارکہ ہوئی اس وقت افقِ عالم کن اندھیروں میں ڈوبا ہوا تھا۔ کس طرح مصطفوی انقلاب فطرتِ انسانی کی احتیاج بن کر سامنے آیا۔ وہ انقلاب جو انسانی زندگی میں سچائیوں اور صداقتوں کی روشنی اتارنے کا موجب اور مقاصد فطرت کی تکمیل کا باعث بنا۔ اس زمانے میں پوری انسانیت کو ایک عظیم انقلاب کی ضرورت تھی آقائے نامدار ﷺ اپنی عظیم الشان انقلاب آفریں نبوی قیادت کے زیر سایہ عالم انسانیت کی ایک آفاقی ضرورت کی تکمیل کا فریضہ ایک ایسے عالمگیر آسمانی انقلاب کے ذریعے ادا فرمارہے تھے جسکے ثمرات انسان کو بحیثیت ایک انسان کے قیامت تک جمع کرنا تھے جس کے بعد رہتی دنیا تک نہ تو کسی اور انقلاب کی ضرورت پیش آسکتی ہو اور

نہ کسی اور نظریئے اور طریق پر مبنی کسی انقلاب کو کامیابی ہی نصیب ہو سکے۔ یہی وجہ ہے کہ روسو سے لیکر ماؤزے تنگ تک جو بھی کوئی داعیٔ انقلاب یا صاحبِ فکر آیا ہے وہ نہ تو اپنی کامیابی کو استمرار بخش سکا اور نہ عوام کی حقیقی نفع بخشی کا سامان ہی کر سکا ہے۔ یہ کہنے میں ہمیں کوئی باک نہیں کہ آج شرق سے غرب تک (خواہ امریکہ ہو یا کینیڈا' ایشیا ہو یا آسٹریلیا' سابقہ روس ہو یا سپین' جرمنی' انگلستان اور فرانس حتی کہ سکینڈے نیویا' ناروے' ڈنمارک اور سویڈن جہاں بھی دنیا کی بہترین فلاحی مملکت موجود ہے جس طرف بھی نگاہ اٹھائیں ہمیں بالعموم اور بحیثیت مجموعی یہ حقائق منہ چڑاتے دکھائی دیں گے کہ انسانی معاشرے جرائم کی آماجگاہ بنے ہوئے ہیں۔ اخلاقی اور روحانی قدروں کا جنازہ نکل چکا ہے۔ امن اور عاقبت کا تصور قصۂ پارینہ بن چکا ہے بڑی طاقتوں پر خدائی کا منصب سنبھالنے کی دھن سوار ہے اور وہ غریب ممالک کے گرد اپنی سیاسی اور اقتصادی غلامی کے حصار کو تنگ کر رہی ہیں۔ تیسری دنیا کے عوام غربت کی چکی میں پس رہے ہیں۔ ترقی یافتہ اقوام ان کے وسائل کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی ہیں' منشیات کا زہر نئی نسل کی رگوں میں دوڑ رہا ہے' طبقاتی کشمکش اپنی انتہا کو چھو رہی ہے۔ نو آبادیاتی نظام' جاگیرداری نظام کی صورت میں زندہ ہے' جنسی بے راہ روی کا ذکر ہی کیا ہے۔' عریانی اور بے حیائی نے نسلِ انسانی کی تخلیقی صلاحیتوں کو نگل لیا ہے۔ انسان کے اعصاب پر عورت بری طرح سوار ہے۔ انسانی معاشرے تشدد کی آگ کی لپیٹ میں ہیں' اجتماعی آبرو ریزی کے واقعات اس تواتر سے رونما ہو رہے ہیں کہ چادر اور چار دیواری کے تحفظ کی باتیں ہوا میں تحلیل ہو کر رہ گئی ہیں۔ طاقتور قومیں انسان کے بنیادی حقوق کی حفاظت کے نام پر حقوق انسانی کے تصور کی مٹی پلید کر رہی ہیں' انسان ڈپریشن کا شکار ہے کہ تضادات کے جنگل اسکے چاروں طرف اپنا دامن پھیلائے کھڑے ہیں۔ دنیا کا ہر تیسرا شخص ذہنی مریض بنا دیا گیا ہے۔ جنگ کا خوف اس کی راتوں کی نیند حرام کر رہا ہے۔ ایٹمی ہتھیاروں اور کیمیائی بموں کے خوف نے اس سے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بھی چھین لی ہے' عدمِ تحفظ کا یہ نتیجہ نکلا ہے کہ اس کا ردعمل انتقام کی

صورت میں سامنے آیا ہے۔ وہ سامنے کی ہر چیز کو ختم کر دینا چاہتا ہے معاشرتی ڈھانچہ بکھر رہا ہے۔ اعتماد اور احترام کی فضا کو انسان کے اندر کا خلا نگل رہا ہے' شرح طلاق میں اور خود کشی کی وارداتوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔ الغرض آج کا پورا سماجی نظام درہم برہم ہو رہا ہے اور انسان جنگ کی تباہ کاریوں کے پس منظر میں اجتماعی خود کشی کے دہانے پر کھڑا ہے دہشت گردی نے امن و امان کی دھجیاں بکھیر دی ہیں ادارے ٹوٹ رہے ہیں' سسٹم تباہ ہو رہا ہے اور جمہوریت کے نام پر جمہوری اداروں کو اپنی انا کی قربان گاہ پر قربان کیا جا رہا ہے۔ قتل و غارت گری کا بازار گرم ہے۔ سودی نظام نے انسان کے جسم کا آخری قطرہ تک نچوڑ لیا ہے۔ قحط اور بد حالی کا عفریت منہ کھولے ہر شے کو نگل جانا چاہتا ہے' شرفِ انسانی کی بحالی کا ہر تصور نفسانی خواہشات کے ملبے تلے دفن ہو چکا ہے' یہ عمومی تصویر ایشائی ممالک کی ہی نہیں مغربی ممالک اس سے بھی دو ہاتھ آگے ہیں۔ وہ مغربی معاشرہ جو ہمارے لئے ایک مثالی معاشرہ بنا دیا گیا ہے جس کی مصنوعی روشنیوں میں ہم اپنا چہرہ پہچاننے کا ہنر بھی کھو بیٹھے ہیں اور اپنے تشخص کو مغربی افکار کے سیلاب کی نذر کر کے اپنی تباہی پر تالیاں بجانے کا فریضہ سرانجام دے رہے ہیں اپنی نسلوں کا مستقبل گروی رکھ کر مطمئن ہیں کہ ہم نے اپنے چند روزہ اقتدار کے لئے مضبوط ہاتھوں کی ضمانت حاصل کر لی ہے اور نہیں جانتے کہ ایسا کر کے ہم نے اس عہد نامے پر دستخط کر دیئے ہیں جو ہماری اجتماعی خود کشی کی مصدقہ دستاویز ہے کہ وقت کی عدالت اس عہد نامے کے ایک ایک لفظ کی توثیق کر کے ہمارے لئے سوچ کا ہر دروازہ بند کر چکی ہے اور شاید اسکے ساتھ توبہ کا دروازہ بھی بند ہو چکا ہے۔

انقلاب کی سطحیں

اس مجوزہ انقلاب کے لئے جس طرح آسمانی اور نبوی ہونا ضروری تھا وہاں یہ بھی لازم تھا کہ وہ انسان کے اندر کم از کم تین سطحوں پر بپا ہو۔ اس کی وہ تین سطحیں درج ذیل ہیں۔

۱۔ علمی، فکری، نظریاتی اور اعتقادی سطح
۲۔ عملی و واقعی سطح
۳۔ روحانی و جذباتی سطح

۱۔ علمی، فکری، نظریاتی اور اعتقادی سطح پر انقلاب آفریں تبدیلیاں لائے بغیر انقلاب کا ہر تصور ادھورا رہتا ہے۔ اس لئے اول سطح پر لازم تھا کہ انسان کے فکر و نظر اور نظریہ و اعتقاد کی اصلاح ہو۔ اسے ایک ایسا عقیدہ و نظریہ نصیب ہو جو عقل سلیم اور علم بالغ کے مطابق ہو اور اسے زندگی کا ایک واضح نصب العین بھی دے جو فرد کے لئے شخصی کمال اور معاشرے کے لئے اجتماعی کمال کا باعث ہو۔ جبکہ اس نصب العین کا حصول ہی دنیا و آخرت میں فتح و غلبہ اور نجاتِ کامل کی ضمانت ہو۔ غرض ایک ایسا عقیدہ اور ایسا نظریہ جو خود بھی متحرک ہو اور حیاتِ انسانی کے لئے مثبت سمت میں تحرک کا ضامن بھی ہو، انسانیت کی اشد ضرورت تھی۔

۲۔ تحریک کے ساتھ لازم ہے کہ اس محرک پر عملی اقدام کرنے والوں کو مکمل عملی وواقعی لائحہ عمل اور بھرپور حکمت عملی کے ذریعے حتمی کامیابی کی ضمانت بھی دی جائے۔

غرض ایک ایسا مکمل ضابطہ حیات (Code of life) جو نظریے کے عین مطابق ہو اور ایک ایسی عملی راہنمائی جو عقیدے اور نظریے کی قدم قدم پر توثیق کرتے ہوئے کامیابی کی ضمانت مہیا کرے، نہ صرف انسانیت کی بلکہ خود اس نظریے اور انقلابی عقیدے کی بھی ضرورت تھی۔

۳۔ انسانی جذبات، عملی رجحانات اور اعتقادی مقتضیات ایک دوسرے سے متصادم ہو جائیں تو انسانی شخصیت توڑ پھوڑ کا شکار ہو جاتی ہے، فطرت کے تضادات درست طریق پر رفع نہ کئے جائیں تو نظریہ کھیل اور نظامِ حیات ایک تماشا بن جاتا ہے۔ جذبات کی رو کو بہنے کے لئے درست سمت نہ دی جائے تو افکار و نظریات اور ان کا عملی ڈھانچہ سبھی کچھ دھرے کا دھرا رہ جاتا ہے۔ اس کی ایک سادہ سی مثال شراب کی برائی ہے۔ علمی

اساطین یورپ وامریکہ اس بات پر مکمل اور بھرپور عقیدہ رکھتے ہیں اور سائنسی تحقیق کی بنا پر اسے برملا ثابت بھی کرتے ہیں کہ شراب انتہائی نقصان دہ چیز ہے' عوام بھی اس حقیقت کے انکار کی مجال نہیں رکھتے لیکن اس کے باوجود وہ اسے ترک نہیں کرپاتے کہ "دل نہیں چاہتا" "جی کو بھلی لگتی ہے" یعنی جہاں جذبات اور علم کے مابین تضاد آیا وہاں بالعموم جذبات ہی کی حکمرانی چلتی ہے اور علم و عقل کو پس پشت ڈال دیا جاتا ہے۔ ہٰذا لازم ہوا کہ عقیدہ و عمل کو قائم رکھنے اور ماننے والوں کو علم پر قائم رکھنے کے لئے جذبات کو اس رخ پر ڈھالا جائے اور ایسے مرکز پر جمع کر دیا جائے کہ ایک طرف وہ خود بخود انسانی عقل کو عقیدے کی مطابقت میں چلائے اور دوسری طرف جمیع وابستگان نظریہ کو ایک وحدت کی لڑی میں بھی پرودے۔

یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ آقائے نامدار ﷺ بیک وقت ان تینوں محاذوں پر مصروف عمل ہیں اور جو انقلاب آپ ﷺ زمانے بھر میں متعارف کرواتے ہیں وہ ہمہ گیر اور کائناتی انقلاب ہے جسے "مصطفوی انقلاب" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

۱۔ فکری سطح پر انسانی شعور کی تکمیل کا سامان ہے۔

۲۔ عملی سطح پر انسانی قوائے ارادہ و عمل کے لئے مکمل ضابطۂ حیات اور کامل نمونۂ کمال ہے۔

۳۔ روحانی سطح پر اخلاقی کمال کے حصول کا مثالی وواقعی طریقہ ہے۔

مختصر لفظوں میں یہ کہ یہ انقلاب شعور' تحت الشعور اور لاشعور کے جمیع تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔ انہیں متضاد و متصادم قوتوں کی شکل دینے کی بجائے باہم ہم آہنگ و متعاون قوی کی صورت میں ابھارتا ہے۔ اس طرح انسانی شخصیت کو ٹوٹ پھوٹ کے عمل سے بچا کر اپنی تکمیل کی طرف "یکسوئی" کے ساتھ گامزن کرتا ہے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ معاشرے اور ماحول کی طرف سے بھی مزاحمت کو ختم کرکے موافقت مہیا کرتا ہے اس کی تفصیل میں جانے کا تو یہ موقع نہیں۔ سردست صرف اس قدر دیکھنا ہے کہ تشکیل معاشرہ کی جو ایک نئی ضرورت ایسی تھی کہ جس کی تکمیل کی

ذمہ داری حق تعالیٰ شانہ نے آقائے دوجہاں ﷺ کے مبارک کاندھوں پر ڈالی تھی۔ اسکی نوعیت کیا ہونی چاہیے تھی۔ بالفاظ دیگر انسانیت اس وقت کس شئے کی ضرورت مند تھی اور نبی اکرم ﷺ نے اس ضرورت کو کس حد تک پورا کیا؟ یہ بات جاننے کے لئے ہم درج ذیل حقائق پر غور کریں گے۔

۱۔ زمانہ بعثت مصطفوی ﷺ کے وقت دنیا کی حالت کیا تھی؟

۲۔ زمانہ بعثت مصطفوی ﷺ کے وقت دنیا کی ضرورتِ انقلاب کیا تھی؟

زمانۂ بعثتِ مصطفوی ﷺ اور انسانیت کی حالت زار

اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے ہمارے پاس ایک طریق تو یہ ہے کہ اس زمانے کے تفصیلی حالات و واقعات کا تجزیہ کرکے متعلقہ امور پر روشنی ڈالی جائے لیکن اس کے لئے سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں صفحات درکار ہونگے ہمارا موضوع ان تفصیلات کا متحمل نہیں ہو سکتا دوسری شکل یہ ہے کہ مختصر تجزیہ کرکے واقعات و حالات حیطۂ تحریر میں لائے جائیں لیکن ہم اس مقام پر محض اشارات اور ان پر مترتب ہونے والے تجزیاتی نوٹ پر اکتفا کریں گے اور اسمیں بھی حتی الوسع اختصار کے پہلو کو سامنے رکھیں گے۔

آقائے نامدار ﷺ کے عہد مبارک میں دنیا میں درج ذیل مقامات قابل ذکر ہیں۔

(ا) ایران: یہ ایک عظیم و غالب و قاہر زرتشتی / مجوسی سلطنت اور اسکی حیثیت سپرپاور (Super Power) کی تھی۔

(ب) روم: یہ ایک عظیم عیسائی سلطنت تھی جو مجموعی طور پر دوسری سپرپاور کی حیثیت رکھتی تھی اور ایران کی ٹکر کی تھی۔

(ج) ہندوستان: یہ چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹا ہوا بہت بڑا علاقہ تھا جو ایران اور چین کے ساتھ ملتا تھا۔

(د) چین: یہ کنفیوشس کی سرزمین تھی جس پر بدھ مت کا غلبہ تھا۔

(ہ) مصر: فراعنہ کی سرزمین جس پر کبھی ایران اور کبھی روم غالب آجاتا تھا۔

(و) شام: یروشلم کی زمین جو بالعموم کبھی روم کے اور کبھی ایران کے تسلط میں رہتی نیز یہود و نصاریٰ کے باہمی خون خرابے کا مظہر بنی رہتی۔ فلسطین کے علاوہ آج کے تین دوسرے ممالک مثلاً مصر، اردن وغیرہ بھی اس میں ہی شامل تھے۔

(ز) عراق: بابل اور نینوا کی سرزمین جو زیادہ تر ایران کے زیر تسلط رہی۔

(ط) یمن: یہ جزیرہ نما کا وہ علاقہ ہے جو صنعاء کی سرزمین ہے۔ جزیرہ نمائے عرب کے جنوب اور بحر احمر کے مشرق میں واقع ہے آج کل حضرموت بھی اس کا حصہ ہے۔

(ظ) جزیرہ نمائے عرب: (خاص طور پر سرزمین حجاز، نجد، التہامہ اور حبشہ وغیرہ

یوں تو ان میں سے ہر علاقہ اپنی ایک جدا تاریخ رکھتا ہے لیکن سردست ہمارے پیش نظر نہ تو کسی علاقہ کی تاریخ کا جائزہ لینا ہے اور نہ کسی تہذیب کے ارتقاء ہی پر گفتگو مقصود ہے لہذا ہم صرف ان حکومتوں کے بارے میں گفتگو کریں گے جو بالعموم حضور ﷺ کی بعثت مبارکہ کے وقت صاحبِ تسلط تھیں اس وقت کے سیاسی حالات، اقتصادی رجحانات، معاشرتی مزاج، قانونی تحرک کا رخ، اخلاقی زبوں حالی اور مذہبی و نظریاتی فرسودگی پر ایک سرسری نگاہ کے لئے صرف ایران اور روم ہی کا تذکرہ کافی ہے۔ لیکن ہم نظریاتی رخ میں اختلاف کی بناپر اور سیاسی مزاج کی نسبت ذرا سا مختلف ہونے کی وجہ سے ہندی معاشرے کا تجزیاتی مطالعہ بھی کریں گے۔ تاکہ بعثتِ نبوی جو مصطفوی انقلاب کا نقطۂ آغاز تھا کے پس منظر کے ساتھ اس کا پیش منظر بھی واضح اور روشن ہو سکے۔ آئندہ سطور میں ہم درج ذیل علاقہ جات کا سرسری سا جائزہ لیں گے۔

۱۔ ایران (Iran)

۲۔ روم (Rome)

۳۔ ہندوستان (India)

ان ممالک کے باشندگان کی زندگی کا مذہبی، سیاسی، اقتصادی، معاشرتی، اخلاقی اور قانونی اعتبارات سے جائزہ لیں گے اور اس حوالے سے بعثتِ نبوی اور مصطفوی انقلاب کی شروعات پر اظہار خیال کریں گے۔

باب-۲

سلطنت ایران

یہ قیصر و کسریٰ کا دور تھا۔ اپنے زمانے کی دو سپرپاورز تھیں۔ سرد جنگ ان کے درمیان بھی جاری رہتی' اس زمانے میں جمہوری شعور کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بادشاہت اپنی تمام تر قباحتوں کے ساتھ انسانیت کے گلے کا ہار بنی ہوئی تھی' ملوکیت کی گرفت اس قدر مضبوط تھی کہ عام آدمی کی انفرادی اور اجتماعی اکائی کا عملاً انکار کر دیا گیا تھا اس کی زندگی اور موت حکمرانوں کے اختیار میں تھی' وہ صرف بادشاہوں کی انا کی بھٹی کا ایندھن بن کر سلگ سکتا تھا لیکن حرف شکوہ زبان پر نہیں لا سکتا تھا۔ ایران کا تاج شاہی بھی رعایا کے خون کے موتیوں سے چمک رہا تھا۔ بلوچستان' کچھ' مکران' کرمان' خراسان' نمود' باقیان' ہندوکش' سیستان' زابلستان' ماوراء النہر' رشت' اصفہان' مازندران' استر آباد' گرگان' فارس' لارستان' خورستان' افغانستان' کابلستان' پنجاب' کردستان' شیروان' بابل' موصل اور دیار بکر سلطنت ایران کا حصہ تھے۔

اس سلطنت کی وسعت کا اندازہ کرنے کے لئے اس میں شامل علاقہ جات کے بارے میں جان لینا ہی کافی ہے۔

(۱) موجودہ ایران اس عظیم سلطنت کا محض ایک صوبہ تھا۔

(۲) موجودہ پاکستان کے بہت سے علاقے اور خاص طور پر بلوچستان کا ایک بڑا رقبہ بلکہ موجودہ صوبہ سرحد کا بھی اچھا خاصہ علاقہ (خاص طور پر افغانستان سے ملحقہ) اس وقت کے ایران میں شامل تھا۔

(۳) بابل' موصل' دیار بکر اور کردستان کے الفاظ اس حقیقت کی غمازی کر رہے ہیں کہ موجودہ عراق کا بہت بڑا رقبہ خاص طور پر کردستان اور موصل کو آج کے نقشے میں دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ نینوا' اربل' کرکوک ایران ہی کی دسترس (Range) میں تھے۔ غرض کہ عراق کا ایک معتد بہ حصہ اور بعض اوقات مکمل عراق اور اس کے پار دمشق یعنی شام اور فلسطین کا علاقہ بھی ایران کی سلطنت میں شامل رہا ہے (جب ہم شام کی بات کرتے ہیں تو اس سے مراد یقیناً آج کا شام نہیں ہوتا) بلکہ وہ شام ہے کہ جس

کے اندر موجودہ لبنان اور اردن بھی شامل تھا (کیونکہ اسلامی دور کے شام کو موجودہ سامراج نے چار حصوں میں تقسیم کر دیا تھا لبنان، شام، فلسطین اور اردن)

(۴) موجودہ افغانستان بھی اس دور کی عظیم ایرانی سلطنت کا باقاعدہ حصہ دکھائی دیتا ہے۔

(۵) اس سلطنت کی سرحد ایک طرف چین سے اور موجودہ وسط ایشیا کی آزاد ریاستوں سے ملتی دکھائی دیتی ہے۔

(۶) بعثت مصطفوی ﷺ کے بعد ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ایران کی سلطنت سارے روم پر قبضہ کر کے ہرقل کو قسطنطنیہ میں پابند کر چکی تھی۔

مختصر یہ کہ ایران کی سلطنت اتنی عظیم تھی کہ ایک وقت اس پر ایسا بھی آیا کہ اس کی سرحد ایک طرف سندھ وہند کے ساتھ ساتھ چین اور روس کے ساتھ ملتی ہوئی بحیرہ قزوین (Caspian sea) تک جاتی تھی تو دوسری طرف اس کی فوجیں عراق، شام، اردن، لبنان، فلسطین، مصر اور کویت تک ہی نہیں بلکہ اس سے بھی آگے بہت آگے انقرہ اور پھر بورسا (Bursa) اور ٹرائے (Troy) تک جا کر استانبول کے سامنے پڑاؤ ڈالے ہوئے تھیں۔ اس طرح موجودہ ترکی ان کے تسلط میں، موجودہ یونان ان کے بائیں ہاتھ میں، بحر اسود (Black Sea) دائیں ہاتھ میں اور یورپ کا دروازہ براہ راست ان کے سامنے تھا۔ یہ وہ عظیم سلطنت تھی کہ آقائے دوجہاں ﷺ کی زبان اقدس سے ادا کردہ چند الفاظ اس کے زوال کی ایک عبرت ناک داستان میں تبدیل ہو گئے۔ تہذیبوں کی ایک ایسی گزر گاہ تھی جو ہندوستان اور چین سے لے کر مصر، شام اور عراق کی مسلمہ تہذیبوں سے خود متاثر تھی اور ان سب کو اپنی تاثر پذیری سے متاثر کرتی تھی۔ اسے قرآن مجید کی ایک ہی آیت نے اس کے انتہائی عروج کے دور میں دائمی زوال کی سند جاری فرما دی تھی۔ طاقت، بربریت اور نشہ اقتدار کی ایک ایسی پناہ گاہ جسے اس کی تاریخ کے بہترین عروج کے دور میں صرف تاجدار کائنات ﷺ کے ایک نامہ مبارک کی بے ادبی کرنے کے جرم میں فطرت نے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اس

کو تاریخ کے بدترین زوال سے دوچار کردیا۔

جیساکہ ہمیں معلوم ہے کہ ایران کے ایک طرف ہندوستان و چین' ایک طرف ایشیائے کوچک' ایک طرف بحیرہ روم اور ایک طرف یورپ تھا۔ اس طرح یہ ایک تہذیبی سنگم تھا جو مشرق و مغرب کو ایک دوسرے سے ملاتا تھا۔ اس اعتبار سے یہ دونوں اطراف واکناف کی تہذیبوں پر اثر انداز بھی ہوتا تھا۔

اس سلطنت کے شمال کی جانب سرحد پر کوئی مضبوط حفاظتی انتظام نہیں تھا۔ جس کی ایک وجہ شاید یہ بھی تھی کہ اس کی ضرورت محسوس نہ کی گئی ہو کیونکہ اول تو موجودہ وسط ایشیائی ریاستیں خود کوئی باقاعدہ بڑی سلطنت نہ تھیں جن کے خلاف کوئی بند باندھا جاتا بلکہ یہ ایک طرح سے قبائلی طرز پر آپس میں دست وگریباں رہتے تھے اور اگر کوئی ایران پر حملہ آور ہوا بھی تو قابل ذکر کامیابی حاصل کرسکا اور نہ کوئی مستقل حکومت ہی قائم کرسکا۔ مختلف حملہ آور قومیں آتی رہیں مثلاً تورانی' غز' مغل' تاتاری' ترکمان' ازبک وغیرہ ایران پر حملے سائبریا کے جنوبی صحراؤں' منگولیا اور ترکستان سے ہوتے رہے۔ یہ لوگ جہاں ایران کو تباہ کرتے رہے وہاں اس پر اپنا کسی قسم کا اثر چھوڑنے کی بجائے یہاں سے متاثر ہوکر جاتے تھے۔ نیز یہ تہذیبی اثرات ایشیائے کوچک اور ہندوستان تک انہی ذرائع سے پہنچتے رہے۔ زرتشت کا اثر یا کم از کم اس کا نام ایران پر تقریباً سترہ صدیاں راج کرتا رہا۔ لیکن سردست ہمارے موضوع سے براہ راست متعلق حصہ ساسانیوں کا عہد ہے۔ عہد ساسانیاں کا آغاز اردشیر اول سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد ایک اجمالی خاکہ درج ذیل ہے۔

بادشاہ کا نام	سن حکومت
شاپور اول	۲۴۱۔۲۷۲ء
ہرمزد اول	۲۷۲۔۲۷۳ء
بہرام اول	۲۷۳۔۲۷۶ء
بہرام دوم	۲۷۶۔۲۹۳ء

بہرام سوم	۲۹۳۔۲۹۳ء
نرسی	۲۹۳۔۳۰۳ء
ہرمزد دوم	۳۰۳۔۳۱۰ء
آذر نرسی	۳۱۰۔۳۱۰ء
شاپور دوم	۳۱۰۔۳۷۹ء
اردشیر دوم	۳۷۹۔۳۸۳ء
شاپور سوم	۳۸۳۔۳۸۸ء
بہرام چہارم	۳۸۸۔۳۹۹ء
یزدجرد اول	۳۹۹۔۴۲۰ء
بہرام پنجم	۴۲۰۔۴۳۸ء
یزدجرد دوم	۴۳۸۔۴۵۷ء
ہرمزد سوم	۴۵۷۔۴۵۹ء
فیروز	۴۵۹۔۴۸۴ء
بلاش	۴۸۴۔۴۸۸ء
قباذ اول	۴۸۸۔۵۳۱ء
خسرو اول (نوشیرواں عادل)	۵۳۱۔۵۷۹ء

اس کے آخری دور میں یعنی ۵۷۱ء کے اپریل میں حضور ختمی مرتبت ﷺ کا میلادِ پاک ہے۔ آپ کی ولادت باسعادت ہوئی اور آپ ﷺ کے پیکر بشریت نے ظہور فرمایا۔ گویا یہ دور ظہور قدسی کا دور تھا۔

ھرمزد چہارم	۵۷۹۔۵۹۰ء
ھرمزد پنجم	۵۹۰۔۶۲۸ء

اسی دور کے درمیانی عرصے میں (کم و بیش ۶۱۰ء) حضور علیہ السلام کی بعثت مبارکہ ہوئی۔ جبکہ اسی کے دور آخر میں (لگ بھگ ۶۲۲ء) آپ ﷺ نے مدینہ

شریف کی طرف ہجرت فرمائی۔

قباذ دوم ۶۲۸ـ ۶۲۸ء

اردشیر سوم ۶۲۸ـ ۶۳۰ء

اس کے بعد متعدد چند روزہ حکمران آئے۔ بالآخر آخری ساسانی بادشاہ یزدجرد سوم برسر اقتدار آیا اور ۶۳۰ء سے ۶۳۲ء تک ایران پر مسلط رہا۔

اس موقع پر ہم خاص طور پر جس عہد سے بحث کریں گے وہ خسرو اول یعنی نوشیرواں عادل کا دور آخر ہے پھر ہرمزد چہارم' خسرو دوم کے دور کا آخر تک ہے ہمیں صرف یہ دیکھنا ہے کہ اس دور میں ایران کی حالت کیا تھی؟

ایران کی مذہبی حالت

انسان بہت جلد ضعیف الاعتقادی کا شکار ہو جاتا ہے دل کے آبگینوں کو ذرا سی ٹھیس پہنچے تو یہ توہمات کی دلدل میں اتنی دور تک دھنس جاتا ہے کہ اس کی حیات نو کے تمام امکانات ختم ہو جاتے ہیں۔ ایرانی بھی غبار جہالت میں گم تھے۔ اہل فارس کے اعتقادات کے بنیادی امتیازات درج ذیل تھے جو انہیں دنیا کی دیگر اقوام کی برادری میں کئی حوالوں سے منفرد بناتے تھے' اور کئی حوالوں سے انہیں معبد کی تاریکیوں کا حصہ گردانتے تھے۔

خدا کا تصور

ایران کے باشندے مظاہر پرست تھے' روشنی' آسمان' آگ' ہوا وغیرہ وہ تمام اشیا جو نفع بخش ہوتیں' قابل پرستش سمجھی جاتیں۔ خاص طور پر سورج دیوتا سب سے بڑا اور اہم تھا۔ اہم خدا وارونا (Varuna) اور متھر (Mithere) تھے۔ موخرالذکر کو متھر اس لئے بھی کہتے ہیں کہ یہ ایک طرح سے سورج دیوتا کا دوسرا نام تھا۔ اسی طرح ایک مقدس بیل کی پوجا بھی کی جاتی تھی جس کا نام ھوما تھا۔

زرتشت

ایسے میں زرتشت آیا اور اس نے توحید کا پیغام دیا۔ ایک خدا کی پوجا کا درس دیا جس کا نام اہورامزدا تھا لیکن رفتہ رفتہ ایک مرتبہ پھر وہی پرانے خدا لوٹ آئے اگرچہ ان کا درجہ کبریائی ہرگز اہورامزدا جتنا نہ تھا۔

ان سب باتوں کے علاوہ ایک اور قادر مطلق کا بھی اضافہ ہو گیا جو اہرمن کے نام سے پکارا گیا۔ اس کو برائی اور شر کا خدا مانا گیا جبکہ اہورامزدا سراپا قوت خیر کا نام تھا لہٰذا قادر مطلق ایک دوسرے کے آمنے سامنے آ گئے۔ خیر و شر کی اس ازلی ابدی لڑائی میں کبھی خیر کا خدا جیت جاتا کبھی شر کے خدا کا پلہ بھاری رہتا۔

آگ کی پوجا

زرشتی زرتشت کے بعد جہاں دیگر خداؤں کے تصور کو واپس لے آئے تھے وہاں آگ کی پوجا بھی شروع کر دی تھی۔ چونکہ زرتشت کی تعلیمات میں آگ کی تقدیس کا تصور موجود تھا اس لئے اپنی آنکھوں سے آگ کی ہیبت و طاقت دیکھی تو پرانے شرک کے خوگر دل وہیں ڈھیر ہو گئے۔ آگ کی تقدیس کا تصور آگ کی پرستش کی صورت میں ظاہر ہوا اور زرتشت کے اصل تصورات کے مفقود ہو جانے کی بنا پر آگ کی پوجا شروع ہو گئی۔ یہ آگ ان کے رگ و ریشے میں رچ گئی اور قلوب واذہان میں بس گئی۔

آقائے نامدار ﷺ کے عہد مبارک میں ایرانیوں کا غالب نظریہ یہی تھا اور آگ کی پرستش ہی ایران کا سرکاری مذہب تھا۔

تین طرح کی آگ

جب عقائد انسانی توہم پرست ذہن کی گرفت میں آ جائیں تو انسان کا ذہنی فتور ان کی شکل مسخ کر دیتا ہے۔ ایسی صورت میں آسمانی ہدایت بھی قطع و برید سے محفوظ نہیں رہتی اور عقل عیار سو بہانے تراش لیتی ہے اور عقائد میں ملاوٹ کا عنصر

شامل ہو جاتا ہے لیکن یہی نہیں ساتھ ہی ساتھ وہ نظریہ اس کے بنانے والے کے ذہنی تحفظات اور مادی مفادات کی حفاظت کا بھی سامان کرتا ہے۔ اس فطری اصول پر ہی آتش پرستوں کا نظریہ و عقیدہ بھی مبنی تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس نظریے کے ماننے والوں نے مذہب کے نام پر اجارہ داریاں قائم کیں۔ ایک ہی مذہب کے ماننے والوں کو کئی خانوں میں تقسیم کر کے رکھ دیا۔ مذہب کو جب سیاست کے تابع کر دیا گیا تو ایران کی مجلسی زندگی ایک نہ ختم ہونے والے ذہنی انتشار اور فکری خلفشار کا شکار ہو گئی۔ یہ مذہبی اجارہ داری طبقاتی کشمکش کا باعث بنی اور ایرانی من گھڑت اور خود ساختہ روایات کی دلدل میں اترتے چلے گئے اور پورا سماج نا آسودگیوں کے جہنم میں جلنے لگا۔ جس طرح ہندوستان میں برہمن نے اپنے ہموطنوں کو ذات پات کے غیر انسانی رویے سے روشناس کرایا بالکل اسی طرح ایران کے مذہبی اجارہ داروں نے بھی تقسیم در تقسیم کے اصول پر عمل جاری رکھا۔ مذہبی رہنماؤں نے آگ کی تین قسمیں بنا ڈالی تھیں جو معاشرے کے تین طبقات کے لئے جدا جدا تھیں۔ ان تینوں کے مقامات جدا اور نام جدا تھے جبکہ ان کو پوجنے والے طبقات بھی جدا تھے۔ ان کے نام حسب ذیل ہیں۔

(ا) آذر فرنبگ۔ یہ آگ علماء اور مذہبی پیشواؤں کی آگ تھی۔

(ب) آذر گشنسپ۔ یہ سپاہیوں اور بادشاہوں کی آگ تھی۔

(ج) آذر برزین مہر۔ یہ زراعت پیشہ افراد کی آگ تھی۔

یہ تین آتش ہائے بزرگ تھیں جو الگ سے خاص طور پر محفوظ کی گئی تھیں۔

آخرت کا عقیدہ

آخرت کا عقیدہ اصولی طور پر تو پایا جاتا تھا یعنی کہ مرنے کے بعد دائمی راحت و سکون (جنت) اور دائمی عذاب و تکلیف (دوزخ) انسان کے عمل کے مطابق ہوتا ہے لیکن اس کی تفصیلات و جزئیات کا کہیں کوئی تصور نہیں پایا جاتا۔ پھر اسے بھی مذہبی اجارہ داروں نے اپنی رضا و خوشنودی اور اپنی دعاؤں اور سفارشات کے ساتھ مخصوص کر لیا

تھا۔

رسالت کا عقیدہ

ایرانی قوم کے کسی فلسفہ میں کسی مقام پر رسالت کا تصور حاوی دکھائی نہیں دیتا۔ بلکہ عامۃ الناس میں تو اس کا کہیں وہم و گمان تک نظر نہیں آتا۔ یہ کہنا یقیناً بے جا نہ ہو گا کہ زرتشت اور مجوسیت میں نبوت و رسالت کا فکری وجود بھی کہیں نہیں ملتا؟ خدا کے برگزیدہ اور محبوب بندہ ہونے کا تصور تو ان میں ضرور تھا۔ مگر اس کو ایک تو مذہبی اجارہ داری کو قائم کرنے کے لئے اختیار کیا گیا تھا اور دوسرے اس کے پس منظر میں سیاسی مقاصد تھے جن کی خاطر بادشاہوں کو خدا کا برگزیدہ بندہ قرار دیا گیا تھا۔ اس کی اصل شکل کیا تھی؟ اس کا بیان آگے آئے گا۔

جادو اور نجوم

ان کے ہاں تقدیر کا بھی باقاعدہ کوئی تصور نہیں پایا جاتا تھا۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ اس کی بجائے ان کے ہاں جادو وغیرہ پر بھروسہ اور علم نجوم پر اعتقاد بہت زیادہ تھا۔ کوئی قدم اٹھانے سے قبل نجومیوں اور جوتشیوں کے در کی دریوزہ گری کرنا پڑتی تھی۔ ضرورت تھی کہ کوئی برگزیدہ ہستی انہیں ان پستیوں سے نکال کر ایک رب پر بھروسہٗ کرنا اور اس کے لکھے پر صبر کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی رضا کی خاطر محنت اور مجاہدہ کی راہ پر گامزن ہونے کی خوئے دلنواز عطا کرے۔

صحیفہ آسمانی

اہل ایران کا ایک مسئلہ آسمانی کتاب سے محروم ہونا بھی تھا۔ ان کے یہاں سرے سے آسمان سے ملائکہ کے ذریعے نازل کردہ کتب کا تصور ہی مفقود تھا۔ زرتشت ہی ان کا فرشتہ تھا اور اس کی تعلیمات ہی آسمانی صحیفہ تھیں۔ مذہبی اجارہ داروں کی تحریف شدہ تعلیمات ان کے لئے کافی تھیں۔ جس طرح بزرگی اور خدا کی مقبولیت کی

سند صرف اور صرف شاہی خاندان اور مذہبی خاندان کے لئے خاص تھی اور اس نے تصور رسالت کو کسی حد تک پورا کر دیا تھا اسی طرح شاہی خاندان اور مذہبی خاندان کی مرضی اور اجارہ دارانہ تعلیمات نے آسمانی صحیفہ کی جگہ لے لی تھی۔ اور بالعموم جب ایسا ہوتا ہے تو ملائکہ کی جگہ بدروحیں' جنات اور توہمات کے دیو لے لیتے ہیں اور کہانت و نجوم پر اعتقاد پختہ ہو جاتا ہے۔ سو وہ جادو ٹونے کے حصار سے باہر نہیں نکل سکے تھے اور گمراہی و جہالت ان کا مقدر بن چکی تھی۔

مقدس اشیاء

ان کے ہاں مقدس اشیاء کئی ہیں لیکن زیادہ تر مقدس اشیاء یا یوں کہیں کہ تقدیس مآب اشیاء درج ذیل ہیں۔

(۱) آگ (۲) پانی (۳) مٹی (۴) کتا (۵) بیل (۶) بلاؤ

مثلاً آگ مٹی پانی وغیرہ کی تقدیس کی کیفیت عجیب انداز میں پائی جاتی ہے۔ انہیں کسی شے سے آلودہ ہونے سے بچانا زیادہ اہم ذمہ داری ہے۔ مثلاً آگ کو اپنے سانس سے بچانا ہے کیونکہ اگر یہ احتیاط نہ کریں تو سانس کی گندگی آگ تک پہنچ جائے گی اور اس کی طہارت و پاکیزگی آلودہ ہو گی۔ حتی کہ مذہبی امور کی انجام دہی کے دوران خاص خاص پجاری بھی اپنے منہ اور ناک کو کپڑے سے لپیٹ لیتے تھے۔

اہل ایران پانی کو بھی بہت زیادہ عزت کی نگاہ سے دیکھتے اور اس کا غایت درجہ ادب کرتے تھے۔ اس ادب اور احترام کا سبب بھی یہی تھا کہ وہ پانی کو نہایت مقدس شے جانتے تھے بلکہ اس کی تقدیس میں وہ پانی کو چھوتے بھی نہیں تھے۔ اس سے منہ نہیں دھوتے تھے۔ مبادا اس میں آلودگی پیدا ہو جائے۔ اگر پانی کو کسی طرح چھونے کی کوئی صورت تھی تو وہ صرف اس قدر کہ اسے پینا ہوتا یا پھر اس سے پودوں کو سیراب کرنا ہوتا۔ ورنہ پھر اس سے تطہیر کے لئے کچھ مذہبی رسوم ہوتیں جنہیں بیان کردہ مذہبی طریق پر پانی استعمال کیا جاتا۔

کتے کو نہایت مقدس اور اہم سمجھا جاتا تھا کیونکہ یہ ایک مفید جانور تھا۔ اور مفید اشیاء (خاص طور پر جانور) ان کے اعتقاد کے مطابق نیکی کے خدا اور خیر کے خالق اہورامزدا نے تخلیق فرمائی تھیں لہٰذا جو چیز اہورامزدا کی تخلیق شدہ تھی اس کا ادب احترام کرنا اور اس کا خیال رکھنا گویا ایک مذہبی فریضہ تھا جس کی بجا آوری ایک ضروری امر تھا جیسا کہ نقصان دہ اور مضرت رساں اشیاء چونکہ اہرمن کی تخلیق کردہ تھیں مثلاً مرغ، مکھیاں، چیونٹیاں، کیڑے مکوڑے اور اسی طرح حیوانات مفترسہ وغیرہ لہٰذا انہیں صرف اس اعتقاد کی بنا پر کہ یہ شر کے خالق اور بدی کے خدا کے پیدا کردہ ہیں تلف کر دینا تک لازم تھا بلکہ ان کا مار دینا اور ایسی اشیاء کا مٹا دینا کارِ ثواب تھا۔ یہ وہ باطل اعتقاد تھا جس کی بنا پر کتے اور بیل جیسے جانوروں کو مقدس سمجھا جاتا تھا۔ حیرت ناک حد تک عجیب بات یہ ہے کہ اس ناپاک و نجس اور بالعموم بے شمار طرح طرح کی بیماریاں ساتھ لے کر گھومنے والے جانور کو عام طور پر انسان کے برابر کا درجہ دیا جاتا تھا۔ لیکن عجیب تر بات یہ تھی کہ ایک شخص کے لئے کتا اپنی اہمیت و تقدیس کے اعتبار سے اپنی بیوی اور بچے سے زیادہ محترم سمجھا جاتا تھا۔ آج کے "ترقی یافتہ" یورپ میں بھی (جہاں صرف سائنس اور علوم نے ترقی کی ہے جبکہ نظریات و معتقدات میں بالعموم وہی پسماندگی اور زبوں حالی میں وہ بھی بالعموم اپنے اسی (Dark Ages) میں رہ رہا ہے اور ان ثقافتی بندھنوں اور معاشرتی قدروں کے چنگل سے مکمل طور پر آزاد نہیں ہو سکا) کتے اور خنزیر کو بہت اہمیت دی جاتی ہے کتے سے "قلبی و روحانی" تعلق کی کیفیت اس حد تک بڑھ چکی ہے کہ کسی کی اولاد سے بعید نہیں کہ کتے اور اپنے باپ کے مابین تقابل ہو تو وہ باپ کو چھوڑ دے اور کتے کو ترجیح دے۔ یعنی علم کی ترقی انہیں عملاً جہالت سے محفوظ نہیں رکھ سکی۔ ایران میں کتے کو بہت اہمیت دی جاتی تھی۔ اسی طرح بیل کو بھی مسند تقدیس پر بٹھایا گیا تھا یعنی اس کے روحانی درجات اس قدر بلند تھے کہ اس کا تقدس و طہارت، پاکی و ناپاکی میں امتیاز کے لائق نہ ہونے کے باوجود، اس کے بول و براز تک میں سرایت کر چکا تھا، انکے یہاں ایک طرح سے بیل پانی

سے بھی زیادہ مقدس چیز کا نام تھا۔ یہ بات اس بنا پر کہی جا سکتی ہے کہ طہارت حاصل کرنے کے لئے وہ لوگ اپنی مذہبی رسوم کے طور پر پانی کو استعمال کرتے تھے۔ لیکن اگر کوئی شے پانی سے بھی زیادہ تطہیر کا باعث تھی تو اس کا نام بیل کا پیشاب تھا (معاذ اللہ) اس سے ان کے نزدیک بیل کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔

ہو سکتا ہے کہ ہندوستان کے لوگوں میں گائے کے تقدس کا تصور ایران ہی سے آیا ہو اس امکان کے پیدا ہونے کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں مثلاً۔

(۱) یہ امر مسلم ہے کہ ہندوستان میں گائے کے تقدس کا تصور ہمیشہ سے نہیں ہے بلکہ ایک وقت وہ بھی تھا جب ہندوستان میں مذہبی قربانیوں میں سے ایک قربانی گائے کی بھی دی جاتی تھی بلکہ زیادہ تر قربانی گائے ہی کی دی جاتی تھی۔

(۲) یہ امر بھی مسلم ہے کہ ایران آریہ قوم کا مرکز تھا اور اس قوم کا مرکز ہونے کی بنا پر اس کا نام ایران پڑ گیا تھا۔

(۳) اس امر کو بھی جھٹلایا نہیں جا سکتا کہ ایران کے تہذیبی' ثقافتی' سیاسی اور معاشرتی اثرات ایک اعتبار سے پوری دنیا پر مرتب ہو رہے تھے' بالکل اس طرح جیسے آج کی سپر پاورز کا تہذیبی پیش منظر کمزور اور محکوم اقوام کے لئے بے پناہ کشش کا حامل ہے' ثقافتی یلغار سے دامن بچانا نہ آج آسان ہے اور نہ اس وقت اس کے اثرات سے بچا جا سکتا تھا۔ چین' ایشیائے کوچک کے مشرقی علاقہ جات ایران کی تہذیب و تمدن سے متاثر ہوئے۔ یہ اثرات یقیناً ہندوستان میں بھی پہنچے چنانچہ ایران کی مذہبی رسومات کا ہندوستان میں اعتقادی سطح پر اثر قبول کرنا بعید از قیاس نہیں۔

(۴) یہ امر ان سب سے بڑھ کر تاریخی اعتبار سے لائق توجہ ہے کہ یہ ایران کے آریہ قوم ہی کے افراد تھے جو نقل مکانی کر کے وادی سندھ میں آباد ہوئے اور پھر وہاں سے آگے بڑھ کر گنگا جمنا کی سرسبز و شاداب وادی پر قابض ہوئے بلکہ گنگا جمنا کی وادیوں کو سب سے پہلے آباد کرنے والے یہی آریائی لوگ تھے جو ایرانی النسل تھے لہٰذا یہ بات غبار تشکیک سے کافی حد تک پاک ہو جاتی ہے کہ بہت ممکن ہے کہ گاؤ ماتا کی ہندوانہ

تعظیم و پرستش کے پیچھے ایرانی بیل کی تقدیس والا نظریہ ہی کار فرما ہو۔

اسی طرح کی ایک رسم و عادت اُودبلاؤ کی تقدیس کی تھی۔ حتیٰ کہ حالت بایں جا رسید کہ اگر کوئی شخص اُودبلاؤ کو مار ڈالتا تو اس کی سزا کوئی معمولی جرمانہ نہیں تھی بلکہ اتنے سے جرم پر اس کی سزا دس ہزار کوڑے کی مقرر تھی۔ یہ ایک اتنی بڑی سزا ہے کہ شاید اتنی بڑی سزا پوری مجوسیت میں کسی جانور کی ہلاکت پر نہ ہو بلکہ اتنی بڑی سزا انسانی قتل کی بھی مقرر نہ ہو۔

اسی طرح مٹی کی غیر معمولی تقدیس کا بھی رواج تھا۔ حتیٰ کہ مردے کو زمین میں دفنانے کی بھی اجازت نہیں تھی۔ ایرانیوں کا عقیدہ تھا کہ اس طرح مٹی کا تقدس پامال ہوتا ہے وہ سمجھتے تھے کہ مٹی پاک اور مقدس چیز ہے۔ لہٰذا اگر اس میں مردے کو دفنایا گیا تو یہ پاک مٹی ناپاک ہو جائے گی۔ گویا مٹی کو پلید ہو جانے سے بچانے کے لئے لازم تھا کہ اس میں کوئی مردہ دفن نہ کیا جائے کیونکہ ایسا کرنے سے دھرتی ماتا کی پوترتا کو دھچکا لگتا ہے۔ جب اس مردہ جسم کے چھونے سے مٹی نجس ہو جاتی تھی تو آگ اس سے بھی کہیں زیادہ طیب و طاہر ہے۔ اس کی حرمت و تقدیس کو بچانے کے لئے مردے کو جلا دینا بھی ناممکن تھا۔ اس پر مستزاد یہ کہ اس مردے کو پانی سے غسل دینے کی بھی ممانعت تھی کہ ایسا کرنے سے یقیناً پانی ناپاک ہو جاتا ہو گا۔ مردے کو دریا برد بھی نہیں کیا جا سکتا تھا اسے غرقاب کرنا بھی ممکن نہ تھا۔

ایسا کیوں؟

اس مقام پر اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ تو اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ وہ لوگ مظاہر پرستی کے پرانے مجرم تھے۔ رب کو تو نہ جانتے تھے اور نہ ہی پہچانتے تھے۔ لہٰذا ہر مفید' یا پر عظمت و ہیبت شے کو معبود بنا لیتے۔ ان کا انگ انگ شرک کے پانی میں ڈوبا ہوا تھا۔ ان کی مثال بنی اسرائیل کے ان افراد کی تھی جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ آ جانے کے باوجود بچھڑے کی پوجا میں مست ہو گئے تھے۔

وَ اُشْرِبُوْا فِی قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ ۔ اور ان کے دلوں میں ان کے کفر کے باعث بچھڑے کی محبت رچا دی گئی تھی۔ (البقرہ' ۲: ۹۳)

یعنی ایک برگزیدہ پیغمبر کے سنگ ہونے کے باوجود بھی ان کی بڑی اکثریت میں بچھڑے کی محبت ایسی ہو گئی گویا دل میں بستا اور رگوں میں دوڑتا ہے۔

لہٰذا زرتشت توحید سے مشابہ اور ایک خداوند قدوس پر ایمان حاصل کر لینے کے باوجود بھی شرک سے پاک نہ ہو سکا۔ سورج کی پرستش سے لے کر آتش پرستی تک اور تقدیس آب و تراب سے تا بہ تقدیس گاؤ وسگ غرض ان کی مظاہر پرستی انہیں شرک پر ہی آمادہ کرتی رہی۔ ظاہر کی پوجا انہیں باطن کے حق تک پہنچنے سے روکتی رہی۔ ان کی کیفیت تو یہ تھی

خوگر پیکر محسوس تھی انسان کی نظر

اور جب حالت اس حد تک جا پہنچی کہ پیکر محسوس کے بغیر فکر و نظر کو اطمینان ہی نصیب نہ ہو سکتا ہو تو ظاہر ہے کہ

پھر کوئی مانتا ان دیکھے خدا کو کیونکر

مختصر یہ کہ ان کی اس فطرت ثانیہ نے انہیں ہمہ وقت مظاہر پرستی کی جانب راغب کئے رکھنے کی ذمہ داری نبھائی جبکہ یہی مظاہر پرستی انہیں گھما پھرا کر دوبارہ' سہ بارہ بلکہ بار بار شرک کی طرف ہی مائل کرتی رہی۔ اس پر مستزاد رسالت و تقدیر وغیرہ اور دیگر ضروری امور کا خارج از اعتقاد ہونا بھی ایک ایسا امر تھا جس نے کسی صورت انہیں راہ راست پر نہ آنے دیا اور وہ اعتقادی پستی اور فکری زبوں حالی میں وہاں تک پہنچے جہاں تک ان کے لئے پہنچ جانا ممکن تھا۔

اس سے بھی زیادہ.....

یہ تو ان کے مذہبی رنگ کی ایک جہت تھی مگر مذہبی میدان میں دو باتیں ایسی بھی تھیں جو ان سب سے بڑھ کر تھیں۔ یہ دو باتیں کسی بھی فکر میں آ جائیں تو اسے

ناقابل عمل بنادیتی ہیں اور اگر وہ فکر ان دو اشیاء کے ساتھ بھی قابل عمل رہ جائے تو شرف انسانیت کو موت کے آہنی پنجے دبوچ لیتے ہیں جبکہ تکریم آدمیت کی حیثیت قتیل مظلوم و بیکس کی سی ہو کر رہ جاتی ہیں۔ آدمی عار آدمیت اور انسان ننگ انسانیت بن جاتا ہے۔ وہ دو خرابیاں درج ذیل ہیں۔

(۱) مذہبی اجارہ داری

(۲) مذہبی تعصب

ان میں سے اول الذکر تو انسان کو انسان کا غلام بناتا ہے اور اس حد تک کہ ایک ہی مذہب کے پیروکاروں کو برابر کا درجہ دینے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ جبکہ موخرالذکر اس حد تک بدبختی سوار کراتا ہے کہ انسان کو انسان کا غلام ہی بنانے پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ ایک انسان کو دوسرے انسان کا دشمن بنا کر چھوڑتا ہے حتی کہ دوسرے کے وجود کو برداشت کرلینا بھی ایک بوجھ اور اسے دیکھنا ایک ناقابل برداشت مرحلہ بن جاتا ہے۔ اس موقع پر ہم اہل ایران کی ان چند باتوں پر نظر ڈالیں گے جو واضح کرتی ہیں کہ اہل ایران میں بھی یہ دونوں خامیاں بدرجہ اتم پائی جاتی تھیں بلکہ بعض مواقع پر تو ان کا اظہار ایسا بھی ہوا جو اس قدر شدید تھا کہ خدا کی پناہ!

مذہبی اجارہ داری

اہل ایران میں مذہبی اجارہ داری بھی نہایت عجیب انداز میں سکہ رائج الوقت قرار پائی تھی۔ اس مذہبی اجارہ داری کے حاصل کرلینے کے پس منظر میں بالعموم درج ذیل محرکات تھے۔

(۱) اقتصادی

(۲) سیاسی

(۳) معاشرتی وسماجی

یہ تین چیزیں ایسا محرک ہیں کہ اگر ان پر عمل پیرا ہوا جائے اور تینوں اقسام

کے مفادات جمع ہو جائیں تو چوتھا مفاد خود بخود آگے بڑھتا ہے اور وہ ہے۔

(۴) نفسانی خواہشات کی پوجا

کبھی اس کے برعکس بھی ہو جاتا ہے وہ یوں کہ اول نفس پرستی کا داعیہ جنم لیتا ہے پھر انسان اس کی تکمیل کی طرف قدم اٹھاتا ہے لیکن تکمیل اور شے ہے جبکہ نفس کا اشباع اور ہی کچھ بات ہوتی ہے (نعوذ باللہ) لہٰذا تکمیل اگر ہو بھی جائے تو اشباع کی خاطر انسان بقیہ تین کی طرف قدم بڑھاتا ہے۔

غرض یہ کہ انسان نفس کا غلام ہو کر رہ جاتا ہے اور اس طرح خوش ہوتا ہے کہ اس کی پرستش کا علم بلند رہے۔ لہٰذا اگر اسے قانون بنانے اور شریعت تخلیق کرنے کا اختیار سونپ دیا جائے تو نتیجہ صرف یہی نکلتا ہے کہ وہ اپنے مفادات کا تحفظ کرتا ہے اور دوسروں کو زیر نگیں رکھنے کی حتی الوسع تدبیر کرتا ہے اور یہ بات نہ صرف یہ کہ اسے جائز' ناجائز کا فرق مٹا کر قدم آگے بڑھانے پر مجبور کرتی ہے بلکہ اس کا بس چلے تو وہ جائز اور ناجائز کے معیار کو بھی یکسر بدل کر رکھ دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کا بنایا ہوا قانون لاکھ اچھا سہی' کہیں نہ کہیں مفادات کا تحفظ ضرور ہو گا اور کسی نہ کسی درجے میں مفادات عامہ کی پامالی ضرور بالضرور ہو گی۔ یہ بھی ایک سبب ہے کہ انسان خدا کے بنائے ہوئے قانون ہی کا محتاج ہے اور اس کی خالصیت کا ضرورت مند۔ نیز احکام خداوندی کے ذریعے عوام کے مفادات کا تحفظ ممکن ہے۔ سو یہی حال اہل ایران کا ہوا یعنی جن افراد کو عوام میں اثر و رسوخ حاصل ہوا انہوں نے اپنے مفادات کا تحفظ ہر ممکن طریق پر کیا۔

مغ --- ماگی --- مجوس --- مغاں

مغ اصل میں اس قبیلے کا نام تھا جس کے ہاتھ میں مذہب کی تمام اجارہ داریاں تھیں۔ یہ لوگ بڑی بڑی جاگیروں کے مالک تو تھے ہی لیکن تمام تر مذہب کا ٹھیکہ بھی انہیں لوگوں نے اپنے پاس رکھا ہوا تھا۔ پوری سلطنت کے مذہبی رہنما یہی لوگ تھے کسی

اور قبیلے یا خاندان کا کوئی فرد نہ کسی مذہبی امر میں دخل اندازی کر سکتا تھا اور نہ اس مقدس پیشے کو اختیار ہی کیا جا سکتا تھا۔ تمام قوم کا جائز و ناجائز ان کے ہاتھ میں تھا اور کسی امر کا مشروع یا غیر مشروع ہونا ان کے قبضہ قدرت میں تھا۔ کسی بھی فعل کا لائق مذمت ہونا یا قابل تقلید ہونا ان کے اشارہ ابرو پر موقوف تھا۔ غرضیکہ ہر حلال حرام کے مالک یہی لوگ تھے۔

یہ قبیلہ ماگی یا مغاں کہلاتا تھا' انہیں مغ بھی کہتے تھے۔ ان میں منتخب شدہ مذہبی راہنما موبد کہلاتے تھے اور ان کا سردار موبداں موبد کہلاتا تھا۔ ایران میں یہ لوگ درج ذیل امور کی انجام دہی کے ذمہ دار تھے۔

(۱) شادی بیاہ اور ولادت و مرگ وغیرہ کی جمیع رسوم کی ادائیگی یہی کر سکتے تھے۔
(۲) دیوتاؤں کے لئے کئی کئی قربانیاں دینے کا حق صرف انہیں کے لئے محفوظ تھا۔ لہٰذا کوئی اور شخص یہ خدمت سرانجام نہ دے سکتا تھا بلکہ قربانی پیش کرنے والا خود بھی ایسا کرتا تو قربانی قابل قبول نہ ہوتی۔
(۳) عوام کے تنازعات اور ان تنازعات کے فیصلے انہیں کے دم قدم سے تھے۔
(۴) کسی بھی امر کے جواز کی سند انہیں پر موقوف تھی۔
(۵) عوام کے معاملات انہیں کی کہانت و نجومیت کے مرہون منت ہوتے تھے۔
(۶) تمام مذہبی کفاروں اور نذر نیاز وغیرہ کی خطیر رقوم پہ تصرف کا حق انہیں کی مرضی پر منحصر تھا۔
(۷) ہر شخص کی آمدنی کا دسواں حصہ مذہب کے نام پر اسی قبیلے کے لئے مختص تھا۔
(۸) شر کے خالق خدا "اہرمن" کے شر سے حفاظت اس وقت تک ممکن نہ تھی جب تک ان کی تائید و حمایت حاصل نہ ہو پاتی۔
(۹) خالق خیر۔ "اہورامزدا" کی کوئی عبادت اس وقت تک مقبول نہ ہوتی تھی جب تک کہ یہ راہنما بیچ میں واسطہ یا وسیلہ نہ بن جاتے یعنی اگر یہ راضی ہیں تو کامیابی ہے وگرنہ سب ناکام و نامراد اور ازلی خائب و خاسر ہیں۔

(۱۰) صرف انہیں روحوں کو تقدس وپاکیزگی اور طہارت باطنی نصیب ہو سکتی تھی جن پر ان کی دعاؤں کا سایہ ہوتا تھا ورنہ شقاوت ہی نصیب تھا۔

(۱۱) حشر کی بلا خیز تکالیف سے چھٹکارا حاصل ہونا بغیر ان ماگیوں کی امداد کے کسی بھی صورت ممکن نہ تھا۔

(۱۲) ان کے ہاں جائیدادیں اور جاگیروں کی جاگیریں صرف مغوں کے لئے وقف ہوتی تھیں۔ اس طرح یہ طبقہ طبقہ جاگیرداراں میں بھی داخل تھا۔

(۱۳) ان کی بے حد تعظیم اور غیر معمولی عزت کرنا ہر شخص پر لازم تھا۔ ان کے قابل عزت بن جانے کے لئے اتنا ہی کافی تھا کہ مذہبی امور کی انجام دہی انہیں پر موقوف تھی لیکن اس کے علاوہ ان کی جائیدادیں اور ان کا مال و متاع کا مالک ہونا بھی ایک ایسا اضافی امر تھا جس کی بنا پر عوام کی گردنیں ان کی بارگاہ میں جھکی ہی رہتی تھیں اور یہ خدائی کے منصب پر جلوہ گر ہو کر عوام کی عزت نفس کو اپنی انا کے الاؤ میں جھونکتے رہتے تھے۔

(۱۴) عوام میں اثر ورسوخ، اعلیٰ خاندان، جائیداد و جاگیر اور معاشی وسائل کی فراوانی ایسے امور تھے جنہوں نے مذہبی رنگ کے ساتھ مل کر اور مذہبی ٹھیکیداروں نے ان امور کے ساتھ مل کر انہیں اس درجہ طاقتور بنا دیا تھا کہ حکومتوں کے الٹ پھیر اور بادشاہوں کے عروج و زوال میں بھی ان کا بہت بڑا ہاتھ ہوتا تھا۔ گویا یہ ایک فیصلہ کن سیاسی قوت بھی بن چکے تھے کیونکہ شاہی خاندان کو بھی ان کی سرپرستی حاصل کرنے کے لئے ان کی باقاعدہ "سرپرستی" کرنا پڑتی تھی۔

(۱۵) سب سے بڑا فتنہ یہ تھا کہ اس ایک خاندان کے علاوہ کسی اور فرد بشر کو اس بات کی جرات نہ تھی کہ مذہبی پیشوائی کا خواب بھی دیکھ سکے۔ اس کا معنی یہ تھا کہ ان مخصوص مذہبی رنگ ڈھنگ کے لوگوں نے باقاعدہ طور پر خاندانی تفوق کو انتہائی بے جا بنیاد بنا کر طبقات کی تقسیم کا کارنامہ انجام دیا تھا۔

مقصد براری کے لئے اپنا خاندانی نسب نامہ بھی کسی فرضی "مافوق الفطرت" قسم کی ماورائی صلاحیتوں کی حامل شخصیت سے جوڑ دیا جاتا۔ یہ افسانوی شخصیت "منوش

چتر" کی تھی۔ اسی کو عام طور پر منوچہر بھی کہا جاتا ہے۔

مذہبی اجارہ داری ایران کی پوری معاشرتی زندگی کے لئے سوہان روح بنی ہوئی تھی اور اس کے جو نتائج حاصل ہو رہے تھے وہ چنداں حوصلہ افزا نہ تھے۔ بلکہ کئی حوالوں سے حوصلہ شکن تھے کہ اس فضائے جبر میں ایک مثالی معاشرے کے قیام کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ انفرادی اور اجتماعی سطح پر اس اجارہ داری کے نتائج مرتب ہو رہے تھے۔

قرب حق کے داعیہ کا خاتمہ

جب فکر کا تحرک اس رخ پر ہو کہ ہم خود نہ تو خدا کے برگزیدہ بن سکتے ہیں اور نہ ہماری کوئی عبادت ہی قبولیت کا شرف حاصل کر سکتی ہے تو ہمت اس سمت میں صرف ہونے کی بجائے شکستہ ہو جاتی ہے اور قدم اس راہ پر اٹھنے سے قبل ہی پھسل جاتے ہیں' یہ سب سے بڑا نقصان تھا جن کا اہل ایران کو سامنا تھا اگر قرب حق کا داعیہ ختم ہو جائے تو عمل صالح کی رغبت نکل جاتی ہے اور زیست مائل بہ حیوانیت ہو جاتی ہے۔ اور انسانی معاشروں کو حیوانی معاشروں میں تبدیل ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ انسان اخلاقی پستی کے عمیق غار میں گرتا چلا جاتا ہے۔ غار کے منہ سے بھاری پتھر آ لگتا ہے واپسی کے تمام راستے مسدود ہو جاتے ہیں اور امید کی آخری کرن بھی بجھ جاتی ہے۔

جائز و ناجائز کے امتیاز کا خاتمہ

اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسانی دماغ و دل جائز و ناجائز کے فرق کو مٹا دیتا ہے' حرام و حلال کی تمیز اٹھ جاتی ہے' خیر و شر کا فرق مٹ جاتا ہے' انسان اپنے مفادات کا قیدی بن کر رہ جاتا ہے' خواہشوں کی محبت اور اس کی اندھی اطاعت ہی انسانی زندگی کا سب سے بڑا مطمح نظر بن جاتا ہے۔ پھر بے لگام خواہشیں اور آرزوئیں مذہب قرار پاتی ہیں' غرور و تکبر' نخوت و ناموس ہی انسان کا سب کچھ بن جاتا ہے۔

زندگی کے تحرک کا رخ حیوانیت کی طرف تیز تر ہو جاتا ہے اور شرف انسانی کی بحالی کی ہر آرزو دم توڑ جاتی ہے۔

اخلاقی کمال کا حصول

اس کے نتیجے میں نہ اخلاقی کمال کا حصول ممکن ہے اور نہ اس کا کوئی طریق یا لائحہ عمل ہی سامنے ہوتا ہے بلکہ تصوراتِ زندگی ہی سرے سے بدل جاتے ہیں۔ اگر کبھی آخرت کا خیال آئے یا مزعومہ خدا کی ناخوشی و عدم رضا کا گمان ہو تو وہی "پروہتوں" کی خدمت میں نذرانے پیش کرنے کی طرف دھیان جاتا ہے۔ اس سے پروہتوں کی پیدا کردہ محتاجی ایک مرتبہ پھر ظاہر ہوتی ہے اور انسانی ضمیر خفتہ کے سر اٹھانے کی رہی سہی امید بھی دم توڑ جاتی ہے۔ پھر قریہ جبر میں سر اٹھا کر چلنے کی رسم کے احیاء کا تصور بھی ممکن نہیں رہتا۔ سر جھکا کر چلنا اور ہر ظلم کو برداشت کرنا ہی اجتماعی رویہ قرار پاتا ہے۔ ضرورت تھی ایک ایسے اصلاحی نظام کی جو انفرادی و اجتماعی سطح پر اخلاقی کمال کے حصول کا داعیہ پیدا کر دے، قربِ حق کا محرک اور نقیب بن جائے اور درمیانی واسطے اور وسیلے کے تصورات کو ان خرافات سے الگ کر دے جو روحانی جمود و تعطل کا باعث بنے تھے۔

مذہبی تعصب

انسان تحمل اور بردباری کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دے تو معاشرہ قوت برداشت سے محروم ہو جاتا ہے اور فرد نرگسیت کا شکار ہو کر ایک زندہ لاش میں تبدیل ہو جاتا ہے فکر و نظر کی دنیا میں ایک بڑی آفت اور عملی سطح پر بدترین مضیبت مذہبی تعصب ہے۔ اپنی جگہ پختگی اور شے ہے جبکہ دوسرے کا وجود برداشت نہ کر پانا دوسری چیز ہے اسی کا نام تعصب ہے۔ ایرانی معاشرے میں اس کی کارستانیاں کئی مقامات پر کئی رنگوں میں سامنے آئیں۔ انسان نے انسانیت کو بار بار تعصب کی تباہ کاریوں کا شکار کیا۔ قتل و غارتگری کا بازار گرم تھا۔ زندگی بار بار ان متعصب انسانوں کے ہاتھ پر بیعت

ارادت کر کے بر سرِ بازار محوِ رقصِ رندانہ ہوتی۔ اس مقام پر ہم نمونے کے طور پر محض چند ایک مثالیں پیش کرتے ہیں۔

(۱) شاپور دوم نے ۳۴۱ میں عیسائیوں کا قتل عام کیا۔ اس قتلِ عام کے بعد جو بچ گئے انہیں کمال فراخدلی سے اور غایت ترحم کے باعث معاف کر دیا۔ لیکن اس معافی کے عالم میں ۱۶۰۰۰ (سولہ ہزار) راہب اور پادری ذبح کر دیئے۔ معافی سے قبل قتل و غارت گری کی کیفیت کیا ہو گی اور عوام میں سے کتنے افراد لقمۂ اجل بنائے گئے ہوں گے۔ اس کا آسانی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے ان مقتولین میں عورتیں مرد سب شامل تھے۔ نیز عیسائیوں کے دیہات کے دیہات تباہ و برباد کر دیئے گئے۔ عیسائی ہونا ہی ان کا اصل قصور تھا۔ اسی بنا پر جب ایران اور روم کی بازنطینی حکومت کے درمیان جنگ چھڑی تو انہوں نے عیسائی حکومت سے خیر سگالی کے جذبات کا اظہار کیا تھا۔ بس اسی جرم کی فرد عائد ہوئی اور انجام بھیانک قتل عام کی صورت میں برآمد ہوا۔

(۲) جب خسرو پرویز نے یہودیوں کے ساتھ مل کر صلیب کے خلاف مقدس جنگ کا اعلان کیا اور آخر کار ۶۱۴ء میں القدس کو فتح کیا تو اس وقت کے یروشلم کے حملے میں

(i) ۹۰ ہزار عیسائی تلوار کے سپرد (کر کے قتل) کئے گئے۔

(ii) کلیساؤں کو جلا کر راکھ کر دیا گیا۔

(iii) بے دریغ اور انتہائی بے دردی سے لوٹ مار کی گئی۔

(iv) صلیب اعظم جو عیسائیوں کی مقدس ترین شے ہے اسے اٹھا لیا گیا۔

(۳) ۶۱۷ء میں خسرو پرویز نے مصر کو فتح کیا اور شہر قسطنطنیہ کے سامنے شہر کالیسڈن پر دس برس قابض رہا۔ اس دوران تمام گرجوں کو کھنڈر بنا دیا گیا اور شہر کی دولت بے دریغ لوٹی گئی۔

(۴) ۳۳۹ء میں ایک کیتھولک پادری، ۵ بشپ اور ایک سو پادریوں کو پھانسی دے دی گئی۔

ہوا یوں کہ ایران کے عیسائیوں کے خلاف ایک فرد جاری کی گئی جس میں ان

کے قابل گردن زدنی جرائم کی ایک فہرست جاری کی گئی۔ ان جرائم کی تفصیل کچھ یوں تھی۔

(۱) عیسائی لوگوں کو ایک خدا کی طرف بلاتے ہیں تاکہ آگ کی تقدیس نہ کریں۔
(۲) پانی سے منہ دھونے کی تلقین کرتے ہیں اس طرح پانی ناپاک کرتے ہیں۔
(۳) شادی اور اولاد سے اجتناب برتتے ہیں۔
(۴) مردوں کو زمین میں دفناتے ہیں (اس طرح زمین ناپاک کر دیتے ہیں)
(۵) موذی جانوروں کو ایک ہی (نیکی پیدا کرنے والے) خدا کا پیدا کردہ بتاتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ اتنے "بڑے جرائم" کے مرتکب انسانوں کو زندہ رہنے کا کیا حق تھا۔ لہذا پہلا قدم ان کے معاش کو تباہ کرنے کے لئے اٹھایا گیا۔ یعنی ان کا ٹیکس عام شہریوں کی نسبت دوگنا کر دیا گیا تاکہ اس جنگ کے اخراجات پورے کئے جائیں جس میں وہ حصہ نہیں لے رہے تھے کہ وہ عیسائیوں کے خلاف تھی۔ اور یہ ٹیکس اکٹھا کرنے کی ذمہ داری اس کیتھولک پادری کو دی گئی جس نے یہ جواب دیا کہ

(ا) لوگ غریب ہیں اس قدر ٹیکس ادا نہیں کر سکتے۔
(ب) بشپ کا کام ٹیکس جمع کرنا نہیں۔

لہذا اس نے ٹیکس جمع کرنے سے انکار کر دیا۔ نتیجہ اس نے بھی بھگتا اور نصف صدی تک عیسائیوں کو بھی اس کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔

(۵) یزدگرد نے عیسائیوں پر کچھ نوازشات کیں لیکن جونہی اسے احساس ہوا کہ وہ ان پر کچھ زیادہ ہی مہرباں ہو رہا ہے اس نے پینترا بدلا اور ماگیوں کو کھلی اجازت دے دی کہ وہ عیسائیوں کا قلع قمع کر دیں۔ یہ اجازت اور اس پر عمل درآمد انتہائی شدت اور کثرت کے ساتھ کم وبیش آئندہ پانچ برس تک جاری رہا۔

کس رخ پر فکری تحرک کے انقلاب کی ضرورت تھی؟ اس سوال سے ہم آخر میں بحث کریں گے۔

سیاسی حالات

ایران کے سیاسی حالات' نظریات اور رجحانات بھی اسی طرح اہمیت کے حامل ہیں جس طرح مذہبی کیونکہ سیاسی بگاڑ بھی مذہبی بگاڑ سے کم نہ تھا۔ نظامِ زندگی درہم برہم ہو چکا تھا۔ ظلم و تعدی اور جور و استبداد حکومت کا طرہ امتیاز بن چکا تھا۔ مطلق العنانی اور خاندانی موروثی اقتدار اس کا افتخار بن گیا تھا اور شخصی حکومتوں کو بچانے کے لئے آنے والی نسلوں کا مستقبل تک گروی رکھ دیا جاتا تھا۔ اس مرحلہ پر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ حکومتی ڈھانچے کے بارے میں تفصیلات درج کر دی جائیں تاکہ مجموعی صورتحال ہمارے سامنے آسکے کہ ظہورِ قدسی کے وقت ایران میں سیاسی منظرنامہ کن روشنیوں یا تاریکیوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔

چنانچہ ایران کے نظامِ حکومت میں دو عوامل نمایاں تھے۔

(۱) جاگیردارانہ نظامِ ملوکیت

(۲) موروثی بادشاہت

اول مرکزی قوت بادشاہ کی ذات ہوتی' جو تمام اختیارات اور تمام مملکت کے سیاہ و سفید کی مالک متصور ہوتی تھی۔ اس بادشاہ کے لئے ایک ہی مخصوص خاندان سے ہونا ضروری تھا۔ کسی اور خاندان کا فرد بادشاہ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

پھر اس کے نیچے نظم سلطنت کو چلانے کے لئے مشیر' وزیر' اور فوج کے عہدے زیادہ تر مختلف جاگیردار خاندانوں کی اولاد کو دیئے جاتے۔ چند خاندان جو ذی اثر تھے اور ہمیشہ ذی اثر رہے' مل کر امرا کا ایک مؤثر طبقہ تشکیل دیتے اور بالفعل حکومت ان چند افراد کے چنگل سے کبھی بھی خود کو چھڑا سکنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔

بادشاہ --- کسریٰ

بادشاہ سے متعلق چند باتیں جو قابل اعتناء ہیں درج ذیل ہیں۔

(۱) بادشاہ کا خاندان خدا کا اختیار کردہ اور اسے بادشاہت خدا کی عطا کردہ ہے۔

(۲) بادشاہ کو جمیع اختیارات خدا نے دیئے ہیں اور وہ جو کچھ بھی کہتا یا کرتا ہے خدا کی براہ راست راہنمائی میں کہتا یا کرتا ہے۔ لہٰذا

(i) اس کی کسی بات پر اعتراض کی کوئی گنجائش نہیں۔

(ii) اس کی کسی بات سے سرمو انحراف نہیں کیا جا سکتا۔

(۳) بادشاہ بلکہ پورا ساسانی خاندان خداؤں کی نسل سے ہے۔

(۴) بادشاہ کی غیر مشروط غلامی اصل میں اہورامزدا (خالق خیر) کے احکام ہی کی تعمیل ہے۔

(۵) بادشاہ خواہ کسی بے گناہ کو پھانسی پر لٹکا دے اور وجہ بھی نہ بتائے یہ اسکا حق ہے۔

(۶) بادشاہ ہونا صرف ساسانی خاندان کے ہی ساتھ مختص ہے اس خاندان سے باہر کا کوئی شخص بادشاہ بننے کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتا ورنہ قابل گردن زدنی ہوگا۔

(۷) بادشاہ کی خدمت میں حاضری کے وقت اس کو سجدہ کرنا لازمی تھا۔

(۸) بیمار پڑ جانے کی صورت میں بادشاہ جس روز کوئی دوا لیتا' کسی اور شخص کو اس روز اس مرض کی دوا لینے کی اجازت نہ تھی۔ یہ بات بادشاہ کے حق میں ایسی گستاخی تھی جسے یقیناً قابل گردن زدنی ہونا چاہئے تھا۔

(۹) بادشاہ کے قریب آنے اور اس سے براہِ راست ہمکلام ہونے کی جرأت کا حق کسی کو نہ تھا۔

(۱۰) قومی خزانہ بادشاہ کی ذاتی ملکیت سمجھا جاتا جو اسی کی ذات پر خرچ ہوتا تھا مثلاً خسرو کی مثال ہی لیتے ہیں۔

(i) اس کے حرم میں تین ہزار بیویاں تھیں۔

(ii) ذاتی خدمت اور محافل رقص و سرود کو زینت بخشنے کے لئے ہزارہا لونڈیاں تھیں۔

(iii) تین ہزار خدمتگار تھے۔

(iv) آٹھ ہزار پانچ سو سواری کے گھوڑے تھے۔

(v) سات سو ساٹھ ہاتھی تھے۔
(vi) بارہ ہزار بار برداری کے خچر تھے۔
اس کے علاوہ سونے چاندی کے جواہرات کا تو شمار ہی نہیں۔
(۱۱) بادشاہ سے کسی بات پر کوئی باز پرس نہیں ہو سکتی تھی مثلاً نوشیرواں عادل نے اپنے سترہ سگے بھائی قتل کر دیئے لیکن اس سے جواب طلبی کا خیال بھی کسی کے دل میں نہ آیا۔ تمام بھتیجوں کو (سوائے ایک کے) قتل کر دیا تو کسی کو اعتراض کا حق نہ تھا۔ یہ تو اس کا اپنا خون تھا اب عوام کے خون کی کیا قیمت تھی اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اگر بیٹا بلاوجہ قتل ہو گیا تو باپ بادشاہ کے انصاف کی تعریف ہی کرنے کا پابند تھا۔ اسے اپنی مظلومیت پر آنسو بہانے کی بھی اجازت نہ تھی۔
(۱۲) جس طرح بادشاہ کی نشست گاہ کے قریب آنے کی کسی کو اجازت نہ تھی اسی طرح اس کی خوابگاہ کی طرف آنے کی بھی کسی فرد بشر کو اجازت نہ تھی حتیٰ کہ اس کی سگی اولاد کو بھی یہ اجازت حاصل نہ تھی' ایرانی معاشرہ بادشاہت کی گرفت ناروا میں سسک رہا تھا۔ انسان ظلم کی چکی میں پس رہا تھا۔ شاہان وقت ہر اخلاقی قدر کو اپنے پاؤں کی ٹھوکر سے اڑا چکے تھے' پوری دنیا کسی نجات دہندہ کی منتظر تھی کیا یہ حالات کسی اصلاح کے طلبگار نہ تھے؟ کیا مظلوم اپنی دادرسی کا حق نہ مانگتے تھے؟ کیا انسانوں کو انسانوں سے ممتاز کر دینا ایک طرح سے انسانیت کی تذلیل نہ تھی؟ اگر یہ سب تھا اور یقیناً تھا تو انسانیت کسی عظیم انقلاب کی ضرورت مند تھی اور ایک نبوی انقلاب آدمیت کی اولین حاجت تھی اور یہی ذمہ داری حق تعالیٰ شانہ نے حضور نبی اکرم ﷺ کے سپرد فرمائی تھی۔
ایک انقلاب --- ایک عالمگیر انقلاب ---
جیسا کہ ہم نے دیکھا ایران میں ذی اثر خاندان سات تھے۔ انہیں کی حکومت تھی اور انہیں کا اصل غلبہ تھا۔ ان میں سے دو شاہی خاندان تھے جبکہ بقیہ پانچ میں سے دو امتیازی حیثیت کے حامل تھے۔ اور وہ ایک سورین (Suren) اور دوسرا کارین (Karen) تھا۔ (بعض نے انہیں سرین اور کرین بھی لکھا ہے) یہ خاندان ساسانی عہد

سے قبل بھی موثر حیثیت کے مالک تھے اور اس دور میں بھی اثر و رسوخ کے مالک رہے۔ ساسانی طرز حکومت اصل میں ایک طرح سے اس جاگیردارانہ نظام کو متحد کر دینے کی ایک کوشش تھی جس نے آپس میں باہم دست و گریباں جاگیرداروں کو ایک مستحکم وفاق کی صورت دی۔ انہوں نے جاگیردار طبقوں کو ایک مرکزی تنظیم کے تحت یکجا کرنے کی سعی مشکور کی اور طوائف الملوکی کو ختم کر کے خاندانوں میں عہدوں کی تقسیم کر دی جو کچھ اس طرح تھی۔

(۱) شہردار / صوبائی حاکم گورنر / یہ عہدہ شہزادگان کے لئے تھا۔
(۲) فوجی جرنیل۔ یہ بڑے بڑے سرداروں کے لئے تھا۔
(۳) اعلیٰ افسر (بزرگان) یہ طبقہ امراء کے لئے خاص تھا۔
(۴) فوجی افسر اور شاہی سپاہی (آزاد) یہ طبقہ رؤسا کے لئے تھا۔
(۵) موبدان، یہ زرتشتی پیشوایان دین تھے۔ (۶) یہ سرکاری مذہب کے عہدے داران،
(۷) اسی طرح ایک طبقہ دبیران کا تھا جو منشی یا حکومت کے سیکرٹری ہوتے۔

عوام کے لئے سب سے مقدس پیشہ زراعت کا تھا۔ جبکہ ایک پیشہ سے وابستہ خواہ کتنا ہی سمجھدار، لائق فائق اور صاحب علم کیوں نہ ہو تاوہ کسی دوسرے افضل پیشے کی طرف نہیں جا سکتا تھا۔ ممکن ہے ہندوستان میں ذات پات کی تقسیم کا غیر انسانی نظام بھی ایرانی نظام حیات ہی کا عکس ناروا ہو۔ مختصر یہ کہ بالائی سطح پر شہنشاہیت تھی اور نیچے جاگیرداروں، امراء، شہزادوں، رئیسوں اور سرداروں پر مشتمل نظام حکومت تھا۔ اشکانی دور میں ایران طوائف الملوکی کی لپیٹ میں رہا، جاگیردارانہ نظام مضبوط تر ہوتا چلا گیا۔ ساسانی دور میں بھی اس نظام حیات کی ہی تجدید ہوئی۔

یہاں ایک اور بات بھی واضح ہوتی ہے کہ جس طرح مذہب نے انسانوں کو طبقات میں تقسیم کر دیا تھا اسی طرح سیاست نے بھی انسان کی طبقاتی تقسیم پر ہی ایمان لانے کا مظاہرہ کیا تھا۔ نیز جس طرح سیاسی کارپردازان سلطنت نے مذہبی طبقے کے تحفظ کی قسم کھائی تھی اسی طرح مذہبی طبقے نے بھی مختلف کتب دینیہ میں سیاسی بازی گروں

کی نمک حلالی کا بھرپور ثبوت دیا تھا یعنی بادشاہ کو خدا کی نسل سے ملا دیا اور اس کے اختیارات کو خدائی اختیارات بنا ڈالا۔ شاہی حقوق کو باقاعدہ مذہبی رنگ دیا گیا مثلاً ان کی تعلیمات کی کتب۔ خدائے نامک' کارنامک استرپایکاں وغیرہ اس امر پر گواہ ہیں۔

قصرِاقتدار کی اندرونی کہانی

اس وقت تک ہم نے ایران کی عوامی زندگی کا جائزہ لیا' مذہبی اور سیاسی صورتحال کا مشاہدہ کیا اور محل کے باہر ہونے والی سرگرمیوں کو نقد و نظر کی کسوٹی پر پرکھا' لیکن اس وقت محل کے اندر بھی کہرام مچا ہوا تھا۔ قصرِاقتدار کی غلام گردشوں میں کس طرح سازشوں کے جال بچھائے جاتے' کس طرح باہمی رقابتیں جنم لیتیں' شاہی خاندان کے افراد کے درمیان مجلسی روابط کی کیفیت کیا تھی۔ یہ ایک طویل داستان عبرت ہے۔

یہ بات مسلمات میں سے ہے کہ بادشاہ کوئی ایسا شخص نہیں ہو سکتا تھا جو شاہی خاندان سے نسبی تعلق نہ رکھتا ہو' چنانچہ بادشاہ کو سب سے زیادہ خطرہ اپنے ہی خاندان کے افراد سے ہوتا تھا' وہ خوفزدہ رہتا تھا کہ اس کی حکمرانی پر اگر شب خون مارا جا سکتا ہے یا اس کے ایوانِ اقتدار میں نقب لگائی جا سکتی ہے تو ایسا صرف اور صرف محل کے' اندر سے ہو سکتا ہے۔ شاہی خاندانی کے افراد کے علاوہ تاجِ شاہی پر شب خون مارنے یا شاہِ وقت کو معزول کر کے تخت و تاج پر قبضہ جمانے کا کوئی دوسرا شخص تصوّر بھی نہیں کر سکتا تھا۔ عوام کے تو ہاتھ بندھے ہوئے تھے اور زبانوں پر "تقدس اور احترام" کے قفل ڈال دیئے گئے تھے اس لئے ان کی طرف سے کسی بغاوت یا احتجاج کا کوئی خطرہ نہ تھا۔ بادشاہوں کے خلاف صرف شاہی خاندان کے افراد کی طرف سے بغاوت ممکن تھی۔ تاجِ شاہی کے خلاف صدائے احتجاج صرف محل کے اندر سے بلند ہو سکتی تھی اس لئے شاہانِ وقت کو اپنے ہی خون پر گہری نظر رکھنا پڑتی اگرچہ مذہب کے اجارہ داروں نے تاج کو تحفظ فراہم کر رکھا تھا اور کسی فرد میں صدائے احتجاج بلند کرنے کی جرات

نہیں تھی۔ تاہم درونِ خانہ پرورش پانے والی محلاتی سازشوں کے امکان کو ختم نہیں کیا جا سکتا تھا اور نہ یہ امکانات ختم ہی ہوئے اس قسم کے خطرات سے نمٹنے کے لئے شاہان وقت اپنے لہو سے ہاتھ رنگنے سے بھی دریغ نہیں کرتے اور یہی تماشا ایران کے شاہی محلات میں بھی ہو رہا تھا۔ ہم نے دیکھا کہ

(۱) کوئی شخص بادشاہ کے قریب پھٹکنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

(۲) کوئی شخص بادشاہ کی خوابگاہ کی طرف نہیں جا سکتا تھا خواہ وہ اس کی سگی اولاد میں سے ہی کیوں نہ ہوتا۔

بلکہ خود بادشاہ کی خوابگاہیں کبھی چالیس چالیس کی تعداد میں ہوتیں تاکہ کسی کو خبر نہ ہو کہ بادشاہ سلامت نے فلاں رات کس خوابگاہ میں بسر کی۔ یہ تحفظات اس خوف کی غمازی کرتے ہیں جس میں شاہان ایران ہر وقت مبتلا رہتے تھے۔ کتب تاریخ میں یہاں تک مذکور ہے کہ کبھی کبھی شاہان ایران اپنی خوابگاہوں کو چھوڑ کر جانوروں کے کمروں میں رات بسر کیا کرتے تھے۔ اس سے بھی آسان کام یہ تھا کہ بادشاہ اپنے خاندان کے تمام ممکنہ حریفوں کو قتل کروا دیتا۔ ایسا بارہا ہوا کہ خاص طور پر جس نوشیرواں کا ذکر پہلے گزر چکا ہے جو عادل کے نام سے مشہور تھا۔ اس نے بھی اپنے سترہ بھائیوں کو تہہ تیغ کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کی اس کے علاوہ بھتیجوں کا قتل الگ تھا۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ اندرونی شورش کی بنا پر یہ کھیل امراء اور عمائدین سلطنت کے ہاتھ میں آ جاتا۔ شاہانِ وقت تاجِ شاہی میں ہر وقت اندیشہ ہائے دور دراز میں مبتلا رہتے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ باغی ان امراء کی حمایت حاصل کر لیں اور بادشاہ کے لئے تکالیف و شدائد کا باعث بنیں لہٰذا بادشاہ کو دوسرا بڑا خطرہ ان افراد سے ہوتا اور بعض اوقات وہ ان کی خوشنودی کی خاطر ان کے ہاتھ میں کھلونا بھی بن جاتا تھا۔ ایسی باتیں ظاہر ہے کہ آخر کار سیاسی استحکام کا اختتام کر دیتی ہیں اور ملک اوپر تلے سازشوں اور بحرانوں کا شکار ہو جاتا ہے۔

مندرجہ بالا حقائق کو سامنے رکھیں تو درج ذیل امور سامنے آتے ہیں۔

محلاتی سازشوں کا جال بچھایا جاتا۔ باہمی کشمکش عروج پر تھی۔ امراء کی بغاوتیں سر اٹھاتیں اور تاج شاہی مشکلات سے دوچار ہو جاتا ہے۔ حرص، لالچ، طمع اور اقتدار کی ہوس میں عمائدین حکومت اندھے ہو رہے تھے۔ نفس پرستی کا دور دورہ تھا۔
مفاد پرستی اور خود غرضی کے سکہ کو اعتبار اور اعتماد حاصل تھا۔ ملک سیاسی عدم استحکام کا شکار تھا۔ سیاسی بحران آئے دن بادشاہوں کی راتوں کی نیندیں حرام کئے رکھتے وردن خان ایک عجیب سی کشمکش جاری تھی۔ اقتدار کے لئے رسہ کشی ہوتی تو کئی بے گناہ بھی مارے جاتے، شاہان وقت ہر وقت خوف کی صلیب پر لٹکتے رہتے، چنانچہ سخت سزاؤں کا ایک نظام بنایا گیا تھا۔ کئی وحشیانہ سزاؤں کے ذریعے خطرات کا راستہ روکنے کی سعی کی گئی جو اکثر رائیگاں جاتی، اپنے سیاسی حریفوں کی آنکھیں نکلوا دی جاتیں ان کے کانوں میں سیسہ پگھلا کر ڈال دیا جاتا، ان کی زبانیں کھینچ لی جاتیں تاکہ وہ سننے، دیکھنے اور بولنے کی صلاحیتوں سے محروم ہو جائیں، آج اس مہذب اور جمہوری دور میں بھی تاریک زمانوں کی روایت زندہ ہے۔ انداز مختلف ہیں لیکن وحشت کی آگ سرد نہیں ہوتی۔

اس موقع پر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان کے نزدیک بادشاہی ایک عیاشی کا ذریعہ اور ان کا خاندانی حق تھا۔ لہٰذا ضرورت اس امر کی تھی کہ کوئی انقلابی مصلح اٹھے اس بنیادی تصور کو ہی جڑ سے اکھاڑ پھینکے جو ظلم و تعدی کا باعث تھا اور جس کا نتیجہ جبر و استبداد تھا ۔ اس وقت بلاشبہ انسانیت کو ایک ایسے تصورِ سیاست کی ضرورت تھی جو سیاست میں سے لالچ، طمع اور حرص و ہوا کے پہلو کو نکال باہر کرے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس وقت آدمیت کو حاجت تھی تو ایک ایسے سیاسی فکر کی جو حکمرانی و جہانبانی کے ایسے اصول پیش کرے جن کی روشنی میں تخت پر متمکن ہونے کا معنی عیش و آرام نہ رہے بلکہ ایک ایسے کٹھن فریضے کی ادائیگی بن جائے جو قدم قدم پر ذمہ اٹھانے والے کے لئے عدم ادائیگی فریضہ کی صورت میں سراپا حسرت و یاس بن جائے۔

معاشرتی حالت

پرانی معاشرت کی بنیاد کی بابت یہ بات تو مسلم ہے کہ یہ معاشرہ طبقات میں

منقسم تھا اور کسی ایک طبقے کا فرد کسی بھی صورت میں اپنا طبقہ تبدیل نہیں کر سکتا تھا۔ نہ کسی کے لئے یہ ممکن تھا کہ وہ اپنے آبائی پیشے کو ترک کر کے کسی اور پیشے کی طرف رخ کر لے۔ اس بات پر پابندی کی خاطر یعنی انہیں کسی بہتر پیشے کی طرف مائل ہونے سے روکنے کے لئے ایک مرتبہ پھر مذہبی طبقے کو استعمال کیا گیا تھا۔ عوام کو یہ سبق رٹوا دیا گیا تھا بلکہ ان کے ذہنوں میں یہ عقیدہ راسخ کر دیا گیا تھا کہ انہیں جو بھی پیشہ آبائی ورثہ میں نصیب ہو گیا ہے وہ اسے تبدیل نہیں کر سکتے کیونکہ ان کے اجداد کو یہ پیشہ اصل میں خالق خیر نے یعنی خدائے خیر اھور امزدا نے عطا کیا ہے۔ لہٰذا جو پیشہ انہیں خود خدا نے دے دیا ہے اسے تبدیل کرنے کا حق کسی کو کیسے دیا جا سکتا ہے؟ ان کا نسب انہیں معاشرے کے جس مرتبے پر فائز کرتا تھا وہ ان کے لئے تاحیات ضروری تھا اس سے بڑے مرتبے کی خواہش و آرزو کرنا ہی ان کے لئے ناجائز تھا یہ امر خدا سے بغاوت کے مترادف گردانا جاتا تھا۔

طبقاتی کشمکش اور اونچی ذات کی حفاظت اس قدر ضروری امر تھا کہ اس کو باقاعدہ تحفظ دیا گیا تھا۔ یعنی اگر کوئی نیچی ذات کا فرد اپنی محنت کی کمائی سے اتنی رقم جمع کر لے کہ کوئی بڑی زمین یا محل خرید سکے تو بھی اس کو اس بات کی اجازت نہ تھی کہ وہ اونچی ذات کے لوگوں کے استعمال کی اشیاء خرید لے یا کسی بڑے آدمی کی جائیداد اس کی مکمل قیمت ادا کر کے اپنی ملک میں لے آئے۔ اس طبقے کی تقسیمات کی لعنت کے علاوہ درج ذیل چند باتیں بھی ہمیں ان کی معاشرت میں دکھائی دیتی ہیں۔

(۱) ان کے یہاں کثیر الزواجی عام تھی۔ عدد کی آخری حد کا تعین زوج کی مالی وسعت کے ذریعے ہوتا تھا۔

(۲) اس کے علاوہ بالخصوص خواص میں داشتہ رکھنے کا رواج عام تھا۔

(۳) لڑکے کی پیدائش پر خوشیاں منائی جاتیں جبکہ لڑکی کی پیدائش کا معاملہ مختلف تھا۔

(۴) لڑکیوں کے لئے اپنے خاوندوں کا انتخاب بھی ان کا اپنا حق نہ تھا۔ بلکہ اس کی

اجازت و ضرورت ہی نہ سمجھی جاتی تھی۔

(۵) ماں، بہن اور بیٹی سے نکاح جائز تھا بلکہ اسے شیطان کے تصرف سے دور نیکی کا باعث جانا جاتا تھا۔ نیز رحمت خداوندی کا اہم سبب گردانا جاتا تھا۔

(۶) شوہر کو اس بات کا مکمل حق حاصل تھا کہ وہ بیوی کو اس کی رضامندی لئے بغیر کسی قلاش ہو جانے والے دوست یا دینی بھائی کی مالی معاونت کے لئے اس کے سپرد کر دے تاکہ وہ اس کے ذریعے کسب معاش کی کوئی راہ نکالے۔ ایسی صورت میں جو بھی اولاد ہوتی وہ پہلے شوہر کی تصور ہوتی ایسی حرکت انسانی ہمدردی کے ذیل میں آتی تھی۔ یہ معاملات بالکل اسی طرح آج کے ترقی یافتہ یورپ میں بھی جاری و ساری ہیں۔ حالانکہ یہ فرسودہ پرانی رسمیں ہیں جنہیں بعد کے ترقی یافتہ دین اسلام نے رد کر دیا تھا۔ غور طلب امر یہ ہے کہ ان باتوں پر اصرار کرنا فرسودگی اور (BackWard) ہونا ہے یا انہیں چھوڑ دینا؟

(۷) بیویوں میں جو رتبہ بڑی بیوی کا ہوتا تھا وہ دوسری بیویوں کا نہیں تھا۔ اسے بادشاہ بیوی جبکہ دوسری بیگمات کو چھوٹی یا خدمتگار بیویاں کہا جاتا تھا۔

(۸) اگر کوئی زرتشتی بیمار پڑ جاتا تو یہ بات اس امر کی علامت سمجھی جاتی کہ اس پر کسی بری روح نے قبضہ کر لیا ہے۔ اس کے علاج میں تساہل سے کام لیا جاتا تھا۔ نیز اس کے قریبی رشتہ دار بھی اسے یکسر نظر انداز کر دیتے بلکہ اس کو ضروریات زندگی سے بھی محروم کر دیتے ہیں۔ یہی ڈرامہ ہندوؤں میں قریب المرگ انسانوں سے بھی کھیلا جاتا ہے۔

(۹) کسی قریب المرگ کی موت کا تعین ایک کتے کے ذریعے کیا جاتا تھا۔ یعنی روٹی کا ایک ٹکڑا اس کے سینے پر رکھ دیا جاتا اور کتے کو اس کے قریب لایا جاتا۔ اگر کتا روٹی اٹھا لیتا تو اس کا معنی یہ تھا کہ وہ شخص مر چکا ہے۔

(۱۰) قریب المرگ شخص کے ساتھ ایک اور عجیب و غریب حرکت کی جاتی یعنی ایک زرد رنگ کا کتا جس کی چار آنکھیں ہوں (وہ تو انہیں شاید نہ ملتا ہو) یا ایک سفید رنگ کا کتا

نہیں نے بھورے کان ہوں اس بیچارے قریب المرگ شخص کے قریب لایا جائے۔ ان کا یہ عقیدہ تھا کہ مرتے وقت شیطان جو اس کی لاش میں گھسنے کی کوشش کرتا ہے وہ اس کتے کے دیدار سے اپنے مقصد میں ناکام ہو جاتا ہے (غالباً نزع اور سانس اکھڑنے کو وہ شیطان کے جسم میں گھسنے کی کوشش سے تعبیر کرتے تھے)

(۱۱) ہم پہلے کہیں ذکر کر آئے ہیں کہ دفنانا' جلانا اور دریا برد کرنا تینوں عمل آگ پانی' اور مٹی کو ناپاک کرتے ہیں جبکہ یہی تین عناصر انتہائی مقدس ہیں۔ لہٰذا وہ کرتے یوں تھے کہ بیچارے مردے کو ایک گہرے کنویں میں لٹکا دیا جاتا تھا جہاں سے گوشت خور جانور بالعموم چیلیں گدھ وغیرہ اس کا گوشت نوچ نوچ کر کھا لیتے۔

(۱۲) روزہ رکھنا ان کے ہاں ممنوع امر تھا کیونکہ اس سے جسم کمزور ہوتا ہے۔

(۱۳) تین طبقات کے لئے آگ کی ایک قسم مختص تھی۔

(۱۴) طبقات کی یہ تقسیم زرتشتیوں کے مابین ہی تھی ورنہ غیرزرتشتی اور غیرایرانی اس سے بھی کئی درجے "پیچ اور گھٹیا" لوگ تھے۔ یہی وجہ تھی کہ خسرو نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ہرقل قیصر روم کی توہین کی تھی۔ نیز آقائے نامدار ﷺ کا نامہ مبارک ایران پہنچا تو کسریٰ ایران اس کے ادب کو بھی ملحوظ نہ رکھ سکا۔

ہم نے بعثتِ نبوی کے وقت ایران کی معاشرتی صورتحال کا جائزہ لیا اور ان خامیوں پر ایک نگاہ ڈالی جس سے معاشرے کے اخلاق سوز اور انسان دشمن رجحانات کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس فرسودہ نظام کے انہدام کا وقت آیا چاہتا تھا کیونکہ جب سورج طلوع ہوتا ہے تو اندھیروں کا وجود مٹ جاتا ہے سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایران میں سسکتی ہوئی انسانیت کب تک محرومیوں کی آگ میں جلتی رہتی' قانونِ فطرت کو آخر حرکت میں آنا ہی تھا۔ ایک عظیم انقلاب اس کے دروازہ پر دستک دے رہا تھا اور تشنہ زمین ابرِ رحمت کے نزول کی دعائیں مانگ رہی تھی' دلِ حزین میں یہ آرزو انگڑائیاں لے لے کر نہ مچلتی ہو گی کہ کاش وہ بھی کبھی سکون کی نیند سو سکیں؟ انہیں خوشحالی کے خواب دیکھنے کا حق حاصل نہیں تھا۔ کیا انہیں کسی مثبت تبدیلی کی ضرورت نہ تھی؟ یقیناً تھی اور

کیوں نہ ہوتی؟ وہ انسان تھے مسلسل ظلم کی چکی میں پسے جا رہے تھے۔ انہیں دوسروں سے کمتر سمجھا جا رہا تھا وہ احساسِ کمتری سے نجات حاصل کرنا چاہتے تو انہیں تذلیل و تضحیک کا نشانہ بنا کر تحقیر کے جنگلوں کی طرف دھکیل دیا جاتا ہے۔

اقتصادی حالت

جس طرح اوپر بیان کردہ خرابیاں معاشرے کے تین اہم پہلوؤں (مذہبی، سیاسی اور معاشرتی) میں شدید بحران اور کثیر خطاؤں کی نشاندہی کرنے کے ساتھ ساتھ بہت وسیع پیمانے پر اصلاحی و انقلابی ضرورت و حاجتمندی تو واضح کرتی ہیں۔ اسی طرح ہم آئندہ سطور میں اس بات کا جائزہ لیں گے کہ ایران کا اقتصادی میدان میں کیا حال تھا؟ کیا وہاں بھی اصلاح کی ضرورت تھی یا نہیں؟ اگر تھی تو کس نوعیت کی؟ ضروری ہے کہ اہل ایران کے ہم اس پہلوئے زیست پر بھی ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈال لیں اور ان خامیوں پر نظر رکھیں جو ان کی معیشت میں ننگ آدمیت اور عارِ عدل و انصاف بنی ہوئی تھیں۔

نظامِ اقتصاد

ایران میں کوئی باقاعدہ اور مربوط اقتصادی نظام رائج نہیں تھا۔ ملک کی دولت شاہانِ وقت اور مراعات یافتہ طبقہ کے لئے کافی سمجھی جاتی جس طرح آج بھی وسائل قدرت پر چند لوگوں کی اجارہ داری قائم کرنے اور جاگیرداری کو تحفظ دینے کے لئے بعض دنیا پرست دانشوروں کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں۔ اور چند ٹکوں کے عوض قلم کی عصمت خریدی جاتی ہے اسی طرح ایران میں بھی امراء کی جاہ طلبی اور ہوس سیم و زر کو مذہب کی پشت پناہی حاصل تھی۔

ڈھانچہ

یعنی وہ بنیادی اصول و ضوابط جن کو پیش نظر رکھ کر تمام جزئیات طے کی جاتی

ہیں یہ ان قوانین اساسیہ کا مجموعہ ہے جن کو سامنے نہ رکھا جائے تو نہ قانون بن سکتا ہے اور نہ کسی بھی طرح کوئی باقاعدہ نظام ہی وجود میں آ سکتا ہے۔

مقصد اور ڈھانچے میں باہمی ہم آہنگی نہ ہو تو اس صورت میں نہ تو قانون قانون رہتا ہے اور نہ ہی نظام نظام کہلانے کا حقدار رہتا ہے۔ جب نظم ہی قائم نہیں تو نظام کیسا؟

ایران کے اقتصاد میں چند ایک بادشاہوں کا عہد چھوڑ کر باقاعدہ اقتصادی نظام کا وجود ہی نہیں ملتا نہ مقاصد کا تعین کیا جاتا اور نہ ڈھانچے کا کوئی وجود ہی ہوتا بس بادشاہ یا جاگیرداروں کی مرضی ہی سب کچھ تھا جبکہ مجموعی رویہ سوائے لوٹ مار کے اور کوئی نہ تھا۔

اگر ہم یہ کہیں تو بے جا نہ ہوگا کہ ایران میں بحیثیت مجموعی استحصال ہی اقتصاد تھا یا یوں بھی کہ اقتصادی نظام محض استحصالی نظام تھا۔ جس میں انسانوں کو بیچا جاتا تھا جبکہ مجبوروں اور انکی مجبوریوں کا تماشا دیکھا جاتا تھا۔

اقتصاد کا بنیادی ستون

ایرانی اقتصاد کا بنیادی ستون طبقات سازی اور اس عمل کی حوصلہ افزائی کرنا تھا۔ خاص طور پر معاشرہ دو بڑے واضح طبقوں میں منقسم تھا اور وسائل قدرت ان کے تصرف میں تھے۔

۱) اول وہ طبقہ تھا جن کے ہاتھوں میں تمام ملک کی دولت سمٹ کر آگئی تھی جو ملکی دولت پر قابض تھے' ہر چیز کے مالک تھے۔ یہ مراعات یافتہ طبقہ تھا جسے پورے ملک کی ملکیت سونپ دی گئی تھی حتی کہ عوام الناس بھی عملاً ان کی ملک قرار پائے۔ اس طبقے میں بالعموم درج ذیل اقسام کے لوگ شامل تھے۔

۱) جاگیردار

۲) امراء

۳) رؤساء

۴) شہزادگان و بادشاہان

۵) فوجی جرنیل

۶) دبیران وغیرہ

ملک کے سیاہ وسفید کے مالک یہ طبقات اونچی نسل اور اعلیٰ نسب سے تعلق رکھتے تھے۔ اونچی ذات کے یہ لوگ نیچی ذات کیلئے ایک طرح سے ان کی جانوں کے مالک کی حیثیت رکھتے تھے۔

ب) یہ محرومین کا طبقہ تھا جس میں وسیع پیمانے پر عوام الناس آتے تھے۔ یہ طبقہ بالعموم درج ذیل پیشہ کے حاملین پر مشتمل تھا۔

۱) کاشتکار

۲) دستکار

۳) مزدور

ان کا مقدر محرومی اور غربت وافلاس کے ساتھ ایسے جوڑ دیا گیا تھا کہ یہ خود اپنے لئے بھوک اور ننگ کے علاوہ اور کسی چیز کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔ ان کی نسلوں سے اچھے دنوں کے خواب دیکھنے کا ہنر بھی چھین لیا گیا تھا۔ یہ لوگ اچھی طرح جانتے تھے کہ اگر ایسا کوئی خواب دیکھا تو نتیجہ سوائے موت یا حسرت کے اور کچھ نہیں ہو گا۔

یہ ایک طویل موضوع ہے لیکن اس وقت ہم اختصار کے ساتھ دونوں طبقات کے بارے میں چند نکات کے ذریعے ان کے حالات پر سرسری سی نظر ڈالیں گے۔

طبقہ اولیٰ

پورے ملک کی دولت کا ارتکاز ان کی تجوریوں میں ہو چکا تھا ان کے احوال چند نکات کی شکل میں درج ذیل ہیں:

۱) تاج شاہی بڑی حد تک ان کے تعاون کا محتاج تھا۔

۲) خسرو نے اپنے ایک گورنر کے بارے میں استفسار کیا تو اس کے احوال اس صورت

میں واضح ہوئے۔ مثلاً اس کے پاس بیس لاکھ دینار تو ایسے فالتو تھے جو کسی طرح اس کے استعمال میں نہ آتے تھے۔

۳) اس کے پاس جواہرات چھ لاکھ دینار کے تھے۔

۴) خراسان ' عراق ' فارس اور آذربائی جان کا کوئی ایک بھی ضلع یا شہر ایسا نہ تھا جہاں اس کے مکان ' سرائیں اور زمینیں نہ تھیں۔

۵) اس کے پاس گھوڑے اور خچر تیس ہزار کی تعداد میں تھے۔

۶) اس کے پاس دو لاکھ بھیڑیں تھیں۔

۷) اس کے پاس سترہ سو ترک ' یونانی اور حبشی غلام جبکہ چودہ سو لونڈیاں ایسی تھیں جو اس کی زر خرید تھیں (ایران بعہد ساسانیان ۵۰۳-۵۰۴)

یہ تو ایک گورنر کا حال تھا۔ اب ذرا ایک جاگیردار کی کیفیت کا اندازہ کریں کہ جب وہ شکار کیلئے گھر سے نکلتا تو اس کے ہمراہ

۸) ایک ہزار اونٹ اس کا سامان لے کر چلتے۔

۹) دو سو رتھوں میں اس کی خواتین سوار ہوتی تھیں۔

۱۰) دس ہزار زرہ پوش سوار اور اس سے کہیں زیادہ پیادہ سپاہی ہلکے ہتھیاروں کے ساتھ باڈی گارڈ کے طور پر اس کے ہمراہ ہوتے تھے۔ ان دس ہزار میں کچھ اس کی رعایا تھے جبکہ کچھ اس کے غلام۔

۱۱) اب اگر بادشاہوں کے احوال کا جائزہ لیں تو کسریٰ کا صرف تاج ہی اکانوے (۹۱) کلو سے زیادہ وزنی تھا۔ جو خالص سونے اور چاندی کا بنا ہوتا تھا اور اس پر زمرّد یاقوت اور موتیوں سے میناکاری کی گئی تھی پھر فرش بہار کا قصہ ایک الگ حیثیت رکھتا ہے۔

یہ چند مناظر جو ہم نے پیش کئے ایک طبقے کا مکمل بیان نہیں بلکہ ایک بہت ہلکی سی جھلک دکھاتے ہیں ایک فیصد بھی نہیں۔ اہل ایران طبقاتی کشمکش کی جس استحصالی جنگ کا شکار ہو رہے تھے اس کے فریقین میں سے مستبد ' جابر ' استحصالی اور حکمران طبقہ کس کروفر ' شان و شوکت ' طاقت و قوت ' عیش و عشرت کا حامل تھا اور اس کے

اختیارات کس قدر زیادہ تھے اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

طبقہ ثانیہ

یہ تو تصویر کا ایک رخ تھا اب تصویر کے دوسرے رخ پر بھی نظر ڈالتے ہیں تو انکشاف ہوتا ہے کہ بدقسمتی سے تصویر کا دوسرا پہلو بھی گہری تاریکی میں ڈوبا ہوا ہے۔ اس مظلوم و مقہور خدائی کی حالت زار دیکھنا بھی لازم ہے تاکہ اندازہ ہو جائے کہ انسانیت کس ظلم وجور کی چکی میں پس رہی تھی کس طرح انسانیت کی تذلیل ہو رہی تھی۔ مسجود ملائکہ کو کس تحقیر اور تضحیک کا ہدف بنایا گیا تھا۔

۱) خراج اور ٹیکس لگانے کا نظام خیانت اور بددیانتی پر مبنی تھا۔ مقہور و مجبور طبقے ظلم کی چکی میں پس رہے تھے، حکومت کے کارندے ان کے خون کا آخری قطرہ تک نچوڑ لینے کی کوشش میں تھے، یہ منفی رویئے کسی نہ کسی صورت میں آج بھی زندہ ہیں آج کے مہذب معاشروں میں بھی ٹیکسوں کا سارا بوجھ صارفین پر ڈال دیا جاتا ہے صارفین کی اکثریت عوام کی ہوتی ہے ان کی قوت خرید کو مفلوج کر دیا جاتا ہے ٹیکسوں کا ظالمانہ نظام آج بھی عدل وانصاف کا منہ چڑا رہا ہے۔

۲) غنیمت کا سارا مال بادشاہ کی ملکیت ہوتا تھا۔ یعنی سپاہیوں سے ان کا حق چھین لیا جاتا تھا اس مال غنیمت سے محافل رقص و سرود منعقد ہوتیں اور عوام کے خون پسینے کی کمائی پر داد عیش دی جاتی۔

۳) ٹیکسوں کے علاوہ جبری نذرانے اور زبردستی کے تحائف بھی عوام سے وصول کئے جاتے تھے اور ایسی ظالمانہ فضا قائم کر دی جاتی کہ سفاک حکمران مسلسل غریب کی زندگی میں ناآسودگی کا زہر گھولتے رہتے۔

۴) جنگوں کے اخراجات بھی عوام سے لگان اور غیر منصفانہ ٹیکسوں کی صورت میں وصول کئے جاتے، غریب کے بچوں کا مستقبل بادشاہوں کی ہوسِ ملک گیری کی نذر ہو جاتا۔ انا کی دیواریں کچھ اور بھی بلند ہو جاتیں جبکہ غریب کو چادر اور چار دیواری کی

چھتری فراہم کرنے سے بھی عملاً انکار کردیا جاتا۔ وہ معاشرے جن میں اہل ہنر کی ناقدری ہوتی ہے۔ آخر کار معاشرتی بدحالی کا شکار ہو کر اپنے ہی ملبے تلے دفن ہو جاتے ہیں۔

۵) امراء اور جاگیردار طبقہ ہر قسم کے ٹیکس سے مستثنیٰ تھا اور سارا بوجھ تنہا رعایا پر ہی تھا۔ یہ رجحان بھی کسی نہ کسی طرح باقی رہ گیا ہے۔ خصوصاً ترقی پذیر ممالک میں کیونکہ جاگیردار اور سرمایہ دار ہی ملکی سیاست پر مسلط ہوتے ہیں اس لئے وہ اپنے طبقے کی نمائندگی کرتے ہوئے انہیں ٹیکسوں کے بوجھ سے بچائے رکھتے ہیں اور اپنے اللے تللوں کی خاطر ٹیکسوں کا سارا بوجھ عوام پر ڈال دیتے ہیں مراعات یافتہ طبقے کو مزید مراعات دیتے ہیں اور کچلے ہوئے لوگوں کو اس حد تک کچلنے کی شعوری کوشش کرتے ہیں کہ قریہ جبر و تشدد میں ان کا دم گھٹ کر رہ جاتا ہے۔

۶) جو لوگ ٹیکس سے تنگ آکر زراعت چھوڑ کر فوج میں چلے جاتے انہیں بے مقصد جنگوں میں اپنی جان گنوانا پڑتی اور وہ حکمرانوں کی انا کی بھٹی کا ایندھن بن کر اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے' فوج کی ملازمت بھی ایک طرح کی غلامی تھی۔ ٹیکسوں کی بھرمار سے تنگ آکر عوام بخوشی غلامی کی زنجیریں اپنے پاؤں میں ڈال لیتے لیکن اس غلامی سے ان کے مصائب کم نہ ہوتے بلکہ مصائب کے ایک نئے دور کا آغاز ہوتا اور وہ روٹی کے ایک ایک لقمے کیلئے بے غیرتی کی صلیب پر ہر روز مصلوب ہوتے۔

۷) جو لوگ اس سے تنگ آجاتے وہ عبادت گاہوں میں پناہ لینا شروع کردیتے اس سے بیروزگاری اور جرائم میں اضافہ ہو جاتا اور ان گنت سماجی برائیاں جنم لیتیں۔

۸) کسانوں کا طبقہ ایسا طبقہ تھا جو اپنی ہی زمینوں کا رہین تھا۔

۹) جاگیردار طبقہ ان کی جان اور مال کا مالک سمجھا جاتا تھا۔

۱۰) اگر کوئی زمین کسی دوسرے جاگیردار کو بک جاتی تو گویا کسان بھی ساتھ ہی بک جاتا اور اس کی ملکیت بھی بدل جاتی تھی۔ اب وہ آزاد نہیں بلکہ دوسرے مالک کا غلام بن جاتا۔

۱۱) جنگوں کی صورت میں فوجیوں کی خدمت اور بیگار کیلئے ان بیچارے کسانوں کی فوج

کھڑی کی جاتی جبکہ انہیں کسی قسم کی کوئی اجرت بھی نہ دی جاتی۔

جب ایک شخص سے سالہا سال تک بیگار لی جائے اور وہ آمدن نہ ہونے پر بھوک پیاس سے بلک رہا ہو تو اسے مژدہ جاں فزا سنایا جائے کہ اس کی عمر بھر کی تپسیا قبول ہو گئی اور اسے مزید دوہرے تہرے ٹیکس کی ادائیگی بھی کرنا ہے تو اس کے دل پر کیا بیتتی ہوگی۔ پھر اس کی اولاد کی کیا حالت ہوگی۔ اگر وہ ٹیکس ادا نہ کر سکے تو سزا کی حقدار ٹھہرے یعنی ٹیکس کی جگہ اسے اور اس کی اولاد کو بھی محنت بلامعاوضہ کرنا پڑے گی اس نتیجے پر پہنچنا چنداں مشکل نہیں کہ اہل ایران میں طبقات کی تخلیق اور طبقاتی تقسیم معاشرتی بگاڑ کا باعث بنی۔ ملک کی قسمت مفاد پرست ٹولے کے شکنجۂ استبداد میں تھی۔ ارتکاز دولت کے فتنے نے بے رحمی سے ملک کو اپنے پنجۂ استحصال میں جکڑ رکھا تھا۔ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان حالات میں تقسیم دولت کس حد تک منصفانہ ہوگی؟ ظالم ظالم تر اور مظلوم مظلوم تر ہوتا جا رہا تھا۔ ظلم کی چکی میں پسنے والے انسان بے بس ہو چکے تھے جبکہ انہیں اس چکی کے پاٹوں میں پیس ڈالنے والے بے خوف ونڈر اور جابر و قاہر بن چکے تھے۔

حالت یہ ہو چکی تھی کہ غریب غریب تر اور امیر امیر تر ہوتا جا رہا تھا پھر بھی عوام اپنے خون کا آخری قطرہ تک ان بھیڑیوں کے سپرد کر دیتے کہ وہ بصد راحت و سکون کمال فرحت و مسرت کے ساتھ اسے بھی نوش جاں کر لیں؟ کیا اب بھی انہیں کسی مسیحا کا انتظار نہ ہوا ہوگا؟ کیا اب بھی ان کی ترستی حسرتیں کسی انقلاب کی تڑپ میں بے چین نہ ہوئی ہونگیں؟

کیا اب بھی ان کی خوفزدہ نگاہیں کسی نجات دہندہ کی تلاش میں سرگرداں نہ ہوں گی؟

کیا اب بھی ان کے بے قرار دل کسی ایسی مقدس ہستی کیلئے نہ تڑپتے ہونگے جو ان پر اتنا ظلم توڑنے والوں کے خونخوار پنجے کو مڑوڑ کر رکھدے؟

کیا اب بھی ان کے مایوس لٹکے ہوئے چہرے اخلاقِ عظیم کے کسی پیکر خوش

خصال کے استقبال میں کھل اٹھنے کیلئے بے چین نہ ہوتے ہونگے؟

کیا اب بھی ان کی ڈوبتی سانسیں کسی ایسے ناخدا کیلئے دعاگو نہ ہوئی ہونگیں جو ان کی تمناؤں کی کشتی کا سچا اور سُچا کھیون ہار بن سکے؟

کیا اب بھی ان کی معصوم حاجات کے گرتے ہوئے لاشے کسی ایسے عظیم انقلابی رہنما کیلئے تڑپ کو اپنے سینے میں محسوس نہ کرتے ہونگے جو ان کی آئندہ نسلوں کیلئے امن و آشتی اور راحت و فراخی کا سرمدی پیغام لیکر آئے؟

اہل ایران ایک ایسے عظیم انقلاب کے منتظر تھے جس کی ذمہ داری بارگاہ ایزدی سے آقائے نامدار ﷺ کے مبارک کاندھوں پر ڈالی جانے والی تھی اور اب اس کے ظہور اور اظہار کا زمانہ قریب آگیا تھا۔

اہل ایران کے اقتصادی حالات دیکھ کر ہمیں ان میں چند بنیادی خرابیاں واضح نظر آتی ہیں:

یہ کہ ظلم اور استحصال کے ہاتھوں عام آدمی کا سانس لینا تک مشکل ہوگیا تھا۔ جبر و استبداد کا دور دورہ تھا۔ انسان کے بنیادی حقوق کا کوئی تصور سرے سے موجود ہی نہ تھا حسد، بغض، عناد، ریاکاری، مفاد پرستی، حرص، لالچ طمع انسان کی رگوں میں اندھیرا بن کر اترے رہے تھے انسان مختلف خانوں میں تقسیم ہوکر رہ گیا تھا۔ انا پرستی انسانی جبلت میں شامل ہوچکی تھی، انسان انسان کی "خدائی" میں ذلیل و رسوا ہو رہا تھا حق دار سے اس کا حق چھین لینے کی آمرانہ روش جاری تھی فکری اعتبار سے غلامانہ ذہن پرورش پا رہے تھے اور حریت فکر کے تمام دروازوں پر پہرے بٹھا دیئے گئے تھے، انسانوں کی تجارت کھلے عام ہوتی آزاد انسانوں کو اپنی غلامی میں جکڑ کر اور ان کی زندگی موت کا وارث بن کر فخر کیا جاتا اور اسے اپنی برتری کی علامت سمجھا جاتا جبری بیگار کا سلسلہ جاری تھا۔ انسان کو بکاؤ مال بنا دیا گیا تھا زمین کی قیمت فروخت میں زندہ انسان بھی شامل ہوتے اور کسان منقولہ جائیداد کی طرح ایک شخص کی ملکیت سے نکل کر خریدار کی ملکیت میں چلے جاتے اور ضمیر انسانی پرکوئی بوجھ نہ آتا۔ آئینہ دل کے آبگینے سلامت رہتے پس مژگاں کوئی بھی آنسو نہ سلگتا۔ دولت کی غیر مساویانہ تقسیم پر کوئی صدائے

احتجاج بلند نہ کرتا' بیروزگاری نے رہی سہی کسرپوری کردی اور پورا معاشرہ اجتماعی خود کشی کے دہانے پر آکھڑا ہوا' نظریں رہ رہ کر آسمان کی طرف اٹھتیں ہوا میں کسی کے قدموں کی آہٹ محسوس ہوتی اور پھر آسمان روشنی سے بھر گیا اور ایران کے عوام دیوانہ وار اس روشنی کا انتظار کرنے لگے جو ان کے آنگنوں میں اترے گی تو صدیوں کے کچلے ہوئے انسانوں کو بھی آسودگی کی بشارت دے گی نئے دن کی یہ روشنی فاران کی چوٹیوں سے اپنے سفر کا آغاز کر چکی تھی۔

مختصر یہ کہ ایک طرف یہ معاشرہ ان محروم طبقات کے بہت بڑے بیگار کیمپ میں تبدیل ہو چکا تھا اور دوسری طرف وہ مراعات یافتہ طبقے کو بھی اپنے سینے سے لگائے ہوئے تھا جنہیں قدم قدم پر "فرش بہار" نصیب ہو رہا تھا

انتظارِ صبح انقلاب

یہ وہ ملک تھا جس کا خزانہ بہبود عوام کیلئے استعمال نہیں ہوتا تھا اسے بادشاہ کی ذاتی ملکیت تصور کیا جاتا تھا۔ یہ وہ ملک تھا جو چلا چلا کر زبان حال سے کہہ رہا تھا کہ مجھے انقلاب کی ضرورت ہے۔ کیونکہ اس سرزمین پر ایک طرف چیتھڑوں کو ترستے سسکتے انسان تھے تو دوسری طرف ایسے جاگیردار بھی تھے جن کے سر پر صرف ٹوپی ایک ایک لاکھ کی مالیت کی ہوتی تھی اور حقیقت یہ ہے کہ جس معاشرے میں ایک طرف جواہرات جڑے لباس اور دوسری طرف چیتھڑے ایک دوسرے کے بالمقابل آجائیں اس ملک کے افق پر صبح انقلاب ضرور طلوع ہوتی ہے اور نظام کہنہ کا سارا طلسم آن واحد میں زمین بوس ہو جاتا ہے پھر اس ملبے سے صبح نو کا اجالا پھوٹتا ہے جو ہر چیز کو منور کر دیتا ہے اور اندھیروں کا وجود یوں تحلیل ہو جاتا ہے جیسے اس ہستی میں کبھی ظلمت آئی ہی نہ تھی جیسے کبھی خزاں کا ادھر سے گزر ہوا ہی نہ تھا جیسے یہ خطہ دیدہ و دل ازل سے روشنیوں کا سرچشمہ اور خیر و نیکی کا مرکز رہا ہے یہی صبح انقلاب ہے جو طلوع ہو کر رہتی ہے۔

روشنی اپنے سفر کا آغاز کر چکی تھی

ادھر جزیرہ نمائے عرب میں تحریکِ اسلامی تمام مزاحمتی ہتھکنڈوں کے باوجود امید اور اعتماد کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھی اب وسیع تر تناظر میں تحریک اسلامی کے فروغ کیلئے ایک ایسا آزادانہ ماحول درکار تھا جس میں دعوت حق کے ساتھ غلبہ دین حق کیلئے سفر انقلاب میں مزید تیزی سے پیش رفت کی جا سکے چنانچہ تحریکِ اسلامی کی مرحلہ وار منصوبہ بندی پر عمل کرتے ہوئے مرحلۂ ہجرت بھی بخوبی طے کر لیا گیا اور عالمگیر سطح پر دعوت حق کے کام کو منظم کیا گیا

ناطقہ سربگریباں ہے اس کیا کہیئے

اس وقت ایران سیاسی اور اقتصادی ہی نہیں اخلاقی بحران کا بھی شکار تھا۔ اخلاقی گراوٹ اور ذہنی پستی نے ایرانیوں کے قومی تشخص کا تصور تک ذہنوں سے کھرچ ڈالا تھا۔

i۔ اخلاقی دیوالیہ پن کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی ماں بہن یا بیٹی سے شادی کرتا تو اس کے اس قبیح فعل کو باعث رحمت سمجھا جاتا۔

ii۔ اپنی بیوی کو کسی دوسرے کے حوالے کر دینا کہ وہ اس سے کسب معاش چکائے ایک پسندیدہ عمل سمجھا جاتا تھا اور اس کی حوصلہ افزائی کی جاتی تھی۔

iii۔ داشتائیں رکھنے کی عام اجازت تھی بلکہ یہ ان کا معمول تھا۔

iv۔ شراب نوشی روز مرہ کا معمول تھا۔

v۔ شراب کے جام لنڈھائے جاتے' رقص و سرود کی محفلیں برپا ہوتیں' حرامکاری ان کی عادت ثانیہ بن چکی تھی اسے قطعاً معیوب نہ سمجھا جاتا۔

ان میں اخلاقی گراوٹ کے دیگر مظاہر و اسباب بھی تھے۔ مثلاً عدل و انصاف کا کوئی تصور ایرانیوں میں موجود نہ تھا' انہوں نے انسانوں کی بھی درجہ بندی کر رکھی تھی اور وہ اس حوالے سے افراد معاشرہ کو محترم ٹھہراتے یا انہیں تضحیک کا نشانہ بناتے اور انہیں تحقیر کا سزاوار گردانتے۔

۱۷۔ جوا اور سٹہ بازی ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی قمار بازی ان کا قومی مشغلہ تھا۔

مزدک نامی شخص کا حصار بے اماں

حضور اکرم ﷺ کی ولادت باسعادت سے تقریباً نصف صدی قبل تک مزدک نامی ایک شخص کم و بیش ربع صدی عروج پانے کے بعد قتل کردیا گیا اس کے مذہب نے عام رواج پایا اور ایک عرصہ تک برسراقتدار رہا۔ اس کی تعلیمات میں سے چیدہ چیدہ نکات درج ذیل ہیں:

۱) کہ وہ خدا کا فرستادہ ہے۔
۲) وہ زرتشت کی طرح ہے۔
۳) وہ دین ابراہیم علیہ السلام کی طرف دعوت دینے والا ہے۔
۴) تمام انسان مساوی ہیں۔ کسی کو کسی پر کسی اعتبار سے کوئی فوقیت نہیں۔
۵) کسی شخص کو کسی جائیداد کے کسی طرح کے ملکیتی حقوق حاصل نہیں ہیں۔
۶) کسی شخص کو کسی بھی عورت کو منکوحہ بنا کر اپنے لئے خاص کرلینے کا کوئی حق نہیں۔

بلکہ ہر طرح کی جائیداد سب کیلئے مشترک ہے۔ اسی طرح ہر عورت ہر شخص کیلئے مشترک ہے۔ اس میں کسی اپنے پرائے اور بہن بیٹی کا کوئی فرق و امتیاز روا نہیں۔ ہر شخص جہاں کسی بھی جائیداد سے انتفاع کا حق رکھتا ہے وہاں کسی بھی عورت سے تمتع اور لذت اندوزی کا بھی حق دار ہے۔

۷) حیوان کا ذبیحہ حرام ہے۔
۸) انسان کو کھانے پینے کیلئے انہیں اشیاء پر اکتفا کرنا چاہیے جو
i) زمین اگاتی ہے (اور جو)
ii) حیوانات سے حاصل کی جاتی ہیں۔ مثلاً انڈے دودھ دہی مکھن وغیرہ

مزدک ایک آدمی کی بیوی کو لیتا تو اسے دوسرے کے حوالے کردیتا۔ اس کے

پیروکاروں نے لوٹ مار کا بازار گرم کیا اور زنا بالجبر سے ایرانی معاشرے میں ایک طوفان بدتمیزی برپا کر دیا۔

نفس پرستی اور حیوانیت کی اس سے بدتر مثال اور کیا ہوگی؟ انسانیت اور انسان کی تذلیل اس سے بڑھ کر بھلا اور کیا ہو سکتی؟ رشتوں کے تقدس کی پامالی اس سے زیادہ بھلا کہاں ہوئی ہوگی؟ اس سے زیادہ بے حیائی اور کیا ہو سکتی ہے کہ ایک شخص اپنی ہی اس سگی ماں سے بدفعلی کرے جس نے اسے دولت وجود سے نوازا؟ اس بات سے زیادہ بے غیرتی بھلا اور کس درجہ پر ہو سکتی ہے کہ ایک شخص اپنی ہی سگی بہن یا اپنی بیٹی کی طرف ہوس ناک نگاہ اٹھائے؟ (نعوذ باللہ)

مگر انسان کس قدر ظالم ہے کہ اس نے (معاذ اللہ) یہ سب کچھ کیا۔ زمین کا حوصلہ ہے کہ اس نے یہ سب اپنے اوپر ہونے دیا اور آسمان کی ہمت ہے کہ اس کی آنکھ نے یہ سب کچھ برداشت کیا۔

کیا یہ اتنی آزاد روی صدیوں پرانی جہالت کی بات نہیں؟ کیا مرد و عورت کو یہ کھلا حق دیدینا اس جہالت کی یادگار نہیں؟ کیا آج اس کی حمایت کرنا فرسودگی اور (Backwardness) نہیں؟ اگر یہ ہے اور یقیناً ہے تو حیرت ہے آج کے اس اندھے ذہن پر جو جدید اور قدیم میں فرق نہیں کر سکتا۔ حسرت و یاس اور افسوس صد افسوس ہے اس دماغ پر جو بعد میں آنے والے پردے اور نکاح کو تو دقیانوسیت' پرانی رسمیں اور قدامت پسندی سمجھے اور اس کا برملا اعلان کرے جبکہ پہلے کی جہالت فرسودگی' گھٹیا پن بے حیائی اور بے غیرتی کو جدید اور جدت پسندی کہے۔

اس بے حمیتی' بے غیرتی' بے حیائی' اخلاق سوزی' دقیانوسیت' فرسودگی' جہالت' بدتہذیبی اور طوفان بدتمیزی کے خلاف پل باندھنے اور انسان کو انسانیت آشنا بنانے کیلئے ایک عظیم کائناتی انقلاب کی ضرورت تھی جو انسانوں کو حیوانیت اور شیطنت کی دلدل سے نکال کر اخلاقی کمال کی راہ پر گامزن کرے یہی وہ ذمہ داری تھی جو اللہ جل وعلا نے اپنے حبیب علیہ الصلوۃ والسلام سے انجام دلوائی۔ اور یہی وہ انقلاب تھا جو ہجرت مدینہ کے ساتھ اپنے اولین تکمیلی اور تیسرے تحریکی مرحلے میں داخل ہوا۔

قانونی حالت

جہاں شرف انسانی کی پامالی کو اس حد تک روا رکھا جاتا ہو کہ رشتوں کا تقدس مٹ گیا ہو وہاں قانون، عدل اور انصاف کے الفاظ کی وقعت کیا ہو گی۔ قانون اور جرائم کو تقسیم کچھ یوں تھی۔

۱) دین چھوڑ دینا۔

۲) بادشاہ کے خلاف بغاوت (بعض اوقات بادشاہ سے محض اختلاف) کرنا۔

ان جرائم کی سزا صرف اور صرف موت تھی۔

۳) آپس میں ایک دوسرے کے خلاف جرم۔

ان جرائم کی سزا کبھی موت ہوتی تھی کبھی کم۔

مروجہ سزائیں

ایران میں جرم و سزا کا ہر تصور تاجِ شاہی کی رضا سے مشروط تھا جب فرمان شاہی ہی قانون کی حیثیت رکھتا ہے تو عدل و انصاف کی صورت حال کیا ہو گی۔

مختلف سزائیں مختلف جرائم کی پاداش میں دی جاتیں۔ مثلاً

۱) ایک سزا کا نام نو موتیں تھا اس میں جلاد

i) پہلے ہاتھوں کی انگلیاں کاٹتا تھا۔ (پہلی موت)

ii) پھر پاؤں کی انگلیاں کاٹتا۔ (دوسری موت)

iii) پھر کلائیوں تک ہاتھ کاٹتا۔ (تیسری موت)

iv) پھر ٹخنوں تک پاؤں کاٹتا۔ (چوتھی موت)

v) پھر کہنیوں تک بازو کاٹتا۔ (پانچویں موت)

vi) پھر گھٹنوں تک پنڈلیاں کاٹتا۔ (چھٹی موت)

vii) پھر کان کاٹتا۔ (ساتویں موت)

viii) پھر ناک کاٹتا۔ (آٹھویں موت)

ix) پھر سر کاٹتا۔ (نویں موت)

اس طرح یہ ظالمانہ اذیت رسانی ختم ہوتی۔

۲) ان میں ایک سزا دیوار میں زندہ چنوا دینے کی بھی تھی۔

۳) ان میں ایک سزا ہاتھیوں کے پاؤں تلے روند ڈالنے کی بھی تھی۔

۴) ان میں ایک سزا زبان کھینچ کر نکال دینے کی بھی تھی۔

۵) ان میں ایک سزا کانوں اور آنکھوں میں پگھلا ہوا سیسہ ڈالنے کی بھی تھی۔

۶) ان میں ایک سزا زندہ آدمی کے جسم کی ساری یا آدھی کھال کھینچ لینے کی بھی تھی۔

۷) جسم کے اعضا ایک ایک کر کے کاٹنے اور ہڈیاں توڑنے کی سزا بھی تھی۔

۸) پیشانی سے ٹھوڑی تک کھال (پورے چہرے کی) کھنچوا دیتے' آنکھوں اور باقی تمام جسم میں سلاخیں چبھوتے اور پھر مرنے تک زخموں' منہ' آنکھوں اور نتھنوں میں تھوڑا تھوڑا سرکہ ڈالتے رہتے' لیموں اور نمک چھڑکتے رہنے کی سزا بھی تھی۔

۹) آنکھیں نکال دینے کی سزا بھی تھی۔ آنکھوں میں کھولتی سلاخ ڈلوانے یا کھولتا ہوا تیل ڈلوانے سے بھی اندھا کیا جاتا تھا۔

۱۰) ایک شخص کے بدلے میں اس کے تمام رشتہ داروں کو قتل کرنے کی سزا بھی تھی۔

۱۱) کبھی یوں ہوتا کہ ایک قیدی کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اسے اندھے کنویں میں پھینکوا دیا جاتا اوپر سے ان پر بھوکے چوہے یا موذی جانور چھوڑ دیئے جاتے جو اسے مرتے دم تک تھوڑا تھوڑا کاٹ کاٹ کر کھاتے رہتے۔ یہ طویل ظالمانہ عذاب کی ایک شکل تھی (ایران بعہد ساسانیان)

ان میں سے زیادہ تر سزائیں سیاسی مخالفین کو دی جاتی تھیں یا اختلاف رائے کرنے والوں کو یا پھر ان شہزادوں کو جن سے بغاوت کا خطرہ ہوتا۔

ان کے قوانین کا ماخذ ان کی مذہبی کتابیں تھیں یا ان کی تشریحات جو بالعموم مذہبی پیشواؤں کی مقرر کردہ ہوتیں۔ تیسری صورت بادشاہ کی جنبش ابرو کا اشارا تھی۔

اثبات جرم و بے گناہی

جرم یا بے گناہی ثابت کرنے کیلئے نہایت عجیب و غریب طریقے اختیار کئے جاتے تھے۔ مثلاً

ا) آگ میں گرم کردہ سرخ لوہے پر ننگے پاؤں چلانا بمع دیگر رسوم مذہبیہ کے کہ اگر بچ گیا تو بے گناہ ہے ورنہ مجرم ہے۔

ب) دوران حلف گندھک ملا پانی پلانا۔

ج) بھڑکتی آگ میں سے چل کر گزرنا۔

د) زہریلی خوراک کھانا۔۔۔ وغیرہ

یہ اور اس طرح کی دیگر آزمائشوں میں جو پورا اترتا وہ یقیناً بے گناہ ثابت ہو جاتا۔۔۔ خواہ اصل مجرم وہی ہوتا۔۔۔ اور اگر کوئی شخص پورا نہ اترتا تو وہ یقیناً مجرم ثابت ہو جاتا۔۔۔ خواہ اس کا جرم سے دور پرے کا بھی کوئی تعلق واسطہ نہ ہوتا۔

ایران کے در و دیوار تک زبان حال سے چلا چلا کر ایک انقلاب کو پکار رہے تھے۔ زمین کی گود ہری ہونے کیلئے انقلاب کی منتظر تھی۔ آسمان کی آنکھ وا ہونے کیلئے انقلاب کے انتظار میں تھی۔ باران رحمت بے تحاشا برسنے کیلئے انقلاب کیلئے چشم براہ تھی۔ انسانیت رو رو کر اگر کسی بے چینی کا اظہار کرتی تھی تو اسی کا کہ وہ ایک انقلاب کی راہ میں اپنی پلکیں بچھا دینے کیلئے بیتاب اور قلب و جاں نثار کرنے کو بے قرار ہے۔

آئندہ صفحات میں ہم اس وقت کی دوسری بڑی طاقت (2nd Super Power) کا جائزہ لیں گے کہ سلطنت رومہ کے حالات کیا تھے؟ تعلیمات عیسوی کس پیچ و تاب سے گزر رہی تھیں اور شعورِ انسانی کن مراحل سے گزر کر اپنی تکمیل کی طرف انتہائی منزل کا متلاشی تھا؟

باب — ۳

سلطنت رومہ

روم و یونان

سوویت روس کے بکھرنے اور کمیونزم کی اپنے ہی وطن میں بے وطنی کے بعد میدان عمل میں صرف ایک سپرپاور باقی رہ گئی ہے امریکہ واحد سپرپاور ہونے کے زعم میں مبتلا ہے اور نیو ورلڈ آرڈر کے ذریعہ یورپ سمیت تمام اقوام عالم پر حکمرانی کے خواب دیکھ رہا ہے لیکن ہجرت مدینہ کے وقت قیصرو کسریٰ کی سپرپاور اپنے تمام تر شاہی کر و فر کے ساتھ موجود تھیں اگرچہ دونوں تہذیبوں میں شرف انسانی کالہو جھلک رہا تھا تاہم لاشعور میں حرفِ حق کو قبول کرنے کا داعیہ بھی موجود تھا یہی وجہ ہے کہ یہ تہذیب چشم زدن میں زمین بوس ہو گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے چند برسوں میں ہر طرف پرچم توحید لہرانے لگا۔

سلطنت رومہ اصل میں ایک طرح سے یونان کی ہی سلطنت کہلاتی تھی کیونکہ فکری واعتقادی نیز عملی اور انتظامی اعتبار سے اس کی جڑیں یونانی تہذیب میں پیوست تھیں حتیٰ کہ یونان اور اس کے فلاسفر ہی رومیوں کے ہیرو تھے۔

یونان اصل میں ایک چھوٹا سا خطہ زمین ہے جو پہاڑی سلسلوں پر مشتمل ہے۔ ان پہاڑوں کے درمیان قابل کاشت وادیاں ہیں۔ دشوار گزار پہاڑی سلسلے کی بنا پر ماضی میں بالعموم یہی حدود ریاست بھی تھیں جو ایک ریاست کو دوسرے سے جدا کرتی تھیں۔ آج اگر ہم جدید نقشہ پر نگاہ ڈالیں تو یونان کے تین اطراف میں سمندر دکھائی دیتا ہے بلکہ خود یونان بھی چھوٹے چھوٹے جزیروں میں تقسیم دکھائی دیتا ہے۔ سمندر کا وہ حصہ جو ترکی کے بالکل آمنے سامنے ہونے کی صورت میں سامنے آتا ہے اسے (Aegean Sea) کا نام دیا جاتا ہے اگر دائیں طرف مڑ کر ایتھنز کے جزائر سے باہر نکل جائیں تو کرت Krit / Crete سے آگے جاکر یہ سمندر (Medterranean Sea) میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ خشکی میں اس سے یوگوسلاویہ' بلغاریہ' البانیہ اور ترکی کی سرحدیں

آکر ملتی ہیں۔ ترکی کا جو حصہ اس کی حدود سے ملتا ہے وہ استنبول ہے۔ یہ وہی جگہ ہے جسے قسطنطین نے آباد کیا تھا اور سمندر کا وہی ساحل ہے جس پر حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ نے جام شہادت نوش فرمایا تھا۔ یہی وہ جگہ ہے جو عظیم سلطنت رومہ کا دار الحکومت بنی اور ایک وقت ایسا بھی آیا تھا کہ روم کی سلطنت اسی قسطنطنیہ ہی میں محصور ہو کر رہ گئی تھی۔ یونان سکندر کے زمانے تک یونہی رہا۔ بعد ازاں سکندر نے اسے ایک عظیم الشان سلطنت کا پایہ تخت بنا دیا۔

اٹلی کا ایک شہر رومہ ہے یہ اٹلی کا دار الحکومت ہے۔ اس کا ایک لقب شہر دوام یا دائمی شہر (Eternal City) بھی ہے۔ ۷۵۳ قبل مسیح میں دریافت ہوا اور دریائے ٹائبر (River Tiber) پر واقع سات پہاڑیوں اور اس کے ارد گرد تعمیر ہوا۔ یہ شہر ایک زمانہ تک عظیم سلطنت روم کا دار الحکومت بھی رہا ہے۔

عیسائیت کے ابتدائی دور میں اس پر گوتھوں (Goths) نے قبضہ کر لیا تھا یہ بنیادی طور پر ایک Germanic یا IndoEuropeanfamily سے تعلق رکھنے والے لوگ تھے جس کے زیر تسلط علاقہ اصلاً Baltic Sea سے لیکر Black Sea تک کا تھا۔ یہ علاقہ ایک طرف پولینڈ' نیدرلینڈ (ہالینڈ) اور جرمنی کا ساحلی حصہ ہے بلکہ سکینڈے نیویا بھی ایک طرح سے اسی میں شمار ہوتا ہے تو دوسری طرف بلغاریہ رومانیہ وغیرہ کا ساحلی علاقہ ہے۔ ان کا یہ قبضہ ۵۵۲ء میں ختم ہوا اور ان کی جگہ بازنطینی حکومت آگئی۔ بازنطینی سلطنت وہ ہے جسے ہمارے مورخین اور ہم روم کہتے ہیں۔ اس کا عروج ۳۳۰ء میں شروع ہوا جب کہ قسطنطین اول نے اسے تعمیر کیا' خود عیسائیت قبول کی اس کو دار الحکومت بنایا اور اس کا نیا نام قسطنطنیہ رکھا۔ روم (اٹلی) کو مسلمانوں نے نویں صدی میں فتح کیا تھا جبکہ قسطنطنیہ کو پندرھویں صدی میں عثمانی ترکوں کی خلافت کے دوران فتح کیا گیا۔ یہ وہ وقت تھا جب سلطنت روم مکمل طور پر ختم ہو گئی۔ قسطنطین کا بنایا ہوا دار الحکومت آج بھی استانبول کے نام سے ترکی کا دار الحکومت ہے۔ غرض کہ روم کی سلطنت (نہ کہ شہر رومہ) ایک وقت تھا کہ دنیا کی عظیم الشان سلطنت تھی بلکہ

اس کی حیثیت ایک Super Power کی سی تھی اٹلی کا شہر رومہ اس کا دارالحکومت رہا ہے۔ اس شہر کا نام روم (Rome) تھا اس کی بنا پر ہی (غالباً) بازنطینی سلطنت کو بھی روم کہا جاتا رہا ہے اس کی ترقی کا بام عروج یہاں تک بلند ہوا کہ اگر ہم آج کے نقشے پر نگاہ ڈالیں تو ایک وقت ایسا بھی تھا جب اس حکومت کی سرحدیں ایک طرف آج کے انگلستان کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے تھیں تو دوسری طرف موریتانیا (Mouritania) اس کی حدود میں داخل دکھائی دیتا ہے۔ تیسری طرف مصر اور شام اس کے زیر نگیں نظر آتے ہیں تو چوتھی طرف آرمینیا کا وہ پہاڑی سلسلہ بھی اسی کے زیر تسلط نظر آتا ہے جو ایک طرف Black Sea کے پاس تک آتا ہے تو دوسری طرف Caspian Sea تک چلا جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ ایک وقت وہ بھی تھا جب روم کی عظیم سلطنت کا جھنڈا آج کے کئی ممالک پر لہرا رہا تھا۔ ان میں خاص طور پر افریقہ میں مراکو، موریتانیا، الجزائر، لیبیا اور مصر قابل ذکر ہیں مشرق وسطی میں عراق، شام، اردن، فلسطین، لبنان ہیں۔ اس کے علاوہ ترکی، اس کے شمال مشرق میں آرمینیا یعنی روس کا کافی حصہ، اب سے کچھ عرصہ پیشتر کے روس، ایران اور ترکی کی سرحدوں کا سنگم آرمینیا کی ریاست تھی لیکن پرانے دور کے آرمینیا کی حدود اس سے آگے موجودہ جورجیا سے بھی کافی آگے تک روس کے اندر تھیں۔ اور پھر یورپ کی طرف چلیں تو اٹلی، بلغاریہ، یوگوسلاویہ، رومانیہ، ہنگری، آسٹریا، جرمنی، فرانس، بلجیم، سوئٹزرلینڈ، مناکو، سپین، پرتگال، لگزنبرگ اور پھر انگلستان تک کی زمین اس ایک حکومت میں شامل تھی۔

ہمیں شک نہیں کہ اس کی حدود مختلف اوقات میں مختلف ہوتی رہیں لیکن مرکزی علاقہ اس کا اٹلی اور یونان ہی کا رہا۔ اگرچہ دارالحکومت استانبول ہاتھ سے نکل گیا اور قوت ادھر منتقل ہو گئی۔

ان دو سلطنتوں کے (ایران اور روم) بعض علاقوں پر بکثرت لڑائی رہی۔ یہ کبھی ایک کے زیر نگیں آئے تو کبھی دوسرے کے زیر تسلط رہے۔ ان علاقوں میں زیادہ

تر مشرق وسطی کے علاقے مثلاً عراق شام وغیرہ۔ اسی طرح ایشائے کوچک والی طرف آرمینیا' قابل ذکر ہیں۔ اسی قبیل سے مصر کو بھی شمار کیا جاسکتا ہے.....

یہ ایک ہلکی سی جھلک تھی اس سلطنت کے حدود اربعہ کی جس کا مذہبی اثر افریقہ میں سوڈان اور نائجیریا سے گزر کر ایتھوپیا اور صومالیہ تک جا پہنچا اور جس کے زیر اثر ہی ایک وقت عرب کے جزیرہ نما کا جنوبی خطہ یعنی یمن کا سرسبز و شاداب علاقہ بھی رہ چکا تھا۔ ایتھوپیا تو خاص طور پر وہ عیسائی حکومت تھی جسے ہم حبشہ کے نام سے جانتے ہیں۔ بعثتِ مصطفوی ﷺ کے وقت اور ہجرت حبشہ تک بھی اہل مکہ کے ساتھ ان کے دوستانہ اور تجارتی تعلقات قائم تھے۔

یہ ایک سپرپاور (Super Power) تھی جس کے نام کا سکہ چلتا تھا۔

روم کے حالات کا مختصر جائزہ

مذہبی حالات

روم کے مذہبی حالات کے پس منظر میں اتنی بات مسلم ہے کہ ان پر یونانی افکار واعتقادات کی نہایت گہری چھاپ تھی۔ انہی کی طرح مظاہر اور آسمانی دیوتاؤں کی پوجا ان کا بھی طریقِ حیات تھا۔ پھر ان کے افکار میں مختلف اوقات میں مختلف تبدیلیاں آتی رہیں۔ ان تبدیلیوں کا ایک مختصر سا خاکہ درج ذیل ہے۔ (اس میں ہم صرف اہم نکات کو بیان کریں گے)۔

۱۔ ۲۷ --- ۱۹ ق م۔ یہ اغسطس (Augustas) کا دور حکومت ہے۔ اس دور میں ہی ملوکیت کا آغاز ہوگیا۔

۲۔ ۹۸ --- ۱۱۷ یہ طرایانوس (Trianus) کا دور ہے یہ پہلا غیر اطالوی بادشاہ تھا۔

۳۔ ۱۱۷ --- ۱۳۸ ھندریانوس (Handrianus) کا دور ہے۔ اس دور کی خصوصیات میں سے ایک یہ بھی تھی کہ اس میں عوامی فلاح وبہبود کی طرف توجہ دی

گئی۔
دوسری اہم خصوصیت یہ تھی کہ اس دور میں مشرقی اور مغربی صوبوں کے مابین مساوی سلوک کا آغاز ہوا۔ اس سے قبل مشرقی علاقوں اور ان کے نظریات کو گھٹیا اور فرسودہ سمجھا جاتا تھا۔
تیسری اہم خصوصیت اس دور کی یہ تھی کہ اس دور میں مشرقی عقائد کا اعتراف کیا گیا۔ یعنی عیسائیت کے وجود کو تسلیم کرلیا گیا ورنہ اس سے قبل مسیحیت کے وجود ہی کو سرے سے تسلیم کرنے سے انکار ہوتا رہا تھا۔
۴۔ ۱۳۸ ... ۱۶۱ انطونیوس (Antonius Puis) کا دور حکومت ہے۔ اس دور کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں فلاح عوام کا تصور ایک مرتبہ پھر دھندلا گیا۔ اس کی جگہ جور واستبداد نے لے لی۔ اس نئے منظر میں عوام بے وقعت اور خواص صاحبانِ وقعت ہو گئے اور اقتدار ان کے ہاتھوں میں کھیلنے لگا۔
۵۔ ۱۸۰ ... ۱۹۲ قومدوس (Commodus) کا دور حکومت آجاتا ہے۔ اس دور حکومت میں ایک اور نئی تبدیلی آگئی۔ ہوا یوں کہ اس کے دورِ حکومت میں مشرقی عقائد کا بالعموم غلبہ ہوگیا۔ جس کا صاف مطلب یہ تھا کہ عوام کا میلان مسیحیت کی طرف اور مسیحیت میں توحید اور ردِ شرک کی طرف زیادہ تھا۔
۶۔ ۲۱۲ ... ۲۱۷ کاراکلا (Caracalla) کا دور حکومت آجاتا ہے۔ اس میں معاشرے نے ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ یہ سیاسی رنگ تھا اور وہ قدم یوں تھا کہ مقتدر رومیوں اور عوام کے درمیان امتیازات کو ختم کردیا گیا۔ ورنہ اس سے قبل انسانوں کے مابین طبقات سازی کی ایک خلیج حائل کردی گئی تھی۔
۷۔ ۲۱۸ ... ۲۲۲ الاگبال (Elagabal) کا دور حکومت ہے۔ اس کے دور میں اہم سرکاری عقائد میں تبدیلی آئی اور وہ یہ کہ سرکاری عقائد میں دو خداؤں کی عبادت کا اضافہ ہوگیا۔
ا) شام کا سورج دیوتا

ii) افریقہ کی چند ر دیوی

یوں ایک مرتبہ پھر پرانے یونانی افکار کا قرب حاصل ہو گیا۔

۸۔ ۲۷۰ --- ۲۷۵ اوریلیانوس (Aurelianus) کا دور حکومت آتا ہے۔ اس کے دور میں عقائد میں ایک اور بہت بڑی تبدیلی آتی ہے۔ مشرک چار قدم اور آگے بڑھاتا ہے اور خداؤں میں مزید اضافہ سے عوام کو روشناس کرایا جاتا ہے۔ ان میں یہ دو خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ا) ایرانی دیوتا متھراس (Mithras) کو زیر عبادت لایا جاتا ہے۔

ب) دوسرا خدا اس سے بھی زیادہ خطرناک متعارف کرایا جاتا ہے اور وہ شہنشاہ اوریلیانوس خود ہے۔ یعنی بادشاہ خود کوئی اوتار بھی نہیں بلکہ براہ راست دیوتا بنا دیا جاتا ہے۔ انسان' انسان کا پجاری ہو گیا اور انسان' انسان کا خدا بن بیٹھا۔

۹۔ ۲۸۴ --- ۳۰۵ دیو قلیسیانوس (Divclalianus) کا دور حکومت آتا ہے۔ اس دور میں درج ذیل اہم تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔

ا) شاہوں اور ولی عہدوں کے مابین حکومت کی نئی تنظیم ہوئی جس کے مطابق قلم رو کو شاہ اور اس کے شاہزادوں میں تقسیم کردیا گیا۔ یعنی بادشاہ کی حکومت مرکزی اور ولی عہدوں کی حکومتیں ذیلی جس طرح ایک وفاق اور اس کے صوبے ہوتے ہیں۔

ب) درباری رسوم کو قدیم مشرقی طرز پر استوار کیا گیا۔ یعنی آدابِ شاہی اور سجدہ شاہی وغیرہ کے بجالانے کی رسم دوبارہ شروع کی گئی اور بادشاہوں کو خدائی کی طرف منسوب کرنے کا نئے سرے سے آغاز ہوا جبکہ ہم یہ بھی پڑھ چکے ہیں کہ بادشاہ کو باقاعدہ دیوتا قرار دے کر اس کی پوجا کا آغاز ایک عرصہ قبل ہو چکا تھا۔ یہاں اسی سوچ نے ایک اور قدم آگے بڑھایا تھا۔

ج) مسیحیوں پر ظالمانہ تشدد کا ایک مرتبہ پھر آغاز ہوا۔ اس کام میں نیا زور و شور اور نیا ولولہ پیدا ہوا۔ لیکن یہ مذہب پھیلتا ہی گیا کیونکہ اس کے ماننے والوں نے اسے پھیلانے اور مقبول عام بنانے کیلئے اس کی بنیادی تصورات میں کافی مناسب تبدیلی پیدا کرلی تھی۔

اس کا بنیادی ڈھانچہ بھی اس قدر بدل گیا تھا کہ جس میں کئی خداؤں کی پرستش اور دیگر یونانی اعتقادی و فکری لوازمات کا بے دریغ اضافہ ہو چکا تھا۔ اس بنا پر مسیحی آبادی میں خاطر خواہ اضافہ ہو چکا تھا اور یہ مذہب اپنی تبدیل شدہ صورت میں پورے روم میں پھیل چکا تھا۔

۱۰۔ ۳۱۱ میں شہنشاہ گلیرئس نے بالآخر رواداری (مذہبی) اور مسیحیت کو اس کی حالیہ شکل میں اس کے نفاذ کا اعلان جاری کیا۔

۱۱۔ ۳۱۲ میں قسطنطین نے لیکینیوس (Licinius) کے ساتھ مل کر مشترکہ حکومت بنائی اور بعد میں اسے بے دخل کر کے خود مطلق العنان شہنشاہ بن بیٹھا۔ اس دور میں یعنی ۳۱۳ میں میلان (Milane) کا شاہی فرمان جاری ہوا جس کی رو سے عیسائیت کو بطور ایک مسلمہ مذہب کے تسلیم کر لیا گیا اور ملک میں مذہبی رواداری کا فرمان تعمیل کی طرف گامزن ہوا۔

اسی کے دور میں ۳۲۵ میں شہنشاہ نے اپنی زیر سرپرستی عیسائی پادریوں اور ان کے بڑے مذہبی راہنماؤں کی ایک مجلس نیقیہ (Nicaea) میں منعقد کروائی اور انہیں کسی ایک مذہب (عیسائیت) کے نام پر جمع ہونے کا موقع مہیا کیا۔

آخری وقت میں اس نے دیکھا کہ عیسائی مذہب اس قدر پھیل چکا ہے کہ اپنے قدموں پر مضبوطی سے کھڑا ہونے کے قابل ہو چکا ہے لہٰذا اس نے خود بھی بپتسمہ لیا اور اپنے عیسائی ہونے کا اعلان کر دیا۔

اس کے بعد عیسائیت اپنی تحریف و تبدیل شدہ صورت میں فروغ پاتی رہی اور دوسری طرف سرکاری مذہب کے طور پر قائم رہی۔ جب ہم بعثت کے وقت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ مبارک کے روم کی مذہبی حالت کو دیکھنا چاہتے ہیں تو اس سے ہماری مراد اس وقت کی مسیحیت کی تحریف شدہ کیفیت کا بیان ہوتا ہے۔ یہ مذہب چونکہ قدیم یونانی افکار سے متاثر ہے اس لئے دونوں کو یکجا کر لینا زیادہ سود مند دکھائی دیتا ہے واللہ اعلم و رسولہ صلی اللہ علیہ وسلم

رومیوں کے مذہب میں خدا کا تصور

یونانیوں میں کسی ایک خدا کا کوئی تصور نہ تھا۔ بلکہ وہ دیوتاؤں کے ایک پورے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ مثلاً

۱) دیوتا زیوس (Zeus) اور اس کی بیوی (Hera) اس خاندان کے یعنی تمام دیوتاؤں کے سربراہ تھے۔ جو انسانی زندگی کے مختلف معاملات کی دیکھ بھال کرتے تھے۔

۲) پوسائیڈن (Poseidon) سمندروں کا دیوتا تھا۔

۳) ہیفائے سٹوس (Hephae Stos) کے ذمہ اسلحہ سازی کی نگرانی تھی اور اس کیلئے ساز گار حالات اور خام مال وغیرہ کی فراہمی تھی۔

۴) محبت کی دیوی کا نام ایفروڈائٹ (Aphrodite) تھا۔ محبت کرنیوالوں کی کامیابی یا ناکامی اس کی نگاہِ عنایت کی مرہون منت تھی۔

۵) علم و حکمت کی فراوانی کا کام ایتھنا (Athena) کے حوالے تھا۔

۶) جنگ و جدال کی صورت میں (Apolo) کی رضامندی ضروری ہے۔

غرض کہ نہایت درجہ ضعیف الاعتقادی اس مرکز علم و حکمت کا طرہ امتیاز تھا علم اور فلسفہ کیا تھا بس بد اعتقادی اور جہالت کا پلندہ تھا۔ عیاذ باللہ۔ یوں سمجھئے طفلانہ سوچ کی حکمرانی تھی۔

روم میں بھی ایک زمانہ (صدیوں تک) اسی طرح معبودان باطلہ کی پوجا ہوتی رہی۔ تا آنکہ حضرت عیسیٰ علی نبینا علیہ الصلوۃ والسلام تشریف لائے اور توحید کا بول بالا کیا جو انہیں پسند نہ آیا۔ آپ کے رفع الی السماء کے بعد حواریوں میں سے کچھ نے مقبولیت حاصل کرنے کیلئے خدا کے تصور میں بھی تبدیلیاں کردیں اور بت پرستی کی چیزیں اور عمل یونان سے مستعار لے لئے۔ مثلاً

i) دیوی دیوتاؤں کی جگہ خدا رسیدہ بزرگوں اور فرشتوں نے لے لی۔ بالفاظ دیگر

ii) بت پرستی کی جگہ مجسموں کی عبادت نے لے لی۔

iii) اوتار ہونے کے تصور کی جگہ حلول نے لے لی

iv) ایک خدا کی جگہ اقانیم ثلاثہ نے لے لی۔ طرفہ تماشا یہ ہے کہ خدا ایک بھی رہا' تین بھی ہو گیا۔ ایک میں تین بھی ہوئے اور تین میں ایک بھی ہوا۔ تین جدا شخصیتیں بھی رہیں اور تین مل کر ایک شخصیت بھی بن گئی۔ غرض ہر لغو بات پر لایعنی تاویل' اور ہر بیہودہ بات کو قابل صد احترام عقیدے کی طرح قبول کر لیا گیا۔

v) پھر ایک شکل یہ بھی تھی کہ حضرت عیسی علیہ السلام کو کلام الہی کا مجسمہ تسلیم کیا گیا

مختصر یہ کہ توحید کی جگہ ہر اعتبار سے شرک نے لے لی تھی اور اسے دوبارہ توحید کی خالصیت کی طرف لانا ازحد ضروری تھا۔ خدا کا تصور مجروح ہو چکا تھا اس غلط تصور کی اصلاح نہایت لابدی امر تھا نیز اس باطل عقیدے سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی برات ظاہر کرنا بھی غایت درجہ لازم تھا۔

رسالت کا تصور

آسمانی مذاہب میں رسالت کا تصور اپنی تمام تر تخلیقی توانائیوں کے ساتھ موجود تھا۔ دیگر مذاہب میں خدا کا تصور کسی نہ کسی شکل میں باقی رہ گیا تھا لیکن رسالت کا تصور اصنام پرستوں میں سرے سے موجود ہی نہ تھا۔

مسیحیت بنی اسرائیل میں آئی تھی اور بنی اسرائیل صدیوں سے نبوت و رسالت سے واقف تھے بلکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شریعت پر عمل کے دعویدار بھی تھے۔ حضرت موسی علیہ السلام کے لائے ہوئے دین پر عمل کرتے تھے۔ (یہ سب کچھ جیسا تیسا بھی الٹا سیدھا تھا مگر بہرکیف ان میں موجود تھا) حتی کہ انہیں نبی آخر الزماں ﷺ کا انتظار تھا اور صدیوں سے تھا۔ لیکن انہوں نے اپنی فطرت سے مجبور ہو کر رسالت و نبوت کے تصور کو بھی مسخ کر دیا۔ ان کی نسل نو میں جو خاص تبدیلی تصور رسالت کے باب میں آئی وہ یہ تھی۔

ا) انہوں نے رسول کے تصور کو ملائکہ کے تصور سے ملا دیا تھا۔

ب) رسول کے انسان اور انسان کے رسول ہونے کا انکار کرنے لگے تھے۔

ج) تصور رسالت کو بعض نے تصور حلول سے ملا دیا تھا۔
د) بعض رسول کو خدا کہہ کر انہیں عبادت کے لائق سمجھنے لگے تھے۔
ہ) بعض عین خدا تو نہیں کہتے تھے لیکن خدا کا بیٹا کہنے لگے تھے۔

غرض کہ رسالت کا تصور خالص اور اصل سچی و سُچی شکل میں قائم نہ رہا تھا اس کی شکل مسخ کر دی گئی تھی۔ لہٰذا لازم تھا کہ اس تصور کی پھر سے اصلاح کی جائے۔ لازم تھا کہ پیکرِ رسالت پر جو شرک کا غبار چھا گیا تھا اس کو تصورِ رسالت و نبوت سے اور فلسفہ نبوت و رسالت کو اس شرک سے اس طرح جدا کر دیا جائے کہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے۔ لازم تھا کہ کوئی مردِ حق اٹھے اور ان تمام خرافات کو اٹھا کر بھاڑ میں جھونک دے جنہوں نے ایک طرف ان پاک طینت اور پاک بازان امت کو افتراء پردازی اور بہتان و الزامات کے نیزوں کی انیوں پر رکھ کر ان کی پاکیزہ روحوں کو زخم زخم اور قلوب کو ریزہ ریزہ کر دیا تھا اور ایسی روحانی اذیتیں دی تھیں کہ الامان والحفیظ تو دوسری طرف انسانیت کو مستقل اور مسلسل قتل و غارت گری اور فتنہ و فساد میں مبتلا کر رکھا تھا۔ نیز دنیا کے ساتھ ساتھ ان کی آخرت بھی برباد کر رکھی تھی۔ لازم تھا کہ ان لایعنی تاویلات اور بے فائدہ "فلسفیانہ موشگافیوں" اور فکری مغالطوں سے سادہ لوح عوام کو نجات دلائی جائے اور انہیں ایسا عقیدہ دیا جائے جو اسے عملی زندگی میں ظاہری اور باطنی ترقی کی طرف گامزن کر سکنے کی قوت رکھتا ہو۔

تصور آخرت

آخرت کا تصور ایک ایسا عقیدہ ہے جو انسان کو بطور ایک انسان کے اس کے غریزہ شوق اور غریزہ خوف دونوں کو حرکت دیتا ہے۔ شوقِ حصولِ جنت و رحمت و دیدار حق کی طرف گامزن کرتا ہے جبکہ خوف دخول نار و لعنت و غضب حق سے بچنے کی طرف مائل کرتا ہے۔ یہ تصور عملِ صالح پر اکساتا ہے جس پر عمل پیرا ہونا نفس انسانی کیلئے غایت درجہ مشکل ہے۔ جبکہ یہی تصور دوسری طرف عمل صالح سے دور بھاگنے کی طرف راغب کرتا اور منکرات سے اجتناب کی طرف انسان کا زور لگواتا ہے۔ جبکہ یہ

عمل نیکی پر عمل پیرا ہونے سے بھی کہیں زیادہ مشکل ہے بلکہ بعض اوقات قریب ناممکن سا محسوس ہوتا ہے۔ لہٰذا آخرت کا تصور یہودیوں اور یونانیوں کو اول تو ویسے ہی قابل قبول نہیں ہو سکتا تھا خاص طور پر ان حالات میں کہ خود ان کے یہاں ہر نیک و بد کے بعد سزا سے بچنے اور جزا حاصل کرنے کیلئے دیوتاؤں کی بارگاہ میں قربانی پیش کرنے کا تصوّر بھی موجود تھا تو بھلا کون بیوقوف اس آرام دہ اور لائقِ صد افتخار تصور کو ترک کر کے اپنا آرام و آسائش بلکہ عیش و عشرت کو ایک دم چھوڑ دینے پر آمادہ ہوتا۔

ایک طرف یہ بات تھی جو تصوّرِ آخرت کو قبول کرنے میں مانع تھی جبکہ دوسری طرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اپنے زعم کے مطابق مصلوب کر دینے کا عمل جو کہ ایک صریح ظلم تھا اور عوام پر محرفین نے مسلط کر دیا تھا بھی اپنی کوئی مناسب توجیہہ کا طلب گار تھا یعنی یہ جھوٹ ایک نیا جھوٹ مانگ رہا تھا اور ایک باطل تصور ایک اور باطل توجیہہ کا طالب ہو رہا تھا۔ سو اس طرف توجہ بھی لازمی تھی۔

تیسری طرف تصوّرِ نبوت و رسالت کے حوالے سے بھی ایک فتنہ کھڑا کر دیا گیا تھا ایک طبقہ نبی کو خدا بنائے بیٹھا تھا تو دوسرا طبقہ نبی کو عام سفلہ نواز گناہوں اور نافرمانیوں پر مجبور سمجھے بیٹھا تھا۔ یہ لوگ حضرت آدم علیٰ نبینا علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اپنے گمان باطل کے مطابق نافرمان اور گنہگار سمجھے بیٹھے تھے (معاذ اللہ)۔ لہٰذا یہ سمجھتے تھے کہ ہر انسان بنیادی طور پر گنہگار ہی پیدا ہوتا ہے (معاذ اللہ) جس کے مطابق ظاہر ہے کہ ہر شخص سزا کا حق دار ضرور بالضرور ہے، اور اس کے لئے چھٹکارے کی کوئی صورت نہیں ہے۔ جب یہ زعم باطل دماغوں میں گھس گیا تو آخر انسان کی نجات کا کوئی سامان بھی درکار تھا۔

اس گفتگو سے ہمارے سامنے درج ذیل تین نکات آتے ہیں۔

۱) انسان گنہگار ہے لہٰذا اسے اخروی نجات کی ضرورت ہے۔

۲) محنت اور مجاہدے سے نجات والا آخرت کا تصور قابل قبول نہ ہو گا۔

۳) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مصلوب کئے جانے کا زعم باطل سے مناسب توجیہہ مانگتا

ہے۔
غالباً یہی وہ بات تھی جس نے عیسائیت کو پھیلانے کی خاطر نہ صرف عیسائیوں کو تبدیلی اور تحریف کی طرف مائل کیا بلکہ تحریف کی شکل میں ایک خوبصورت نفس پرستانہ توجیہہ بھی سامنے لاکر رکھ دی۔ آخرت کے عقیدے کی تحریف شدہ شکل درج ذیل تھی اور اس وقت تک بھی ہے۔

۱) انسان کو نجات کی ضرورت ہے۔

۲) حضرت عیسٰی علیہ السلام (یعنی خدا نے بندوں کی نجات کی خاطر اپنے بیٹے --- اور اکلوتے بیٹے ---) کو حضرت آدم علیہ السلام سے لیکر آخر روزِ قیامت تک کے تمام ایمان لانے والوں کی طرف سے کفارے کے طور پر خود قربانی کے لئے پیش کیا اور خود کو مصلوب کروایا۔ یعنی حضرت عیسی علیہ السلام کے مزعومہ صلیب دیئے جانے سے تمام انسانوں کی نجات مسلم ہوگئی ان انسانوں کے لئے جو انسان جو ان خرافات پر ایمان لے آئیں۔

۳) کفارہ ادا ہو جانے کے بعد اب کسی کو نجات کیلئے کسی عمل کی ضرورت نہیں جسے تقویٰ کیلئے ضروری خیال کیا جاتا ہو۔ جب تقوی کا دروازہ ہی بند ہو جائے تو فرد کا ظاہر وباطن دونوں عمل کی روشنی سے محروم ہو کر بے عملی کی تاریکیوں میں ڈوب جاتے ہیں۔

آخرت کے عقیدے میں یہ وہ تحریف تھی جس کا ختم کیا جانا ضروری تھا تاکہ اخلاقی کمال کے حصول کی طرف توجہ دی جاسکے۔ اور انسان بہیمیت بے عملی اور جمود مسلسل کے چنگل سے آزاد ہو کر عمل کی دنیا میں قدم رکھ سکے۔ ضرورت تھی کہ اس تصور کی جگہ ایک ایسا عقیدہ دیا جائے کہ جس میں

i) روحانی مزاج کو غلبہ حاصل ہو، قلبی کیفیات کا آئینہ دار ہو۔

ii) جو بہیمی عوارض فطریہ کو قانون اور روحانیت کے تابع منظم کردے، جو فطرت کے مقاصد کی نگہبانی کرنے پھر فرد اپنے من میں ڈوب کر زندگی کے سراغ کے سفر پر نکل جائے۔

iii) جو انسان کے قوائے عمل کو مثبت سمت میں ابھارے اور فرد کے اندر قوت ایمانی پیدا کرے۔

iv) جو انسان کے جذبات اور لاشعور کو مثبت سمت میں تحریک عطا کرکے اس کے غریزہ ارادہ و عمل کو مہمیز اور محرک کی طرح تحرک پر مجبور کردے۔

v) جو تشویق اور تخویف کے دونوں غرائض سے اس طرح کام لے کہ دونوں کی تناسب شرح سے تحریک پیدا کرتا رہے۔

vi) جو اخلاقی کمال کا واضح تصور دے اور اس کے حصول میں مدد و معاون ہو شرف انسانی کا تحفظ کرے' انسان کی ذہنی پستی اور فکری آلودگی کو ختم کرکے فکر و نظر کے شفاف راستوں کو اجالنے کا اہتمام کرے۔

vii) جو عبادت اور وسیلہ کے تصور کو واضح کرے نیز دونوں کی جدا حدود کا ایسے تعین کرے کہ دونوں کو اپنا اپنا مناسب مقام بھی حاصل ہو جائے اور دونوں ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو کر فتنہ کا باعث بھی نہ بنیں۔

مختصر یہ کہ عقائد کی دنیا میں جب ہم اہل روم اور مسیحیوں کے تحریف شدہ عقیدہ آخرت کو دیکھتے ہیں تو ہمیں اس میں اصلاح کی ضرورت صاف طور پر محسوس ہوتی ہے اور ہم شدت سے محسوس کرتے ہیں کہ جنت دوزخ' سزا جزا اور غضب و رضا ہر شے کو اس کا مناسب مقام ملنا چاہیے اور ہر کسی کیلئے مناسب حال عمل و اخلاق کا کسب نصیب ہونا چاہیے۔ تاکہ ہر کسی میں سے کوئی بھی تصور لایعنی اور بے معنی ہو کر نہ رہ جائے۔

اصل میں یہی وہ بنیادی عقائد ہیں کہ جو اصل الاصول ہوا کرتے ہیں اور ان میں بگاڑ آچکا تھا۔ بقیہ ملائکہ و کتب وغیرہ کا عقیدہ ان میں موجود تھا.....

کتب سماوی

آسمانی کتابوں میں درج عقائد پر وہ یقین رکھتے تھے اس پر وہ عمل پیرا بھی تھے یعنی آسمانی کتاب بھی ان کے پاس تھی۔ لیکن وہ کس حال میں تھی محتاج بیان نہیں۔

تعلیمات اسلامی کا چہرہ مسخ کر دیا گیا تھا۔ وہ سراسر تحریف شدہ تھی۔ ان کے پاس موجود کتابیں درج ذیل خصائص کی حامل تھیں۔

۱) ان کے پاس بیک وقت چار کتابیں تھیں۔

۲) ان میں سے کوئی کتاب بھی نہ تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تھی اور نہ ان کی املا کرائی ہوئی تھی اور نہ کسی نے اسے جمع کر کے ان کی حیاتِ ظاہری میں ان سے اس کی تصدیق کروائی تھی۔

۳) یہ چار کتب بھی بے شمار جھگڑوں اور بہت بڑے بڑے خونیں تنازعوں کے بعد سینکڑوں کتب میں سے منتخب کی گئی تھیں۔

۴) پھر یہ انتخاب بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفع الی السماء کے بعد کہیں چوتھی صدی میں جا کر ہوا۔

۵) ان کتابوں کے انتخاب تک کا ریکارڈ تاریخ میں محفوظ نہیں کہ وہ ان تین صدیوں میں کن کن مراحل سے گزریں اور کہاں کہاں پہنچیں؟

۶) یہ کتب جن افراد کی طرف منسوب ہیں خود ان کا تصدیق نامہ ان کے ساتھ موجود نہیں۔

۷) یہ آسمانی کتاب سے کہیں زیادہ کہانیوں کی کتابیں لگتی ہیں۔ زیبِ داستان کیلئے بہت کچھ بڑھالیا گیا ہے۔

۸) جو کتابیں موجود تھیں ان کا بھی ترجمہ در ترجمہ کیا گیا تھا۔ جبکہ اصل کا کہیں بھی سراغ نہیں ملتا تھا کہ روئے زمین پر یہ اپنا کوئی وجود بھی رکھتی ہے یا نہیں۔ پھر ان ترجمہ کرنے والوں کی بھی کوئی خبر نہ تھی کہ وہ کون ہیں اور کہاں ہیں؟

۹) ان کتب میں اور ان کی تیاری میں بہت بڑا ہاتھ اور مرکزی کردار بلکہ تقریباً سارے کا سارا ہاتھ ایک شخص سینٹ پولس (St. Pauls) کا ہے۔ یہ شخص یہودی تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بدترین دشمن تھا۔ ہمیشہ انہیں اذیت دیتا تھا (معاذ اللہ) آپ کے رفع الی السماء کے بعد اچانک اس کے دماغ میں ایک دھن سمائی اور اپنے ایک

روحانی کشف کا دلفریب قصہ گھڑا اور حواریوں میں آشامل ہوا۔ یہودیوں کی تحریف وفتنہ کی عادت کے بارے میں سب کو معلوم ہی ہے۔ سو اس نے یہ حرکتیں یہاں بھی کیں۔ ابتدا بہت نیک بن کر اور نہایت محنت اور مجاہدے سے سادہ لوح حواریوں کا اعتماد حاصل کیا۔ پھر رفتہ رفتہ اپنا کام شروع کیا اور چرب زبانی سے سب پر غالب آگیا۔ اس شخص نے ختنہ وغیرہ کے صریح احکام کو جو تواتر سے چلے آتے تھے تبدیل کردیا تو اس معاملے میں کیا کسر اٹھا رکھی ہوگی جس کی بابت پہلے سے کچھ مواد تھا ہی نہیں۔
(عیسائیت کیا ہے؟ از تقی عثمانی)

جس شخص کی اس نوعیت کی کیفیت ہو بھلا اس کی لکھی یا لکھوائی گئی کتب کو بطور آسمانی کتاب کے قبول کر لینا گویا نامعتبر لحوں کو معتبر بنانے کے مترادف ہے اور عقل سلیم کے خلاف ہے۔

سو اس معاملے میں ضرورت تھی ایک نئی کتابِ ہدایت کی جو اپنی اصل کے اعتبار سے آسمانی وحی پر مبنی ہو اور جو تحریف وتبدیل کے جمع امکانات کو کلیتاً رد کردے۔ ایسی کتاب جو خدا کے نام پر بندوں کی لفاظی یا لایعنی کہانیوں کی کتاب نہ ہو بلکہ خدا کا کلام ومعنی اس کے بندوں تک پہنچانے کی اپنے اندر ضمانت رکھتی ہو۔ ایسی کتاب جو اپنے کلامِ خدا ہونے پر اپنے اندر بھی شواہد ودلائل کی قوت رکھتی ہو۔ جس کے بیان کردہ حقائق ناقابلِ تبدیل (Unchangable) اور اٹل ہوں اور اپنے خارج میں بھی ایسے دلائل رکھتی ہو جو اس کے کلام الٰہی ہونے پر بین اور ناقابل تردید ثبوت ہوں اور اسے ابد الاباد تک حیاتِ جاوداں بخش دیں۔ ضرورت تھی ایک صحیفہ انقلاب کی جو قیامت تک ہر دور کے انسان کی نظری اور عملی رہنمائی کا فریضہ سرانجام دے سکے۔

ضرورت تھی ایک ایسے فرد کی جس کی زبان ہی حق وباطل کے مابین حد فاصل ہو جس کا صدق واخلاص اور امانت ودیانت ہر اعتبار سے شک وشبہ سے بالاتر ہو۔

ضرورت تھی ایک ایسے انقلابی قائد کی جو باطل کے کروفر کو تہ وبالا کردے۔
یقیناً دنیا کو ایک عالمگیر انقلاب کی ضرورت تھی کیونکہ فرسودگی اپنی انتہا کو پہنچ

چکی تھی اور اس نظام حیات کی بنیادیں اندر سے کھوکھلی ہو چکی تھیں بلکہ ظاہری رنگ و روغن بھی اتر چکا تھا۔

تقدیر خیر و شر

تقدیر خیر و شر کا سلسلہ ہمیشہ فکر انسانی میں علم و عمل کے نئے راستوں کی تلاش کے مسئلے کے طور پر موجود رہا ہے لیکن اسلام نے اس مسئلہ کو اس طرح سلجھایا ہے جسے عقل سلیم بھی تسلیم کرتی ہے اور انسانی فطرت بھی جسے قبول کر کے اپنے قول و فعل کا عنوان بناتی ہے۔

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ اہل کلیسائے روم تقدیر خیر و شر کے درست تصور سے مکمل طور پر ناآشنا تھے۔ انہیں ہر صبح چرچ میں جانے سے قبل اور ہر کھانے پر اس بات کی تعلیم دی جاتی کہ دعا کریں کہ اے خدا (جسے انہوں نے یسوع سے بدل لیا تھا) ہمیں آج کے دن کی غذا عطا فرما۔ لیکن تعطل و توکل میں فرق کر سکنے کی اہلیت نہ ہونے کی بنا پر ان میں رہبانیت جیسا مرض بھی پیدا ہو چکا تھا۔ دوسری طرف وہ ہر خیر و شر کا خالق خدا کو اور کاسب (حاصل کرنے والا) انسان کو نہیں کہتے تھے بلکہ ان کے یہاں تو سرے سے اس خلق و کسب کے فرق کا تصور بھی کہیں نہ تھا۔ سب سے بڑھ کر خرابی یہ تھی کہ ہر بات اور شے کا خالق مالک انہوں نے حضرت عیسٰی علیہ السلام کو بنا رکھا تھا حتی کہ ان کے نزدیک لائق عبادت بھی وہی تھے۔

ایک اور خرابی جو ان میں پیدا ہو چکی تھی کہ صبر کے نام پر سر جھکا کر مار کھاتے چلے جاؤ اور ظالم کا ہاتھ روکنے کا تصور دل میں نہ لاؤ۔

یہ مرض بھی انہیں متحرک اور محرک نہیں ہونے دیتا تھا۔ بلکہ اس تصور نے انہیں اس قدر جامد بنا دیا تھا کہ وہ باطل کو پنپتے دیکھ کر بھی خاموش رہتے تھے اور ظلم کے خلاف صدائے احتجاج بلند نہیں کرتے تھے۔ اس غیر انسانی اور غیر فطری رویے نے پوری حیاتِ انسانی کو مفلوج کر کے رکھ دیا تھا۔

ایک فاسد تصوّر ان میں حضرت عیسٰی علیہ السلام کی دوبارہ آمد کے عقیدے

کی وجہ سے بھی پیدا ہو گیا تھا کہ جب وہ دوبارہ تشریف لائیں گے تو حقدار کو اس کا حق دلا کر باطل کا قلع قمع کریں گے اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے کا شعور فروغ پاتا رہا اور معاشرہ بے عملی کا شکار ہو کر موت کے دہانے پر آپہنچا

ان معروضی حالات کے پیش نظر ضرورت تھی کہ انسانیت کو کوئی واضح نصب العین دیا جائے۔ اس کے عقائد کی اصلاح کی جائے۔ اسے اپنے کسب سے تقدیر لکھنا سکھایا جائے اس کی ذات میں تعطل کی جگہ توکل کا جوہر پیدا کیا جائے اور سعی پیہم' جہد مسلسل اور بار بار گر گر کر اٹھنا اور بے حال ہو ہو کر سنبھلنا سکھایا جائے۔ ضرورت تھی کہ کوئی توکل' جدوجہد اور نتیجہ کے باہمی رشتے کو انکے لاشعور میں پختہ کرے اور اس تکون کو ان کے دماغوں میں ڈال دے اور قلوب میں راسخ کردے ضرورت تھی کہ کوئی انہیں غلبہ کے وعدہ الٰہی پر آگ میں کود جانے کی جرات دیدے۔ انہیں خاک کی آغوش میں تسبیح و مناجات کی عادت پڑ چکی تھی' خستگی و زبوں حالی ان کا شیوہ بن چکا تھا۔ سو ضرورت تھی کہ کوئی انہیں وسعت افلاک میں تکبیر مسلسل کی طرف لائے اور سر اٹھا کر باطل کے سر غرور کو پاؤں تلے روند ڈالنا سکھائے۔ ضرورت تھی اور اشد ضرورت تھی کہ کوئی انداز نگہ بدل لینے کا موقع فراہم کرے اور اس غرض سے اس کے سامنے شاہ بازی کا طریق فاش کردیا جائے۔ ضرورت تھی کہ تقدیر کے ماروں کو تقدیر اپنے خون سے رقم کرنے کا سبق دیا جائے۔ ضرورت تھی کہ ان کے عقیدہ متعلقہ تقدیر کو درست کیا جائے' انہیں رہبانیت کے قعر مذلت سے باہر نکالا جائے' ان میں جرات رندانہ پیدا کی جائے۔ ان میں باطل استحصالی طاقتوں سے ٹکر لینے اور حق کیلئے مرنے مارنے کی صلاحیت پیدا کی جائے۔

ملائکہ

عیسائیت میں ملائکہ کا تصور پایا جاتا تھا لیکن اس میں اصلاح کی ضرورت تھی۔ مثلاً

وہ ملائکہ کی عبادت سے گریز نہ کرتے تھے۔

وہ ملائکہ کی تفصیل نہ جانتے تھے

مذہبی تعصب

مذہب آپس میں بیر رکھنا نہیں سکھاتا۔ یہ وسیع تر انسانی مراسم کو مربوط کرتا ہے۔ یہ انسانوں کے درمیان اخوت اور بھائی چارے کے جذبات کو فروغ دیتا ہے' یہ دکھ بانٹتا بھی ہے اور آسودگیاں افراد معاشرہ کے درمیان تقسیم بھی کرتا ہے' تعصب نام کی کوئی چیز مذہب کی سلطنت میں سرے سے پائی ہی نہیں جاتی لیکن بدقسمتی سے ان گنت سماجی اور فکری عوامل کی بنا پر مذہب کو جاننے والے ہی سب سے زیادہ تعصب کا شکار ہوتے ہیں اور کسی مذہب کے ماننے والے فرقہ پرستی کی لعنت میں گرفتار ہو جاتے ہیں تو کبھی تعصب فرقہ واریت کے عفریت کی صورت میں نمودار ہوتا ہے تو کبھی مذہبی دہشت گردی کی آڑ لے کر سیکولر ذہن کو مذہب کے خلاف پروپیگنڈے کا ہتھیار فراہم کرتا ہے اور بنیاد پرستی کی آڑ میں دینی تحریکوں کا راستہ روکنے کیلئے یہی تعصب کبھی مسجد اقصیٰ میں آتشزدگی کا باعث بنتا ہے اور کبھی بھارت جیسے ملک میں بابری مسجد کی شہادت کی صورت میں رونما ہو کر امن عالم کی تباہی کا سامان مہیا کیا کرتا ہے۔

اہل روم کا مذہبی تعصب بھی اہل ایران سے کسی حوالے سے بھی کم نہ تھا' حضرت عیسیٰ کی بعثت ہوئی وہ منصب رسالت پر رونق افروز ہوئے تو یہودیوں نے انکی مخالفت میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا یہی یہودی نبی آخر الزماں ﷺ کے خون کے پیاسے ہو گئے تھے

۱) حضرت عیسٰی علیہ السلام پر گھٹیا الزام عائد کیا گیا اور ان کی کردار کشی کے لئے جھوٹ کے پلندے تخلیق کئے گئے اور پروپیگنڈے کے محاذ پر ہر حربہ استعمال کیا گیا۔

۲) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ ماجدہ حضرت مریم کے بارے میں انتہائی گھٹیا ،وقیانہ اور غلیظ زبان استعمال کی گئی۔

۱) جو آپ پر ایمان لاتا اس پر اذیت دہی اور تعذیب کے ہر طرح کے دروازے کھل اٹھتے تھے۔

یہ سلسلہ صدیوں تک چلتا رہا تا آنکہ عیسائیت نے سرکاری مذہب کی صورت

اختیار کرلی۔ ایذا رسانی کی ایک مثال کے طور پر سزا یہ تھی کہ ان پر درندوں اور بھوکے کتوں کو چھوڑ دیا جاتا جو انہیں جھنجھوڑ کر رکھ دیتے۔ جو عیسائی ہو جاتا اسے صلیب پر لٹکا دیا جاتا۔ کئی گھنٹوں کے اس دردناک عذاب کے بعد صلیب کو آگ لگا دی جاتی۔ (تاریخ تہذیب:۱۸۱ مَیس نَس)

یہ سب کچھ ہوتا رہا اور مذہب کے نام پر ہوتا رہا۔ ان معصوموں کا اگر کوئی گناہ تھا بھی تو صرف اس قدر کہ انہوں نے عیسائی مذہب کو اختیار کرلیا تھا اور اللہ کے برگزیدہ رسول پر ایمان لائے تھے اپنے اندر بھی حرفِ حق کی تلاش کا سفر جاری رکھا اور اپنی عملی زندگی میں بھی پرچمِ توحید بلند کرکے فطرت کے تقاضوں کی تکمیل میں مصروف رہے لیکن یہ سب کچھ تو ابھی صرف ان رومیوں کا تعصب تھا جو عیسائی ہونے والوں کے خلاف تھے لیکن جو لوگ عیسائی ہوگئے اور صدیوں بعد تک جن کی فرقہ وارانہ کارروائیاں دہشت کے انگارے اگلتی رہیں ان کا تعصب اس سے دو ہاتھ آگے تھا۔ یہ ایک دوسرے کو عیسائی تسلیم نہ کرتے تھے۔ اور کافر و مرتد کہتے تھے لیکن اسی پر اکتفا نہیں تھا بلکہ

۱) ایک دوسرے کے کلیساؤں کو جلا ڈالتے تھے۔

۲) ایک دوسرے کے راہبوں اور راہباؤں کو قتل کر ڈالتے۔

۳) قتل و غارت گری آئے دن کا معمول تھا۔

۴) ان میں سے جس کا بھی بس چلتا وہ ایک دوسرے کے ساتھ اس سے بھی زیادہ بدتر سلوک کرتا۔

ان کے مذہبی تعصب کا ہی کارنامہ تھا کہ جب انہوں نے مسلم اندلس پر قبضہ کیا تب تو لاکھوں مسلمانوں کو صرف مسلمان ہونے کی پاداش میں بلکہ صرف عربی کا ایک لفظ سیکھنے پر بھی۔

- شکنجوں میں کس کے تمام جسم کی ہڈیاں تڑوائیں۔
- گھروں کو آگ لگائی۔

۔ بھیانک اور شدید اذیت ناک پھانسی گھر تعمیر کئے اور زندہ انسانوں کو مصلوب کرکے سفاک لمحوں کو ابن آدم کا مقدر بنایا۔

ملک بھر کے قرآن مجید بلکہ عربی زبان کی تقریباً ہر کتاب کو تمام شہروں میں اکٹھا کیا اور بڑے چوک میں جمع کرکے آگ لگا دی۔ نیز جس کسی نے قرآن مجید چھپا لیا اور پکڑا گیا اس کی سزا موت مقرر کی۔ وسیع پیمانے پر اسلام کی بیٹیوں کی بے حرمتی کی۔ آج کشمیر اور بوسنیا میں بھی ابلیس کے ان فرزندوں نے اپنا وہی کردار دہرایا ہے۔

جو شخص بر سر بازار عیسائیت کے حق ہونے اور قرآن اور اسلام کے باطل ہونے کا اقرار نہ کرتا یا عیسائیت کے کسی بھی عقیدے پر اعتراض کر دیتا جس کا کوئی جواب عیسائیوں کے پاس نہ ہوتا تو اس کی سزا اسے بھوکے رکھنا' شکنجوں میں کسنا' جانور چھوڑ دینا' آگ میں جلا دینا' زخمی کرکے زخموں پر نمک یا لیموں وغیرہ چھڑکنا' ہڈیاں توڑ دینا' طرح طرح کی اذیتیں دینا یہاں تک کہ یا تو وہ عیسائیت کا حق ہونا قبول کرلے یا پھر موت تک جا پہنچے اور آگے بڑھ کر اسے گلے لگالے۔ اس مظلوم کے پاس تیسرا کوئی راستہ نہ تھا۔

پھر یہی وہ پیکران تعصب ہیں جنہوں نے ۹ ویں اور ۱۰ ویں صدی میں القدس کو فتح کیا اور اسے مسلمانوں سے چھین لیا تو ایک لاکھ کے قریب نہتے مسلمان شہریوں کو شہید کر ڈالا حتی کہ گلیوں میں بہتے ہوئے ان کے مقدس خون کی کیفیت یہ تھی کہ

عیسائیوں کے گھوڑوں کے پاؤں مکمل طور پر خون میں ڈوب جاتے تھے
یعنی پنڈلیوں تک خون گلیوں میں بہہ رہا تھا۔

یہ وہ مذہبی تعصب ہے کہ جو رومیوں کی گھٹی میں پڑا ہوا تھا جس کا اظہار وہ اس زمانے میں بھی کرتے تھے اور بعد میں بھی کرتے رہے حتی کہ آج بھی کر رہے ہیں۔

ایرانیوں کی طرح اس قوم کے عقائد بھی خرابی کا شکار تھے۔ ایرانیوں کی طرح ان کے عقائد میں بھی شرک کا عنصر غالب تھا اگرچہ ان کی کیفیت اور نوعیت ذرا سی مختلف تھی۔ ایرانیوں کی طرح اس قوم کا تصور رسالت و نبوت اور برگزیدگی بھی اصلاح کا طالب تھا۔ ایرانیوں کی طرح اس قوم کے تصورات اور نظریات باطل تھے۔

امویوں کی طرح انہیں بھی حق کی ضرورت اور ان کے اربابِ فکر ودانش کو حق کا انتظار تھا۔ ایرانیوں کی طرح ان میں آخرت کا عقیدہ اپنی مسخ شدہ صورت میں موجود تھا اور اصلاح طلب تھا۔ ایرانیوں کی طرح ان میں بھی مذہبی تعصب اپنے زوروں پر تھا۔ ایرانیوں کی طرح ان میں بھی مذہبی برداشت کا مادہ کم تھا۔ ان کی مذہبی دنیا بھی ایک عظیم انقلاب کی منتظر تھی۔

سیاسی حالت

یونان میں مطلق العنانی ختم ہوئی تو (Oligarchy) کو فروغ ملا لیکن وہ پھر فوری طور پر مطلق العنانی میں بدل گیا۔ (تاریخ تہذیب)

ابتدا میں رومی حکومت بھی اسی طرز فکر کی پیروکار تھی۔ چند افراد کے ایک طبقے کی آمریت مسلط تھی یہ آمرانہ رویہ لوگوں کو پسند نہ تھا اور جمہوری شعور کو فروغ ملنے لگا۔

جولیس سیزر نے بھلی ماریس کی طرح مطلق العنان بادشاہی کی طرف قدم بڑھایا اس نے سینٹ کو توڑا تو نہیں لیکن ایسے اقدامات کئے کہ سینٹ اس کے تمام احکام ماننے پر مجبور ہوگئی۔

اس کے قتل کے بعد (Octavian) نے زمامِ اقتدار سنبھالی اور مصر کو بھی سلطنتِ رومہ میں شامل کرلیا۔ اس نے جمہوریت کے ظاہری اور ضروری اداروں کو قائم رکھا لیکن درحقیقت اپنے اختیارات بہت بڑھا کر اپنی حکومت کو مستحکم کیا۔ اس کی دوغلی پالیسی کی وجہ سے لوگ اس کی پوجا کرنے لگے۔ یہ مشرقی طریقہ ان کے ہاں بھی رواج پاگیا۔ (تاریخ تہذیب'، ۱: ۱۴۵)

یہاں سے بادشاہت کے سلسلے کا آغاز ہوا چھ صدیوں کے بعد بھی ہر طرف ملوکیت ہی تھی۔ جمہوریت کا نام ونشان تک باقی نہ رہا تھا۔

جمہوریت میں بھی

سینٹ کی ممبرشپ (رکنیت طبقہ امرا کے ساتھ ہی خاص رہی)۔

پیپ اسمبلی میں عوام کو آنے کا حق تھا لیکن بہت بڑی اکثریت امرا کی ہی تھی۔

عوام کو طبقہ امرا میں شادی کرنے' سینٹ کا رکن بننے اور قونصل کا عہدہ حاصل کرنے کی اجازت نہ تھی۔ لیکن بعد ازاں یہ اجازت مل گئی مگر پھر بھی اہمیت عملی طور پر خاندان اور جائیداد کو ہی رہی۔

دولت مند لوگ غریب آدمی کی بہ نسبت سیاسی اختیارات بھی زیادہ رکھتے تھے اور ان سے فائدہ اٹھانے کے مواقع بھی انہیں زیادہ میسر آتے تھے اور یوں وہ بالواسطہ طور پر بھی عوام پر مسلط رہتے تھے۔ اپنے بے پناہ اثر ورسوخ کی بدولت عوامی رائے عامہ پر اثر انداز ہوتے عملاً عوام سے آزادانہ رائے کے اظہار کا حق بھی چھین لیا گیا تھا۔

صوبوں میں زیادہ تر اقتدار اور سیاسی اختیارات بڑے زمینداروں کو حاصل تھے۔ تمام امور کی انجام دہی انہیں کے ذمے تھے۔ وہ سیاہ وسفید کے مالک تھے جو چاہے کرتے انہیں کوئی پوچھنے والا نہ تھا چیک اینڈ بیلنس کا کوئی انتظام سرے سے موجود ہی نہ تھا۔ ان غیر مساویانہ اور عدل کے فرضی اختیارات کے حصول کیلئے محض جاگیردار ہونا ہی کافی تھا الغرض منہ میں سونے کا چمچہ لیکر پیدا ہونے والوں کی حکمرانی تھی تاج شاہی کے نمک خواروں کا کام صرف یہ تھا کہ وہ حکومت کے ٹیکسوں کی ادائیگی کے نظام کو یقینی بنائیں' شاہانِ وقت کے قصیدے پڑھیں سب اچھا ہے کا راگ الاپیں اور فوج کیلئے افرادی قوت کا اہتمام کریں اس کے بعد انہیں عوام کو پنجۂ استبداد میں لینے کی کھلی چھٹی تھی۔ سیاسی اعتبار سے جمہوریت کے آثار باقی رہ گئے تھے لیکن بنیادی طور پر یہ نظام' نظام جبر میں تبدیل ہو چکا تھا عوام کو واضح طبقات میں تقسیم کردیا گیا تھا۔ دولت مندوں' جاگیرداروں' صنعت کاروں اور فوجی افسروں کو بے پناہ اختیارات حاصل تھے اور وہ ان بے ہنگم اور غیر ضروری اختیارات کو بے دریغ استعمال کرتے۔ انہیں معاشرے میں خصوصی حیثیت' وقعت' عظمت اور سربلندی حاصل تھی جبکہ دوسری طرف غریب عوام غریب ہی رہے انہیں جمہوریت کے نام پر دھوکہ دیا گیا لیکن یہ صورت حال بھی زیادہ عرصہ قائم نہ رہ سکی۔ ملوکیت کا سورج طلوع ہوا تو لولی لنگڑی جمہوریت کی بساط

بھی لپیٹ دی گئی۔ شہنشاہی میں وہی مضمرات تھے جو ایران کے سیاسی نظام میں بیان ہو چکے ہیں۔ بادشاہوں کی پرستش کی حد تک تکریم و تعظیم کی جاتی۔ یہ بادشاہ مطلق العنان ہوتے۔ ان کے منہ سے نکلا ہوا ہر لفظ قانون کی حیثیت رکھتا تھا نہ کوئی اصول تھا اور نہ کوئی ضابطہ' جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا کالا قانون عملاً سوسائٹی میں رائج تھا۔ محلاتی سازشوں کا نہ ختم ہونیوالا سلسلہ تخت و تاج کی اکھاڑ پچھاڑ کا باعث بن رہا تھا اور سلطنت روما اپنے ظاہری کروفر کے باوجود اندر سے کھوکھلی ہو چکی تھی۔ پھر اسی نظام کی طرح صوبے وغیرہ شہزادوں یا جاگیرداروں میں تقسیم کر دیئے جاتے۔ انہیں ہر طرح کے اختیارات دے دیئے جاتے تاکہ ان کی انا کو تسکین ملتی رہے اور صدائے احتجاج سے علم بغاوت بلند کرنے تک کا مرحلہ موخر ہوتا رہے اور تمام ممکنہ خطرات کے خلاف احتیاطی تدابیر اختیار کرکے تخت و تاج کو ممکن حد تک تحفظ کی دیواریں فراہم کی جائیں۔ یہ ملک بھی سیاسی اعتبار سے بزبان حال پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ کوئی ہے جو ایک عظیم سیاسی انقلاب بپا کرے اور مجھے اس دائمی عذاب و اذیت سے نجات دلاتے۔

اقتصادی حالت

تاریخ شاہد ہے کہ سیاسی بالادستی اقتصادی ترقی ہی کی مرہون منت ہوتی ہے مضبوط معیشت بذات خود ایک بہت بڑا ہتھیار ہے جس سے سرد جنگوں میں نہیں گرم جنگوں میں بھی فیصلہ کن کامیابیاں حاصل کی جاتی ہیں۔ ماضی میں بھی یہ فلسفہ اتنا ہی کار آمد تھا جتنا آج ہے آج پوری دنیا میں اقتصادی بالادستی کے حصول کی جنگ جاری ہے ہجرت مدینہ اور پھر مصطفوی انقلاب کے ارتقائی سفر کے وقت یونان بھی معاشی اعتبار سے واضح طبقات میں تقسیم ہو چکا تھا۔

۱) ایک وہ طبقہ تھا جس میں اپنی زمین کاشت کرنے کی طاقت و ہمت تھی۔ نیز وہ اس کے اخراجات برداشت کر سکتے تھے۔ یہ لوگ دوسرے طبقے کو بھاری شرح پر سود دیتے جو وہ ادا نہ کر پاتے۔

۲) دوسرا طبقہ ان افراد پر مشتمل تھا جو نہ مستحکم مالی پوزیشن کا مالک تھا نہ وہ اثاثہ جات رکھتا تھا اور نہ مطلوبہ سرمایہ اس کے پاس تھا۔ یہ طبقہ بے بسی کی زندگی گزار رہا تھا۔ یہ لوگ مجبور ہوئے تھے کہ بڑے طبقے سے ادھار لیکر اپنی زمینیں کاشت کریں لیکن وہ اس کی ادائیگی پر کبھی بھی قادر نہ ہوتے اور بھوکے مرتے تھے۔ نتیجتاً انہیں درج ذیل شرائط میں سے کوئی ایک شرط قبول کرنا پڑتی تھی۔

i) یا تو قرض خواہوں کے کھیتوں میں مفت مزدوری کریں، بیگار کاٹیں یا سود در سود ادا کریں جو ان سے کسی طور بھی ممکن نہ تھا وہ ساری عمر کولہو کے بیل کی طرح اپنے خون پسینے کی کمائی سود اتارنے میں صرف کرتے۔ بالکل انہی شاہان ماضی کے نقوش قدم پر چلتے ہوئے آج کی سامراجی طاقتیں بھی تیسری دنیا کے گرد اقتصادی اور سیاسی غلامی کے حصار کو تنگ کر رہی ہیں اور ان پر قرضوں کا بوجھ لاد کر ان کی تخلیقی صلاحیتیں مفلوج کر رہی ہیں۔

ii) دوسری صورت یہ تھی کہ اپنی جائیداد اس سودی نظام کی بھینٹ چڑھادی جائے اور خود فاقوں پر مجبور ہو جائیں۔

iii) یا پھر اگر رقم اس سے بھی زیادہ ہے تو جائیداد بھی دے دیں اور خود بھی اس کے زرخرید غلام بن کر سرِ تسلیم خم کر دیں اور وہ استحصالی طبقے کا فرد جائیداد کا بھی مالک بن جاتا اور صاحب جائیداد کا بھی اس کی شخصی آزادی ختم ہو جاتی اور غلامی کے بھیانک غار میں جا گرتا اور پھر صدیوں تک اس کی اولاد کو بھی آزادی کا سورج دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔

ان حالات نے نئے نئے پیشوں کو جنم دیا۔ ہنر مندوں اور دست کاروں کی ایک کھیپ تیار ہو گئی، جہاز رانی کا ملکہ بھی حاصل کیا گیا۔ انجینئرنگ کے شعبہ میں ترقی ہوئی اور لوہے کی عظمت کا اعتراف صنعتی انقلاب کا پیش خیمہ بنا۔ اگر چہ ان ہنر مندوں کی حسن کاری بھی دھندلائی ہوئی تھی اور ان کے مقدر پر ملوکیت کی سیاہ رات مسلط تھی لیکن رات کتنی ہی طویل کیوں نہ ہو بہر حال اسے گزر جانا ہوتا ہے۔ روم استحصال کی آگ میں جل

رہا تھا نفرت اور تعصب کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ روم جو ہر طرف اور ہر طرح سے مکمل طور پر زیر استبداد تھا یہ طبقہ اس قدر پسا ہوا تھا کہ اس میں اپنی آواز بلند کرنے کی بھی طاقت نہ تھی۔

روم کا معاشرہ معاشی اعتبار سے دو واضح طبقات میں تقسیم ہو چکا تھا۔

طبقہ اولیٰ

یہ طبقہ امرا تھا جس میں جاگیردار، زمیندار بڑے تاجر اور فوجی جرنیل صنعت کار اور ٹھیکیدار وغیرہ شامل تھے۔ اگرچہ ایک موقع پر جائیداد کی حد بندی کی گئی تھی لیکن وہ زیادہ موثر ثابت نہ ہوئی تھی اور بہت دیر تک چل بھی نہ سکی تھی۔ جاگیردار اور بڑے زمیندار ہمیشہ چور دروازے تلاش کر کے زرعی اصلاحات کو ناکام بناتے رہتے۔

i) خوشحال رومی عیش و عشرت اور راحت و آرام سے پر آسائش زندگی گزارتے۔ ان کے پاس

i) دیہاتوں میں بنگلے ہوتے جو شیشی کی کھڑکیوں اور پانی کے نل سے بھی مزین ہوتے۔

ii) ہر طرح کے بے شمار کھانے ہوتے اور بار بار کثیر مقداد میں کھاتے اور جان بوجھ کر قے کر کر کے کھاتے۔

۲) ہر جائز و ناجائز طریقہ اختیار کر کے اپنی جاگیروں کی وسعت پذیری کے اقدامات کئے جاتے ہوں ہوس کا عفریت تھا کہ کہیں رکتا ہی نہیں تھا۔

۳) معدنی وسائل اگرچی حکومت کی ملکیت میں تھے لیکن بالواسطہ مراعات یافتہ طبقہ ہی ان سے فیض یاب ہو رہا تھا۔

۴) ریشم کی صنعت پر ''اونچے طبقے'' کی اجارہ داری تھی اور ریشمی کپڑا صرف شاہی خاندان کے افراد کے لئے مخصوص تھا۔

۵) فوج اور شاہی افسروں کی مزید معاونت کے لئے ناجائز ٹیکس لگائے جاتے۔ غریب کا خون

چوسنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتے' عدل وانصاف کو شاہی خاندان کا کھلونا تصور کیا جاتا وہ جب چاہتے کھانڈرے بچوں کی طرح اسے توڑ دیتے۔

۶) یہ محافل طرب میں داد عیش دیتے رقص و سرود کی محفلوں کا انعقاد امارت کی نشانی سمجھا جاتا۔ عریانی اور فحاشی کے فن میں "جدت پسندی" کا ثبوت دے کر اولاد ابلیس کو مستحکم بنیادیں فراہم کی جاتیں۔

طبقہ ثانیہ

ایک طرف تو یہ حالت تھی کہ زمینوں اور ان کے کاشت کرنے والے غریب کسانوں کی قسمت کے مالک بنے ہوئے تھے جبکہ دوسری طرف یہ حالت تھی کہ اپنی جان کے بھی لالے پڑے ہوئے تھے۔ ادھر داد عیش کی یہ کیفیت تھی کہ ہر روز' روز عید اور ہر شب' شب برات دکھائی دیتی جبکہ ادھر زبوں حالی کی یہ کیفیت تھی کہ نسلوں کی نسلیں بھوک سے مر رہی تھیں اور کوئی پوچھنے والا نہیں تھا غرض کہ ظلم کی کوئی حد نہ تھی' نفسانی خواہشات کا عفریت چنگھاڑ رہا تھا اور جبر واستبداد اپنے نقطہ عروج کو چھو رہا تھا۔ رات کچھ اور بھی گہری ہو چکی تھی۔

عوامی سطح پر کیا ہو رہا تھا۔ سلطانی جمہور تو دور کی بات ہے جمہور کی زبوں حالی دیکھ کر فلک بھی اپنی آنکھیں بند کرلیتا تھا۔

۱) نصف سے زیادہ آبادی خیرات پر گزارا کرتی۔

۲) کاشتکار بڑے زمینداروں کی غلامی میں جکڑے ہوئے تھے۔

۳) قحط سالی اور طغیان کے باوجود ان پر ٹیکسوں کا بوجھ جوں کاتوں برقرار رہتا تھا۔

۴) شام مصر اور افریقہ میں مزدوروں سے جبری مشقت لی جاتی۔

۵) کاشتکاروں کو زمین کے ساتھ فروخت کردیا جاتا۔

۶) ٹیکسوں میں کسی موقع پر کمی نہیں کی جاتی تھی۔ ہاں یہ ضرور ہوتا تھا کہ جو ٹیکس ادا نہ کر سکتا تھا اس کی جائیداد ضبط کرلی جاتی تھی۔

۷) مصر اور شام کو تو بری طرح لوٹا جاتا ان کے وسائل پر مکمل طور پر قبضہ جمالیا گیا۔

۸) بیروز گاری عام تھی۔ بھوک ننگ اور بیماری کو عوام الناس کا مقدر بنادیا گیا تھا وہ کاتب تقدیر کے لکھے پر قانع تھے۔

۹) عوام کیلئے رہائش ایک مسئلہ تھا۔ لکڑی کے بدنما تنگ و تاریک جھونپڑے ان کا مقدر تھے۔

۱۰) ٹیکس پر ٹیکس لگائے جاتے تھے حتیٰ کہ ناجائز اور پے در پے طویل جنگوں کے دوران جہاں تباہی آتی وہاں ٹیکسوں کی صورت میں نئی مصیبت عوام الناس پر نازل ہوتی۔

۱۱) سردی میں پہننے کیلئے گرم کپڑوں کا کوئی تصور نہ تھا۔

۱۲) غربت اور افلاس اس حد تک پہنچ چکے تھے کہ بعض اوقات غریب ان مظالم سے تنگ آکر بغاوت پر اتر آتے لیکن اس صورت میں بھی انہیں اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑتا۔ لفظ بغاوت خودکشی کے مترادفات میں شامل کردیا گیا تھا۔ اتنا ضرور ہے کہ لہو میں تر پرندہ چٹان پر اپنا نشان چھوڑ جاتا موت کو گلے لگا کر وہ زندگی کے مصائب سے چھوٹ جاتے۔ موت ان کیلئے سکون کے دروازے کھولتی اور وہ بخوشی اس دروازہ سے گزر کر عمیق غاروں میں اتر جاتے جہاں سے ابھی تک کوئی واپس نہیں آیا۔

حکومت کا رویہ

مزدوروں سے بیگار لی جاتی' ان سے غلاموں جیسا سلوک کیا جاتا۔ جبر کا رد عمل بغاوت کی صورت میں نمو پذیر ہوتا ہے لیکن تاریک ادوار کا یہ بھی ایک المیہ ہے کہ جبر کے ہاتھوں کی گرفت اتنی سخت تھی کہ کوئی صدائے احتجاج بھی بلند نہ کرسکتا۔ تمام جذبے سینوں میں گھٹ کر رہ جاتے۔ یہ گرفت استحصالی طبقے کی پشت پناہی کرتی بلکہ فیصلہ کرنے کی طاقت بھی اسی استحصالی طبقے کے ہاتھ میں ہوتی' آج بھی یہ استحصالی طبقات صدیوں پرانے اسی فرسودہ طرز عمل کو اپنائے ہوئے ہیں۔ طرفہ تماشا ہے کہ اپنے مفادات پر زد پڑنے لگتی ہے تو حزب اقتدار اور حزب اختلاف کے جاگیردار ایک ہی

بولی بولنے لگتے ہیں اور آن واحد میں ان کے سیاسی اختلافات مٹ جاتے ہیں گویا یہ کسی بھی ضابطہ اخلاق کے پابند نہیں ہوتے یہ صرف اپنے مفادات کے قیدی ہوتے ہیں حتی کہ ملک کے اقتدار اعلیٰ کو بھی اپنے مفادات کی خاطر قربان کر دیتے ہیں۔

حکومت باقاعدہ ایسے اقدامات کرتی کہ جن کی بنا پر اس کو آخر کار خسارہ اٹھا کر صنعت کی جان چھوڑنے کی بجائے اس صنعت سے جان چھڑانی پڑی۔ مثلاً ایک مرتبہ ریشم کی صنعت کچھ لوگوں نے نجی طور پر لگائی کیونکہ حکومت نے اس کی باقاعدہ ترغیب دی تھی لیکن اس کا مال مارکیٹ میں آتے ہی حکومت نے اپنے مال کا نرخ بالکل ہی گرا دیا۔ تاآنکہ وہ لوگ خود ہی بری طرح خسارے کا شکار ہوئے اور اس صنعت سے جان چھڑانے پر مجبور ہو گئے اور نجی کارخانے بند ہو گئے۔ جب ایسا ہو گیا تو حکومت نے اپنے بنائے ہوئے ریشم کا نرخ بڑھا دیا اور منہ مانگی قیمتیں وصول کیں۔

دوسرے ٹیکسوں کا معاملہ بھی عجیب تھا۔ زراعت پر ظالمانہ ٹیکسوں کا بوجھ ڈال کر نمو کے تمام دروازے بند کر دیئے گئے کیونکہ زراعت کی ترقی صنعتی ترقی کا پیش خیمہ بنتی ہے اس لئے زراعت پر کاری ضرب لگا کر نہ صرف صنعتی انقلاب کا راستہ روکا گیا بلکہ عوام الناس کو ملنے والی متوقع خوشحالی کے امکانات بھی ختم کر دیئے گئے۔

حکومتِ وقت تجارتی اداروں کی آزادانہ سرگرمیوں پر بھی پہرے بٹھاتی اور تجارتی ثمرات کو لالچ کی نگاہ سے دیکھتی۔

پھر نظام کی خرابی اپنی جگہ تھی جس سے عوام کے استحصال میں اضافہ ہو رہا تھا اور درمیان میں حکومت کی لوٹ مار کے علاوہ دیگر ٹھیکیداروں وغیرہ کو بھی الگ سے لوٹ مار کا موقع مل جاتا تھا۔

حکومتی جبر سے قیصر روم کی تاریخ بھری پڑی ہے۔ تاریخ کے اوراق ظلم کی داستانوں کی امانت اپنے سینے میں سنبھالے ہوئے ہیں۔ آج یہ لوگ عبرت کا نشان بن چکے ہیں لیکن عبرت کے ان نشانوں سے ہم کوئی عبرت حاصل نہیں کرتے بلکہ خدائی کے منصب کے حصول کیلئے کچھ بھی کر گزرنے کیلئے تیار رہتے ہیں۔ اقتدار کا نشہ ہماری

آنکھوں پر بے حسی کی پٹی باندھ دیتا ہے اور ہم عدل وانصاف کے تقاضوں کو بالائے طاق رکھ کر اپنی خاندانی حکومتوں کو بچانے کیلئے اپنی غیرت کو بھی نیلام گھر کی زینت بنانے سے نہیں چوکتے۔

مختصر یہ کہ ایک اندھیرا تھا جو ایوانِ اقتدار کی چکاچوند مصنوعی روشنیوں کی کوکھ سے جنم لیکر حیاتِ انسانی کے ہر ہر گوشے کو اپنی لپیٹ میں لے چکا تھا۔ ایک ظلم تھا جو محلات کی غلام گردشوں میں پرورش پاتا۔ ایک قہر تھا جو استحصال کی شکل میں عوام پر ٹوٹتا۔ یہ اندھیرے دونوں ہاتھ اٹھا کر روشنی کو پکار رہے تھے۔ کسی کے اسم گرامی کی دہائی دے رہے تھے کہ روشنی اے روشنی اب افقِ دیدہ ودل پر جلد طلوع ہو اے انقلاب رحمت آ۔۔۔ ہمیں قریۂ جبر سے رہائی دے۔ اے صبح انقلاب آنگنوں میں اتر کہ اب تو چراغِ سحری بھی دم توڑ چکا ہے۔ اے رجائیت کے سورج! ظلمتِ شب کے سمندر سے ابھر۔ کیا اس فضائے تیرہ و تار کو ایک مربوط نظامِ حیات کی ضرورت نہ تھی۔
کیا مظلوم کو دادرسی کے لئے حصولِ انصاف کی تمنا کرنے کا بھی حق حاصل نہیں تھا؟
ضرورت تھی کہ ظالم کے پنجے کو مروڑ کے رکھ دیا جائے۔
ضرورت تھی کہ غرور کا سرپاؤں تلے کچل دیا جائے۔
ضرورت تھی کہ انسانوں کو انسانوں کی خود ساختہ خدائی سے نجات دلوائی جائے۔
ضرورت تھی کہ استحصالی نظام کو تہ وبالا کر دیا جائے۔
ضرورت تھی کہ حق دار کو اس کا حق بغیر منت کے مل جائے۔
اور انصاف کو مظلوم کی دہلیز تک پہنچایا جائے اور عملاً بھی اس کے زخموں پر مرہم رکھا جائے۔
ضرورت تھی کہ رنگ ونسل کے فرق کو مٹا دیا جائے۔
ضرورت تھی کہ امیر اور غریب کی تفریق کو ختم کر دیا جائے۔
ضرورت تھی کہ ایک کائناتی و آفاقی انقلاب آئے۔
ضرورت تھی کہ ایک آسمانی انقلاب زمین پر اترے

اور اس ضرورت کی تکمیل کیلئے آقائے نامدار ﷺ کا انتخاب کائنات کی تخلیق سے بھی قبل عمل میں آچکا تھا۔ حضور ﷺ اس انقلاب رحمت کے داعی تھے جس نے حیات انسانی کے ہر ہر گوشے میں نمو کے جزیروں کو شعورِ بقاء عطا کیا۔

معاشرتی حالت

کسی تمدن کا ثقافتی پس منظر صحیح معنوں میں ان اجتماعی رویوں کی عکاسی کرتا ہے جسے صدیوں کے طویل سفر کے بعد اپنے عہد کی دانش سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس اجتماعی شعور کا تجزیاتی مطالعہ ہمیں اس مخصوص عہد کی معاشرتی اقدار سے آگاہ کرتا ہے اور ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ انسانی روابط کس نہج پر مرتب ہو رہے ہیں آگے چل کر ان روابط نے قومی کردار کی تشکیل کے وقت کیا صورت اختیار کی اور ملی تشخص کی حدود کی نشاندہی کس طرح ہوئی یہ انسانی روابط ان تاریخی حقائق پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہیں۔

یونانی معاشرہ بنیادی طور پر تین طبقات میں منقسم تھا' وہ تین طبقات درج ذیل تھے۔

ا) بادشاہ

بادشاہ اپنے امراء کی مدد اور مشورے سے کاروبار حکومت چلاتا تھا یہ اختیارات کا سرچشمہ ہوتا

۱) سیاسی قوت شاہان وقت کے ہاتھوں میں مرکوز ہوتی۔

۲) تاجِ شاہی ہی مذہبی قیادت کا نشان گردانا جاتا۔

ب) امراء

یہ طبقہ خود کو دیوتاؤں کے خاندان کا فرد بتاتا تھا چونکہ ان کا نسب دیوتاؤں کے سربراہ خاندان سے ملتا تھا لہٰذا یہ لوگ بھی دیگر افراد پر فوقیت رکھتے تھے' کوئی قبیلہ اور کوئی طبقہ ان کی برابری کا دعویٰ نہیں کر سکتا تھا۔ یاد رہے کہ یہ وہ یونان ہے جسے

ارسطو اور افلاطون جیسے فلسفی پیدا کرنے کا شرف وغرور حاصل ہے۔ یہ مرکز فلسفہ وحکمت انسان کو کس مہارت سے انسان پر بلا سبب وکسب فوقیت دے ڈالتا یہ ایک طویل داستان ہے۔

ج) عوام

اس معاشرتی ڈھانچے میں عوام سب سے نچلے درجے میں تھے۔ اس میں جہاں کاشتکار اور تاجر لوگ شامل تھے وہاں بحری قزاق بھی آتے تھے۔

اسلحہ سازوں' رتھ بانوں اور دیگر ہنرمندوں کو بھی اسی عوامی سطح پر رکھا جاتا تھا بالکل اسی طرح جیسے ہمارے معاشرے میں بھی ایک حکمران طبقہ پیدا ہو چکا ہے۔ سیاست باقاعدہ منقولہ جائیداد کی طرح وراثت میں منتقل ہوتی ہے۔

دختر حوا کسمپرسی کے عالم میں تھی عورت کے احترام کا کوئی تصور رومیوں کے ہاں موجود نہ تھا۔ غلاموں کو جانوروں سے بدتر سمجھا جاتا۔

ایک عجیب احساسِ برتری یونانیوں میں پیدا ہو چکا تھا وہ غیر یونانیوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے۔

یہ اس یونان کی حالت تھی جس کا پیروکار روم تھا۔ روم میں عیسائیت کے فروغ کے بعد مجموعی صورت حال میں ایک حد تک تبدیلی رونما ہوئی۔ افکار و نظریات کی اصلاح ہوئی لیکن کلی بگاڑ ختم نہ ہو سکا اور قوم کے اجتماعی رویوں میں کوئی خاص تبدیلی نہ آئی۔

روم کا معاشرہ دو حصوں اور طبقات میں منقسم تھا۔

طبقہ اولیٰ

۱) یہ طبقہ خوشحال خاندان پر مشتمل تھا۔ یہ طبقہ امرا کا تھا۔

۲) اس طبقہ میں صرف وہ لوگ شامل تھے جو بڑے بڑے خاندانوں سے وابستہ تھے یا وسیع و عریض زمینوں کے مالک تھے یا بڑے جاگیردار کنبوں سے وابستہ تھے۔

۳) یہ مکمل شہری تھے اور انہیں ایک آزاد شہری کے مکمل حقوق حاصل تھے۔
۴) اس طبقے کے چند لوگوں کو چھوڑ کر سب ہی بالعموم عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہے تھے۔
۵) جب بادشاہت کا تختہ الٹا گیا اور جمہوریت آئی تو اسی طبقہ نے تمام اداروں پر قبضہ کرلیا۔
۶) سینٹ اور اسمبلی کے ارکان اسی طبقے سے لئے جاتے تھے۔
۷) قونصل کا عہدہ بھی اسی طبقہ کے ساتھ مخصوص تھا۔
۸) عوام کو بعد ازاں یہ حق دیا گیا لیکن عملاً اسی طبقہ کا قبضہ قائم رہا۔
۹) یہ لوگ سیاسی اختیارات سے زیادہ فائدہ اٹھانے کے اہل تھے۔
۱۰) صوبوں کے تمام معاملات اور اختیارات انہی کے ہاتھ میں تھے۔
۱۱) شروع میں عوام کو ان میں شادی کا حق بھی نہ تھا بعد ازاں انہیں یہ حق دیا گیا لیکن عملاً بے سود تھا۔
۱۲) یہ لوگ ایک طرح سے سادہ عوام کے جان و مال اور عزت و آبرو کے مالک تھے اور خوشحال طبقے عیش و نشاط کی زندگی بسر کرتے تھے۔
۱۳) زمین کی طرح صنعتوں کارخانوں پر بھی انہیں کا قبضہ تھا۔ مزدوروں اور کاشتکاروں کو بیچ کھانا ان کا حق تھا۔
یہ تو تصویر کا ایک رخ تھا جبکہ دوسرا رخ اس سے یکسر مختلف تھا۔

طبقہ عوام

۱) یہ لوگ جزوی شہری تھے مکمل شہری نہیں۔ اس کا معنی صاف ظاہر ہے کہ انہیں شہری ہونے کے حقوق حاصل نہیں تھے۔
۲) ابتدائی دور میں انہیں فوج میں آنے کا حق حاصل نہیں تھا۔
۳) انہیں پنچ اور گھٹیا سمجھا جاتا تھا۔

دراصل یہ لوگ اس معاملے میں بھی یونان کے مقلد محض تھے۔ اہل یونان کے بارے میں تاریخ تہذیب میں یہ بات ملتی ہے کہ اس کے دو حصے تھے۔ ایتھنز اور سپارٹا۔ دونوں میں حسب ذیل طبقات تھے۔

۱) شہری

یہ سپارٹا کے اصلی باشندے تھے۔ یہ پوری آبادی کا پانچ سے دس فیصد تھے۔ یہی طبقہ حکمران تھا۔ انہیں میں سے فوجی بھی تھے۔ یہ کوئی اور کام نہ کرتے تھے۔

۲) غلام

یہ اصل شہریوں سے دس گنا زیادہ تھے۔ یہ کھیتی باڑی کرتے تھے۔ ان کی تقدیر زمینوں سے وابستہ کردی گئی تھی۔۔۔

۳) آزاد

یہ طبقہ کسانوں' کان کنوں تاجروں اور دیگر شہری سرگرمیاں انجام دینے والے افراد کا تھا۔ انہیں نہ کوئی سیاسی حقوق حاصل تھے اور نہ یہ اہل سپارٹا میں شامل ہو سکتے تھے اور نہ ان میں شادی ہی کر سکتے تھے۔

دوسری طرف ایتھنز کی مکمل آبادی تین لاکھ پندرہ ہزار نفوس پر مشتمل تھی۔ جن میں ایک لاکھ ستر ہزار شہری تھے مگر ان میں سے بھی صرف تیس ہزار بالغوں کو موثر شہریت کے حقوق حاصل تھے لیکن عورتوں کو کوئی حقوق حاصل نہ تھے۔

ایک لاکھ پندرہ ہزار غلام اور تیس ہزار غیر ملکی تھے۔ جنہیں نہ وہاں زمین خریدنے کا حق حاصل تھا اور نہ کسی قسم کی شہریت کے حقوق انہیں حاصل تھے۔ چاندی کی کانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کو زنجیروں میں جکڑ کر رکھا جاتا تھا اور ان سے جبری مشقت لی جاتی تھی۔

یہ وہ طبقاتی کشمکش کی بنیاد تھی جو یونانی "علم و حکمت" نے فراہم کی تھی اور جس پر اہل روم نے اپنے معاشرے اور اپنی معاشرت کی عمارت اٹھائی تھی۔ رومیوں نے اپنے نقطہ نظر سے زندگی کی مختلف تعبیرات کیں اور ان تعبیرات کو وہ فلسفیانہ رنگ دے کر دنیا والوں کو اپنی علمی وجاہت کا تاثر دینے میں بڑی حد تک کامیاب رہے۔ یہ ان کی اپنی سیاست' اپنی معیشت' اپنے مذہب اور اپنے علم و حکمت اور اپنے تاریخی دستور کے مطابق تقسیم کردہ انسانی قدروں اور انسانی طبقات کی رسم بد تھی' جس پر وہ اپنے تمام تر خالص اور سچے جذبوں کے ساتھ عمل پیرا تھے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ دو باتیں قابل غور ہیں جن میں سے ایک تو انکی نگاہ میں انسان کی حیثیت کا تعین کرتی ہے جبکہ دوسری ان کی نظر میں عورت کی حیثیت کو مرد کے مقابلے میں متعین کرتی ہے۔

گناہ۔ خمیر انسانی

ان کا نظریہ تھا کہ انسان اپنی اصل کے اعتبار سے گناہ گار ہے اور پیدائشی طور پر اپنے سر پر گناہوں کا بوجھ لے کر اس دنیا میں آتا ہے اس کو وہ (Original Sin) کہتے تھے ان کی مذہبی زندگی میں یہ نظریہ آج بھی پایا جاتا ہے۔ یہ نظریہ ان کی نظر میں انسان کی حیثیت کو واضح کرتا ہے جس کے مطابق انسان گنہگار ہے نہ کہ لائق اعتناء و اعتبار کوئی معزز و محترم ہستی۔ آدمی اپنے ہی ضمیر کی عدالت میں مجرم ٹھہرا کہ اس کا تو خمیر ہی گناہ کے پانیوں سے گوندھا گیا ہے یہ شعوری سطح پر انسانیت کی تذلیل تھی اور ہے' جب عزت نفس ہی مرجائے' انسان اپنی ہی نظروں میں گر جائے' تو وہ وقار اور تمکنت کو ابن آدم کا مقدر کیسے بنا سکے گا؟

احترام عورت مفقود

دوسری اہم بات ان کا عورت کے بارے میں نظریہ تھا۔ وہ اس بات پر ایمان رکھتے تھے کہ ہر گناہ کی جڑ عورت ہی ہے اور اس سے سوائے گناہ کے اور کسی بات کی

توقع رکھنا لایعنی سی بات ہے۔ یہی بنیاد تھی جس پر ان کے ہاں معاشرے میں عورت کو کبھی بھی مرد جیسے حقوق نہیں مل سکے۔ اس کے برہنہ سر پر احترام اور عزت کی ردا دینے کا تصور مفقود تھا۔ غرض کہ انسان کے طور پر تو مرد بھی لائق اعزاز نہ تھا لیکن عورت تو انتہائی گھٹیا اور پیچ شے کا نام تھا حتی کہ بطور بیوی عورت کو خاوند کے سامنے اپنی زبان بھی کھولنے کی اجازت نہ تھی۔ عورت جس کے قدموں میں جنت ہے' کو جوتی کی نوک کے برابر بھی نہ سمجھا جاتا۔ اس کے حقوق کا تعین تو بہت دور کی بات ہے عملاً اس کے وجود ہی کو تسلیم نہ کیا جاتا۔ یہ درجہ بندی تو صرف رومیوں کے مابین تھی۔ جہاں تک غیر رومیوں کا تعلق ہے تو رومی انہیں اپنے سے (گویا کہ گھٹیا ترین رومی سے) بھی کمتر جانتے' گھٹیا سمجھتے اور پیچ گردانتے تھے۔ اس سپرپاور (Super Power) کی درون خانہ حالت یقیناً قابل رحم تھی۔ دنیا کی عظیم ترین فوجی طاقت اور طاقتور ترین مملکت کا علمی' فکری' نظریاتی' اعتقادی' عملی' روحانی' انفرادی اور اجتماعی دیوالیہ پن ارباب علم و دانش کے لئے لمحہ فکریہ ہے۔

یونانی فلسفہ رطب ویابس کا آئینہ

بے مقصد فلسفیانہ مباحث اکثر وقت کا ضیاع ثابت ہوتی ہیں۔ یونان کا سارا فلسفہ اسی رطب ویابس کا آئینہ دار ہے جس نے ذہن انسانی کو نہ افکار تازہ کی خوشبو سے مشام جاں کے معطر ہونے کی بشارت دی اور نہ فکر و نظر کی گتھیاں سلجھا کر اولاد آدم کے لئے نظری آسودگیوں کا اہتمام کیا۔ یہ کیسا ترقی یافتہ معاشرہ تھا جہاں انسان کے بنیادی حقوق کا کوئی تصور موجود نہ تھا' جہاں انسانی حقوق کی مسلسل خلاف ورزی ہو رہی تھی' جہاں دختر حوا کے ہونٹوں پر بے بسی کے قفل چڑھا دیئے گئے تھے اور اس کے پاؤں میں غلامی کی ایسی زنجیریں پہنا دی گئی تھیں جو مدتوں تک اس کا مقدر رہیں۔

تشنہ کامیاں سراپا دعا

وقت آ گیا تھا کہ وہ لمحہ منتظر کہ پوری کائنات جس کی پذیرائی کے لئے اپنی

آنکھوں میں سمٹ آئی تھی اب وقار، تمکنت اور شرف انسانی کی قندیل تھامے زمین پر اتر آئے، ہاں وہی لمحہ صدیوں سے تشنہ زمینیں جس کے نزول کی دعائیں مانگ رہی تھیں۔ وقت آگیا تھا کہ وہ لمحہ ابر کرم بن کر اور خنک موسموں کی نوید لے کر آسمان ملوکیت پر چھا جائے، انسانیت کے مقدر میں عافیت و سلامتی کا آفتاب بن کر طلوع ہو، آسودہ لمحوں کی بشارتیں ہر آنگن میں پھول کھلائیں، ہر دریچے میں چراغ جلائیں اور افق عالم پر امن کا دائمی پرچم لہرائیں، وہ لمحہ زمین پر اترے اور اہل زمین کو جنگ کی ہولناکیوں سے بچائے اور انسان کے بنیادی حقوق کے شعور کو عدل کی بنیاد بنا کر معاشرے کو توازن و اعتدال کی راہوں پر گامزن کرے۔

نظام جبر کے انہدام کا اعلان

وہ لمحہ منتظر زمین پر اترا تو ذرہ ذرہ خوشی سے جھوم اٹھا، ہوائیں وجد میں آ گئیں، تشنہ زمینوں کی دعائیں مستجاب ہو چکی تھیں۔ کارکنان قضاوقدر نے قیصروکسریٰ کے نظام جبر کے انہدام کا اعلان کیا، پژمردہ موسموں کے چہرے کھل اٹھے، انسانیت کی کشت نامراد بہار کے لمس جاوداں سے ہمکنار ہوئی اور کائنات کا ذرہ ذرہ بارگاہ خداوندی میں سجدہ ریز ہو گیا، حرف دعا کلمہ شکر میں تبدیل ہو گیا۔

اندھیرے اپنا رخصت سفر باندھ رہے تھے

جب کوئی معاشرہ قعر مذلت میں گرتا ہے تو سب سے پہلے وہ اخلاقی گراوٹ اور ذہنی پستی کا شکار ہوتا ہے، آزاد خیالی کے نام پر مذہبی قوتوں کو کمزور کر دیا جاتا ہے، ضابطہ ہائے حیات کی من مانی تاویلات کر کے روایات کا گلا گھونٹ دیا جاتا ہے، یونانی تہذیب بھی اسی شکست و ریخت کا شکار تھی۔ جب راتیں اللہ کے ذکر کے بغیر جاگنے لگیں تو ذہن انسانی پر شیطانی قوتیں قبضہ جما لیتی ہیں۔ رقص گاہوں میں روشنیاں ہوتی ہیں اور ناچ گھر آباد ہونے لگتے ہیں۔ ثقافت کے نام پر کثافت کے انبار تخلیق کئے جاتے ہیں، حرام کاری اور رقص و سرود کی آندھی نے رومیوں کے افکار و نظریات کو اپنی

پلیٹ میں لے رکھا تھا۔ اس بازار کا سارا گند گھر کے آنگنوں میں بہہ رہا تھا۔ جب طوائف کے کوٹھے بقعۂ نور بن جائیں تو شرفاء کے گھروں میں اندھیرا رہنے لگتا ہے' ساحلوں کی روشنی دور ہونے لگتی ہے اور امید کی آخری کرن بھی بجھ جاتی ہے۔ قدم قدم پر قمار خانے آباد تھے۔ اپنے معاملات میں دھوکہ دہی کو رومیوں نے معمول بنا رکھا تھا' عہد کی پابندی کا کوئی تصور ہی موجود نہ تھا' چور بازاری اور لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم تھا'قلب انسان بغض' حسد' کینہ اور لالچ کی آگ میں جل رہا تھا۔ رحمت حق جوش میں آئی اور ابر کرم ٹوٹ کر برسا اتنا کہ پیاسی زمینیں جل تھل ہو گئیں۔ایک ہمہ گیر انقلاب جو ہر شعبہ زندگی میں انقلابی تبدیلیوں کا پیغام لے کر آیا' بنی نوع انسان کا مقدر بنا' دستار فضیلت صاحبان زر کے سر پر نہیں باندھی گئی بلکہ معیار فضیلت "تقویٰ" کو قرار دیا گیا۔

محمد ﷺ کا ستارا طلوع ہو چکا تھا' نبی آخر الزمان کی بعثت کا اعلان ہو چکا تھا۔ سفر انقلاب میں مرحلہ ہجرت پایہ تکمیل کو پہنچ چکا تھا اب عالمگیر سطح پر دعوت حق کے کام کا آغاز ہو رہا تھا۔ چار دانگ عالم میں اللہ کی توحید کا پرچم لہرانے والا تھا۔ قیصرو کسریٰ کی تہذیبیں غیرارادی طور پر صبح نو کے اجالوں کو اپنے دامن میں سمیٹنے کے لئے بے قرار تھیں' روشنیوں کا قافلہ آگے بڑھ رہا تھا اور اندھیرے اپنا رخت سفر باندھ رہے تھے۔

قانون مجرموں کے کٹہرے میں

عدل کی حکمرانی نہ صرف حکومتوں کے استحکام کا باعث بنتی ہے بلکہ خیر کی قوتوں پر عوام کا اعتماد بھی بحال رہتا ہے۔ ان کا یہی اطمینان کسی معاشرے یا کسی نظام حیات کے لئے سند جواز فراہم کرتا ہے لیکن رومیوں کے ہاں عدل کا جو تصور تھا بھی وہ حکمرانوں اور امراء کی انانیت کی بھٹی کا ایندھن بن چکا تھا۔ جمہوریت کے نام پر جمہوریت کی مٹی پلید ہو رہی تھی اور آمریت اپنی بدترین شکل میں عوام پر مسلط تھی' بادشاہوں کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ قانون کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس پر مستزاد یہ کہ

قانون ظالم کو ظلم سے روکنے کا فریضہ انجام نہیں دیتا تھا بلکہ اس کی پشت پناہی کرتا تھا۔ گذشتہ صفحات میں بیان ہو چکا ہے کہ جاگیردار اپنی جاگیر کے ساتھ مزارعین کو بھی بیچ دیتے تھے اور اسے کوئی پوچھنے والا نہیں تھا۔ اسی طرح اگر وہ کسی غریب کو قتل بھی کر دیتے یا اس کی ہر شے چھین لیتے تو پھر بھی مظلوموں کی دادرسی میں قانون بے بس تھا۔ قانون کا مقصد عدل کرنا نہیں مراعات یافتہ طبقے کے حقوق کی حفاظت کرنا تھا۔ جب کوئی معاشرہ قانون کے ہاتھوں میں بے حسی اور مصلحت کی ہتھکڑیاں پہنا دے تو عدالت کا یہ فیصلہ خود قانون کو مجرموں کے کٹہرے میں لا کھڑا کرتا ہے۔

رومیوں کے ہاں نہ تو انسانی اقدار کی حفاظت تھی اور نہ انسانی اقدار کا ان کے یہاں کوئی تصور پایا جاتا تھا۔ ان کے یہاں قانون کا مقصد سوائے طبقات کی تفریق قائم رکھنے کے اور کوئی نہ تھا۔ انکے قانون میں جو خامیاں تھیں وہ تو تھیں ہی اور وہ وہی خامیاں تھیں جن کا ذکر ایران کے حالات میں گزرا لیکن اس سے بھی بڑھ کر یہ امر قابل غور ہے کہ ان کے نزدیک قانون کی حیثیت کیا تھی؟ یہ حیثیت مختلف طبقات کے لئے مختلف تھی۔

(۱) اعلیٰ طبقے کے ہاتھوں میں قانون اور عدل کی اعلیٰ اقدار بچے کا وہ کھلونا بن چکی تھیں جو بچے کے ہاتھ سے گر کر چکنا چور ہو جاتا ہے۔

(۲) ادنیٰ طبقے کے لئے قانون اس شکنجے کا نام بن کر رہ گیا تھا جس میں انہیں کس دیا جاتا تھا اور ان کے حقوق کو کچل کر قریہ جبر کے جھوٹے خداؤں کی خدائی کو تحفظ کی دیواریں فراہم کی جاتی تھیں، عوام کے ارمانوں اور تمناؤں کا خون کیا جاتا تھا اور ان میں سے جو کوئی بھی اپنے حقوق کے لئے سر اٹھانے کی کوشش یا بات کرتا تو اسے موت کی نیند سلا دیا جاتا۔

قانون کی بالادستی کے حوالے سے اس عہد کا تجزیاتی مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ہاں

۱۔ قانون کی کوئی باقاعدہ لائق اعتبار تعریف نہیں ملتی۔

۲۔ قانون کی حدود کا واضح تعین دو ٹوک انداز میں میسر نہیں تھا۔
۳۔ حقوق کے تعین میں طبقات کی تقسیم عمل میں لائی گئی تھی۔
۴۔ اقلیتوں کے حقوق کا گویا سرے سے کوئی تصور ہی نہ تھا۔
۵۔ مقتدر افراد کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ قانون کا درجہ پاتا تھا۔
۶۔ جنگوں کے قوانین اول تو تھے ہی نہیں اور اگر کہیں کسی درجے میں ان کا وجود پایا بھی جاتا تھا تو ان میں بنیادی انسانی حقوق کے تحفظ کی نہ تو کوئی ضمانت تھی اور نہ ان کے نزدیک ان کی کوئی اہمیت ہی تھی۔

یہ معاشرے خوف خدا سے عاری تھے ان کے ہاں خشیت الٰہی کی شدید کمی تھی۔ ایک ایسی اخلاقی و روحانی قوت کی کہ جو انہیں ان کے اندر سے سر اٹھا کر مجبور کرتی کہ وہ دوسروں کے حقوق کو باقاعدہ ادا کریں یا کم از کم اتنا ضرور کر دیتی کہ انہیں دوسروں کے حقوق کی باقاعدہ پامالی سے ہی روک دیتی۔

دوسرے لفظوں میں یہ کہا جائے گا کہ جس زمانے میں حضور نبی اکرم ﷺ کی بعثت مبارکہ ہوئی ہے اس دور میں ساری دنیا میں ہر معاشرہ روحانی الذہن لوگوں کی تیاری اور ان کی ضرورت سے غافل تھا۔ اسی وجہ سے یا اسی بنا پر کسی بھی قسم کی اخلاقی و روحانی تربیت کے ہمہ گیر نظام کی ضرورت کو سرے سے محسوس ہی نہیں کیا جاتا تھا وہ احساس جو پورے معاشرے کو اس طرح اپنی لپیٹ میں لے لیتا کہ ان کی معاشرتی زندگی کا تحرک مطالبہ حقوق اور اس کے نتیجے میں حقوق و مفادات کی جنگ کی بجائے ایتائے حقوق کی سمت مڑ جاتا۔

اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوتا کہ تحفظ حقوق کے لئے صرف بیرونی محرک یعنی قانونی سزائیں ہی نہ ہوتیں بلکہ جرائم سے روکنے کے لئے ایک ایسا اندرونی محرک بھی پایا جاتا جو اصل الاصول کا درجہ رکھتا۔ جبکہ قانون کی ذمہ داری محض ایک مددگار کی رہ جاتی۔ لیکن وہ محرک کیا ہو؟ یہ سوال تو بہت بعد کا ہے اس زمانے کی کیفیت تو یہ تھی گویا انہیں سرے سے کسی محرک کے ہونے کا ہی علم نہ تھا۔ ان کے حالات تو اس بات کی

طرف واضح غمازی کرتے تھے گویا انہیں ایسے کسی محرک کی حاجت ہی محسوس نہ ہوتی ہو۔ اور سچ بات بھی یہی ہے کہ ان کے وہم و گمان میں بھی کہیں ایسے محرک کا خیال تک نہ آیا تھا' کجا یہ کہ وہ اس کی ضرورت محسوس کرتے اور پھر تلاش حق کے لئے نکلتے۔ اس پس منظر کی جزئیات سے آگاہی اس لئے بھی ضروری ہے تاکہ ہمیں معلوم ہو سکے کہ پیغمبر انقلاب حضور رحمت عالم ﷺ نے جب مکہ میں تحریک اسلامی کا آغاز کیا تو انہیں کن مخالفتوں اور مزاحمتوں کا سامنا کرنا پڑا تاکہ ہم اس زمانے میں آقائے دوجہاں ﷺ کے برپا کردہ انقلاب کی قدر و قیمت کا اندازہ کر سکیں اور ہمیں معلوم ہو کہ سرکار دو عالم ﷺ کے احسانات اس دنیا پر کس قدر ہیں؟ نیز ہمیں یہ بھی معلوم ہو کہ آنحضور ﷺ کی ذات بابرکات انسانیت پر خدا کا کتنا بڑا فضل ہے۔ یہ وہ واحد احسان ہے کہ خود خدائے تعالیٰ نے اپنے پاک کلام میں انسانیت پر یہ احسان باقاعدہ جتلایا ورنہ یوں تو لحہ لحہ اس کے احسانات ہیں لیکن کبھی نہ جتلائے گئے نہ جتلائے جاتے ہیں۔

ہم نے ایک طرف سکینڈے نیویا سے عراق و شام تک' دوسری طرف وادی سندھ سے آرمینیا تک اور تیسری طرف مراکو سے مصر بلکہ نیچے ایتھوپیا' صومالیہ تک کے حالات کا سرسری جائزہ لیا ہے۔ اس وقت کی مہذب دنیا میں سے اب جزیرہ نمائے عرب کے علاوہ ہندوستان' سری لنکا' نیپال' بھوٹان' پاکستان (خاص طور پر پنجاب) سے لے کر نقشے پر ذرا دائیں طرف اوپر کو چین' جاپان اور روسی ریاستیں۔ ان قابل ذکر مقامات کا ذکر ابھی باقی ہے۔ ان میں مرکزی حیثیت چین اور ہندوستان کو حاصل تھی۔ چین میں بالعموم کنفیوشس کا نام چلتا تھا لیکن وہ مذہب تحریف شدہ ہو کر بدھ مت سے بدلا جا چکا تھا یا بدلا جا رہا تھا۔ نیز چھوٹی چھوٹی ریاستوں کی کیفیت تھی جو کہ ہندوستان سے ملتی جلتی ہے اس لئے ہم ہندوستان کا تذکرہ کرتے ہیں۔ اب تک جو حالات گذشتہ صفحات میں بیان ہو چکے ہیں' ہندوستان کی حالت بھی ان سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھی۔

باب ـ ۴

ہندوستان

عہد رسالت مآب ﷺ میں سرزمین ہند ایک طرف نیپال اور بھوٹان سے لے کر نیچے سری لنکا کے جزیرے تک پھیلی ہوئی تھی جبکہ دوسری طرف سندھ سے لے کر برما تک کا علاقہ ہندوستان میں شامل تھا۔ اس کی سرحدیں ایک طرف سمندر سے ملتی تھیں تو دوسری طرف ایران کے ساتھ ملتی تھیں۔ نیز ایران سے آگے ایک طویل سرحدی پٹی چین کی سرحد تک جاتی تھی۔ یہ کوئی باقاعدہ مملکت یا سلطنت نہیں تھی اور نہ کوئی وفاق تھا۔ کسی مرکزی حکومت کا کوئی نام ونشان نہ تھا بلکہ یہ مختلف چھوٹی چھوٹی ریاستوں اور ان کے راجاؤں کی جدا جدا آزاد حکومتوں پر مشتمل سرزمین تھی جن میں باہمی جنگ وجدال کی روش جاری رہنے کا معمول تھا۔ اس ماحول میں ہندوستان جن حالات سے اور اس کے باشندے جن احوال سے گزر رہے تھے ان کی ایک جھلک ہم آئندہ صفحات میں پیش کریں گے۔

ہندوستان کا سیاسی منظرنامہ

ہندوستان بت پرستی کے اندھیروں میں ڈوبا ہوا تھا۔ ذات پات کی تقسیم در تقسیم نے انسانی حقوق کے ہر تصور کو مٹا کر رکھ دیا تھا۔ ہندی تمدن مختلف اکائیوں میں بٹا ہوا تھا۔ ہر طرف ثقافتی بدامنی کی سرخ آندھی چل رہی تھی۔ ہندوستان کے سیاسی نظام میں وفاق اور مرکزیت کا کہیں دور دور تک بھی تصور نہ تھا بلکہ پورا ملک چھوٹی بڑی بے شمار ریاستوں میں بٹا ہوا تھا۔ یہی وہ قدر تھی جو ہندوستان اور روم وایران میں مشترک نہ تھی۔ ورنہ ہر ریاست اندرونی طور پر کم وبیش اسی طرح کے ڈھانچے پر مشتمل تھی جس پر کہ روم اور ایران کی بڑی سلطنتوں کی بنیادیں اٹھائی گئی تھیں' ان گنت ریاستوں میں راجے مہاراجے اقتدار پر براجمان تھے' مجموعی صورت حال کچھ یوں تھی۔

(۱) ریاست کا سربراہ راجہ کہلاتا تھا اور وہی مختار مطلق تھا۔ اس کے اختیارات خدائی اختیارات کی مانند تھے اور کسی کو اس کے سامنے اظہار رائے یا اختلاف کرنے کی بالعموم

مجال نہ تھی۔

(۲) یہ راجہ کسی کی جزا' سزا' قانون سازی' مالیہ' لگان وغیرہ ہر معاملے میں آزاد تھا۔ کسی قانون' ضابطے کا پابند نہ تھا نہ کسی کے سامنے جوابدہ ہی تھا۔

(۳) ہندوستان کے اصل باشندے غلاموں سے بھی بدتر زندگی بسر کر رہے تھے انہیں شودر بنا کر ہر اس انسانی استحقاق سے محروم کر دیا گیا تھا جسے اونچی ذات کے ہندو اپنے لئے روا رکھتے تھے' احساس برتری کا یہ عفریت ہر طرف تباہی بکھیر رہا تھا۔

(۴) ہندوستان بے شمار سیاسی اور جغرافیائی اکائیوں میں تقسیم ہو چکا تھا۔ یہ اکائیاں جنگ و جدل میں مصروف رہتیں' انا کی دیوی ہر راجے مہاراجے کے ذہن پر حکمران تھی' انانیت کی دیواریں بلند سے بلند تر ہو رہی تھیں۔ جبکہ سیاسی قیادت راجپوتوں کے ہاتھ میں تھی گویا انہیں پیدا ہی حکومت کرنے کے لئے کیا گیا تھا' یہ بھی برتری کا احساس اپنے سینوں میں پالتے اور شرف انسانی کی بحالی کی ہر کوشش کو اپنے خلاف سازش قرار دیتے۔

(۵) عوام کو کسی حوالے سے بھی کاروبار حکومت میں شریک نہیں کیا جاتا تھا۔

(٦) مذہبی حوالے سے برہمنوں کی اجارہ داری قائم تھی۔

(۷) بادشاہت راجوں مہاراجوں کی شخصی اور خاندانی حکومتوں کی صورت میں موجود تھی۔

(۸) ایرانی اور رومی تہذیب کی ساری برائیاں ہندی تہذیب میں بھی در آئی تھیں۔ عوام کا وہاں بھی کوئی پرسان حال نہ تھا اور یہاں بھی ظلم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کا حوصلہ کسی کو نہ تھا۔ ہندوستان کی سرزمین بھی قریہ جبر بنی ہوئی تھی۔

ذات پات کی دلدل میں گھرا ہوا سماج

طبقاتی کشمکش کی دلدل میں ہندی معاشرہ بری طرح گھرا ہوا تھا اور اصلاح احوال کی بظاہر کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ ذات پات کے دست تظلم میں

انسانیت سسک رہی تھی۔ ہندوستان کا پورا سیاسی اور مذہبی ڈھانچہ اسی مراعات یافتہ طبقے کے حقوق کے لئے بنایا گیا تھا۔ عوام کا استحصال جاری تھا اور استحصالی قوتوں کی راہ میں کسی مزاحمتی تحریک کا تصور بھی ہندو معاشرے میں پاپ (گناہ) سمجھا جاتا تھا۔ فرد کی سماجی حیثیت کا تعین اس کی ذاتی صلاحیتوں کی بنا پر نہیں بلکہ اس کی ذات کے پیش نظر کیا جاتا شودر خواہ کتنی ہی صلاحیتوں کا مالک کیوں نہ ہو وہ ہمیشہ اونچی ذات والوں کی حقارت کا ہی نشانہ بنتا' فرد اپنی خداداد صلاحیتوں کی بدولت معاشرے میں اعلیٰ مقام کے حصول کی جدوجہد نہیں کر سکتا تھا' ترقی اور خوشحالی کے دروازے اس پر ہمیشہ کے لئے بند کر دیئے گئے تھے کیونکہ بھگوان نے اسے نیچ ذات میں پیدا کیا۔ نیچ ذات والوں کو گندے نالے کے کیڑوں سے زیادہ اہمیت نہ دی جاتی تھی۔

(۱) ہر طبقہ اپنی حدود کا پابند تھا اور ان حدود کو توڑنا قابل سزا اور ناقابل معافی جرم تھا۔

(۲) جرم خواہ ایک ہی ہوتا لیکن مجرم کو سزا اس کے جرم کی بجائے اس کے طبقے کی درجہ بندی کے مطابق دی جاتی تھی۔

(۳) اس نظام جبر میں نیچ ذات کے لوگ (یہ خود ساختہ تقسیم تھی ورنہ سب انسان برابر ہیں' آدم کی اولاد ہیں اور آدم کا خمیر مٹی سے اٹھایا گیا تھا) تعلیم تک حاصل نہ کر سکتے تھے۔

(۴) مذہبی زبان کی باریکیاں (یعنی سنسکرت) سمجھنا اور اس پر عبور حاصل کرنا صرف اور صرف برہمن ہی کا ادھیکار تھا۔

(۵) شودر کی حیثیت محض برہمن کے غلام کی تھی۔ برہمن اگر کسی کو قتل بھی کر دے اس سے باز پرس نہیں ہو سکتی تھی۔ حتیٰ کہ راجوں' مہاراجوں میں اتنی اخلاقی جرات نہ تھی کہ وہ پنڈت جی کو ایک انسان کے قتل پر محض زبانی سرزنش ہی کر سکیں۔ برہمن سامراج کا یہ غیر انسانی رویہ آج بھی زندہ ہے اور کشمیر میں اس رویے کا عملی مظاہرہ بھی ہو رہا ہے بلکہ پورے بھارت میں اقلیتوں کے ساتھ جو سلوک روا رکھا جا رہا ہے وہ اسی رویے کا آئینہ دار ہے۔

(۶) شودر سے مذہبی کتاب کو سننے کا بھی حق چھین لیا گیا تھا۔ کوئی شودر اگر کچھ پڑھ لیتا تو اس کی زبان کاٹ دی جاتی اس کی آنکھیں نکال لی جاتیں اور اگر اتفاقاً بھی کسی مذہبی کتاب کا کوئی جملہ اس کے کان میں پڑ جاتا تو سزا کے طور پر پگھلا ہوا سیسہ اس کے کانوں میں انڈیل دیا جاتا' تمہاری یہ جرات کہ تم ہماری مذہبی کتاب سنو' تم شودر ہو' گندی نالی کا کیڑا ہو' اپنی اوقات میں رہو۔

(۷) وہ کسی برہمن کو چور کہہ دیتا تو جسم کا کوئی بھی حصہ کاٹ دیا جاتا۔

(۸) سخت کلامی کرتا تو زبان میں سوراخ کر دیا جاتا۔

(۹) بڑی ذات کے آدمی کے ساتھ اس کے برابر کے درجے پر بیٹھ جاتا تو کولھا کاٹ دیا جاتا۔

(۱۲) ان کے کنویں الگ' آبادیاں الگ اور رہن سہن جدا تھے۔ انہیں برہمنوں اور اونچی ذات کے دیگر افراد کے لئے خاص کنویں سے پانی لینے اور ان کے ساتھ ایک شہر میں رہنے کی اجازت نہ تھی۔

(برٹینیکا' ۳:۱۰۱۱' تحقیق البیرونی: ۴۵۹' مسلم ثقافت (سالک)' ۸:۷ ۳)

کیا یہ جھلک ایک انسانی معاشرے کی ہو سکتی ہے؟ کیا اس معاشرے میں بنیادی انسانی حقوق کا کوئی تصور موجود ہونا ممکن ہے؟ کیا اس ظالمانہ تقسیم کا انسانیت ' سے دور کا بھی کوئی رشتہ متصور ہو سکتا ہے؟ جبکہ ایسا نہیں اور یقیناً نہیں ہے تو کیا انہیں ایک عظیم معاشرتی انقلاب کی ضرورت محسوس نہ ہوتی تھی؟ جی ہاں! انہیں انقلاب کی ضرورت تھی اور انقلاب آ بھی گیا اور یہ انقلاب ہادی کائنات جناب محمد ﷺ لے کر مبعوث ہوئے تھے۔

قانون برہمن کی رضا کا دوسرا نام

جس معاشرے میں انسانوں کے درمیان مساوات کا کوئی تصور موجود نہ ہو وہاں قانون کی حکمرانی کا عالم کیا ہو گا؟ وہاں قانون کی نظروں میں برابری کیسے ممکن ہو

گی؟ اس قوم کی قانونی حالت کیا تھی؟ ہندوستان کی تاریخ کا سرسری مطالعہ بھی اس کی حیثیت کو واشگاف کر دیتا ہے۔ خصوصاً ان کے معاشرتی اور سیاسی حالات معلوم ہو جانے کے بعد تو الگ سے یہ کہنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی کہ قانون برہمن کی رضا کا دوسرا نام تھا۔

اس ہندی معاشرے میں عدل و انصاف محض یہ تھا کہ برہمنوں کی زبان سے نکلے ہوئے احکام کی حرف بحرف پیروی کی جائے' برہمنوں نے ہر حوالے سے سماج پر اپنی گرفت مضبوط کر رکھی تھی۔ مثلاً

(۱) مندر کے "راز" سے پردہ اٹھانے کی سزا موت تھی۔
(۲) پنڈت اور پروہت کی اہانت کی سزا موت تھی۔
(۳) تمام انسانوں کو برابر سمجھنے کی سزا موت تھی۔
(۴) شودر کے لئے مہینے میں ایک مرتبہ سے زیادہ حجامت بنوانا جرم تھا۔
(۵) شودر اگر برہمن کے داڑھی یا پاؤں کو (خواہ معافی مانگنے کے لئے ہی کیوں نہ کرے) چھولے تو اس کی سزا ہاتھ کاٹ دینا تھی۔
(۶) برہمن' کھشتری' ویش اور شودر کے لئے ایک ہی جرم کی سزا مختلف تھی۔
(۷) کسی شودر سے ہمدردی کرنا اور اس پر ترس کھانا ایک قانونی جرم گردانا گیا تھا۔
(۸) عورت کے لئے قانون تھا کہ اسے وراثت میں سے کچھ نہیں ملے گا۔
(۹) اگر اس کا مرد مرجاتا تو اس کے ساتھ اسے بھی زندہ جلا دیا جاتا۔
(۱۰) عورت کو غیر منقولہ جائیداد کا مالک ہونے کا قانونی حق حاصل نہیں تھا۔

یہ اور اس طرح کے دیگر احوال ایسے تھے جو زبان حال سے چیخ رہے تھے کہ کوئی تو ہو جو اس دکھی انسانیت کے درد کا درماں کرے۔ کوئی تو نجات کا پیغام لے کر آئے۔ کوئی تو صبح انقلاب کی تمہید بنے۔

بندۂ مزدور کے تلخ اوقات

ہندوستان سونے کی چڑیا تھا۔ وسائل قدرت سے مالا مال' دستکار اور ہنرمند

ہندوستان کی معیشت کو مضبوط بنانے میں اپنا کردار ادا کر رہے تھے لیکن مزدور کی عظمت کا کوئی تصور موجود نہ تھا۔ چنانچہ یہ وسائل چند ہاتھوں میں مرکوز ہو کر رہ گئے تھے، راجوں مہاراجوں کی شاہانہ زندگیوں پر بے پناہ مصارف اٹھ رہے تھے، ایران اور روم کی تہذیبوں کی طرح ہندوستانی معاشرے میں عام آدمی کسمپرسی کے عالم میں تھا اور وسائل قدرت سے پیدا ہونے والی آسودگی اور خوشحالی اس کے آنگن سے بہت دور تھی، طبقاتی تقسیم یہاں اپنی بدترین شکل میں موجود تھی، غربت، افلاس اور مفلوک الحالی کا راج تھا، ملکی معیشت کا دارومدار زیادہ تر زراعت پر تھا لیکن زراعت پر بھی چند طبقات کی اجارہ داری تھی۔

راجا اندر کا اکھاڑہ

مختصر لفظوں میں یہ کہ ہندوستان کے معاشی حالات بحیثیت مجموعی ناگفتہ بہ تھے۔ یہ ملک جتنا دولتمند تھا یہاں کے عوام اسی قدر بھوکے تھے۔ سرزمین پاکستان بھی وسائل سے مالا مال ہے لیکن ان وسائل پر چند جاگیرداروں، سرمایہ داروں کا قبضہ ہے اور عام آدمی جبر اور مہنگائی کے پاٹوں میں پس رہا ہے، وسائل قدرت پر اجارہ داری کا طلسم توڑے بغیر ابن آدم کے لئے آسودہ لمحوں کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، عہد رسالت مآب ﷺ میں ہندوستان کے اقتصاد کے بڑے چرچے تھے لیکن واقعتاً اس کے کھیتوں میں بھوک اگتی تھی کیونکہ مزارعین کے بچے بھوکے سوتے اور تعلیم سے محروم رہتے۔ ذات پات کے بندھنوں میں جکڑے ہوئے معاشرے میں انفرادی اور اجتماعی سطح پر اخلاقی صورتحال کا جائزہ لیا جائے تو حیرت انگیز انکشافات سوالیہ نشان بن کر سامنے آ کھڑے ہوتے ہیں۔ پورا ہندوستان راجہ اندر کا اکھاڑا بنا ہوا تھا۔ مندروں کی راہداریوں کی تاریکی میں جنم لینے والی ان کہی کہانیاں اخلاقی قدروں کی پامالی کی داستان سنا رہی تھیں، رقص و سرود کو مذہب کا حصہ بنا دیا جائے تو عریانی اور فحاشی کے سیلاب

کے آگے بند باندھنا ممکن نہیں رہتا۔ ہندوستانیوں کی اخلاقی پستی کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ ہندوؤں کا سب سے بڑا معبود "سومنات" (یا سومناتھ) تھا جو انسانی قد سے بھی بڑا تھا' یہ پتھر کا مجسمہ تھا اور جسے مرد کے مخصوص عضو کی شکل پر تراشا گیا تھا۔

(۲) بعض طبقات کے لئے ازواج کی کوئی تعداد مقرر نہیں تھی۔

(۳) مندر پیشہ ور عورتوں کے مراکز تھے۔ اور اسی طرح بدکاری کے اڈے تھے۔ جس طرح عیسائیوں میں راہبوں کے مراکز اور کلیسا بدکاری کے مراکز بن گئے تھے۔

(۴) عورتیں بیک وقت کئی کئی خاوند رکھ لیتی تھیں۔

(۵) شراب اور زنا تو مذہبا فرض بھی تھا۔ ایک خاص موقع پر مرد و عورت سب ایک جگہ جمع ہوتے۔ ایک دوسرے کو (مرد عورتوں کو اور عورتیں مردوں کو) مادر زاد برہنہ کر کے پوجا (عبادت) کرتے۔ اس موقع پر شراب بھی پی جاتی اور پھر بدمستی میں جس کے ہاتھ جو عورت لگ جاتی وہ اسی کو بدکاری کے لئے پکڑ لیتا تھا۔ اس مقام پر کسی مقدس رشتے یعنی بہن' بیٹی' ماں وغیرہ کا کوئی لحاظ نہیں کیا جاتا تھا بلکہ اس "فریضہ" کو تمام تقدسات اور تفریقات سے بالاتر ہو کر "ادا فرمایا جاتا"

(۶) علاوہ ازیں خاص فقرے مقرر تھے جس کو بول کر یا پڑھ کر بلا لحاظ رشتہ ہر مرد و عورت ہمبستری کر لیا کرتے تھے۔ (مسلم ثقافت' ۱:۴۰)

(۷) ان کے مندروں میں آج بھی ننگی عورتوں کی تصاویر ملتی ہیں بلکہ بعض مونث خداؤں (دیویوں) کی پوجا کی جاتی ہے تو اس طرح کہ ان کا برہنہ حالت کا مجسمہ سامنے رکھ کر ماتھا ٹیکا جاتا ہے۔

آج کے یورپ کی بھی کم و بیش ایسی ہی حالت (تھوڑے فرق کے ساتھ) ہے۔ ہمارا میڈیا آج ترقی کے نام پر جس چیز کو اپنی قوم کے گلے کا طوق بنا دینا چاہتا ہے۔ وہ کوئی ترقی نہیں ہے بلکہ دراصل یہ وہی فرسودہ' دقیانوسی اور قدیم طرز حیات ہے کہ جس کا جوا ہم نے صدیوں پہلے اپنے گلے سے اتار پھینکا تھا۔ کیا ہمیں واقعی اپنے دین کو چھوڑ کر اس فرسودگی اور دقیانوسیت کی طرف چلے جانا چاہئے یا اسے ٹھکرا کر ترقی کی راہ

پر گامزن ہو جانا چاہئے؟ اس فرسودگی اور دقیانوسیت کا اختتام ضروری تھا اور تاریک ادوار کی اس علامت سے چھٹکارا دامن مصطفےٰ ﷺ سے وابستہ ہوئے بغیر ممکن نہ تھا۔ ہندی معاشرے کو مثبت سمت میں ثقافتی اور روحانی سفر کی ضرورت تھی اور ایک ایسے انقلاب کی ضرورت تھی جو انہیں اس فرسودگی اور بیہودگی سے نجات دلا سکے۔ یہ آسمانی انقلاب آقائے نامدار ﷺ کے دست حق پرست پر مقدر ہو چکا تھا۔ یہ وہی انقلاب ہے جس کا دوسرا اہم ظہور اسی رسول معظم ﷺ کے فیض سے ایشیاء کے اس مرکز سے ہو گا جہاں "ابنائے فارس" اور "یمن کے بیٹے" آکر جمع ہوئے جہاں "آرین" اور "زط" (جاٹ) پہنچ کر ملے' جہاں ایک طرف حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی قوم اور دوسری طرف حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی قوم آکر آباد ہوئی۔ جہاں اولین وحی یعنی "زبراولین" کے امین ایک مرتبہ پھر اٹھیں گے لیکن اس مرتبہ وہ آخری وحی (قرآن) کے پرستار ہوں گے۔

الغرض اول البشر حضرت آدم علیہ السلام اور اول المرسلین حضرت نوح علیہ السلام کی سرزمین کو اس مرتبہ اول الخلق یعنی حقیقت احمدیہ ﷺ کے فیض اور اول الانبیاء علیہ التحیہ والثناء کے اس عظیم انقلابی پیغام کی ضرورت تھی جو ان پر خاتم النبیین ﷺ کی صورت میں ظہور فرمانے پر نازل ہونا تھا۔

ہندوستان منتظر تھا انقلاب حبیب کبریا علیہ التحیہ والثناء کا۔ ظہر آدم سے وعدہ الست کے لئے نکالے گئے "ذرے" اپنے باطن میں ایک نجات دہندہ کے انتظار میں سلگ رہے تھے جس کی شاید ان کے ظاہری پیکر کو بھی نہ خبر تھی۔

امیین کی ایک شاخ دوسری شاخ میں اٹھنے والے پیغمبر آخرالزمان ﷺ کے لئے منتظر تھی جبکہ پہلے پیغمبر کی تعلیمات ان کے اندر ایسے موجود تھیں کہ انہیں خود اس کی خبر نہیں تھی۔

مذہبی حالت

ہندوستانی معاشرہ جن افراد سے مل کر بنا تھا۔ وہ بنیادی طور پر ایک قوم نہ تھے

بلکہ کئی اقوام کا انبوہ کثیر تھے۔ ہندومت ہی ہندوستان کا سب سے بڑا مذہب تھا' بدھ مت کو ہندو معاشرہ اپنی مضبوط ثقافتی روایات کی بنا پر دیس نکالا دے چکا تھا۔ جین مت بھی ہندومت سے بہت زیادہ مختلف نہ تھا۔ یہ محض ردعمل کے طور پر ابھرا اس لئے بڑی آسانی سے اسے بھی اپنا لیا گیا۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے ہندی معاشرہ دراصل برہمنی معاشرہ تھا اور ہے' برہمنوں کو مکمل طور پر مذہبی اجارہ داری حاصل تھی' ہندوستان کے عوام توہم پرستی کا شکار تھے اور جہاں لوگ تیقن کی دولت سے محروم ہوں وہاں ان کے فکری اثاثوں کو لوٹنا اتنا مشکل نہیں ہوتا۔ جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہندوستان میں مختلف قومیں آباد تھیں' قدرتی طور پر یہ اقوام ثقافتی اور دینی اعتبار سے بھی ایک دوسرے کی ضد تھیں اور ان میں علمی اور عملی دونوں سطحوں پر محاذ آرائی' مجلسی کشمکش کا رہنا بعید از قیاس نہیں۔

مذاہب ہندیہ

ہندوستان میں پائے جانے والے بڑے مذاہب کی تعداد تین ہے۔

(۱) **ہندومت:** یہ مذہب اہل ہند کا قدیم ترین مذہب ہے۔ یہی وہ مذہب ہے جس کی بابت نئے انکشافات کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے۔ یہی اس وقت ہمارا موضوع خاص ہے۔

(۲) **جین مت:** یہ مذہب بھی ہندومت کے خود ساختہ انسانیت سوز حالات کے ردعمل کے طور پر سامنے آنے والا مذہب ہے۔ "فنائے ذات" اور "عدم تشدد" کا یہ مذہب یا نظریہ وفلسفہ آخرکار ہندومت میں ہی مدغم ہو گیا۔ حتیٰ کہ "مہاویر" جو اس کا پرچارک تھا خود بھی ہندومت کے ایک دیوتا کی شکل اختیار کر گیا۔

(۳) **بدھ مت:** یہ کوئی باقاعدہ مذہب نہیں ہے جس میں خدا' رسول' کتاب' فرشتوں اور آخرت وغیرہ کا باقاعدہ طور پر ذکر ہوتا بلکہ یہ ایک فلسفہ ہے جو ایک شخص

"بدھا یا مہاتما بدھ" (اس کے مختلف القاب) کا عطا کردہ ہے۔ اس کے فلسفہ کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان نے اپنی خواہشات کی تکمیل اور ان کے اندھے اتباع میں اپنی زندگی کو دکھوں سے بھر لیا ہے۔ جس کا علاج اس خواہش کو ختم کرنے میں مضمر ہے۔ جس کا طریق کار تین چیزوں نیک عمل، مراقبہ اور علم کو جمع کرنا ہی ہے اور یہی بدھا کا طریق ہے۔ ان تین چیزوں کو جمع کر لینے کا معنی ہے کہ انسان جان تلف کرنے، چوری، زنا، نشہ وغیرہ مخرب اخلاق اشیاء سے پرہیز کرے اور خود نگری، یکسوئی، توجہ تام، تنہائی، مجاہدہ اور ریاضت کے ذریعے اپنی روحانی ترقی میں مشاہدہ حق تک پہنچے۔ (بدھا اس سے مراد حضرت واجب تعالیٰ نہیں لیتا کیونکہ وہ کسی خدا کا کوئی تصور ہی سرے سے نہیں رکھتا)۔ اس کے نزدیک مشاہدہ حق سے مراد غالباً اس "حقیقت حقہ" کو پالینا ہے جس کا اسے کسی "صورت نوریہ" میں مشاہدہ ہوا۔ قطع نظر اس سوال سے کہ آیا وہ شیطانی تصرف تھا یا رحمانی فضل و احسان جس نے اسے ڈھانپ لیا تھا۔ یاد رہے کہ اس کے ہاں یہ منزل صرف ایک ہی راہ سے حاصل ہو سکتی ہے اور وہ راہ جنگلوں کی خاک چھاننے اور کوہساروں کی آبلہ پائی میں مضمر ہے۔ انسان خدمت خلق کرے، کسی کی دل آزاری نہ کرے، میانہ روی اختیار کرے۔ لیکن تقریباً ڈیڑھ دو سو سال تک یہ لوگ مکمل طور پر رہبانیت کی گود میں چلے گئے۔ اتنا ضرور ہوا کہ انہوں نے

۱۔ ویدوں کا انکار کر دیا۔

۲۔ قربانی کے تصور کا انکار کیا۔

۳۔ طبقات اور دیوتاؤں کی تقسیم کا رد کیا۔

۴۔ برہمن کی بالادستی ختم کر دی۔

۵۔ سنسکرت کا راج ختم کر دیا۔

۶۔ نفع بخشی کی طرف رجحان قائم کیا۔

۷۔ حکمرانوں میں جا کر اس فلسفہ یا فکر نے عوام کی بہبود کا سامان کیا۔

۸۔ عوامی شورشیں اور بغاوتیں ختم کیں اور امن کا سامان (کسی حد تک کیا)

۹۔ تاجروں کی مالی حالت بہتر کی۔

۱۰۔ سب سے اہم کام یہ کیا کہ محدود طبقاتی وفاداریوں کا قلع قمع کرنے کی بھرپور کوشش کی بلکہ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ وہ آسام سے افغانستان تک ایک ہی ریاست قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ لیکن کچھ اس لئے کہ ان کے پاس کوئی باقاعدہ نظم حیات نہ تھا اور کچھ برہمن کی مضبوط گرفت کو ٹھیک طرح سے دور نہ کر سکنے کی بنا پر برہمن ایک مرتبہ پھر انہیں شکست دینے میں کامیاب ہو گیا۔ بدھ ازم کو اپنی مقبولیت کے لئے چین، جاپان، انڈونیشیا، ملائشیا، تھائی لینڈ وغیرہ کی طرف ہجرت کرنا پڑی۔ آج بھی بدھ مت کے بڑے مراکز، چین، جاپان، فلپائن، تھائی لینڈ، کوریا، انڈونیشیا، سری لنکا اور نیپال وغیرہ میں ہیں۔ غرض ہندوستان میں ہندومت نے اپنا قبضہ جما کر دم لیا مہاتما بدھ کے فکر و فلسفہ کو اپنا بوریا بستر بحیثیت مجموعی وہاں سے لپیٹنا پڑا۔

ہندومت کا پس منظر و پیش منظر

ہندومت ان لوگوں کا مذہب ہے جو حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی ایرانی قوم "آرین" اور حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی یمنی قوم "جاٹ" (زط) کے ہندوستان میں جمع ہونے سے وجود میں آئی اور غالباً آئندہ کسی وقت میں سورہ جمعہ کی آیت وَاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ کی ایک اور تفسیر بن کر ابھرے یعنی فیضان نبوت ﷺ کی امین بن کر ابھرے (واللہ اعلم بالصواب)۔ یہ قوم اپنی اصل کے اعتبار سے اللہ کی اولین شریعت کی حامل ہے۔ یہ "زبر اولین" نیز ایک معنی کے اعتبار سے "صحف اولیٰ" کی امین ہے اور حضرت نوح علیہ السلام سے نسبت رکھتی ہے۔ ایک روایت کے مطابق حضرت نوح علیہ السلام جس سرزمین پر تشریف لائے وہ ہندوستان ہے۔ یہیں کیرالہ میں وہ مقام "تنور" ہے جہاں سے طوفان نوح کا آغاز ہوا تھا۔ یوں تو حضرت آدم علیہ السلام کے بارے میں بھی آیا ہے کہ ان کا ہبوط موجودہ ہندوستان میں ہوا تھا۔ تفاسیر میں اس مقام کا نام "دجنا" آیا ہے جہاں حضرت آدم علیہ السلام کا

ہبوط ہوا تھا۔ یہ "دجنا" (عربی میں) یہاں پر (موجودہ دور میں) دکھنا یادکھن ہے جو ہندوستان کے جنوبی حصے کا مشہور نام ہے۔

اسی طرح امام شوکانیؒ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کا تنور ہندوستان میں تھا۔

(فتح القدیر' ۲: ۴۷۴)

اس مقام پر یہ بات بھی یاد رہے کہ ہندوستان کی زمین آج سے بیس کروڑ سال قبل براعظم افریقہ کے ساتھ خشکی کے ذریعے جڑی ہوئی تھی۔ رفتہ رفتہ اپنی قدرتی حرکت کے ذریعے عرب سے ملی بلکہ یوں کہیں کہ اس قدرتی تحرک ارضی نے اس علاقے کو آج کے عرب کی شکل دے دی۔ حقیقت یہ ہے کہ آج کا عرب آج سے بیس کروڑ برس قبل جس مقام پر تھا وہ جگہ آج سمندر ہے۔ یہ مقام موجودہ براعظم افریقہ سے کافی نیچے جا کر تھوڑا سا دائیں طرف تھا۔ یہاں ہند اور عرب ایک ہی زمین تھے۔

ہندومت کا بھولا بسرا ماضی

آج ہندو ایک ایسی قوم کا نام ہے جو اپنے ہی نبی کو بھول چکی ہے۔ وہ "وید" کو خدا کا کلام تو کہتے ہیں لیکن یہ نہیں جانتے کہ انہیں یہ کلام کس رسول کے ذریعے ملا؟

لیکن ہندوؤں کو جس ایک ہستی سے بڑی عقیدت ہے وہ اس شخصیت کو مہانووو (MahaNuvu) کے نام سے یاد کرتے ہیں جو ایک بہت عظیم سیلاب کے بعد ایک کشتی کے ذریعے یہاں اترے جو اپنے سات رشیوں کے ساتھ بچ نکلی تھی۔ ان کے یہاں طوفان نوح کی بہت ساری تفصیلات حیرت انگیز طور پر پائی جاتی ہے۔

مہا (اعظم) نوو (نوح) کا لفظ بدلتے بدلتے مانو اور پھر "منو" ہو گیا۔ پھر "منو" بھی ان کے یہاں کئی شخصیتوں کے لئے بولا جاتا ہے (غالباً عظمت کی علامت بن کر مجازاً

نام دیا گیا اور پھر وہی نام اس کا قائم مقام ہو گیا ہو گا) لیکن یہ لفظ باقاعدہ طور پر ویدوں میں حضرت نوح علیہ السلام کے لئے ۷۵ مقامات پر آیا ہے۔ دیگر میں مثلاً حضرت آدم علیہ السلام کے بارے میں ہے کہ "منو کے بائیں حصے سے شت روپا (یعنی حضرت حوا پیدا ہوئیں)"

(اگر اب بھی نہ جاگے تو، ۴: ۳۴)

پہلے ایک نظر ہندومت کے اصل روپ پر ڈالتے ہیں پھر اس کی تحریف شدہ شکل کا تنقیدی جائزہ لیں گے۔

ہندومت کا اصلی نام

ہندومت کا اصل "ویدی" نام ہندومت نہیں بلکہ اس کے لئے ویدوں میں درج ذیل الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔

۱۔ سناتن دھرم (سدا سے سیدھا چلا آیا ہوا اور قدیم دین)۔۔۔ **یعنی الدین عند اللہ الاسلام**

۲۔ شاشوت دھرم (آسمان سے زمین تک سیدھا چلا آیا ہوا)۔۔۔ **دین قیم**

۳۔ سودھرم (فطرت کا سکھایا ہوا نہ کہ ماں باپ کا سکھایا ہوا)

۴۔ سوبھاو نیت کرم (یعنی دین فطرت)

کیا یہ ویدک نام موجودہ ہندو دھرم کا ہو سکتا ہے؟ یہ صفات ہو بہو اسلام کی ہیں اور اسلام ہی ہر نبی کا دین ہمیشہ سے رہا ہے۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ پچھلوں کی تعلیمات مسخ اور پھر منسوخ ہو گئیں جبکہ آقا ﷺ کا قرآن ناقابل مسخ و نسخ ہے۔

ہندومت میں خدا کا تصور

ہمارے یہاں "الہ" سے لام تعریف لگا کر اللہ بن جاتا ہے اور معین ہو جاتا ہے۔ مختلف مذاہب میں یہی لفظ کسی نہ کسی تبدیل شدہ شکل میں پایا جاتا ہے۔ یہ الله ال۔ الہ کہیں **الوہ، الوهیم، ایل، ایلیاہ، لاہ** وغیرہ شکلوں میں استعمال ہوتا رہا ہے۔ ہندوؤں میں خدا کے (ایشور) کے مختلف ناموں میں سے ایک "الا" ہے جو ال یا ایلیا سے

بنا ہے اس کا معنی پوجا کرنا یا حمد و ثنا کرنا ہے۔ یہ معنی الہ کے مختلف معانی میں سے دو ہیں۔
(اگر اب بھی نہ جاگے تو: ۱۱۵ بحوالہ گیتا اور قرآن پنڈت سندر لال)
یعنی اگر یقین کر لیا جائے کہ ان کے ہاں یعنی "اللہ" ہی کا لفظ خدا کے لئے استعمال ہوتا ہے تو یقیناً بے جا نہ ہوگا۔
ویدک دھرم میں توحید کا تصور تو ہندو ویدانت کا برہم سوتر دیکھ کر ہی واضح ہو جاتا ہے۔
ان کے الفاظ درج ذیل ہیں۔
ایکم' برہم' دوئیتہ' ناستے' نیہہ' نا' ناستے کنچن۔ یعنی "ایک ہی خدا ہے' دوسرا نہیں ہے' نہیں ہے' نہیں ہے' ذرا سا بھی نہیں"
ویدانت ہی میں خدا کی شان ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے۔
"اکلم ایوم ادوئیتم" (وہ ایک ہی ہے دوسرے کی شرکت کے بغیر)
مزید دیکھئے (رگ وید' ۱۰۔ ۱۲۱۔ ۳/ ۱۰' ۱۲۱' ۵/ ۸۔۱۔۱/ ۱/ ۶۔ ۴۵۔۱۶/ ۱۰۔۱۲۱۔۱/ ۲۔۱۔۳/ ۲۔۱۔۴/ ۲۔۱۔۶/ ۲۔۱۔ ۱۱/ ۱۰۔ ۱۱۴۔ ۵/ یجروید۔ ۴۰۔۹ اتھروید ۲۔۲۔۲

(اگر اب بھی نہ جاگے تو: ۱۱۹۔ ۱۲۲)

تصور رسالت

تصور رسالت بھی پرانے دور میں تو پایا جاتا ہے لیکن آج اسی طرح مفقود ہے جس طرح توحید مثلاً شری مد بھاگوت مہاپران (۹۔ ۲۴۔ ۵۶) میں ہے "جب بھی بھلائیاں کم ہو کر گناہ بہت زیادہ بڑھ جاتے ہیں تو "ہری" جو تمام خداؤں کا خدا ہے وہ یقیناً (رہنمائی کے لئے) ایک جان پیدا کرتا ہے۔

(اگر اب بھی نہ جاگے تو: ۱۲۴)

گزشتہ انبیاء کا ذکر

حضرت نوح علیہ السلام کا تذکرہ تو بہت تفصیل سے ہے خاص طور پر طوفان

نوح علیہ السلام دیکھئے فرانسیسی مصنف ڈیوباس (Dubois) کی کتاب
(Hindu Mamars Customs and Ceremonies) لیکن اس کے
علاوہ دیگر انبیاء کا بھی تذکرہ بھی اس میں ملتا ہے۔ مثلاً

حضرت آدم علیہ السلام

برہما اپنے جسم کے دو حصہ کرکے ایک سے مرد اور دوسرے سے عورت ہوا
اور اس طرح بہت سے جانداروں کی تخلیق ہوئی۔
(اگر اب بھی نہ جاگے تو بحوالہ کلیان 'گورکھپور' ہندو سنسکرتی انک جنوری '۱۹۵۰: ۷۹۵)

اس طرح پنڈت وید پرکاش آپادھیائے کی کتاب "ویدوں اور پرانوں کے
آدھار پر دھارک ایکتا کی جیوتی" میں ہے۔ "آدم اور حویہ وتی (حوا) وشنو کی گیلی مٹی
سے پیدا ہوئے۔ پردان نگر (انعامات کی بستی یعنی جنت) کے مشرقی حصہ میں پرمیشور کے
ذریعہ بنایا گیا خوبصورت چار کوس کے رقبے کا بہت بڑا جنگل تھا۔ گناہ والے درخت کے
نیچے جاکر بیوی کو دیکھنے کی بیتابی سے آدم حویہ وتی کے پاس گئے۔ تبھی سانپ کی شکل بنا
کر وہاں فوراً کلی (شیطان) نمودار ہوا۔ اس چالاک دشمن کے ذریعہ آدم اور حویہ وتی
ٹھگ لئے گئے اور وشنو کے حکم کو توڑ ڈالا اور دنیا کا راستہ دکھانے والے پھل کو شوہر
نے کھالیا...... آدم علیہ السلام کی عمر نو سو تیس سال ہوئی۔
(اگر اب بھی نہ جاگے تو: ۱۲۶)

حضرت نوح علیہ السلام

اس سے یتوح (نوح علیہ السلام) پیدا ہوا۔ اس نے پانچ سو سال تک راج
کیا..... ایک بار وشنو نے اسے خوب بتایا کہ اے پیارے یتوح سنو! ساتویں دن حشر برپا
ہوگا تم لوگوں کے ساتھ کشتی میں فوراً بیٹھ جانا اے اندر کے بھگت اپنی جان بچاؤ......
چالیس دن تک زبردست بارش ہوئی "بھارت ورش" پانی میں ڈوب گیا اور چار سمندر
مل گئے اور بیکراں ہو گئے۔ اللہ والا برگزیدہ یتوح اپنے اہل خاندان کے ساتھ طوفان ختم

ہونے پر وہاں رہنے لگا یوح کے بیٹے سام (سام) حام اور یا قوت نام سے مشہور ہوئے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام

اس کے تین بیٹے ابرم (ابراہیم علیہ السلام) نہور اور ہارن اس طرح ملیچھ (یعنی غیر آرین۔ اصل معنی کے اعتبار سے آرین اور غیر آرین کی تقسیم تھی' یعنی سامی اور غیر سامی۔ غیر سامی یا غیر آرین نسل کو ان کی زبان میں ملیچھ کہا جاتا تھا۔ یہ لفظ ناپاک اور کم تر یا گھٹیا تر کے معنی میں بعد کو کہیں جا کر استعمال ہونا شروع ہوا لہٰذا یہاں ہر جگہ ملیچھ سے مراد ناپاک یا گھٹیا نہیں بلکہ غیر آرین یا غیر سامی (Non-Smatic) نسل ہے) نسل کے سردار ہوں گے۔

(اگر اب بھی نہ جاگے تو: ۷-۱۲۵)

یہ اشلوک بھوشیہ پران کے پرن سگ پرو کے گھنڈ نمبر ا اور ادھیائے نمبر ۴ سے لئے گئے ہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے کوہ ہمالیہ سے آگے بلکہ کشمیر تک آنے کا ذکر پایا جاتا ہے۔

"ایک مرتبہ شکادیش ہم تنگ (ہمالیہ) سے آگے ہوڑ دیش گئے۔ وہاں پہاڑوں کے درمیان اس راجا نے سفید پوش گورے رنگت والے معزز شخص کو دیکھا۔ خوش ہو کر پوچھا آپ کون ہیں؟ انہوں نے کہا میں عیشی (عیسیٰ) ہوں۔ کنواری ماں سے پیدا ہوا ہوں۔ میں سچائی کی تعلیم دینے والے ملیچھ (غیر آریہ / غیر سامی) دھرم کی تعلیم دیتا ہوں۔ یہ سن کر راجا نے پوچھا دھرم کے بارے میں آپ کے کیا خیالات ہیں؟ یہ سن کر مسی (مسیح علیہ السلام) بولے "سچائی کے زوال پذیر ہونے اور ملیچھ دیش کے حقانیت سے دور ہو جانے پر میں مسی (مسیح علیہ السلام) یہاں آیا ہوں ..... اے راجا! میرے ذریعے ملیچھوں کے قائم کیے ہوئے دین کی باتیں سنو..... اس لئے عیشی مسی (عیسیٰ مسیح) میرا نام

ہے۔

(اگر اب بھی نہ جاگے تو:۵۸بحوالہ بھوشیہ پران)

الغرض یہ قوم کہ جن کا نام ہندو' اصل مذہب سناتن دھرم' شاشوت دھرم یا سود دھرم ہے' شاید حضرت نوح علیہ السلام کی قوم ہوں۔ ان کے ویدوں میں حضرت نوح علیہ السلام کی بابت تفاصیل ملتی ہیں جبکہ ان کے عقائد حقیقیہ' اصلیہ' ابتدائیہ میں اللہ کی توحید کے ساتھ رسالت اور رسل عظام علیہم السلام کا نہایت واضح تصور موجود ہے۔ صرف یہی کچھ نہیں بلکہ انکی کتب میں خود آقائے دوجہاں ﷺ کا تذکرہ مبارک درجنوں مقامات موجود پر ہے' ان میں سے بہت سے مقامات پر کعبہ والے شہر مکہ کے ساتھ تعلق اور وہاں آپ ﷺ کی پیدائش کا ذکر ہے۔ کئی مقامات پر آپ کی حقیقت احمدیہ ﷺ کا بیان ہے۔ بعض مقامات پر تو باقاعدہ آپ کے نام نامی اسم گرامی یعنی محمد ﷺ کے ساتھ ذکر ہے۔ جبکہ کثیر مقامات ایسے ہیں جہاں آپ کے اسم پاک کا ترجمہ کر دیا گیا ہے۔ ہم ان میں سے بعض مقامات کا آخر میں ذکر کریں گے۔

آسمانی کتب کا تصور

ہندوؤں کی مذہبی کتب درج ذیل ہیں۔

۱۔ پران　۲۔ براہمن　۳۔ اپنشد　۴۔ آرنیک　۵۔ وید

ان کتابوں میں سے اول چار کو تفسیر و تشریح کا درجہ حاصل ہے۔ جبکہ ان کا ایک لفظ بھی خدا کی طرف منسوب نہیں جبکہ آخر الذکر خالص خدا کا کلام ہے اور کوئی شخص اس میں ردو بدل نہیں کر سکتا۔ یہ بات "کلیان پدم پران انک" میں اس طرح کہی گئی ہے۔

"خدا کے اپنے الفاظ کو کوئی بولنے والا ویسے ہی مطلب والے دوسرے الفاظ سے بدل نہیں سکتا۔ اگر بدلے تو اسے خدا کے الفاظ نہیں کہا جائے گا۔ اس قاعدے کے مطابق وید کے الفاظ خدا کے الفاظ ہی ہیں .... صرف یہی نہیں بلکہ جملے میں ان الفاظ کی

ترتیب بھی نہیں بدلی جاسکتی"۔

(اگر اب بھی نہ جاگے تو: ۹۴ بحوالہ. کلیان پدم پران انک اکتوبر ۱۹۴۴: ۳)

یہ کلمات واضح الفاظ اور صریح طریق پر بیان کرتے ہیں کہ ہندوؤں کے مذہب یا بالفاظ دگر ویدک دھرم یا سناتن دھرم میں خدا کے کلام اور آسمانی کتابوں کا تصور موجود ہے۔ یہی نہیں کہ اس تصور کا وجود پایا جاتا ہے بلکہ یہاں تک کہ اصل اور ترجے نیز متن اور شرح میں باقاعدہ فرق کیا جاتا ہے اور لفظ تو لفظ رہے یعنی ان کا بدل دینا تو دور کی بات ہے صرف جملے میں ان کی ترتیب کو بدل دینے سے بھی کلام انسانی تصرف کہلائے گا خدا کا کلام نہیں رہے گا۔ کجا یہ کہ ترجمہ کو کلام حق تعالیٰ قرار دے دیا جائے۔ اس جہت میں یہ تصور اسلام کے سب سے قریب بلکہ ایک طرح سے بعینہ وہی تصور ہے جو اسلام میں ہے۔ یہ تصور کلام الٰہی کے کسی بھی موجودہ مذہبی تصور سے نمایاں طور پر ممتاز ہے اور کسی بھی تصور کے بہ نسبت اسلام کے اقرب ہے۔

ملائکہ کا تصور

ملائکہ کا تصور بھی ان لوگوں میں موجود ہے لیکن مقدس ہستیوں یعنی دیوتاؤں یا دیویوں کی شکل میں۔ یہی تقدس اور ماورائی طاقت کی حامل ہستی کا تصور بعد ازاں چھوٹے خداؤں میں بدل گیا۔ رگ وید کے دسویں کھنڈ کے ادھیائے ۱۲۱ میں اشوک ۲ میں ہے۔

"ایشور ہی روحانی اور جسمانی طاقتیں عطا کرنے والا ہے اور اسی کی عبادت تمام دیوتا (فرشتے) کیا کرتے ہیں... اس ایشور کو چھوڑ کر تم کس دیوتا کی عبادت کر رہے ہو؟"

غرض کہ توحید' رسالت اور کتب سماویہ کی طرح ملائکہ کا تصور بھی کسی نہ کسی رنگ میں ان کے ہاں پایا جاتا تھا۔

آخرت کا تصور

ہم نے ایران اور روم کے ذیل میں دیکھا کہ انہوں نے عقیدہ آخرت کو مسخ

کر دیا تھا اور اس کی صورت بدل دی تھی۔ یہ بات ہے بھی اہم کہ آخرت کا عقیدہ امم سابقہ میں سے ہر ہر امت نے بہت زیادہ مسخ کر دیا تھا۔ یہ وہ واحد عقیدہ تھا جس کے ساتھ بد ترین طریق پر دو دو ہاتھ کئے گئے تھے۔ یہ وہ مظلوم عقیدہ تھا کہ جس نے اور کسی عقیدے کو کبھی نہیں چھیڑا۔ ہندو مذہب کے پیروکار بھی اسی قبیل کے ہیں لیکن ان کی اصل کتاب یعنی ویدوں میں کوئی خاص قابل ذکر تبدیلی متعارف نہیں کرائی گئی۔ اس کی بابت چند نکات ہم آئندہ سطور میں بیان کریں گے۔ اصل ہندو عقیدے میں جو تصورات ابھی تک محدود و محفوظ ہیں وہ درج ذیل ہیں۔

۱۔ سورگ۔ جنت

۲۔ نرک۔ جہنم

۳۔ پرلوک۔ دوسری دنیا۔ آخرت

۴۔ یم دوت۔ موت کا فرشتہ

۵۔ پنرجنم۔ دوسری زندگی یعنی بار بار زندگی نہیں۔

یہ تصورات خود آواگان / بار بار موت اور اسی دنیا میں بار بار زندہ ہونا کی نفی کرتے ہیں۔ ان میں موت کے ساتھ صرف ایک اور زندگی کو تسلیم کیا گیا ہے اور وہ بھی دوسری دنیا کی نہ کہ اس دنیا کی۔ رہی یہ بات کہ دوسری دنیا سے کیا مراد ہے تو آیئے دیکھتے ہیں۔

دوسری دنیا

دوسری دنیا سے صرف جنت اور دوزخ کے دو تصورات کو واضح کیا گیا ہے۔

تصور جنت

جنت کی بابت ویدوں میں درج ذیل بیانات ملتے ہیں۔

۱۔ تم وہاں اپنی صداقت کی مدد سے اس مقام کو دیکھنا جو انتہائی وسیع النظر ہے۔ اس میں جنت کی وسعت کا بیان ہے۔ (رگ وید۔۱۔۲۱۔۶)

۲۔ جو علم رکھتے ہیں وہ دوسروں سے پہلے زندگی عطا کرنے والی سانس لے کر اس جسم سے نکل کر آسمان میں پہنچ کر اپنے تمام ساتھیوں کے ساتھ رہتے ہیں۔ جن راستوں سے دیوتاؤں (فرشتوں) نے سفر کیا تھا ان سے گزرتے ہوئے جنت میں پہنچ جاتے ہیں۔ (اتھروید۔ ۲۔ ۳۴۔ ۵)

اس میں جنت کے بارے میں درج ذیل باتیں واضح ہیں۔

۱۔ جنت آسمانوں میں ہے۔

۲۔ اس تک پہنچنے کے لئے فرشتوں کا راستہ اختیار کرنا پڑتا ہے یعنی فرشتے آسمانی اور جنتی مخلوق ہیں۔

۳۔ موت کے وقت روح جسم سے نکل کر دوسری زندگی میں داخل ہوتی ہے جو اس دنیا میں نہیں بلکہ آسمانی دنیا میں ہے۔

۴۔ نیک لوگوں کی وہاں اپنے ساتھیوں سے ملاقات اور سنگت رہتی ہے۔

۵۔ اس مقام کا نام جنت ہی ہے جو دنیا آسمانی ہے زمینی نہیں۔

۶۔ شہد کے کناروں اور مکھن سے بنی نہریں جو شراب' دودھ' دہی اور پانی سے لبریز ہوں گی۔ بے پناہ شیرینی ان سے ابلی پڑتی ہو گی۔ یہ چشمے جنت کی دنیا میں تجھ تک پہنچیں گے۔ (اتھروید' ۴۔ ۳۴۔ ۲)

اس میں جنت کی صفات اور بعض احوال کا بیان ہے۔ یہ یقیناً اس دنیا کی بات نہیں اور اوپر کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دنیا موت کے فوراً بعد کی ہے۔

یہ چند اقتباسات بڑی وضاحت سے جنت کا احوال بیان کرتے ہیں۔ غور سے دیکھئے کہیں ان میں رتی برابر بھی شائبہ ہوتا ہے کہ یہ موجودہ ہندو ذہن کے کسی گوشے سے نکل کر نوک قلم سے پھسل پڑے ہیں۔ لیکن یہ بھی ایک زندہ حقیقت ہے کہ یہ نظریات اور جنت کا یہ تصور اصل ہندوانہ آسمانی کتابوں میں جوں کا توں موجود ہے۔

تصور دوزخ

تصور دوزخ کچھ اس طرح واضح ہوتا ہے۔

۱۔ جو گنہگار ہیں ان کے لئے یہ اتھاہ گہرائی والا مقام وجود میں آیا ہے۔
یہ جہنم کے بارے میں صریح الفاظ ہیں (رگ وید '۴۔ ۵۔ ۵)

۲۔ یہاں اس کے جسم کو بھڑکتی لکڑیوں کے بیچ ڈال کر جلایا جاتا ہے۔ کہیں خود اور کہیں دوسروں کے ذریعے کاٹ کاٹ کر اسے اپنا ہی گوشت کھلایا جاتا ہے۔
(شری مدبھاگوت پران '۳۔ ۳۰۔ ۲۵)

۳۔ موت کی دنیا کے کتوں یا گدھوں کے ذریعے جیتے جی اس کی آنتیں کھینچی جاتی ہیں۔ سانپ بچھو وغیرہ ڈسنے والے اور ڈنک مارنے والے جانداروں سے اذیت پہنچائی جاتی ہے۔ (شری مدبھاگوت پران: ۳-۳۰-۲۶)

۴۔ جسم کو کاٹ کاٹ کر ٹکڑے ٹکڑے کیا جاتا ہے۔ اسے ہاتھیوں سے چروایا جاتا ہے۔ پہاڑ کی چوٹیوں سے گرایا جاتا ہے یا پانی یا گڑھے میں ڈال کر بند کر دیا جاتا ہے۔ یہ سب سزائیں اور اسی طرح کی اندھ تمس اور رو رو نامی دوزخوں کی اور بھی بہت سی عقوبتیں عورت ہو یا مرد اس روح کو زندگی میں ہونے والے گناہ کے باعث بھگتنا ہی پڑتی ہیں۔ (شری مدبھاگوت پران: ۳-۳۰-۲۷ '۲۸)

غور کیجئے کہ اس قدر تحریف شدہ ہونے کے باوجود ابھی اصل کی کچھ نہ کچھ رمق کسی حد تک باقی ہے۔ کہیں آواگون کی کوئی ہلکی سی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے؟ ہرگز ہرگز نہیں بلکہ نہ صرف یہ کہ دوزخ کی سزاؤں کا بیان ہے جو کہ دوزخ کے وجود پر واضح دلیل ہے بلکہ نمبر ۳ میں دیکھئے "موت کی دنیا کے...." یعنی موت کے بعد جو دنیا ہے وہ اس دنیا سے مختلف ہے اور گنہگاروں کے لئے مندرجہ سزاؤں سے بھرپور ہے جہاں سے واپسی کا کوئی راستہ نہیں (معاذ اللہ) جبکہ ایسی ہی کیفیت پیچھے جنت کے بیان میں گزر چکی ہے کہ وہاں سے بھی واپسی کا کوئی تصور نہیں اور موت کے بعد اس دنیا کی زندگی کا کوئی تصور نہیں۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے۔ "اگر اب بھی نہ جاگے تو: ۱۳۵۔ ۱۴۱"

اب اس موقع کی سب سے دلچسپ گفتگو کا مرحلہ آتا ہے۔ یعنی ویدوں میں

"حضور نبی اکرم ﷺ کا ذکر مبارک" اس مقام پر ہم ہندو دھرم کی ابتدائی حالت کو مکمل کریں گے۔

ویدک دھرم میں ذکر مصطفیٰ ﷺ

ویدک دھرم میں آقائے دوجہاں ﷺ کا تذکرہ مبارک تین ادوار میں منقسم ہے۔

۱۔ خلق اول اور اولین نبی اور رسول کے طور پر۔ بنام احمد۔ اسے کہیں "ایمد" (Amid) کہیں "رحمت" کہیں "امیت" (Emeth) اور کہیں "ایتابھ" کر دیا گیا ہے۔ یہ نام بالخصوص حقیقت محمدیہ ﷺ اور نور احمد ﷺ پر دلالت کرتا ہے۔ نیز بعض مقامات پر آپ کی حقیقت مقدسہ کے لئے "اگنی" کا لفظ بھی مستعمل ہے۔ یہ لفظ بالخصوص آپ ﷺ کے خلق اول اور عبد اول ہونے پر دلالت کرتا ہے۔

۲۔ اس حیات ظاہریہ میں یہ لفظ بطور ظہور بشری کے آپ کا ذکر مبارک کہیں لفظ محمد ﷺ کے ساتھ ہے جسے بعض اوقات "موہ مد" کر دیا گیا ہے تو کہیں نراشنس کا لفظ آیا ہے جس کا عین متبادل لفظ کہ عین اسی معنی پر دال ہے "محمد ﷺ" ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے بائبل میں فارقلیط (Paraclete) آیا ہے اور کہیں تو آپ ﷺ کا ذکر مبارک "مہروالاعرب کا پیغمبر" کے الفاظ سے بھی آیا ہے۔ نیز بعض مقامات پر یہ ذکر لفظ "رام" سے بھی آیا ہے۔ مثلاً "رام رام ست" ہیں۔

۳۔ ایک ذکر بطور "ماتریشوا" بھی ہوا ہے۔ اسی طرح بطور "جل" کے بھی ذکر مبارک ملتا ہے۔ ان کلمات کا مدلول "خالص روحانیت" ہے۔ لیکن یہ بھی یاد رہے کہ یہ ذکر بطور ظہور ثالث ہے۔ جو غالباً گزشتہ دونوں مرحلوں کے بعد --- اس مقام پر ---- کے ظہور یعنی قیامت کے مقام محمود کی طرف اشارہ ہے کیونکہ اس میں نفع بخشی اور حضور ﷺ کی تعریف کرنے کا ذکر بھی ملتا ہے۔ جس کی پوری دلالت شفاعت کبریٰ اور محمودیت دونوں پر صادق بھی آتی ہے۔

حقیقت محمدیہ ﷺ اور نور احمدی ﷺ

یجروید (۳۱۔ ۱۸) میں ہے "وہ تمام علوم کا سرچشمہ "احمد" عظیم ترین شخصیت ہے۔" یہ روشن سورج کے مانند اندھیروں کو دور بھگانے والا ہے۔ اس سراج منیر کو جان لینے کے بعد ہی اندھیروں کو جیتا جا سکتا ہے۔ نجات کا اور کوئی راستہ نہیں۔

رگ وید (۸۔ ٦۔ ۱۰۷۹) میں ہے "احمد ﷺ نے سب سے پہلے قربانی دی اور سورج جیسا ہو گیا۔"

ترجموں میں بعض جگہ غلطیاں ہوتی رہتی ہیں مثلاً احمت، بمقام احمد کے کیا گیا کیونکہ سنسکرت میں اکثر "د" کی جگہ "ت" آ جایا کرتی ہے۔ لیکن اس "ت" کو لا کر ایک اور تحریف یہ کی جاتی ہے کہ "احم" اور "ت" کو اول جدا کیا جاتا ہے پھر دو جدا لفظ "اہم" اور "ات" بنا دیا جاتا ہے جس سے ترجمہ کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے کیونکہ "اہم" کے معنی ہیں "میں" اور "ات" کے معنی ہے "اس"

بدھ مت میں بھی اس کا ہلکا سا اثر پایا جاتا ہے۔ "بدھا" پیغمبر کا قریب معنی دیتا ہے۔ پیغمبر کے معنی میں بھی مستعمل ہے جبکہ جاپان میں "پہلے بدھا" یعنی اولین پیغمبر (جسے سب سے پہلے نبی بنایا گیا تھا) "امیتابھ" بتایا جاتا ہے۔ جبکہ اسی کو وہاں "**ایمد**" (Amid) بھی کہا جاتا ہے۔ جو ظاہر ہے کہ احمد ہی ہے (ﷺ) نیز امیتابھ دو لفظوں کا مجموعہ ہے "امیت" (د کو ت کرنا ان کی زبان سنسکرت میں روا ہے) اور "آبھا" "امیت" "**ایمد**" یا "احمدؐ" تو واضح ہے جبکہ "آبھا" نور کو کہتے ہیں۔ "امیتابھ" کا معنی ہے نور احمد ﷺ یعنی اولین پیغمبر نور احمد اور حقیقت محمدیہ ﷺ ہے۔

(اگر اب بھی نہ جاگے تو: ۱۰۰۔ ۱۰۱)

(Gospels of Buddha- by Carus .p :217)

Rocovery of Faith By Dr. Rodha Karishnon, P :154 (50)-

اسی طرح ایک لفظ "اگنی" بھی استعمال ہوتا ہے یہ لفظ اصل میں "اگرنی"

سے بنا ہے۔ جس کا معنی ہے سب سے پہلا اسی بناء پر یہ لفظ بطور **الاول المطلق "اللہ"** کے لئے ہے۔ جبکہ بطور اول خلق اور اول عبد آقائے دوجہاں ﷺ کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اس مقام پر ہم دوسرے معنی کے حوالے سے دیکھتے ہیں۔ (رگ وید '۱۔ ۱۲۔ ۱۱ میں ہے۔

ہم "اگنی" کو پیغمبر چنتے ہیں۔ یعنی نور احمد' حقیقت محمدیہ اور خلق اول کو اسی کیفیت میں بھی درجہ رسالت اور فریضہ نبوت عطا فرماتے ہیں۔ اسی طرح اسی رگ وید (۱۔ ۳۱۔ ۱۵) میں ہے۔

"اگنی وہ انسان (ہے) جو عبادت گزاروں سے خوش ہوتا ہے"

یہ حقیقت محمدیہ ﷺ ایک راز ہے جو ہر کسی کی سمجھ میں نہیں آتا۔ ہندو بھی نہیں سمجھے لیکن انہیں ویدوں میں جہاں اس نور پاک کا ذکر ملتا ہے اس بات کا بھی تذکرہ ملتا ہے کہ اس راز کی حقیقت کو کون لوگ انفشاء کریں گے (رگ وید '۱۰۔ ۷۱۔ ۱۳ میں ہے۔

"اس راز کو **راسخین فی العلم** " تلاش کریں گے۔ اسی میں (۳۔ ۲۹۔ ۵) میں درج ہے۔

"تحقیق سے ہی اگنی کا راز کھلے گا۔ اسی پر تمہاری فلاح کا دار و مدار ہے اور اس راز کو کھلنے کے بعد تم امام عالم بنو گے۔"

پھر رگ وید ہی میں (۵۔ ۷۔ ۳۔ ۳) میں یوں بھی آیا ہے کہ

"ریگستانی امت کے لوگ (مراد ظاہر ہے کہ مسلمان ہیں) اس راز کو تلاش کریں گے۔

ایک مقام پر یہ بھی ہے۔

"سب سے بعد والی مشعل (قرآن مجید) کو سب سے پہلے والی مشعل (وید) کے اوپر رکھنا پڑے گا۔ تبھی اگنی کا راز کھلے گا"۔ (رگ وید '۳۔ ۲۹۔ ۳)

یعنی واضح لفظ ہے کہ وید کو قرآن مجید کی روشنی میں نہ پڑھا جائے تو اس کی تمثیلات گمراہ بھی کریں گے اور الجھنیں بھی پیدا ہوں گی لیکن ایسا کر لیا جائے تو حقائق سے پردہ اٹھ جائے گا' تفصیل کے لئے دیکھیں۔ (اگر اب بھی نہ جاگے تو: ۱۱۱۔ ۱۱۳)

ظہور بشری کا بیان

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بابت "بھوشیہ پران کے پرتی سگ برد" کے ایک مقام پر اشلوک اس طرح ہیں۔

"اسی دوران اپنے پیروؤں کے ساتھ محامد (محمد ﷺ) نام کے مقدس ملیچھ (غیر آریہ' غیر سامی یا ابراہیمی نسل سے) وہاں آئیں گے......

راجہ بھوج ان سے کہے گا۔ "اے ریگستان کے باشندے' شیطان کو شکست دینے والے' معجزوں کے مالک' برائیوں سے پاک و صاف' برحق' باخبر اور خدا کے عشق و معرفت کی تصویر! تمہیں نمسکار ہے"۔

(تیر گھنڈ' تیسرا ادھیائے اشلوک' ۵۔۱۶)

اس میں اسم پاک کی صراحت بھی ہے سوائے اس کے کہ تلفظ محمد کی بجائے محامد ﷺ ہو گیا ہے۔ آقائے نامدار ﷺ کی سیرت پاک کے بھی کچھ اجزا کا بیان ہے۔ مثلاً

"رات میں کوئی خدا کا قاصد راجا بھوج کے پاس آ کر بتلائے گا کہ ختنہ کرانے والا' چوٹی نہ رکھنے والا' داڑھی رکھنے والا' پاک جانوروں کو غذا بنانے والا خدا کا مقرب بندہ ہے۔"

شری مد بھاگوت۔ مہاتم پران میں (۲۔۷۶) کو دیکھیں لکھا ہے۔ (یہ تحریف کی کوشش کے بعد ہے)

"اگیان ہتیو کرت "موح مد" اندھکار ناشم ودھایم ہی تدو دیتے ویو یکہ"

(جب بے شمار ادوار حیات میں اجتماعی خیر کے طلوع ہونے سے انسان کو حق کا فیضان حاصل ہونے والا ہو تب موح مد (محمد ﷺ) کے ذریعہ تاریکیوں کا خاتمہ ہو کر فہم و حکمت کا نور طلوع ہو گا)

اس میں "موح مد" اصل میں محمد ﷺ تھا لیکن موح (لالچ) اور مد (شراب) کو جدا کر

دیا گیا تاکہ نیا معنی پیدا ہو سکے۔ پھر ترجمہ "لالچ اور شراب کے ذریعے تاریکیوں کے خاتمہ" کو "لالچ اور شراب کی تاریکیاں" کر دیا گیا۔ لیکن غالباً اصل میں لفظ "کے ذریعے" نے حقیقت کھول دی۔

"رام" کا لفظ

ویدوں میں حضور ﷺ کے لئے رام کا لفظ بھی بولا گیا ہے۔ یعنی "تین ظہور والی ہستی" کیونکہ رام کا معنی "تین عدد" بھی ہے۔

۱۔ پہلا ظہور مرتبہ حقیقت محمدیہ ﷺ پر ہوا تھا۔ خلق اول بنے۔

۲۔ دوسرا ظہور عالم ارواح میں مرتبہ نبوت و حقیقت نبوت پر ہوا تھا جب انبیاء پر ظہور فرمایا۔

۳۔ تیسرا ظہور مرتبہ بشریت پر ہوا جب محمد ﷺ نام رکھا گیا۔ حضور نبی اکرم ﷺ کے لئے تیسرے درجے پر ظہور کی بنا پر خاص طور پر مکہ کے ساتھ آپ کا تعلق بیان کیا گیا ہے۔ (رگ وید: ۱۰-۹۳-۴) میں لکھا ہے کہ

"(میں) اس ناقابل شکست رشی (روحانی بزرگ) ناف زمین مکہ کے سپوت، روحانی شخصیت "رام" کا بیان کروں۔"

اس میں رام کسے کہا گیا ہے؟ یہ امر محتاج بیان نہیں رہا۔

اس "رام" کی پیدائش کی جگہ کا نام "ایودھیا" (یعنی وہ جگہ جہاں جنگ نہ ہو) بتایا گیا ہے جو حرم مکی کا نام ہے کیونکہ وہی ایسا مقام ہے جہاں قتال حرام ہے اور ہمیشہ سے حرام ہی رہا ہے۔

ان سے سیتا کو منسوب کیا گیا جس کا معنی ہے "راجا کی نجی زمین" مراد اس سے بیت اللہ یا کعبۃ اللہ ہے اور بالکل بلاتصریف الی المجاز واضح ہے۔ پھر مکہ کو قرآن نے "بستیوں کی ماں" اور بائبل نے عورت (Woman) لکھا ہے۔

(مکاشفات یوحنا، ۱۷:۱۸) (رگ وید: ۴-۵۷-۶، ۷)

رام چر ترمانس میں ہے کہ بھگوان نے خود سیتا کو "رام" کے حوالے کیا تھا۔ یہ بھی واضح ہے کہ خدا نے مکہ اپنے حبیب ﷺ کے حوالے کر دیا ہے۔ لیکن یار لوگوں نے اسے بھی افسانہ بنا کر رکھ دیا اور "رام چندر جی" کے نام سے "سیتا" کو اس کی بیوی فرض کر کے ایک ماورائی کہانی گھڑ لی گئی جس کا نام اصل میں رکھا گیا تھا "رامائن" (رام آین) یعنی (رام کا آنا یا رام کا گھر) مگر رام چندر جی کی نئی کہانی گھڑ لی گئی اور رامائن اس کا نام پڑ گیا۔

اسی طرح کعبہ کے کفار مکہ اور مشرکین کے قبضے میں چلے جانے کو "سیتا کے اغوا" سے تعبیر کیا گیا (سیتا کا معنی ہے کعبہ) جسے ان سے ہنو مان یا ہنی مان (یعنی باطل کو نقصان پہنچانے والی مقدس ہستی) نے آزاد کروانا تھا۔ لیکن فتح مکہ کے اس قصے کو سیتا کے اغوا اور یرغمالی سے شروع کر کے ہنو مان جی کو ایک بندر کی شکل میں سامنے لایا گیا۔

اسی طرح آقا علیہ الصلوۃ والسلام کے بعد نیک اور متقی لوگ آپ ﷺ کے خلیفہ ہوئے اسی بناء پر نیک لوگوں کو آپ کا بھائی بنایا گیا۔ سنسکرت میں "بھرت" نیک لوگوں کو کہتے ہیں جن سے مراد خلفاء راشدین اور بالخصوص سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہیں لیکن "بھرت جی" رامائن نامی کہانی میں رام جی کے بھائی بن کر فٹ ہو گئے۔ نیز رام چر تر مانس میں یہ بات بھی بتائی گئی ہے کہ جس نے "اگنی یعنی احمد ﷺ" کو بنایا، تخلیق کیا وہی ہنو مان جی (ہنن۔ محمد ﷺ) کو بھی بھیجنے والا ہے۔ یعنی جسے اولاً تخلیق کیا گیا اسے آخری نبی و پیغمبر (دوت) بنا کر بھیجا جانا مذکور تھا مگر مستقبل میں رونما ہونے والے واقعہ کو ماضی کا افسانہ فرض کر کے ایک ماورائی تفصیل گھڑ لی گئی جس کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں بلکہ حقیقت اس میں چھپ گئی۔

ایک روایت

رام سے متعلق ایک عام روایت چلی آ رہی ہے، کہا جاتا ہے "رام رام ست" یہ اس وقت کہا جاتا ہے جب موت کے بعد ارتھی اٹھائی جاتی ہے۔ ہندو کبھی

"رام ست" نہیں کہتے۔ بلکہ "رام رام ست" ہی کہتے ہیں جس کا معنی ہے رام کا رام (احمد ﷺ کا خدا) ست ہے۔

اسی طرح رام جی کا تارک منتر (نجات والا منتر) اس طرح ہے۔ "رام۔ رامائے نم" یعنی رام کے رام کی عبادت کرو یعنی انہیں حکم ہے کہ محمد ﷺ کے خدا کی عبادت کرو۔

اسی طرح شری کرشن جی مہاراج کا معاملہ ہے ..... یہ سب آخر مہابھارت والی جنگ پر منتج ہوتا ہے جو کہ ہمیں غزوات ہند کے نام سے احادیث میں معلوم ہیں (اگر اب بھی نہ جاگے تو: ۱۵۹۔ ۱۷۵)

ہجرت اور فتح مکہ کا ذکر

اتھرویدا (۲۰۔ ۱۲۷۔ ۱۔ ۲۱۳) میں ہے۔

اے لوگو سنو! نراشنس (محمد ﷺ) کو لوگوں کے درمیان مبعوث کیا جائے گا۔ اس مہاجر کو ہم ساٹھ (۶۰) ہزار اور نوے (۹۰) دشمنوں سے اپنی پناہ میں لے لیں گے۔ اس کی سواری اونٹ ہوگی جس کے ساتھ بیس (۲۰) اونٹنیاں ہوں گی۔ جس کی عظمت آسمانوں کو بھی جھکا دے گی۔ اس رشی کو سو دینار، دس مالائیں، تین سو گھوڑے اور دس ہزار گائیں عطا کی گئیں ہیں۔ (اگر اب بھی نہ جاگے تو: ۱۳۲)

اس میں تمثیلی انداز میں درج ذیل حقائق کو واضح کیا گیا ہے لیکن اس سے قبل بعثت اور ہجرت کا تذکرہ ہے۔

(۱) ۱۰۰ دینار سے مراد اصحاب صفہ میں سے ۱۰۰ ہیں (حاملین کمالات علمیہ و روحانیہ)
(۲) ۱۰ مالائیں (عشرہ مبشرہ)
(۳) ۳۰۰ گھوڑے (شرکاء غزوہ بدر: ۳۱۳)
(۴) ۱۰.۰۰۰ گائیں (فتح مکہ کے وقت کے سپاہی صحابہ)۔ دس ہزار

یوں تو یہ ایک طویل کتاب کا موضوع ہے لیکن اس مقام پر ہم ایک اور بیان

پر اکتفا کریں گے۔

مہر نبوت والا پیغمبر ﷺ

مہر نبوت شریف کا تذکرہ بھی ویدوں میں ملتا ہے۔ رگ وید (۱۔ ۱۲۳۔ ۱) میں آخری رسول ﷺ کی نشانی بیان کی گئی ہے کہ:

"سمہ راد وت عربن" (اگر اب بھی نہ جاگے تو: ۱۳۳)

ان کی تشریح محتاج بیان نہیں ہے۔ سہ کا معنی ہے ساتھ "مدرا" کا معنی ہے "مہر" دوت کا معنی ہے رسول یعنی بھیجا ہوا اور عربن کا معنی ہے ملک عرب۔ معنی واضح ہو گیا کہ "ملک عرب کے مہر والے رسول ﷺ" یا یوں کہ "مہر کے ساتھ ملک عرب کے رسول ﷺ"

مقام محمود

اس مقام پر ہم ہندومت کے قدیم اور حقیقی روپ یعنی اصل سناتن دھرم کی وہ چند باتیں رقم کریں گے جو اس دور میں بھی کسی نہ کسی شکل میں مسلسل چلی آ رہی ہیں۔ یہ ایک ہلکی سی جھلک آج تک کی ہونے والی دست برد اور تحریفات سے محفوظ رہی ہے۔ اس کی آخری کڑی جو ہم اس وقت بیان کر رہے ہیں وہ آقائے دو جہاں ﷺ کے مقام محمود کی طرف اشارہ ہے۔ صراحت اگرچہ نہیں ہے لیکن انداز بتلا رہا ہے کہ مراد مقام محمود ہی ہے۔ (رگ وید' ۳۔ ۲۹۔ ۱۱) میں ہے۔

"جس اگنی (اول خلق اور اول عبد) کا تمام وسیع و لامتناہی روپ کبھی ختم نہیں ہوتا اسے بغیر جسم والی روح کہتے ہیں۔ (یہ مقام حقیقت محمدیہ ﷺ کا ہے) جب وہ پیکر جسمانی میں ہوتے ہیں تو تب آسر (سب سے بعد میں آنے والا۔ نبی آخر الزمان ﷺ) اور نراشنس (محمد ﷺ) کہلاتے ہیں (یہ بشری حیات کا ذکر ہے جس کے بعد اخروی حیات رہ جاتی ہے) اور جب کائنات کو منور کرتے ہیں تو "ماتریشوا" ہوتے ہیں اس وقت وہ ہوا کی طرح (روحانی) ہوتے ہیں"۔

رگ وید ہی میں (۱۰-۴۵-۱) میں ہے۔

"اگنی (خلق اول اور عبد اول) کا پہلا ظہور سورگ (جنت کی دنیا) میں بجلی (نور) کی شکل میں ہوا' ان کا دوسرا ظہور ہم انسانوں کے درمیان ہوا۔ تب وہ جات وید (پیدا ہوتے ہی علم رکھنے والا) یعنی امی کہلائے۔ ان کا تیسرا ظہور جل (ویدوں میں جل روحانیت کی علامت ہے) میں ہوا"۔

(اگر اب بھی نہ جاگے تو: ۱۷۶، ۱۷۷)

ان دونوں عبارتوں کا سیاق و سباق واضح کر رہا ہے کہ اگر ایک ظہور عالم ارواح میں دوسرا اس دنیا میں ہوا تو یقیناً تیسرا جہان اخروی میں ہو گا۔ اب یا تو یہ جنت کا مقام وسیلہ ہے یا قیامت کا مقام محمود۔

زمانہ ہجرت اور ہندوستان کی مذہبی حالت

ہجرت مدینہ کے وقت ہندوستان میں ذہنی پسماندگی' مذہبی اجارہ داری کے روپ میں فرد کی زندگی میں زہر گھول رہی تھی۔ کئی نیم خود مختار ریاستوں پر مشتمل یہ خطہ زمین سیاسی' معاشی' سماجی' اخلاقی اور مذہبی انحطاط کا شکار تھا۔ حرف زوال ہر شعبہ زندگی کا مقدر بن چکا تھا۔ جغرافیائی حد بندیاں بھی ٹوٹ پھوٹ رہی تھیں۔ سیاسی حوالے سے برصغیر ان گنت چھوٹی چھوٹی اکائیوں میں بٹا ہوا تھا۔ ہندومت اور سناتن دھرم کی اصل تو ہم نے پہلے بیان کر دی ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ کئی صدیاں گزر جانے کے بعد اس میں تبدیلیاں بھی بہت لائی گئی ہیں بلکہ اسے اس حالت کو پہنچا دیا گیا ہے کہ اس میں مذہب کے اصل تصورات کہیں ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتے۔ اس مقام پر اولاً تین بنیادی تصورات مذہبیہ کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ یعنی تصور خدا' تصور رسالت اور تصور آخرت۔ اس کے بعد ہندوستان کی مذہبی کتابوں کا جائزہ لے کر ہجرت مدینہ کے وقت ہندوستان کی مذہبی حالت پر نظر ڈالی جائے گی۔

خدا کیلئے رام یا اگنی کے الفاظ

ہندوستان میں تہذیب انسانی کے آغاز کے وقت ایک خدا کا تصور موجود تھا البتہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بوجوہ اس بنیادی تصور کی ہیئت بدلتی رہی۔ خدا کے لئے اگنی یا رام کے الفاظ استعمال ہونے لگے اور ایک اللہ کا تصور آہستہ آہستہ پس منظر میں چلا گیا۔ یہ کلمات ایک سے زیادہ اطلاقات رکھتے تھے۔ یعنی خدا کے نام بھی تھے اور بعض مخلوقات کے اسماء بھی یہی تھے۔ مثلاً "اگنی" اللہ کے لئے بھی استعمال ہوتا تھا اور اول خلق کے لئے بھی۔ جس سے برگزیدہ ہستیوں کی طرف منتقل ہو گیا۔ اسی طرح دیگر اسماء کے ساتھ بھی یہی ہوا ہے۔ مثلاً اللہ (اللہ) وغیرہ۔ اسی طرح "برہما" ایک طرح سے کم و بیش "الرحمن" کے معنی میں استعمال ہوتا تھا۔ لیکن مخلوق کے بعض افراد کے لئے بھی استعمال ہوتا تھا۔ اس روش نے غلط فہمیوں کو جنم دیا۔ فکری مغالطے پیدا ہوئے، فلسفیانہ موشگافیوں کی گرد حقائق کے چہروں کا حلیہ بگاڑتی رہی یہ بھی ہوا کہ رفتہ رفتہ مختلف صفاتی اسماء کے لئے بھی پیکران منظور و مرئی کو وجود میں لایا جانا ضروری سمجھا جانے لگا۔

ان باتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہر صفاتی نام کے ساتھ بھی ایک فرضی خدا کی ضرورت پیش آئی اور بعض مخلوق کو بھی درجہ "الہ" مل گیا۔ خاص طور پر جب ہر صاحب مرتبہ ہستی کو "الہ" کہنا لغتاً بھی روا ہو تو تحریف اور بھی آسان ہو جاتی ہے اور تصورات کو بگاڑ دینا کوئی مشکل نہیں رہتا۔ پھر مستزاد یہ کہ کوئی اصل بھی باقی نہیں جس کے ہوتے ہوئے اصل تصور کی حفاظت آسان ہوتی اور اگر کوئی اصل تھی بھی تو عوام کو چونکہ سنسکرت پڑھنے سمجھنے کی اجازت نہ تھی لہٰذا کسی تحریف پر گرفت کرنے والا بھی کوئی نہ تھا۔ اس امر کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہزاروں خداؤں کی ایک فوج جمع کر دی گئی اور نوبت اس حد تک جا پہنچی کہ اہل تحقیق موجودہ ہندو مذہب کو باقاعدہ مذہب اور ان میں خدا کے تصور کو کوئی باقاعدہ تصور خدا تسلیم نہیں کرتے۔ اس مذہب کے عقائد کا یہ فکری یا فلسفیانہ پہلو انتہائی علمی بانجھ پن کا مظہر ہے۔

کیا یہ افسوس کا مقام نہیں کہ ایک طرف تو خدا کے لئے "اگنی (ازلی۔ اول)،

ایشور (مستغنی)، جواد (جو ہمیشہ عطا کرتا ہے کبھی لیتا کچھ نہیں) جیسے لفظ استعمال ہوتے ہیں وہیں دوسری طرف اسی خدا کے طور پر پہاڑ، سمندر، درخت، جانور حتی کہ بندر کو بھی قبول کرلیا جائے۔ (العیاذ باللہ)

بہ بیں عقل ودانش بباید گریست

رسول کی جگہ اوتار کا تصور

(۱) ایک طرف تو بعض کلمات خدا کے لئے استعمال ہوتے تھے۔ دوسری طرف وہی کلمات بعض انبیاء علیہم السلام کے لئے استعمال ہونے لگے۔ مثلاً اگنی، رام وغیرہ۔ جب ایک لفظ دونوں کے لئے استعمال ہونے لگے تو رفتہ رفتہ محرفین نے دونوں کے فرق کو ختم کردیا اور دونوں کو ایک ہی قرار دینا شروع کردیا۔

(۲) ان انبیاء علیہم السلام کے روحانی کمالات و تصرفات کی طرف دیکھتے ہوئے انہیں خارج از بشریت کردیا حالانکہ وہ بلاشبہ عام بشر نہ تھے۔ لیکن بشر اور مخلوق تو تھے۔

(۳) اب ایک طرف تو دونوں کے لئے ایک ہی درجہ قرار دینا تھا اور دوسری طرف انہیں مخلوقیت سے کلیتاً خارج بھی نہ کرسکتے تھے۔ لہٰذا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک نیا تصور گھڑنا پڑا اور یہ نیا تصور "اوتار" کا تھا۔

اب رسول بیچ میں سے نکل گئے اور نسیاً منسیاً ہوگئے جبکہ ان کی جگہ براہ راست "بھگوان جی" نے لے لی۔ اور عقیدہ یہ بن گیا کہ خدا ہر دور میں مختلف انسانوں کی شکل میں پیدا ہوتا ہے (کبھی کسی نام سے تو کبھی کسی نام سے) اور دنیا کو یا کسی خاص فرد کو مصائب سے نجات دلا کر چلا جاتا ہے یا پھر کسی اور روپ میں پیدا ہونے کے لئے فوت ہوجاتا ہے۔

اس تصور کی تکمیل کے لئے "آواگون" کے عقیدے نے بھی اسے فکری جواز فراہم کیا۔ صورتحال یہ ہے کہ صدیوں سے ہندومت کی تصورِ نبوت و رسالت سے آشنا نہیں رہا۔ کچھ اسی طرح کا سلوک ملائکہ کے ساتھ بھی ہوا۔ اسی بناپر کئی مقامات پر

فرشتے کی جگہ "دیوتا" کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔

نفسانی خواہشات کی غلامی

اگر آخرت کا تصور افکار انسانی سے خارج کر دیا جائے تو انسان کو کسی ضابطے یا اصول کا پابند بنانا مشکل ہو جائے گا۔ وہ نفسانی خواہشات کا غلام ہو کر رشتوں کے تقدس تک کو بھول بیٹھے گا اور انسانی معاشروں کو حیوانی معاشرہ میں تبدیل ہوتے دیر نہیں لگے گی۔ موت اور آخرت کا تصور ہر مذہب کا بنیادی تصور ہے۔ اس کی ایک بنیادی وجہ تو یہ بھی تھی کہ موت ایک زندہ حقیقت ہے۔ کوئی ذی شعور اس کا منکر نہیں ہو سکتا۔ مذہب میں موت کے بعد زندگی کا تصور ضرور ملتا ہے۔ ہندومت میں بھی آخرت کا مکمل تصور موجود تھا جس کا بیان گزشتہ صفحات میں گزر چکا ہے۔ سردست ہم ہندوؤں کے موجودہ تصور آخرت (آواگون) سے بحث کریں گے۔

ایک سے زیادہ اموات کا تصور

ایمانی اور روحانی دنیا میں ایک سے زائد مرتبہ مرنا اور بار بار مرنا ممکن ہے لیکن یہ سب مجازاً ہوتا ہے۔ اس موت کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ یہ موتیں ایک کے بعد ایک حیوانیت کی طرف بھی سفر کرتی ہیں جبکہ ان کا تحرک ایک کے بعد ایک ملکیت کے درجات میں بھی بلند سے بلند تر کی سمت ہوتا ہے۔ ذیل میں ہم اس تصور اور اس کی حقیقت کو واضح کرتے ہیں۔

برے عمل والی موت

انسان اپنی زندگی میں اچھے اور برے اعمال کرتا ہے۔
جس کے اچھے عمل زیادہ ہوں اسے ہم اچھا آدمی کہتے ہیں اور جس کے برے اعمال اس کے اچھے اعمال سے بڑھ جائیں وہ برا آدمی کہلاتا ہے۔ نبیوں کے سوا کوئی دوسرا ایسا انسان نہیں جس میں صرف اچھائیاں ہی اچھائیاں ہوں اور یہ بھی ممکن نہیں کہ انسان برائیوں

کا ہی مجموعہ ہو اور اس میں کوئی بھی اچھائی نہ ہو' اس لئے جہاں عام انسان اچھائیاں کرتا ہے' نیک اعمال اس کے نامہ اعمال میں لکھے جاتے ہیں وہاں اس سے گناہ بھی سرزد ہوتے ہیں' وہ برائیوں میں بھی ملوث ہوتا ہے۔

درجات میں ایک درجہ چھوڑ کر نیچے آجاتا ہے۔ گویا کہ اس نے اپنا ایک ایمانی اور روحانی درجہ کھو دیا۔ یہ وہ عمل ہے جسے ہم اس درجے کی موت کہہ سکتے ہیں۔ انسان جوں جوں گناہ میں آگے بڑھتا رہتا ہے اس کے درجات کی موت یکے بعد دیگرے واقع ہوتی رہتی ہے۔ اس بات کو ہم مجازاً انسان کی بے شمار اموات سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ پھر روحانی و ایمانی موت کے اس سفر میں نفس کے مختلف درجات ہوتے ہیں۔ ان درجات میں نفس کی مثالی شکلیں مختلف ہوتی ہیں۔ کبھی اس کی کیفیت گدھے کی سی ہوتی ہے تو کبھی بندر' کوے وغیرہ کی سی۔ حتی کہ کبھی کتے یا خنزیر جیسی بھی ہوتی ہے (معاذ اللہ)۔

اس امر کے واضح ہو جانے سے منکشف ہوا کہ گناہ اور اس کے ذریعہ قلب و روح کی موت کے اس لحہ لحہ سفر میں انسانی نفس اپنی صفات کے اعتبار سے کبھی سانپ ہوتا ہے تو کبھی گدھا یا گھوڑا۔ غرض وہ مختلف حیثیات سے گزرتا ہے اور آخر کار پست ترین پستی میں جا گرتا ہے۔ (نعوذ باللہ من ذالک) یہ وہ امر واقعی ہے کہ جس کو ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ انسانی نفس کبھی ایک جانور کی شکل میں ہوتا ہے تو اس کے درجات کی مزید موت کے بعد وہ کسی اور جانور کی صفات پر چلا جاتا ہے لہٰذا مجازاً ایسا کہہ دینے میں کوئی حرج نہیں۔

یہ وہ تصور ہے جسے بگاڑ کر "آواگون" کی ایک جہت تحرک کا تعین کر دیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اگر کسی انسان کے عمل اچھے نہ ہوں تو وہ مرنے کے بعد کسی جانور کی شکل میں زندہ کر دیا جاتا ہے۔ اگر عمل پھر بھی برے رہیں تو اس کی دوسری موت کے بعد تیسرا جنم اس سے بدتر جانور کی شکل میں دیا جاتا ہے ... تاآنکہ وہ اس قدر بدترین حالت کو پہنچ جاتا ہے کہ وہ وصال نار (معاذ اللہ) کا درجہ پالیتا ہے جو کہ دائمی

عذاب ہے۔ (نعوذ باللہ من ذالک)

حالانکہ حقیقت صرف اسی قدر ہے کہ وہ اپنے گناہوں کے ذریعے خود کو نیچے سے نیچے گراتا جاتا ہے اور بد سے بدتر نفسانی صفات کا لبادہ خود پر چڑھاتا جاتا ہے تا آنکہ اس کو موت آ جاتی ہے اور وہ (نعوذ باللہ من ذالک) آخرت میں عذاب کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔

کتنی سادہ سی بات تھی جسے بگاڑ کر کیا سے کیا بنا دیا گیا۔

نیک عمل والی موت

اسی طرح روحانیت کے مدارج طے ہوتے ہیں۔ صالح اور نیک لوگ اعمال صالحہ کی بدولت درجہ کمال کی طرف ایک زینے کے بعد دوسرے زینے پر قدم رکھتے ہیں اور مختلف مراحل طے کرتے ہوئے گوہر مقصود کو پا لیتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص نیک عمل کرتا ہے تو اس کو روحانی درجہ اول سے بھی بلند تر درجہ مل جاتا ہے۔ یہ اس کے لئے ایک طرح سے نئی زندگی ہوتی ہے۔ وہ بلند تر مقام پر پہنچ کر گزشتہ درجے کو اپنے لئے موت گمان کرتا ہے کیونکہ گزشتہ یا کم تر درجہ اس کے لئے بمنزلہ ایک گناہ کے ہوتا ہے جسے وہ روحانی کمزوری بیماری یا موت سے تعبیر کر کے نئے حاصل شدہ اور بلند تر درجے کو صحت و توانائی اور زندگی شمار کرتا ہے۔ اس طرح اس کے لئے اس کا ہر نیا لمحہ نئی زندگی جب کہ گزشتہ لمحہ ایک موت کی طرح بن جاتا ہے وہ اسی طرح درجہ بہ درجہ بلند تر ہوتے ہوئے اپنے نفس کی کیفیت کو خالص روح یا ملائکہ کے درجے تک پہنچا دیتا ہے۔ اس کا یہ روحانی عروج جاری رہتا ہے تا آنکہ وہ وصال حق کے نشہ سرمدی سے سرشار ہو جاتا ہے۔ اس کے اس روحانی سفر کو بھی مجازاً ایک کے بعد ایک نئی زندگی ملنے سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

یہ وہ سادہ سا تصور ہے جس کو بگاڑ کر "آواگون" کی ایک اور جہت بنا دی گئی ہے۔ یعنی کہا جاتا ہے کہ انسان اگر نیک عمل کرے تو موت کے بعد اسے نئی زندگی دی

جاتی ہے جو اس کی پہلی زندگی سے اچھی ہوتی ہے۔ یہ اس کی نیکیوں کا صلہ ہوتا ہے۔ اگر وہ نیکیاں جاری رکھے تو اس سے اگلی زندگی میں اسے اور اچھا درجہ اور عمدہ زندگی عطا کر دی جاتی ہے۔ تا آنکہ وہ وصال حق کی لذتوں سے آشنا کر دیا جاتا ہے اور اسے دائمی زندگی عطا کر دی جاتی ہے۔

حالانکہ اصل تصور صرف اتنا ہے کہ ایک انسان درست ایمان کے بعد نیک عمل کرے تو اس کے درجات بلند ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ جوں جوں وہ نیکیوں میں اضافہ کرتا چلا جاتا ہے توں توں اس کے قرب حق میں ترقی ہوتی چلی جاتی ہے۔ حتی کہ وہ وصل حق کی لذت سے سرفراز کیا جاتا ہے۔ وہ اسی سرشاری میں زندگی گزارتا ہے اور وصل کے درجات بڑھاتا جاتا ہے یہاں تک کہ اسے موت آجاتی ہے جس کے بعد اسے جنت کی دائمی زندگی سے نوازا جاتا ہے۔ کتنا سادہ سا تصور تھا بگاڑ کر کیا سے کیا بنا دیا گیا ہے۔

اس تصور کی اجتماعی موت

معاشرہ افراد سے بنتا ہے۔ اس لئے انفرادی رویوں سے اجتماعی رویوں کا رخ متعین ہوتا ہے۔ اس تصور کی اجتماعی شکل یہ بنتی ہے کہ جب کوئی شخص نیکی کرتا ہے تو اس کے درجات بلند ہوتے ہیں۔ نیکیوں کے دوران معاذ اللہ اگر کوئی گناہ سرزد ہو تو وہیں سے درجات نیچے آجاتے ہیں اور اگر نیچے جاتے جاتے کوئی نیکی کرے تو وہ اس وقت والے درجے سے بلند ہو جاتا ہے۔ زندگی انہی نشیب و فراز کو طے کرنے کا نام ہے۔ حیات انسانی کا سفر جاری رہتا ہے یہاں تک کہ وہ رزق زمین بن جاتا ہے، قبر کی تاریکیوں میں اتر جاتا ہے اور اس کے اعمال کا دروازہ بند ہو جاتا ہے۔

"آواگون" کی بھی اجتماعی شکل اسی طرح کی بنتی ہے کہ اگر انسان برا عمل کرے تو اگلی زندگی میں اسے جانور بنا دیا جاتا ہے اور اگر وہ زندہ ہو کر درندگی سے بچا رہے تو اسے اس سے اگلی زندگی میں پھر انسان بنا دیا جاتا ہے۔ ہندو مت میں تصور

آخرت کے حوالے سے آواگون کے نظریے کے تجزیاتی مطالعے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ آخرت کے تصور کو موجودہ ہندومت میں کس حد تک بگاڑا جا چکا ہے کہ عقیدہ آخرت کی شکل مسخ ہوتے ہوتے بالکل ہی تبدیل ہو گئی ہے۔ اب اس کی اصل کا سراغ لگانا تقریباً ناممکن بنا دیا گیا ہے۔ سورگ (جنت)' نرک (دوزخ) پرلوک (دوسری دنیا یعنی آخرت)' پنرجنم (دوسری زندگی) یعنی بار بار زندگی نہیں بلکہ ایک ہی دوسری زندگی۔

مذہبی کتابیں

دنیا کے دیگر مذاہب کی طرح ہندومت کا بھی اپنا ایک ثقافتی پس منظر ہے بلکہ اپنے پیروکاروں پر اس کی فکری گرفت اتنی مضبوط نہیں جتنی اس کی ثقافتی اور مجلسی گرفت سخت ہے۔ اس دھرم کا مطالعہ اس پس منظر کی جزئیات کا تخلیقی' وجدانی اور عقلی سطح پر ادراک کئے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ گزشتہ صفحات میں ہندی تہذیب و تمدن کا بھی مختلف حوالوں سے جائزہ لیا گیا' ہم نے دیکھا کہ ہندو دانشوروں نے خدا کے تصور کی جو خود ساختہ تاویلات کیں وہ پوری ہندو قوم کو بت پرستی کے اندھے غاروں کی طرف لے گئیں اور ایک خدا کی جگہ ہزاروں خدا وجود میں آ گئے حتی کہ یہ خدا انسانی شکل اختیار کر کے زمین پر بھی اترنے لگے۔ عقل عیار سو بھیس بدل کر ذہن انسانی پر مسلط رہی' وہ صراط مستقیم کو چھوڑ کر ابلیسی راستوں پر چلتا رہا اور اپنے ہاتھ کے تراشے ہوئے پتھر کے بے جان بتوں کے سامنے سربسجود ہو کر انہیں اپنی حاجت روائی اور مشکل کشائی کے لئے پکارتا رہا۔ پتھر کے وہ بے جان ٹکڑے جو اپنے اوپر بیٹھنے والی مکھی کو بھی اڑانے کی سکت نہیں رکھتے تھے ان کے سامنے گڑگڑا کر التجائیں پیش کی جائیں۔ ہندومت کی مذہبی کتابوں میں تحریف در تحریف کا سلسلہ جاری رہا' ان کی مذہبی کتابوں کا نام وید ہے ان کے بارے میں ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ یہ کتابیں کسی مخلوق کا کلام نہیں بلکہ یہ اللہ کا کلام ہے جو ان کے دلوں پر اِلقاء ہوا ہے۔ القاء کا یہ تصور اس لئے تخلیق کیا گیا کہ ان کے ہاں واسطہ رسالت کا کوئی تصور موجود نہیں یا اب اس حد تک معدوم ہو چکا

ہے کہ ڈھونڈنے سے بھی اس کا نام و نشان نہیں ملتا گویا انہوں نے نبی یا رسول کی جگہ "رشیوں" کو دے دی۔ تحریف در تحریف کے باوجود ایسے شواہد مل جاتے ہیں جن سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ممکن ہے اصل کلام' کلام خدا ہی ہو۔ اس موضوع پر جناب شمس نوید عثانی نے اپنی کتاب "اگر اب بھی نہ جاگے تو" میں قلم اٹھایا ہے اور قرآن پاک کی آیات اور ویدوں کی عبارات کا تقابلی جائزہ لیا ہے۔

ہندومت میں ایسی کتابیں بھی موجود ہیں جو ویدوں کی عبارات کی تشریحات و توضیحات اور تعبیرات پر مبنی ہیں اور ہندو سوسائٹی میں احترام اور عقیدت کی نظر سے دیکھی جاتی ہیں۔ مثلاً پران' اپنشد وغیرہ لیکن انہیں نہ تو کلام خدا سمجھا جاتا ہے اور نہ انہیں کلام خدا کے برابر ہی جانا جاتا ہے۔ لیکن عملی طور پر انہیں کم حیثیت بھی نہیں دی جاتی۔ وید اور اس کی چند تشریحات ہندو مذہب کا کل مذہبی سرمایہ ہے۔

ان کے علاوہ چند رزمیہ نظمیں ہیں لیکن یہ نظمیں خود ساختہ جنگوں کی کہانیاں ہیں جن کا وجود تاریخ انسانی میں کہیں نہیں ملتا اور کہیں ہو تو خبر نہیں لیکن ایک بہت دلچسپ بات یہ ہے کہ جب کوئی شخص ان فرضی جنگوں اور ان کے زمانے کو دیکھتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ جنگیں کروڑوں اربوں سال سے بھی قبل کبھی برپا ہوئی تھیں جبکہ وہ زمانہ ست یگ یعنی نور کا زمانہ تھا جب ہر طرف حق ہی حق تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کوئی بھی شخص انسانی تخلیق کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا بلکہ اس تصور کو قائم کرنے کیلئے بھی کوئی موجود نہیں تھا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس زمانے کی کسی نوری مخلوق کا ذکر ان کے ویدوں (اصل کلام حق میں) میں پایا جاتا ہوگا جس پر انہوں نے رام چندر جی کی رامائن اور کرشن جی مہاراج کی مہابھارت تخلیق کر ڈالی۔ قابل غور بات یہ بھی ہے کہ رام اول خلق کو بھی کہتے ہیں مزید ملاحظہ کیجئے "اگر اب بھی نہ جاگے تو" کے وہ ابواب جن میں رام چندر جی اور کرشن جی کی حقیقت بیان کی گئی ہے۔ یعنی رامائن اور مہابھارت دو فرضی کہانیاں ہیں جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں لیکن ہندوؤں نے انہیں مذہبی کتابوں کا درجہ دے رکھا ہے۔

۱ - ان تمام حالات میں ہندومت کی موجودہ کیفیت کے ساتھ اس کو محققین کوئی

باقاعدہ مذہب نہیں سمجھتے۔ ان کا ایسا سمجھنا بھی کسی حد تک بجا ہی ہے کیونکہ جس فکر وفلسفہ میں خدا کا کوئی باقاعدہ تصور نہیں وہ مذہب کہلانے کا بھی کسی طور پر حقدار نہیں۔

۲۔ ہندومت میں رسالت کا تصور ہی سرے سے خارج کردیا گیا ہے۔ کیا ہم اسے پھر بھی مذہب کہہ سکتے ہیں۔ ہرگز نہیں کیونکہ وحی کا تعلق براہ راست رسول کا تقاضا کرتا ہے جبکہ مذہب کی فکر وفلسفیانہ بنیاد وحی ہوتی ہے۔ جب رسول ہی نہیں تو وحی بھی وحی نہ رہی۔ لہٰذا مذہب بھی باقاعدہ مذہب نہ رہا۔

۳۔ عام طور پر ہندو مذہب میں آخرت کا تصور بھی کوئی نہیں پایا جاتا ہے۔ تناسخ یا کرما (Karama) کا تصور کسی صورت بھی آخرت کا تصور کہلانے کا حقدار نہیں کیونکہ آخرت بہر طور آخرت ہے جبکہ عقیدہ تناسخ اسی دنیا کی زندگی کی تصدیق کرتا ہے۔ ہم تناسخ کے ہوتے ہوئے کہہ سکتے ہیں کہ ہندومت میں آخرت کا کوئی ایسا تصور باقی نہیں رہا جس کو ہم باقاعدہ طور پر بطور حیات اخروی کے قبول کرسکنے کی پوزیشن میں ہوں۔

درج بالا حقائق کی روشنی میں ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ مسلمہ معیارات کے مطابق ہندومت کوئی مذہب نہیں بلکہ بعض غیر مربوط عقائد کا مجموعہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندو دھرم قبول کرنے کیلئے نہ کسی خدا کو ماننا پڑتا ہے اور نہ کسی رسول پر ایمان ہی لانا پڑتا ہے۔ نہ آخرت اور جنت دوزخ پر نہ باقاعدہ اور باضابطہ وحی پر اور نہ کسی بھی فرشتے پر ایمان لانے کی ضرورت ہے۔ بلکہ ہندو ہونے کیلئے درج ذیل باتوں پر عمل کرنا ہی کافی ہے۔

۱۔ برہمن کی تعظیم اور ہر امر میں اس کی اعانت

۲۔ عورت کا مقام معاشرے میں کم تر سمجھا جائے۔

۳۔ ذات پات پر یقین رکھا جائے۔

۴۔ حیوانی زندگی مجروح نہ کی جائے۔

۵۔ چند مخصوص مقامات اور اشیاء کی (بلاوجہ) تعظیم کی جائے۔

نوٹ: ہندوؤں میں ابتداً قربانی کا رواج تھا اور ایرانیوں کی طرح قربانی صرف پروہت ہی ٹھیک طریق پر ادا کرسکتا تھا وگرنہ کسی اور کو اس کے قبول وعدم قبول کی خبر ہی ممکن نہ تھی بلکہ اس کا قبول ہونا بھی مشکوک ہوگیا۔ یہ ان کی مذہبی اجارہ داری کی ایک شکل

تھی لیکن بعد ازاں قربانی ممنوع ہو گئی۔

سرزمین ہند پر بسنے والی اقوام کے اجتماعی سیاسی' ثقافتی اور مذہبی رویوں کا جائزہ لینے اور منظر نامے کے مختلف رنگوں کی تعبیرات کرنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اس میں تازہ ہواؤں اور شاداب لمحوں کی تمنا کسے نہیں ہوگی حالات کا فطری تقاضا بھی یہ تھا کہ زندگی کا ہر شعبہ انقلاب آفریں تبدیلیوں سے آشنا ہو' ظلم کی زنجیریں ٹوٹیں' آمریت کی سیاہ رات کا خاتمہ ہو' قانون کی بالادستی قائم ہو' میزان عدل موروثی راجوں مہاراجوں کے ہاتھ سے چھین لی جائے۔ ذات پات کے حصار ناروا سے سسکتی ہوئی انسانیت کو نجات دلا کر مساوات کا ایک ایسا نظام رائج کیا جائے جس میں کالے کو گورے پر اور گورے کو کالے پر' عجمی کو عربی پر اور عربی کو عجمی پر کوئی فوقیت اور برتری حاصل نہ ہو' معیار فضیلت صرف اور صرف تقویٰ ہو' گردنیں جھکیں تو صرف اپنے مالک حقیقی کی بارگاہ میں' فرسودہ تصورات کے ہربت کو پاش پاش کر دیا جائے۔ انسان کو ایک ایسا ضابطہ حیات دیا جائے جو اس دنیا میں بھی اس کی کامیابی کا ضامن ہو اور آخرت میں بھی اس کی نجات کا باعث بنے' ایک ایسا ضابطہ حیات جو شرف انسانی کی بحالی کا امین ہو' جو انسان کا مقدر روشنیوں سے تحریر کر کے اسے ایک بار پھر مسجود ملائکہ کے اعزاز کا حق دار ثابت کر دے۔

قرآن اور ویدوں کا تقابلی جائزہ

کلام خدا اپنی گواہی آپ ہوتا ہے کہ یہ کلام کسی انسان کی تخلیق نہیں بلکہ کلام الٰہی ہے جو اللہ نے وحی کے ذریعہ اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم قلب اطہر پر نازل کیا۔ خود آیات ربانی اس صحیفہ انقلاب کی حقانیت' احکامات خداوندی کی سچائی اور صداقت کی دلیل ہیں۔ بعض قرآنی آیات اور ویدوں کی عبارت میں (تحریف در تحریف کے باوجود) حیرت انگیز طور پر مماثلت پائی جاتی ہے۔ شری گنگا پرشاد اپادھیائے نے اپنی کتاب "مصابیح الاسلام" میں انہیں تفصیل سے درج کیا ہے۔ ہم ذیل میں ویدوں کی عبارات کے انہی تراجم سے استفادہ کر رہے ہیں۔

قرآن	وید
۱۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○ (الفاتحہ' ۱:۱) سب تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں جو تمام جہانوں کی پرورش فرمانے والا ہے۔	मह्ो वेवस्य सवितु: परिष्टुति: اس دنیا کے بنانے والے کے لئے تعریف ہے۔ (رگوید: ۵۔۸۱۔۱)
۲۔ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○ (الفاتحہ' ۱:۲) نہایت مہربان بہت رحم فرمانے والا ہے۔	वसुर्धयमान: جو دینے والا اور رحیم ہے۔ (رگ وید: ۳۔ ۳۴۔۱)
۳۔ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ○ (الفاتحہ' ۱:۵) ہمیں سیدھا راستہ دکھا۔	नय सुपथा राये अस्मान ہم کو ہمارے فائدے کے لئے سیدھے راستہ پر لگا۔ (یجروید: ۴۰:۱۶)
۴۔ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰہَ لَہٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا لَکُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیْرٍ ○ (البقرہ' ۲:۱۰۷)	महोदिव: प्रथिव्यश्च सम्राट وہ عظیم زمین و آسمان کا مالک ہے۔ वत्विन्द्र ऊती وہ ایشور ہماری مدد کرے۔ (رگ وید: ۱۔ ۱۰۰۔۱)

کیا تمہیں معلوم نہیں کہ آسمانوں اور زمین کی بادشاہت اللہ ہی کے لئے ہے اور اللہ کے سوا نہ تمہارا کوئی دوست ہے اور نہ ہی مددگار۔

۵۔ ... وَخَلَقَ كُلَّ شَىْءٍ

(الفرقان، ۲۵:۲)

اسی نے ہر چیز کو پیدا فرمایا ہے۔

प्रजा पति जर्नयति प्रजा इमा:

پرماتما سب پرجا (مخلوق) کو بناتا ہے۔

(اتھروید: ۷۔۱۹۔۱)

۶۔ ... وَاَنْفِقُوْا خَيْرًا لِّاَنْفُسِكُمْ

(التغابن، ۶۴:۱۶)

اور (اللہ کی راہ میں) خرچ کرتے رہو یہ تمہارے لئے بہتر ہوگا۔

य एक इद् दिदयतेवसु मर्ताय दाशषे

خدا ایک ہے وہ مہربان خیرات کرنے والے آدمی کو رزق دیتا ہے۔

(رگ وید: ۱۔ ۸۴۔ ۷)

۷۔ اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعِفْهُ لَكُمْ ... (التغابن، ۶۴:۱۷)

اگر تم اللہ کو اچھی طرح سے (اخلاص اور نیک نیتی سے) قرض دو گے وہ اس کو تمہارے لئے بڑھاتا جائے گا۔

۸۔ ... وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ ...

(الانعام، ۶:۱۴)

اور وہ (سب کو) کھلاتا ہے اور (خود اسے) کھلایا نہیں جاتا۔

अनश्नन्नन्यो अभिचाकशीति

پرماتما کھاتا نہیں ہے۔ دوسروں کو کھلانے کا انتظام کرتا ہے۔

(رگ وید: ۱۔ ۱۶۴۔ ۲۰)

۹۔ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَىْءٌ

(الشوریٰ، ۴۲:۱۱)

اس کے جیسا کوئی نہیں (وہ ایک یکتا

न तस्य प्रतिमा अस्ति

اس پرمیشور کی کوئی مورتی نہیں بن سکتی۔ (یجروید: ۳۲۔ ۳)

ویگانہ ہے' نہ ذات وصفات میں اس کا کوئی مماثل ہے نہ کوئی اس کا ہمسر' نہ ہم جنس' وہ تم کو نظر نہیں آتا' تم اس کی آواز نہیں سنتے)

۱۰۔ وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ...
(البقرہ' ۲:۱۱۵)
اور مشرق و مغرب (سب) اللہ ہی کا ہے۔

यस्येमाः प्रदिशः
سب سمتیں اسی کی ہیں۔
(رگ وید: ۱۰۔۱۲۱۔۴)

۱۱۔ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ۝ (البقرہ' ۲:۱۱۵)
پس تم جدھر بھی رخ کرو ادھر ہی اللہ کی توجہ ہے (یعنی ہر سمت ہی اللہ کی ذات جلوہ گر ہے)

सविता पश्चातात् सविता पुरस्तात्
सवितोत्तरतात् सविताधरात्तात्
دنیا کا خالق مشرق مغرب' اوپر اور نیچے سب جگہ ہے۔
(رگ وید: ۱۰۔۳۶۔۱۴۰)

विश्वत श्चक्षुरुत विश्वतो मुखो
خدا کی آنکھ ہر طرف ہے' خدا کا منہ ہر طرف ہے۔ (رگ وید: ۱۰۔۸۱۔۳)

۱۲۔ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ۝ (ق' ۵۰:۱۶)
اور ہم تو اس کی رگ جان سے بھی زیادہ قریب ہیں۔

त्वंनो अन्तम उत त्राता
تو ہم سے نزدیک ترین اور محافظ ہے۔
(رگ وید: ۵۔۲۴۔۱)

۱۳۔ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖ اِلَّا بِمَا شَآءَ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ (البقرہ' ۲:۲۵۵)

न यस्य द्यावा प्रथिवी अनुव्यचो
न सिंधवो रजसो अन्तमानशुः।
नोत स्ववृष्टिं मदे अस्य युध्यत

اور وہ اس کی معلومات میں سے کسی چیز کا بھی احاطہ نہیں کر سکتے مگر جس قدر وہ چاہے اور اس کی (کرسی سلطنت وقدرت) تمام آسمانوں اور زمین کو محیط ہے۔

एको अन्यच् चकृषे विश्वमानुषक्

نہ زمین اور آسمان اس خدا کے محیط ہونے کی حد کو پا سکتے ہیں۔ نہ آسمان کے کرّے۔ نہ آسمان سے برسنے والا مینہ۔ سوائے اس خدا کے کوئی اور دوسرا اس خلقت پر قدرت نہیں رکھ سکتا۔

(رگ وید: ۱۔ ۵۲۔ ۱۴)

۱۴۔ وَیُنَزِّلُ الْغَیْثَ

(لقمان' ۳۱: ۳۴)

اور وہی مینہ برساتا ہے۔

۱۵۔ أَلَمْ تَرَ اَنَّ الْفُلْکَ تَجْرِیْ فِیْ الْبَحْرِ بِنِعْمَتِ اللّٰہِ (لقمان' ۳۱: ۳۱)

کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ کے فضل سے کشتیاں سمندر میں چلتی ہیں۔

वेद नावः समुद्रियः

وہ سمندر کی کشتیوں کو جانتا ہے۔

(رگ وید: ۱۔ ۲۵۔ ۷)

۱۶۔ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ یُوْلِجُ الَّیْلَ فِیْ النَّھَارِ وَیُوْلِجُ النَّھَارَ فِیْ الَّیْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ کُلٌّ یَّجْرِیْٓ اِلٰٓی اَجَلٍ مُّسَمًّی وَّاَنَّ اللّٰہَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ○

(لقمان' ۳۱: ۲۹)

کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے (یہ سلسلہ برابر جاری ہے) اور سورج اور چاند کو (اپنے اپنے) کام پر لگا رکھا ہے ہر ایک اپنے وقت مقررہ تک چلتا ہے اور (یہی نہیں بلکہ)

अहोरात्राणि विदधद् विश्वस्य मिषतो वशी

کل جانداروں کے اوپر قدرت رکھنے والے خدا نے دن اور رات کا سلسلہ قائم کیا۔ (رگ وید: ۱۰۔ ۹۰۔ ۲)

اللہ تعالیٰ بھی تمام کاموں سے خوب واقف ہے (نہ تمہارا ظاہر اس سے پوشیدہ ہے اور نہ باطن)

۱۷۔ نِعْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا كَذٰلِكَ نَجْزِىْ مَنْ شَكَرَ ○ (القمر، ۵۴:۳۵)

محض اپنے فضل (وکرم) سے۔ اسی طرح ہم ان کو جزا دیتے ہیں جو شکر گزاری کریں۔

यदङ्ग दाशुषे त्वमग्ने भद्रं करिष्यसि।
तवेत् तत् सत्यमङ्गिरः

پرمیشور آپ نیک آدمی کو اچھا پھل دیتے ہیں۔ یہ آپ کا حقیقی خاصہ ہے۔

(رگ وید: ۱۔۱۔۶)

۱۸۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا ○ (النساء، ۴:۳۶)

بیشک اللہ اس شخص کو پسند نہیں کرتا جو تکبر کرنے والا (مغرور) فخر کرنے والا (خود بین) ہو۔

ऋतस्य पथा नमसा विवासेत्

انسان کو چاہئے کہ سچائی کے راستے پر عاجزی سے چلے۔

(رگ وید: ۱۰۔۳۱۔۲)

۱۹۔ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الْاَرْضِ ۭ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَىْءٍ عَلِيْمٌ ○ (الحجرات، ۴۹:۱۶)

اور اللہ کو تو سب کچھ معلوم ہے جو کچھ آسمانوں اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ کو ہر شے کی خبر ہے۔

यो विश्वाभि वि पश्यति भुवना सं च पश्यति

وہ ایشور ساری دنیا اچھی طرح جانتا ہے۔ (رگ وید: ۱۰۔۱۸۷۔۴)

۲۰۔ يَعْلَمُ سِرَّكُمْ وَجَهْرَكُمْ وَيَعْلَمُ مَا تَكْسِبُوْنَ ○ (الانعام، ۶:۳)

وہ تمہاری پوشیدہ اور تمہاری ظاہر (سب باتوں) کو جانتا ہے اور جو کچھ کما رہے ہو وہ اسے بھی جانتا ہے۔

यस्तिष्ठति चरति यश्च वञ्चति,
यो निलायं चरति यः प्रतङ्कम्।
द्वौ संनिषद्य यन्मन्त्रयेते
राजातद् वेद वरुणस्तृतीयः।

جو کھڑا ہوتا ہے۔ چلتا ہے جو دھوکا دیتا ہے جو جو چھپتا پھرتا ہے جو دوسرے کو

۲۱۔ وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ○ (الحدید، ۵۷:۴)

وہ تمہارے ساتھ ہے جہاں بھی تم ہو اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اسے دیکھ رہا ہے۔

تکلیف دیتا ہے جو دو آدمی خفیہ بات کرتے ہیں۔ تیسرا ایشور ان سب کو جانتا ہے۔ (اتھرووید: ۴۔۱۶۔۲)

۲۲۔ وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ (الانعام، ۶:۱۸)

اور وہی اپنے بندوں پر غالب ہے۔

विश्वस्य मिषतो वशी

وہ سب جانداروں پر غالب ہے۔
(رگ وید: ۱۰۔۱۹۰۔۲)

۲۳۔ يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِى الْاَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيْهَا (الحدید، ۵۷:۴)

وہ جانتا ہے جو کچھ زمین میں داخل ہوتا ہے اور جو کچھ اس سے نکلتا ہے اور جو کچھ آسمان سے اترتا ہے اور جو کچھ اس کی طرف چڑھتا ہے۔

सर्वंतद् राजा वरुणो विचष्टे
यदन्तरा रोदसी यत् परस्तात्

جو زمین اور آسمان میں یا اس کے اوپر ہے اسے ایشور دیکھتا ہے۔
(اتھرووید: ۴۔۱۶۔۵)

۲۴۔ وَهُوَ الَّذِىْٓ اَرْسَلَ الرِّيٰحَ بُشْرًا ۢ بَيْنَ يَدَىْ رَحْمَتِهٖ (الفرقان، ۲۵:۴۸)

اور وہ (اللہ) ہی ہے جو اپنی (بارش) رحمت سے قبل (ٹھنڈی ٹھنڈی) ہواؤں کو (بارش کی) خوشخبری دینے کے لئے بھیجتا ہے۔

वेद वातस्य वर्तनिमुरो ऋष्वस्य
वृहत: । वेदा ये अध्यासते

وہ اوپر پھیلی ہوئی خوشگوار ہوا کے راستوں کو جانتا ہے اور ان سب چیزوں کو جانتا ہے جو اس کے سہارے رہتی ہیں۔ (رگ وید: ۱۔۲۵۔۹)

۲۵۔ وَهُوَ الَّذِىْ جَعَلَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ

अहोरात्राणि विदध:

خِلْفَةً (الفرقان ۲۵:۶۲)

اور وہی ہے جس نے ایک دوسرے کے پیچھے آنے والے رات اور دن بنائے۔

دن اور رات بنائے۔

(رگ وید: ۱۰۔ ۱۹۰۔ ۲)

۲۶۔ وَجَعَلَ الَّيْلَ سَكَنًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا ۚ (الانعام ۶:۹۷)

اور اسی نے رات کو آرام کے لئے بنایا ہے اور سورج اور چاند کو حساب و کتاب کے لئے۔

सूर्याचन्द्रमसौ धाता यथा पूर्वमकल्पयत्

خالق نے سورج اور چاند کو مثل سابق خلقتوں کے (رگ وید: ۱۰۔ ۱۹۰۔ ۳)

۲۷۔ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ۚ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ○ اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ○

(الاعراف ۷: ۵۴ - ۵۵)

اسی کے حکم (سے ایک نظام) کے پابند بنا دیئے گئے ہیں خبردار ہر چیز کی تخلیق اور تدبیر کا نظام چلانا اسی کا کام ہے اللہ بڑی برکت والا ہے جو تمام جہانوں کی (تدریجاً) پرورش فرمانے والا ہے۔ تم اپنے رب سے گڑگڑا کر اور آہستہ (دونوں طریقوں سے) دعا کیا کرو بیشک وہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

होतारं सत्ययजं रोदस्योरुत्तानहस्तो नमसा विवासेत

قابل پرستش۔ زمین اور آسمان کو سچے راستہ پر چلانے والے پر میشور سے عاجزی سے ہاتھ اوپر اٹھا کر دعا مانگو۔

(رگ وید: ۶۔ ۱۶۔ ۴۶)

۲۸۔ ... اَلْكَبِيْرُ الْمُتَعَالُ ○

(الرعد ۱۳:۹)

سب سے برتر اور اعلیٰ رتبے والا۔

अद्धा देव महा

خدا در حقیقت بہت بڑا ہے۔

(اتھروید: ۲۰۔ ۵۸۔ ۳)

۲۹۔ ... لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ؕ
(یونس‘ ۱۰: ۶۴)
اللہ کی باتیں بدلا نہیں کرتیں۔

अव्धानि वरुणस्य व्रतानि
خدا کے قانون نہیں بدلتے۔
(رگ وید: ا۔ ۲۴۔ ۱۰)

۳۰۔ ... وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۝
(الفتح‘ ۴۸: ۲۳)
آپ اللہ کی سنت (اللہ کی فطرت‘ اللہ کے اصول) میں کبھی فرق نہ پائیں گے۔

न किरस्य प्रमिनन्ति व्रतानि
خدا کے قوانین کوئی نہیں بدل سکتا۔
(اتھروید: ۱۸۔ ا۔ ۵)

۳۱۔ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوْا بِمَا عَمِلُوْا وَيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا بِالْحُسْنٰى ۝ (النجم‘ ۵۳: ۳۱)
اور جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اللہ ہی کا ہے تاکہ برائی کرنے والوں کو ان کے عمل کا بدلا دے اور جنہوں نے بھلائی کی ان کو نیک اجر دے۔

इमे चित् तव मन्यवे वेपेते
भियसा मही यदिन्द्र वज्रिननोजसा
वृत्रं मरुत्वां अवधीर चंञ्नु
स्वराज्यम्
اے خدا زمین اور آسمان تیرے رعب سے کانپتے ہیں۔ اے خدا تو اپنے قہر سے بدکار کو مارتا ہے اور نیکی کرنے والے کے لئے روحانیت کی عظمت قائم کرتا ہے۔ (رگ وید: ا۔ ۸۰۔ ۲)

۳۲۔ هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝
(الحدید‘ ۵۷: ۳)
وہ (سب سے) پہلا اور (سب سے) آخر اور (اپنی قدرت کے اعتبار سے) ظاہر اور (اپنی ذات کے اعتبار سے) پوشیدہ ہے اور (اس سے اول و آخر‘ ظاہر

तवमग्ने प्रथमो अङ्गिरस्तमः
اے پرمیشور تو سب سے اول ہے اور سب سے زیادہ عالم ہے۔
(رگ وید: ا۔ ۳۱۔ ۲)

وباطن کی کوئی بات پوشیدہ نہیں) وہ سب کچھ خوب جانتا ہے۔

۳۳۔ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى

(البقرہ ۲:۲۵۶)

بے شک ہدایت گمراہی سے واضح طور پر ممتاز ہو چکی ہے سو جو کوئی معبودانِ باطل کا انکار کر دے اور اللہ پر ایمان لے آئے تو اس نے ایک مضبوط قلعہ تھام لیا۔

दृष्ट्वारुपेव्याकरोत् सत्यानृते
प्रजापतिः अश्रद्धामनृते दृधाच्
छ्रद्धां सत्ये प्रजापतिः

خدا نے حق وباطل کی کیفیت کو سمجھ کر حق کو باطل سے جدا کر دیا اور حکم دیا کہ اے لوگو حق پر ایمان لاؤ اور باطل پر ایمان مت لاؤ۔ (یجروید: ۱۹-۷۷)

۳۴۔ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ○ (البقرہ ۲:۴۴)

حالانکہ تم اللہ کی کتاب بھی پڑھتے ہو تو کیا تم نہیں سوچتے۔

उत त्वः पश्यन्न ददर्श वाचम्
उत त्वः शृण्वन्न शृणोत्येनाम

بے عقل لوگ کتاب دیکھتے ہوئے نہیں دیکھتے اور سنتے ہوئے نہیں سنتے۔

(رگ وید: ۱۰-۷۱-۴)

۳۵۔ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا وَّاِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ○ (البقرہ ۲:۴۱)

اور تم ہی سب سے پہلے اس کے منکر نہ بنو اور میری آیتوں کو (دنیا کی) تھوڑی سی قیمت پر فروخت نہ کرو اور مجھ ہی سے ڈرتے رہو۔

महेचन त्वामद्रिवः पराशुल्काय
देयाम् । न सहस्राय नायुताय
वज्रिवोन न शताय शतामघ

اے لازوال قادرِ مطلق خدا تو اس قدر بیش قیمت ہے کہ میں تجھ کو کسی قیمت کے لئے نہ چھوڑوں نہ ہزار کے لئے، نہ اربوں کے لئے، نہ سینکڑوں دنیاوی نعمتوں کے لئے۔ (رگ وید: ۸-۱-۵)

۳۶۔ اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی
(النجم، ۵۳:۳۸)
کہ کوئی شخص دوسرے کے گناہ کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔

स्वयं यजस्व स्वयं जुषस्व
تو ہی عمل کر تو ہی اس کا پھل بھوگ
(یجروید: ۲۳۔۱۵)

۳۷۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَظْلِمُ النَّاسَ شَیْئًا وَّلٰکِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَہُمْ یَظْلِمُوْنَ ○
(یونس، ۱۰:۴۴)
بے شک اللہ تو لوگوں پر کچھ بھی ظلم نہیں کرتا البتہ لوگ اپنے اوپر آپ (ہی) ظلم کرتے ہیں۔

क्रत्व: समह दीनता प्रतीप जगमा शुचे । मृला सुक्षत्र मृलय
اے قادر مطلق عظیم الشان پروردگار ہم اپنی جہالت سے گمراہ ہوتے ہیں۔ ہمارے اوپر مہربانی کیجئے۔
(رگ وید: ۷۔۸۹۔۳)

۳۸۔ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ (آل عمران، ۳:۹۲)
تم ہرگز نیکی کو نہیں پہنچ سکو گے جب تک تم (اللہ کی راہ میں) اپنی محبوب چیزوں میں سے خرچ نہ کرو۔

केवलाघो भवति केवलादी
جو اپنی کمائی کو اکیلا ہی کھاتا ہے وہ گناہ کھاتا ہے۔ (رگ وید: ۱۰۔۱۱۷۔۶)

۳۹۔ اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ فِی السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْکٰظِمِیْنَ الْغَیْظَ وَالْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ○
(آل عمران، ۳:۱۳۴)
یہ وہ لوگ ہیں جو فراخی اور تنگی (دونوں حالتوں) میں خرچ کرتے ہیں اور غصہ ضبط کرنے والے ہیں اور لوگوں سے

स इद् भोजो यो गृहवे
ददात्यन्नकामाय चरते कृशाय
अरमस्मै भवति यामहूता
उतापरीषु कृणुते सखायम्
جو غریبوں اور حاجت مندوں کی مدد کے لئے خیرات کرتا ہے وہی سخی ہے اس کا بھلا ہوتا ہے اس کے دشمن بھی اس کے دوست بن جاتے ہیں۔
(رگ وید: ۱۰۔۱۱۷۔۳)

(ان کی غلطیوں پر) درگزر کرنے والے ہیں اور اللہ احسان کرنے والوں سے محبت فرماتا ہے۔

۴۰۔ فَذٰلِكَ الَّذِیْ یَدُعُّ الْیَتِیْمَ ۝ وَلَا یَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِیْنِ ۝ فَوَیْلٌ لِّلْمُصَلِّیْنَ ۝

(الماعون '۱۰۷: ۲۔۴)

پس یہی وہ (بدنصیب) ہے جو یتیم (بیکس کی ہمدردی کرنے کی بجائے اس) کو دھکے دیتا ہے اور (نہ خود کسی غریب کو کھلاتا ہے) نہ محتاج کو کھانا کھلانے کی (دوسروں کو) ترغیب دیتا ہے۔ پس ایسے نمازیوں (یعنی مسلمانوں) پر افسوس ہے۔

य आध्राय चकमानाय पित्वो

ऽन्नवान्त्सन् रफितायोपजग्मुषे ।

स्थिरं मनः कृणुते सेवते

पुरोतोचित् स मर्डितारं न विन्दते

جو ترس کے قابل یتیم روٹی کے طالب کو روٹی ہوتے ہوئے بھی مدد نہیں دیتا اور سخت دل کر کے خود کھاتا رہتا ہے اس کو مصیبت آنے پر کوئی راحت نصیب نہیں ہوتی۔ (رگ وید: ۱۰۔۱۱۷۔۲)

نوٹ: شری گنگا پرشاد اپادھیائے کے تراجم سے ہمیں چند جگہ اختلاف ہے لیکن ہم نے انہیں کے ترجمے نقل کئے ہیں۔

باب پنجم

ہجرت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مفکرین کی نظر میں

Tahia Al-Ismail اپنی کتاب Lif of Muhammad میں لکھتا ہے

The oath of Al-Aqaba marked an opening for the new religion enabling it to grow unmolested in a city where people could worship Allah in hope and freedom and without fear. To worship openly before all men, whether believer or not, without being tortured, persecuted, or molested had been the dream of he Muslims of Makka and after thirteen years of patient struggle Allah made their dream a reality.[1]

"بیعت العقبہ نے نئے دین کی راہیں کھول دیں اور ایک ایسے شہر میں بے روک ٹوک اس کو فروغ پانے کا موقع عطا کیا جہاں لوگ امید اور آزادی کی فضا میں کسی خوف و خطر سے بے نیاز خدائے واحد کی عبادت کر سکیں۔ مسلمانان مکہ کے لئے ظلم و ستم اور اذیت کا سامنا کئے بغیر مومن اور غیر مومن افراد کے سامنے کھلے عام عبادت کرنا ایک ایسا خواب تھا جس کی تعبیر اللہ نے انہیں تیرہ سالہ پر عزیمت جدوجہد کے بعد حقیقت کی صورت میں دکھادی"۔

During the second part of the night the Messenger, by the power of Allah, was able to walk unseen through the ranks of the encircling youths. He went to the house of Abu Bakr who was expecting him. The two men climbed out through a window at the back of the house. All they had with them was five thousand dinars belonging to Abu Bakr. Muhammad had spent all his own and Khadija's money in the mission. Abu Bakr had made much money in trade and once had forty thousand dinars put aside, but after embracing Islam and after three years of boycott, he had spent most of his money in freeing persecuted slaves and relieving the poor and distressed Muslims.[2]

---

[1] Life of Muhammad by Thaia Al-Ismail p.78

[2] Life of Muhammad by Thaia Al-Ismail p.80

اس رات کے دوسرے حصے میں پیغمبر(ﷺ) اللہ کی مدد و نصرت سے محاصرہ کرنے والے نوجوانوں کی صفوں سے بن دیکھے بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ وہ ابوبکر(رضی اللہ عنہ) کے گھر پہنچے جوان کے لئے چشم براہ تھے۔ دونوں گھر کی عقبی کھڑکی پھلانگ کر باہر آگئے۔ ان کے پاس صرف پانچ ہزار دینار تھے جو حضرت ابوبکر(رضی اللہ عنہ) کے ملکیت تھے۔ محمد(ﷺ) کے پاس اپنی اور (حضرت) خدیجہؓ کی جو رقم تھی وہ ساری مشن کی راہ میں خرچ ہو چکی تھی۔ حضرت ابوبکر(رضی اللہ عنہ) نے تجارت سے کافی پیسہ کمایا تھا انہوں نے اس میں سے چالیس ہزار دینار مختص کر رکھے تھے لیکن اسلام قبول کرنے اور تین سالہ بائیکاٹ (مقاطعہ) کے بعد صرف پانچ ہزار دینار ان کے پاس رہ گئے تھے۔ اس رقم کا بیشتر حصہ انہوں نے ستم زدہ غلاموں کی رہائی اور بے یارو مددگار مصیبت زدہ مسلمانوں کی امداد پر خرچ کر دیا تھا۔

In order to give the Muslims the strength to uphold these teachings which were new and alien to the spirit of the world at the time and in order to make these principles a living force and a way of life, the Messenger brought all the Muslims together by assigning to each Muslim a brother in Islam. This bond had all the sancity of the blood brotherhood that the Arabs revered. He brought together one of the Emigrants with one of the Supporters in these contracts, so that the Emigrants would not feel like strangers in the land, and so that the Supporters would forget their old feuds and vendettas. Muhammad chose as his brother 'Ali ibn Abi Talib, the young cousin he had brought up and loved as his own son.

This act proved beneficial to all. The natives of Madina explained to their Emigrant brethren the customs of the city, and many even shared their homes and purses with them. the natural hospitality

of the Arabs, combined with the new faith, made these men completely selfless. Both Emigrants and Supporters thought only of the good of their small community and not of themselves. The Emigrants who had been learning and teaching the Quran for thirteen years helped their brothers from Madina with their studies in religion.[1]

ان تعلیمات کے ذریعے مسلمانوں کو تقویت دینے سے جن سے اس وقت روح عصر بیگانہ و نا آشنا تھی اور ان اصولوں کو ایک زندہ جاوید قوت اور زندگی کے لائحہ عمل کی شکل دینے سے پیغمبر اسلام (ﷺ) نے تمام مسلمانوں کو ایک دوسرے کا اسلامی بھائی بنا کر اتحاد و یکجہتی کے رشتے میں پرو دیا۔ اس رشتے میں اس خونی بھائی چارے کے رشتے کا تقدس موجود تھا جو عربوں کے نزدیک محترم تھا آپ ایک ایک مہاجر کو ایک ایک انصاری (مددگار) کے ساتھ معاہدے میں منسلک کر دیتے تاکہ مہاجرین اپنے آپ کو اس سرزمین میں اجنبی نہ سمجھیں اور انصار اپنی پرانی عداوتیں اور جھگڑے بھلا دیں۔

محمد (ﷺ) نے اپنا بھائی اپنے چچا زاد (حضرت) علی ابن ابی طالب کو چنا جسے انہوں نے اپنے بیٹے کی طرح چاہا اور پرورش کی تھی۔

یہ اقدام سب کے لئے بہت سود مند ثابت ہوا۔ مدینے کے مقامی باشندوں نے اپنے مہاجر بھائیوں کو شہر کے رسوم اور طور طریقے سمجھا دیئے اور بہت سوں نے انہیں اپنے گھروں اور روپے پیسے میں بھی شریک کر لیا۔ عربوں کی فطری مہمان نوازی اور اس نئے دین کے اختلاط نے ان میں مکمل بے لوثی کی خو پیدا کر دی مہاجرین اور انصار دونوں بجائے اپنے آپ کے اپنی مختصر قوم کی بہتری کے بارے میں سوچنے لگے۔ مہاجر جو تیرہ سال تک قرآن سیکھتے سکھلاتے چلے آئے تھے اپنے مدنی بھائیوں کے دینی تعلیم میں معین و مددگار ثابت ہوئے۔

Washington Irving اپنی کتاب "Life of Muhammad" میں رقم طراز ہے۔

[1] Life of Muhammad by Thaia Al-Ismail p.88

Divers accounts are given of the mode in which Muhammad made his escape from the house after the faithful Ali had wrapped himself in his mantle and taken his place upon the couch. The most miraculous account is that he opened the door silently, as the Koreishites stood before it, and, scattering a handful of dust in the air, cast such blindness upon them that he walked through The midst of them without being perceived. This, it is added, is confirmed by the verse of the thirtieth chapter of the Koran: 'We have thrown blindness upon them, that they shall not see".
The most probable account is that he clambered over the wall in the rear of the house, by the help of a servant, who bent his back for him to step upon it.[1]

محمد (ﷺ) اپنے گھر سے کس طرح جان بچا کر نکلنے میں کامیاب ہو گئے جب ان کے جان نثار ساتھی علی (رضی اللہ عنہ) ان کی چادر اوڑھ کر ان کی خواب گاہ پر دراز ہو گئے تھے اس بارے میں جو بیانات دیئے گئے ہیں ان میں انتہائی معجزاتی بیان یہ ہے کہ انہوں نے خاموشی سے دروازہ کھولا اور سامنے کھڑے اہل قریش پر مٹھی بھر خاک پھینکی جس سے ان پر ایسا اندھاپن طاری ہو گیا کہ وہ ان کے درمیان میں سے گزر گئے درآنحالیکہ وہ انہیں نہ دیکھ سکے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی تصدیق قرآن کے تیسویں پارے کی اس آیت سے ہو جاتی ہے۔ "ہم نے ان پر نابینائی کی وہ کیفیت طاری کر دی کہ وہ دیکھنے کی صلاحیت سے عاری ہو گئے"۔

انتہائی اغلب بیان یہ ہے کہ وہ گھر کی عقبی دیوار پھلانگ گئے اور ایک خادم کی مدد سے جس نے اپنی پشت کو ان کے آگے جھکا لیا اس پر پاؤں رکھ کر چلے گئے۔

W-Montgomerywatt کی کتاب *"Muhammad at Mecca"* میں کہتا ہے۔

[1] Life of Muhammad by Washington Irving p.71

These thoughts and conceptions doubtless only received their full development some time after the Hijrah, but they must have been present in embryo when Muhammad began his negotiations with the men of Madina. That Muhammad should have had in mind ----- albeit in rudimentary from ----- an ideology capable of being elaborated to form the basis of the great movement of Arab expansion, is a measure of the width of his perception of the needs of his time and the vastness of his achievement during the Meccan period.[1]

ہجرت کے کچھ عرصہ بعد ہی بغیر کسی شک و شبہ کے ان خیالات و تصورات کا ادراک بھرپور انداز سے ہو سکا لیکن جب محمد (ﷺ) مدینے کے لوگوں سے مذاکرات کر رہے تھے اس کا ہیولٰی ضرور ان کے ذہن میں ہو گا۔ باقی رہی یہ بات کہ محمد (ﷺ) کے نہاں خانہ دماغ میں ابتدائی مبہم شکل میں کوئی ایسا نظریہ کار فرما ہو گا جو آگے چل کر عظیم عرب توسیع پسندی کی بنیاد فراہم کرے گا اس کا اندازہ عصری ضرورتوں کے تصور اور مکی دور میں ان کی کارکردگی کے وسیع تناظر سے ہو جاتا ہے۔

W-Montgomerywatt کی کتاب "*Muhammad at Medina*" سے چند اقتباسات

The Medinan period of Muhammad's career begins with his arrival at Qub'a in the oasis of Medina on or about 4 September 622 (12/iii/I) Life in Macca had become intolerable or even impossible for him, owing to the opposition he had aroused, and he had come to an agreement with the leading men of Madina. The precise nature of this agreement will be discussed later. On the religious side it meant the acceptance of

[1] Muhammad at Mecca by Montgomery Watt p.153

Muhammad as prophet, and on the political side the acceptance of him as arbiter between the opposing factions in Madina. Many seem to have been sincere in their acceptance of his prophethood, but others probably looked only at the political side. Relying on this agreement, some seventy of Muhammad's Maccan followers preceded him to Medina, where they were given lodging by his Madinan adherents. Thus on his arrival at Madina Muhammad had a large religious following and a position in the community of some political importance, though his powers may not have been exactly define. His Meccan and Medinan followers came to be known respectively as the Emigrants (muhajirun, those making the hijrah) and the Ansar or 'helpers'.[1]

محمد (ﷺ) کی مدنی زندگی کا آغاز عیسوی کیلنڈر کے مطابق کھجوروں کی سرزمین مدینہ میں قبا کے مقام پر آپ کی تقریباً ۴ ستمبر ۶۲۲ کی آمد کے ساتھ ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ مکہ میں مخالفت و مزاحمت کی بناء پر آپ پر عرصہ حیات نا قابل برداشت بلکہ ناممکن بنا دیا گیا تھا اور آپ کا مدینہ کے سرکردہ لوگوں کے ساتھ معاہدہ ہو چکا تھا جس کی تفصیل بیان کرنے کا یہ موقع نہیں تاہم مذہبی نقطہ نظر سے اس کا مطلب یہ تھا کہ بطور پیغمبر آپ کو قبول کر لیا گیا اور سیاسی سطح پر آپ کی حیثیت مدینہ کے متخاصم گروہوں کے درمیاں ایک ثالث اور مصالحت کنندہ کی تھی۔ بہت سوں کے نزدیک آپ کی پیغمبرانہ حیثیت مسلمہ تھی لیکن بعضوں کے مد نظر صرف آپ کا سیاسی پہلو ہی زیادہ اہم تھا۔ متفق علیہ معاہدے پر انحصار کرتے ہوئے محمد (ﷺ) کے لگ بھگ ستر پیرو کار آپ سے پہلے ہی وارد مدینہ ہو گئے تھے جہاں آپ کے مدنی رفقاء و وابستگان نے انہیں رہائشی سہولتیں بہم پہنچادی تھیں۔ اس طرح محمد (ﷺ) کا مدینہ میں ورود خاطر خواہ مذہبی حمایت اور کسی حد تک سیاسی اہمیت کے جلو میں ہوا تھا قطع نظر اس کے کہ آپ کے اختیارات حتمی

[1] Muhammad at Madina by Montgomery Watt p.1

طور پر متعین نہیں ہوئے تھے۔ آپ کے مکی اور مدنی پیروکاروں کو بالترتیب مہاجرین اور انصار کے ناموں سے یاد کیا جاتے لگا۔

It is easy to see how clans and sub-clans in this position would be atracted by the prospect of an outsider coming to hold the balance in the affairs of Medina. They may have felt that unification was bound to come sooner or later, but have disliked being under a ruler from Ba'l-Hubla or Bayadah. A member of any of the Medinan clans would already have his friends and his enemies among the other clans, and was unlikely to be fair to all. The fact that Muhammad was an outsider and the trust his character inspired in them gave a promise that he would be more satisfactory. Moreover, under Muhammad unification would be effected without first having a disastrous civil war. Since Salimah showed anti-Jewish tendencies, one may also wonder whether they were afraid that Ibn Ubayy, who was friendly with the Jewish clans, might rely on them to a great extent and so allow them to regain their influence in Medina. It is tempting to suppose that the clans represented at the first 'Aqabah were proletarian in consitution and the remainder aristocratic, but there is not sufficient evidence for such a view.[1]

یہ بات قابل فہم ہے کہ قبائل اور ان کی ذیلی شاخیں یہ توقع لگائے ہوئے تھیں کہ کب کوئی باہر سے آکر مدینے کے معاملات کو مائل بہ توازن کرسکے۔ یہ احساس ان کے دامن گیر ہو سکتا تھا کہ بزود یا بدیر ان میں اختلاط واشتراک کا پیدا ہونا ناگزیر ہے لیکن انہیں یہ گوارا نہ تھا کہ بیرونی قبائل میں سے کوئی فرد آکران پر حکمرانی کرنے لگے۔ یہ تو ہو سکتا تھا کہ مدنی قبائل میں سے کسی فرد کے دوسرے قبائل کے افراد کے ساتھ

[1] Muhammad at Madina by Montgomery Watt p.176

دوستانہ یا معاندانہ تعلقات ہوں تاہم اس بات کا احتمال نہیں تھا کہ وہ سب کے ساتھ انصاف کرنے والا ہو۔ ان حالات میں محمد (ﷺ) کا باہر سے آکر ان کے دل میں اعتماد جاگزیں کرلینا بہت زیادہ تسلی بخش اور اطمینان افزا بات تھی۔ مزید برآں محمد (ﷺ) کی زیر قیادت بغیر کسی خوفناک خانہ جنگی کے اتحاد و اختلاط کی فضا پیدا کی جاسکتی تھی چونکہ قبیلہ سلیمہ کے یہود کے مخالف رجحانات واضح تھے یہ سوچ بھی کار فرما تھی کہ آیا وہ ابن ابی سے خوف زدہ تھے کہ وہ یہودیوں کے ساتھ دوستانہ مراسم کی بناء پر انہیں اس امر کی اجازت دیں گے کہ وہ مدینہ میں دوبارہ اثر و نفوذ حاصل کرلیں۔ یہ امر قرین قیاس ہے کہ بیعت عقبہ اولیٰ کے موقع پر نمائندگی کرنے والے قبائل مزاجاً جفاکش تھے اور بقیہ قبائل طبقہ اشرافیہ سے تھے لیکن اس نقطہ نظر کی تائید میں زیادہ شہادت دستیاب نہیں۔

The attitude of Ibn Ubayy has to be surmised from the scant accounts of his behaviour. He must have realized that the movement towards Islam had become so strong that it could not be checked, and that to withstand it would simply cause him to lose influence. He probably also hoped to rule all Medina, and may even have seen in Islam a means towards his end; if Islam provided a religious basis for unity, he could exercise the political control. Had the Jews been converted to Islam, this dream might have come true in part. But the Jews rejected Islam, Muhammad proved to be an expert in handling political affairs, and Ibn Ubayy showed too little fervour for the cause he had nominally espoused to have a position of importance within the religious movement. This is admittedly conjectural, but some such line of thought is required to explain why Ibn Ubayy became a Muslim, and then, without outwardly ceasing to be a Muslim, became an opponent of Islam.[1]

---

[1] Muhammad at Madina by Montgomery Watt p.177

ابن ابی کے طرز عمل پر مبنی بہت کم روایات موجود ہیں جن سے اس کے رویے کے بارے میں محض اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ روز افزوں اسلامی تحریک کے متعلق وہ لازماً محسوس کرتا ہوگا کہ اس کے زور کو روکنا اس کے بس میں نہیں اور اس کا محض برداشت کئے جانا اس کے اثر ونفوذ کھو دینے کا باعث بنے گا۔ وہ غالباً تمام مدینے پر حکمرانی کی آس لگائے بیٹھا تھا اور اسلام کے ورود کو اس نے اس مقصد کا ذریعہ سمجھ لیا تھا۔ اس کی سوچ یہ ہوگی کہ اگر اسلام نے مذہبی اتحاد کی بنیاد فراہم کردی تو وہ اپنے سیاسی اثر کو بروئے کار لاسکے گا اگر یہودی دائرہ اسلام میں داخل ہو جاتے تو اس کا یہ خواب جزوی طور پر شرمندہ تعبیر ہوسکتا تھا لیکن انہوں نے اسلام کو مسترد کردیا۔ محمد (ﷺ) سیاسی معاملات سلجھانے میں ماہر تھے اور ابن ابی کا نئے مذہب کے ساتھ لگاؤ محض رسمی اور برائے نام تھا جس کی وجہ سے وہ اس تحریک میں اپنے لئے کوئی اہم مقام نہ پیدا کرسکا۔ یہ ساری باتیں محض ظن وتخمین کی پیداوار ہیں لیکن یہ امر وضاحت طلب ہے کہ ابن ابی نے اسلام کیوں قبول کیا اور خارجی طور پر مسلمانی ترک کئے بغیر وہ اسلام کا مخالف کیوں بن گیا۔

This explanation, even if mainly sound, probably has a false emphasis, laying too much stress on the personal rivalry. Up to this time, some eighteen months after the Hijrah, Muhammad had apparently accomplished nothing of moment. Others also stayed away ----- Ibn Ubbay, and even Sad b. Ub'adah; the latter indeed is said to have been suffering from snake-bite, but that may be merely his excuse. If there was a movement away from Muhammad, his notable victory and his gentle handling of the truants put a stop to it. Usayd and Sa'd b. Ub'adah continued to stand high in his favour, and even Ibn Ubayy did not refuse outright to help at Uhud. The man who gave the lead in loyal devotion to Muhammad was S'ad b. Mu'adh, and the continued to be foremost of the Ansa'r as a whole until his death, when Sad b.

Ub'adah (Sa'idah) took his place. The leader of the Khazraj at Badr was al-Huba'b b. al Mundhir (Salimah), but he was not specially prominent in later events.[1]

یہ وضاحت اگرچہ زیادہ صائب ہی کیوں نہ ہو ذاتی رقابت اور چپقلش پر بہت زیادہ زور دینے کے باعث غلط اصرار کا پہلو لئے ہوئے ہے ہجرت کے اٹھارہ ماہ گزر جانے کے بعد اب تک محمد (ﷺ) نے کوئی اہم کارنامہ سرانجام نہیں دیا تھا۔ دوسرے افراد ابن ابی اور یہاں تک سعد بن عبادہ جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ سانپ کے کاٹنے سے علیل تھا بھی پرے پرے رہے ہو سکتا ہے کہ یہ محض ایک بہانہ ہی ہو۔ اگر محمد (ﷺ) کے مخالف کوئی اور تحریک بھی ہو تاہم ان کی قابل ذکر فتح اور بھگوڑوں کے ساتھ ان کے نرم سلوک نے اس کا خاتمہ کردیا تھا۔ اسعد اور سعد بن عبادہ نے بدستور آپ کی حمایت جاری رکھی اور ابن ابی نے بھی جنگ احد میں مدد سے صریحاً انکار نہیں کیا۔ وہ شخص جو والہانہ انداز سے محمد (ﷺ) کے ساتھ وفاداری میں پیش پیش رہا سعد بن معاذ تھا اور وہ مرتے دم تک انصار میں سب سے آگے تھا جس کی جگہ سعد بن عبادہ نے لی بدر میں خزرج کا سردار الحبیب بن المنذر تھا لیکن بعد میں جو واقعات پیش آئے ان میں اسے کوئی خصوصی مقام حاصل نہیں۔

Hughknnedy اپنی کتاب

"The Prophet and the Age of the Caliphates" میں تبصرہ کرتے ہوئے کہتا ہے۔

At this crucial point, however, Muhammad was approached by the inhabitants of the settlement of Medina. The people of this community made their living from agriculture in their oasis. Despite their sedentary life, they, like the Quraysh, had maintained their tribal distinctions and their systems of clan security. The Arabs of this oasis were divided into two

[1] Muhammad at Madina by Montgomery Watt p.181

main tribes, the Aws and Khazraj, who were said to have migrated from South Arabia to settle the area in the mid-sixth century. In addition to these two main groups, there were three small tribes of Jews or Judaized Arabs, the Banu Qurayza, the Banu'l Nadir and the Banu Qaynuq'a. the Aws and Khazraj had been feuding for many years but in the years before the Hijra these feuds had become more serious and general, culminating in the battle of Buath in about 617 which had resulted in a peace of exhaustion. Clearly it was a community in need of a leader and arbitrator to put an end to this murderous internecine strife. Clearly too, this leader would have to be an outsider since no local person would be acceptable to the entire population.

It was in these circumstances that a group of Medinese first approached Muhammad, probably in 620. They went home to Medina and returned the next year for the pilgrimage. In 622 about seventy people from Medina, all converts to Islam, met the Prophet by night at 'Aqaba outside the city, Muhammad was careful to ensure that they swore to obey him and fight for him and to ensure that he was invited by men of both Aws and Khazraj and so would not be the candidate of only one party. He also insisted that twelve naqibs were appointed to represent his interests in Medina Muhammad then was careful to safeguard his position in advance and be sure that his position would be accepted by a considerable proportion of the population. The Muslims then began to move in small groups, careful not to attract attention to themselves. While the Prophet remained behind until he and Abu Bakr made their way by obscure paths to Medina which they reached on the 24 September 622. A new era had begun.

تاہم مدینہ بستی کے باسیوں نے اس نازک موقع پر محمد (ﷺ) سے رابطہ قائم کیا۔ ان لوگوں کی گزر اوقات نخلستانی علاقے میں زراعت پر ہوتی تھی قریش مکہ کی طرح اپنی اقامتی زندگی میں انہوں نے اپنے قبائلی تشخص و امتیاز اور قبائلی حفاظتی نظام کو برقرار رکھا تھا۔ نخلستانی خطے کے یہ عرب باشندے دو بڑے قبیلوں اوس اور خزرج میں منقسم تھے جو ایک روایت کے مطابق چھٹی صدی کے وسط میں جنوبی عرب سے نقل مکانی کر کے اس علاقے میں آباد ہوئے تھے۔ ان دو بڑے گروہوں کے علاوہ یہود یا یہودی بنائے گئے عربوں کے تین چھوٹے قبیلے۔ بنو قریظہ' بنو نضیر اور بنو قینقاع بھی یہاں مقیم تھے اوس اور خزرج قبیلے سالہا سال سے ایک دوسرے سے بر سر پیکار تھے لیکن ہجرت سے قبل کچھ سالوں سے ان خانہ جنگیوں میں سنگین اضافہ ہو گیا تھا جن کا نقطہ عروج ۶۱۷ء کے لگ بھگ جنگ بعاث کی صورت میں رونما ہوا جس کے نتیجے میں دونوں فریق تھک ہار کر صلح پر آمادہ ہو گئے۔ اب یہ اس شکستہ حال قوم کو بظاہر ایک ایسے ثالث کی ضرورت تھی جو طویل خوں آشام باہمی آویزشوں اور جنگوں کا خاتمہ کر دے۔ ظاہر ہے کہ یہ مصالحت کنندہ انہیں مدینے کے باہر ہی سے قبول ہوتا اس لئے کہ کوئی مقامی رہنما تمام آبادی کو قابل قبول نہیں ہو سکتا تھا۔

یہ حالات تھے جن میں اہل مدینہ کے ایک گروہ نے محمد (ﷺ) سے رابطہ قائم کیا۔ یہ واقعہ غالباً 620ء کو پیش آیا۔ وہ اپنے گھروں کو لوٹ گئے اور اگلے سال حج کے موقع پر دوبارہ آئے۔ 622ء میں مکہ میں تقریباً ستر مسلمان افراد آئے اور پیغمبر اسلام سے بیرون شہر رات کے وقت ملے محمد (ﷺ) نے حزم و احتیاط سے کام لے کر اس امر کو یقینی بنایا کہ وہ آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتے وقت جنگ کی صورت میں آپ کا ساتھ دینے کا وعدہ کریں اور ایک گروہ نہیں بلکہ اوس اور خزرج دونوں گروہوں کی طرف سے انہیں مدعو کیا جائے۔ آپ نے اپنے مفادات کے تحفظ کیلئے دس نمائندہ نقباء کے تقرر پر اصرار کیا۔ محمد (ﷺ) اپنی پوزیشن کو پیشگی طور پر مستحکم کرنا چاہتے تھے تاکہ انہیں آبادی کے کثیر حصے کا تعاون حاصل ہو جائے۔ اس کے بعد مسلمان تھوڑے تھوڑے کر کے ہجرت کرنے لگے۔ وہ محتاط تھے کہ مخالفین ان کی طرف متوجہ نہ ہوں جبکہ پیغمبر(

ﷺ) مکہ ہی میں رہے یہاں تک کہ وہ رازداری سے مدینہ پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ 24 ستمبر 622ء کو ان کا مدینہ میں ورود ایک نئے سن ہجری کا پیش خیمہ تھا۔

The Hijra, or migration of the Prophet from Mecca to Medina during the summer of 622, marked a major turning-point in the history of the Islamic movement. His followers in Mecca, later known as the Muhajireen or Emigrants. Some seventy in number, had left in small groups through July, August and September.

The Hijra meant that the Muslims were now free of the hostility of the leaders of the Quraysh and the restricting atmosphere of Mecca and were now settled among people who had invited them and at least some of whom were Muslims; Muhammad could preach and they worship with an openness which had been impossible before. But the emigration from Mecca also meant that the Muhajirun had abandoned the traditional clan links which had guaranteed their security and clearly they could no longer rely for protection on relatives they had left behind. The traditional system may not have been perfect and in the case of the Prophet himself it had become increasingly ineffective, but it had provided a framework in which they could live. The early converts had become Muslims as individuals, not in clans, and even after they had adopted Islam, the clan remained the basic social link. Now with the move to Medina a new form of social organization was required.

To begin with the Emigrants were quartered in the houses of those among the people of Medina who had invited them, now known as the Ansa'r or helpers of the Prophet, but if this arrangement had continued, they might have become little more than hangers-on, constantly needing help and protection. To avoid this,

a series of agreements were drawn up in the first two or three years after the Hijra, agreements which are known collectively as the 'Constitution of Medina". This takes the form of agreements between the Muhajirun and the people of Yathrib (Medina). All the believers are described as umma, a community apart from the surrounding pagan society, and they are to make war as one. The bond between members of the umma transcends any bonds or agreements between them and the pagans and they are all to seek revenge if any Muslim is killed fighting 'In the way of God". If, however, one Muslim kills another, then the normal rules of retaliation continue to operate, with the proviso that the Muhajirun, who had no close relatives in the city, were to be considered as clan like any of the native clans of Medina. There are also clauses dealing with relations with the Jews, who are partners in the affairs of Medina and bear their share of the expenses of warfare as long as there is no treachery between them and the Muslims, although both Muslims and Jews will keep their own religion. Muhammad is only mentioned twice, both times to emphasize that the arbitration of any disputes belongs to God and Muhammad: no other arbitrators are mentioned. The documents, then, tried to solve the problems of justice within the city and relations with outsiders, but they do not suggest that the power of Muhammad was absolute or lay any emphasis on religious affairs. Medina was to be a haram as Mecca was, for its people, and Muhammad was to be its founding holy man.[1]

تحریک اسلامی میں مکہ سے 622ء کے موسم گرما میں پیغمبر(ﷺ) کی ہجرت

---

[1] The Prophet & the age of the Caliphates by Hugh Kennedy p.33

کا واقعہ تاریخ اسلام کے ایک نئے موڑ کی حیثیت رکھتا ہے۔ آپ کے مکی پیروکار جنہیں بعد میں مہاجرین کے نام سے پکارا جانے لگا تعداد میں تقریباً ستر تھے وہ چھوٹے چھوٹے گروہوں کی شکل میں جولائی، اگست اور ستمبر کے مہینوں میں سفر ہجرت پر روانہ ہوئے۔ ہجرت کا ان کے نزدیک مفہوم یہ تھا کہ وہ اب قریشی رہنماؤں کی دشمنی اور مکہ کے حبس زدہ ماحول سے آزاد ہو کر ان لوگوں کے درمیان آ گئے تھے جنہوں نے انہیں دعوت دی تھی اور ان میں سے ایک قابل ذکر تعداد مسلمانوں کی تھی۔ یہاں محمد (ﷺ) کی تبلیغ اور اس کے نام لیواؤں کی کھلے عام عبادت کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ ایسا ماحول اس سے پہلے انہیں میسر نہیں تھا۔ مکہ سے ہجرت کا مطلب یہ بھی تھا کہ مہاجرین روایتی قبائلی روابط کو جو ان کیلئے تحفظ کی ضمانت تھے پس پشت ڈال چکے تھے اور اب وہ ان رشتہ داروں پر جنہیں چھوڑ کر وہ یہاں آ گئے تھے کسی حفاظت کیلئے انحصار نہیں کر سکتے تھے۔ روایتی طور پر یہ نیا نظام کامل نہیں ہو سکتا تھا اور خود پیغمبر کیلئے یہ معتد بہ طور پر غیر موثر تھا لیکن یہ ایک ایسا ڈھانچہ مہیا کرتا تھا جس کے مطابق زندگیاں گزارنے کے سوا ان کے پاس اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ حلقہ اسلام میں ابتدائی نووار دین انفرادی طور پر مسلمان ہوئے تھے نہ کہ گروہی شکل میں اور قبول اسلام کے بعد بھی ان کا بنیادی معاشرتی تعلق برقرار تھا۔ لیکن اب مدینہ منتقل ہو جانے کے بعد ایک نئے سماجی ڈھانچے کی تنظیم ان کی ضرورت بن گئی تھی۔

ابتداء مہاجرین کی آباد کاری مدینے کے ان لوگوں کے درمیان ہوئی جنہوں نے انہیں دعوت دی تھی اور جنہیں اب انصار (مددگاران پیغمبر) کے نام سے جانا جاتا تھا لیکن اگر یہ اہتمام و انتظام مستقلاً جاری رہتا تو ان کی حیثیت ان پیران تسمہ پا سے زیادہ نہ ہوتی جو ہمہ وقت مدد اور تحفظ کے ضرورت مند رہتے ہیں۔ اس ممکنہ صورت حال سے نجات حاصل کرنے کیلئے ہجرت کے پہلے دو یا تین سالوں کے دوران لگاتار معاہدے عمل میں لائے گئے جنہیں اجتماعی طور پر "میثاق مدینہ" سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ معاہدے بحیثیت مجموعی مہاجرین اور اہل یثرب (مدینہ) کے درمیان تشکیل پائے جملہ اہل ایمان

کو امت یا قوم کے نام سے پکار جانے لگا۔ یہ امت گردونواح کے مشرک معاشرے سے منفرد حیثیت کی حامل تھی جسے ملت واحدہ کی صورت میں جنگ آزما ہونا تھا۔ امت کے افراد کے مابین رشتہ اخوت ان کے اور مشرکین کے درمیان کسی بھی روابط اور معاہدوں سے ماوراء ہے اور اگر اللہ کی راہ میں کوئی مسلمان قتل کردیا جاتا ہے تو ان سب پر انتقام لینا فرض ہوجاتا ہے تاہم اگر ایک مسلمان دوسرے کو قتل کرتا ہے تو قصاص کے قوانین وضوابط معمول کے مطابق روبہ عمل آتے ہیں صرف اس شرط کے ساتھ کہ مہاجرین کو جن کے شہر میں کوئی قریبی (خونی) رشتہ دار نہیں تھے انہیں مدینے کے کسی قبیلے اور گروہ کے ہم پلہ قبیلہ تصور کیا جائے گا۔ معاہدے میں یہودیوں سے تعلقات کے بارے میں شقیں موجود ہیں جو مدینہ کے معاملات میں برابر کے فریق تسلیم کئے جاتے ہیں اور وہ اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے اس وقت تک جنگی اخراجات ادا کرنے کے ذمہ دار ہیں جب تک وہ مسلمانوں سے غداری کے مرتکب نہیں ہوتے۔ معاہدے میں محمد (ﷺ) کا ذکر صرف دو دفعہ ہوا ہے اور وہ اس امر کی صراحت کرتا ہے کہ کسی جھگڑے اور تنازعے کی صورت میں ثالثی کا حق اللہ اور اس کے رسول کا ہے ان کے علاوہ کسی تیسرے کا نام بطور ثالث مذکور نہیں۔

ان دستاویزات کے ذریعے شہر کے اندر اور باہر عدل وانصاف کے مسائل سے عہدہ برا ہونے کی کوشش کی گئی لیکن ان میں اشارتاً اس بات کا ذکر نہیں کہ محمد (ﷺ) کو مطلق اختیار حاصل ہے یا مذہبی معاملات پر زور دیا گیا ہے مدینے کو مکے کے لوگوں کی طرح حرم کا درجہ حاصل ہوگیا اور محمد (ﷺ) اس کے بانی مقدس بشر ٹھہرے۔

الحمد للہ سیرت الرسول کی چوتھی جلد اختتام پذیر ہوئی لیکن فلسفہ ہجرت کا مضمون ابھی ختم نہیں ہوا۔ سیرت الرسول کی پانچویں جلد جو واقعات ہجرت کے بارے میں ہے کے ابتدائی حصوں میں فلسفہ ہجرت کا بیان جاری رہے گا۔

اشاریہ

نمبر شمار	عنوان	صفحہ

القرآن

نمبر شمار	اطراف الآیات	حوالہ	صفحہ
	الفاتحہ: ۱		
۱	الحمد لله رب العالمینO	۱:۱	۵۹۳
۲	الرحمن الرحیمO	۱: ۲	۵۹۳
۳	اھدنا الصراط المستقیمO	۱: ۵	۵۹۳
	البقرۃ: ۲		
٤	واذقال ربك للملئكة انی جاعل . .	۲: ۳۰	۱۰۸
٥	وقلنا یادم اسکن انت وزوجك . . .	۲: ۳۵	۱۰۹
٦	اھبطو مصرا فان لکم ما سالتم–	۲: ۲٦۱	۱۱۰
۷	فازلھما الشیطن عنھما فاخرجھما . .	۲: ۳٦	۱۱۱
۸	قلنا اھبطوا منھا جمیعا . . .	۲: ۳۸	۱۱۱
۹	فاما یاتینکم منی ھدی . . .	۲: ۳۸	۳۱۱
۱۰	ولاتشتروا بایتی ثمنا قلیلا . . .	۲: ٤۱	٦۰۱
۱۱	وانتم تتلون الکتاب . . .	۲: ٤٤	٦۰۱
۱۲	وکانوا من قبل یستفتحون . . .	۲: ۸۹	۳۹۹
۱۳	واشربوا فی قلوبھم العجل . . .	۲: ۹۳	٤۷٥
۱٤	الم تعلم ان الله له ملك السموات . . .	۲: ۱۰۷	٥۹۳
۱٥	و لله المشرق والمغرب . . .	۲: ۱۱٥	٥۹٥
۱٦	فاینما تولوا فثم وجه الله . . .	۲: ۱۱٥	٥۹٥

نمبر شمار	اطراف الآیات	حوالہ	صفحہ
۱۷	ویکون الرسول علیکم شهیدا–	۲: ۱۴۳	۲۳۲
۱۸	الذین اتیناهم الکتاب یعرفونه ۰۰۰	۲: ۱۴۶	۳۹۸
۱۹	فمن اعتدی علیکم فاعتدوا علیه ۰۰	۲: ۱۹۴	۳۱۱
۲۰	ان الذین امنوا والذین هاجروا ۰۰۰	۲: ۲۱۸	۸۶، ۲۶۵ ۳۲۴
۲۱	قالوا لاطاقة لنا الیوم بجالوت ۰۰۰	۲: ۲۴۹	۳۹۱
۲۲	فهزموهم باذن الله –	۲: ۲۵۱	۳۹۲
۲۳	ولایحیطون بشیء من علمه ۰۰۰	۲: ۲۵۵	۵۹۵
۲۴	قد تبین الرشد من الغی ۰۰۰	۲: ۲۵۶	۶۰۱
۲۵	لایسئلون الناس الحافا–	۲: ۲۷۳	۳۷۷
	آل عمران: ۳		
۲۶	والله یؤید بنصره من یشاء –	۳: ۱۳	۳۹۲
۲۷	لن تنالوا البر حتی تنفقوا مما تحبون–	۳: ۹۲	۶۰۲
۲۸	الذین ینفقون فی السراء والضراء۰۰	۳: ۱۳۴	۶۰۲
۲۹	ان ینصرکم الله فلا غالب لکم ۰۰	۳: ۱۶۰	۳۹۲
۳۰	فاستجاب لهم ربهم انی لا اضیع ۰۰	۳: ۱۹۵	۲۶۶، ۳۲۷
	النساء : ٤		
۳۱	والتی تخافون نشوزهن ۰۰۰	٤: ۳٤	۵۳
۳۲	ان الله لایحب من کل مختالا فخورا○	٤: ۳٦	۵۹۷

نمبر شمار	اطراف الآیات	حوالہ	صفحہ
۳۳	من یطع الرسول فقد اطاع اللہ-	۴: ۸۰	۲۳۱
۳۴	فمالکم فی المنافقین فئتین ۰۰۰	۴: ۸۸	۲۵۳
۳۵	ودوا لوتکفرون کما کفروا ۰۰۰	۴: ۸۹	۸۸، ۳۵۶
۳۶	ان الذین توفهم الملئکة ظالمی ۰۰۰	۴: ۹۷	۸۷، ۲۴۸
۳۷	الم تکن ارض اللہ واسعة فتهاجرو ۰۰	۴: ۹۸	۲۴۲
۳۸	ومن یهاجر فی سبیل اللہ یجد فی ۰۰	۴: ۱۰۰	۸۸، ۳۵۷
	المائدہ: ۵		
۳۹	یا قوم ادخلوا الارض المقدسة ۰۰۰	۵: ۲۱-۲۲	۲۱۷
۴۰	فاذهب انت وربك فقاتلا ۰۰۰	۵: ۲۴	۲۱۷
۴۱	قال فانها محرمة علیهم اربعین سنة ۰۰	۵: ۲۶	۲۱۸
۴۲	یایها الذین امنوا من یرتد منکم ۰۰۰	۵: ۵۴	۳۹۴
۴۳	واللہ یعصمك من الناس-	۵: ۶۷	۳۹۴
۴۴	قال اللہ انی منزلها علیکم ۰۰۰	۵: ۱۱۵	۱۳۷
	الانعام: ۶		
۴۵	هو الذی خلقکم من طین ۰۰۰	۶: ۲	۱۰۵
۴۶	یعلم سرکم وجهرکم ویعلم ماتکسبونO	۶: ۳	۵۹۷
۴۷	کتب علی نفسه الرحمة-	۶: ۱۲	۲۶۵
۴۸	وهو یطعم ولایطعم -	۶: ۱۴	۵۹۴

نمبر شمار	اطراف الآیات	حوالہ	صفحہ
٤٩	و هو القاهر فوق عباده–	٦: ١٨	٥٩٨
٥٠	وجعل الليل سكنا والشمس ...	٦: ٩٧	٥٩٩
	الاعراف: ٧		
٥١	قال اهبطوا بعضكم لبعض عدو–	٧: ٢٤	١١١
٥٢	الاله الخلق والامر تبرك الله ...	٧: ٥٤	٥٩٩
٥٣	والیعاد اخاهم هودا–	٧: ٦٥	٢٤٠
٥٤	فعقروا الناقة وعتوا عن امر ربهم ...	٧: ٧٧	١٣٩
٥٥	اتاتون الفاحشة ماسبقكم بها من ..	٧: ٨٠–٨١	١٥٩
٥٦	والى مدين اخاهم شعيبا–	٧: ٨٥	٢٤٠
٥٧	يا فرعون انى رسول من رب العالمينO	٧: ١٠٤–١٠٥	١٩٨
٥٨	وجاء السحرة فرعون قالوا ان ...	٧: ١١٣–١١٤	٢٠٣
٥٩	قال عسى ربكم ان يهلك عدوكم ...	٧: ١٢٩	٢٠٧
٦٠	يا موسى اجعل لنا الها كما هم الهة–	٧: ١٣٨	٢١٣
٦١	انكم قوم تجهلونO ان هؤلاء ...	٧: ١٣٨–١٤٠	٢١٣
٦٢	ياموسى انى اصطفيتك على الناس ...	٧: ١٤٤–١٤٥	٢١٤
٦٣	رحمتى وسعت كل شئى–	٧: ١٥٦	٢٦٥
٦٤	الذين يتبعون الرسول النبى الامى ..	٧: ١٥٧	٤٠٠

نمبر شمار	اطراف الآیات	حوالہ	صفحہ
۸۱	والسابقون الاولون من المهاجرين . .	۹: ۱۰۰	۳۴۶، ۴۰۵
۸۲	لقد تاب الله على النبى . . .	۹: ۱۱۷	۳۴۸، ۴۰۵
	یونس: ۱۰		
۸۳	ان الله لايظلم الناس . . .	۱۰: ۴۴	۶۰۲
۸۴	لاتبديل لخلق الله . . .	۱۰: ۶۴	۶۰۰
۸۵	وقال موسى ربنا انك اتيت فرعون . . .	۱۰: ۸۸	۲۱۰
۸۶	امنت انه لا اله الا الذى امنت به . . .	۱۰: ۹۰	۲۱۲
۸۷	وجاورنا ببنى اسرائيل البحر . . .	۱۰: ۹۰	۳۶۱
	هود: ۱۱		
۸۸	واوحى الى نوح انه لن يومن من . .	۱۱: ۳۶	۱۱۸
۸۹	ويصنع الفلك وكلما مر عليه . . .	۱۱: ۳۸	۱۱۹
۹۰	حتى اذا جاء امرنا وفار التنور . . .	۱۱: ۴۰-۴۲	۱۲۰، ۳۵۹
۹۱	لاعاصم اليوم من امر الله . . .	۱۱: ۴۳	۳۶۰
۹۲	وقيل ياارض ابلعى ماءك . . .	۱۱: ۴۴	۱۲۱
۹۳	هو انشاءكم من الارض-	۱۱: ۶۱	۱۰۷
۹۴	تمتعوا فى داركم ثلاثة ايام . . .	۱۱: ۶۵	۱۴۰
۹۵	قال ياقوم هؤلاء بناتى هن . . .	۱۱: ۷۸	۱۶۳
۹۶	قالوا لقد علمت مالنا فى بناتك . . .	۱۱: ۷۹	۱۶۳

نمبر شمار	اطراف الآیات	حوالہ	صفحہ
	الفرقان: ۲۵		
۱۴۰	وخلق کل شئی–	۲۵: ۲	۵۹۴
۱۴۱	ان قومی اتخذو ھذا القرآن مھجورا–	۲۵: ۳۰	۶۲
۱۴۲	وھو الذی ارسل الریاح بشرا ۰۰۰	۲۵: ۴۸	۵۹۸
۱۴۳	وھو الذی خلق من الماء بشرا–	۲۵: ۵۴	۱۰۴
۱۴۴	وھو الذی جعل الیل والنھار خلفة–	۲۵: ۶۲	۵۹۸
	الشعراء : ۲۶		
۱۴۵	قال فعلتھا اذا وانا من الضالینo ۰۰۰	۲۶: ۲۰–۲۲	۱۹۹
۱۴۶	قال فرعون ومارب العالمینo ۰۰۰	۲۶: ۲۳–۲۴	۲۰۰
۱۴۷	قال ربکم و رب آبائکم الاولینo	۲۶: ۲۶	۲۰۰
۱۴۸	قال ان رسولکم الذی ارسل الیکم ۰۰۰	۲۶: ۲۷	۲۰۱
۱۴۹	قال رب المشرق والمغرب وما بینھما ۰۰۰	۲۶: ۲۸	۲۰۱
۱۵۰	قال لئن اتخذت الھا غیری لاجعلنك ۰۰۰	۲۶: ۲۹	۲۰۲
۱۵۱	قالوا اولو جئتك بشئ مبینo ۰۰۰	۲۶: ۳۰–۳۳	۲۰۲
۱۵۲	قال للملاء حوله ان ھذا لساحرعلیمo	۲۶: ۳۴–۳۵	۲۰۳
۱۵۳	قال کلا ان معی ربی سیھدینo	۲۶: ۶۲	۲۱۱
۱۵۴	قال رب ان قومی کاذبونo	۲۶: ۱۱۷	۱۱۶
۱۵۵	ھذه ناقة لھا شرب ۰۰۰	۲۶: ۱۵۵	۱۳۹

نمبر شمار	اطراف الآیات	حوالہ	صفحہ
١٥٦	رب نجنی واھلی ممایعملونo	٢٦: ١٦٩	١٦٠
	القصص: ٢٨		
١٥٧	واوحينا الى ام موسى ان ارضعيه ...	٢٨: ٧	١٨١
١٥٨	فالتقطه ال فرعون ليكون لهم عدوا ...	٢٨: ٨ – ١٣	١٨٢
١٥٩	ولما بلغ اشده واستوى اتيناه حكما ...	٢٨: ١٤	١٨٤
١٦٠	ودخل المدينة على حين غفله من ...	٢٨: ١٥– ١٧	١٨٥
١٦١	يا موسى أتريد ان تقتلنى كما ...	٢٨: ١٩	١٨٦
١٦٢	وجاء رجل من اقصى المدينة ...	٢٨: ٢٠– ٢٢	١٨٧
١٦٣	ولما ورد ماء مدين وجد عليه امه ...	٢٨: ٢٣– ٢٤	١٩٠
١٦٤	فجاءته احدهما تمشى على استحياء ...	٢٨: ٢٥–٢٦	١٩١
	العنكبوت: ٢٩		
١٦٥	فما كان جواب قومه ...	٢٩: ٢٩	١٦٠
١٦٦	قال رب انصرنى على القوم المفسدينo	٢٩: ٣٠	١٦٠
١٦٧	ياعبادى الذين امنوا ...	٢٩: ٥٢	٢٦٤
	لقمان: ٣١		
١٦٨	الم تر ان الله يولج الليل فى النهار ...	٣١: ٢٩	٥٩٦
١٦٩	الم تر ان الفلك تجرى فى البحر ..	٣١: ٣١	٥٩٦
١٧٠	وينزل الغيث–	٣١: ٣٤	٥٩٦

الأحاديث والآثار

نمبر شمار	اطراف الاحادیث والآثار	صفحہ
۲۰	عليك بالهجرة فانها لامثل لها۔	۲۹۱
۲۱	ويحك ان شان الهجرة لشديد ...	۲۹۳
۲۲	اى الهجرة افضل؟ قال ان تهاجر ماكره ربك ...	۲۹۷
۲۳	اللهم امض لاصحابى هجرتهم ولاتودهم على ...	۲۹۹
۲۴	لاهجرة بعد الفتح۔	۳۰۶
۲۵	انقطعت الهجرة منذ فتح الله على نبيه مكة۔	۳۰۶
۲۶	... لاتنقطع الهجرة ماقوتل الكفار۔	۳۰۸
۲۷	فهجرته الى ما هاجر اليه۔	۳۲۱
۲۸	المسلم من سلم المسلمون من لسانه ويده ...	۳۶۷
۲۹	ان رسول الله وابابكر وعمر كانوا من المهاجرين ...	۳۶۷
۳۰	ان اول ثلة تدخل الجنة لفقراء المهاجرين...	۳۶۸
۳۱	فاذا اكثر اهل الجنة فقراء المهاجرين ...	۳۶۹
۳۲	فقراء المهاجرين يدخلون الجنة قبل اغنياءئهم ...	۳۷۰
۳۳	ان فقراء المهاجرين يدخلون الجنة قبل اغنيائهم ...	۳۷۰
۳۴	ابشروا! صعاليك المهاجرين بالفوز يوم القيامة ...	۳۷۰
۳۵	واول من يرده على فقراء المهاجرين الدنس ثيابا ...	۳۷۱
۳۶	حوضى كما بين عدن وعمان ابرد من الثلج ...	۳۷۱
۳۷	اصحاب محمد الذين هاجروا معه الى المدينة۔	۳۷۲
۳۸	هم الذين هاجروا مع النبى من مكة الى المدينة ۔	۳۷۲

ویدیں

اقوال

نمبر شمار	اطراف الاقوال	صاحب القول	صفحہ
۱	ای اعتزلوا الی فراش اخر اویرقد ۰۰۰	امام سیوطیؒ	۵۳
۲	جنبوا مضاجعهن(واهجروهن) من ۰۰۰	امام مجاهد رح	۵۴
۳	والمراد اترکوهن منفردات فی مضاجعهن۰۰۰	امام آلوسیؒ	۵۵
۴	ای فاحذرنی واترکنی۰۰۰	امام آلوسیؒ	۵۶
۵	الضمیر للقرآن کانوا یذکرون ۰۰۰	امام ابن کثیرؒ	۵۸
۶	تهجرون من الثلاثی تترکون ۰۰۰	امام سیوطیؒ	۵۹
۷	وجوز ان یکون المعنی علیه ان ۰۰۰	امام آلوسیؒ	۵۹
۸	تهجرون بالقول السیئی فی القرآن-	امام مجاهدؒ	۶۰
۹	مهجورا ای مسبوبًا متروکًا (معرضا عنه)	امام محلی رح	۶۲
۱۰	وذلك ان المشرکین کانوا لایضعون ۰۰۰	امام ابن کثیرؒ	۶۲
۱۱	ای متروکا بالکلیة ولم یؤمنوا به ۰۰۰	امام آلوسیؒ	۶۴
۱۲	وجوز ان یکون مصدر من الهجر ۰۰۰	امام آلوسیؒ	۶۵
۱۳	واهجرهم هجرا جمیلا بان تجانبهم ۰۰۰	امام آلوسیؒ	۷۶
۱۴	ای لاتتعرض لهم ولاتشتغل بمکافاتهم ۰۰۰	امام قرطبیؒ	۷۷
۱۵	هجر: الهجران والهجران مفارقة الانسان۰۰۰	راغب اصفهانیؒ	۸۹
۱۶	وهو موسی بن عمران بن قاهث ۰۰۰	امام ابن کثیر رح	۱۸۰
۱۷	بهر ا لله تعالیٰ کی مشیت یه هوئی ۰۰۰	شاه ولی ا لله رح	۱۸۴
۱۸	یا هارون! ان ا لله امرنی وامرك ان ۰۰۰	سیدنا موسی علیه السلام	۱۹۸
۱۹	واذقدبینا حقیقة هذا المنصب وان ۰۰۰	ابن خلدونؒ	۲۳۵

نمبر شمار	اطراف الاقوال	صاحب القول	صفحہ
۲۰	قدنها ابوبكر لمادعى به وقال لست ۰ ۰ ۰	ابن خلدونؒ	۲۳۶
۲۱	The oath of Al-Aqaba marked an	Tahia Al-Ismail	۶۰۷
۲۲	During the second part of the night	// //	۶۰۷
۲۳	In order to give the Muslims the	Tahia Al-Ismail	۶۰۸
۲۴	Divers accounts are given of the	Washington Irving	۶۱۰
۲۵	These thoughts and Conceptions	W-Montgomery Watt	۶۱۱
۲۶	The Mediana period of Muhammad	// //	۶۱۱
۲۷	It is easy to see how clans and sub-clans in this position	// //	۶۱۳
۲۸	At this crucial point, however, ...	Hugh Knnedy	۶۱۶
۲۹	The Hijra, or migration of the prophet	// //	۶۱۹

اشعار

نمبر شمار	اشعار	شاعر	صفحہ
۱	عشق پر زور نہیں، ہے یہ وہ آتش غالب کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے	غالب	۴۵
۲	ہر ظلم کی توفیق ہے ظالم کی وراثت مظلوم کے حصے میں تسلی نہ دلاسا		۷۲
۳	کما جده الاعراق قال ابن ضمرة علیها کلاما جار فیه واهجرا		۹۲
۴	اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی	اقبال	۲۲۹
۵	یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں	اقبال	۲۷۲
۶	خوگرِ پیکرِ محسوس تھی انساں کی نظر پھر کوئی مانتا اَن دیکھے خدا کو کیونکر	اقبال	۴۷۵

اعلام

اماکن وبلاد

اقـوام و قـبـائـل

نمبر شمار	اقوام و قبائل	صفحہ
۱۹	ساسانی	۴۶۵‘۴۶۷‘۴۸۵‘۴۸۷
۲۰	سامی	۵۶۸
۲۱	سلیمہ	۶۱۴
۲۲	سورین(Suren)	۴۸۶
۲۳	عاد	۱۲۵‘۱۲۸‘۱۳۰‘۱۳۱‘۲۴۰
۲۴	عبرانی	۱۷۹
۲۵	عمالقہ	۱۷۳
۲۶	غز	۴۶۵
۲۷	قبطی	۱۸۴‘۱۸۵‘۱۸۶‘۱۸۷‘۱۹۹
۲۸	قریش	۳۸۸‘ ۳۹۰‘ ۴۲۷‘ ۴۳۳‘ ۴۴۱‘ ۴۴۲‘ ۶۱۱‘۶۱۸‘۶۲۱
۲۹	کارین(Karen)	۴۸۶
۳۰	گوتھ (Goths)	۵۱۴
۳۱	مغ	۴۷۷
۳۲	مغل	۴۶۵
۳۳	ملیچھ	۵۶۸ - ۵۷۷
۳۴	ہوازن	۴۳۳
۳۵	ہود	۱۲۷
۳۶	یونانی	۴۹۷
۳۷	Germanic	۵۱۴

کتابیات

نمبر شمار	کتاب	مصنف / متوفی	مطبع / سن طباعت
1	القرآن الکریم	منزل من اللہ	
2	صحیح البخاری	امام محمد بن اسماعیل بخاریؒ ۲۵۶ھ	قدیمی کتب خانہ کراچی ۱۳۸۱ھ
3	صحیح المسلم	امام مسلم بن الحجاج القشیریؒ ۲۶۱ھ	قدیمی کتب خانہ کراچی ۱۳۷۵ھ
4	جامع الترمذی	امام محمد بن عیسیٰ ترمذیؒ ۲۷۹ھ	فاروقی کتب خانہ ملتان
5	سنن نسائی	امام احمد بن شعیب نسائیؒ ۳۰۳ھ	قدیمی کتب خانہ کراچی
6	سنن ابن ماجہ	امام محمد بن یزید القزوینی ۲۷۳ھ	قدیمی کتب خانہ کراچی
7	مسند احمد بن حنبل	امام احمد بن حنبلؒ ۲۴۱ھ	دار الفکر بیروت ۱۳۹۸ھ
8	تفسیر ابن عباس	حضرت عبداللہ بن عباسؓ ۶۸ھ	مطبعہ میمنہ مصر ۱۳۸۱ھ
9	تفسیر ابن کثیر	امام اسماعیل بن کثیر القرشیؒ ۷۷۴ھ	دار المعرفہ بیروت ۱۴۰۰ھ
10	الجامع لاحکام القرآن	ابو عبداللہ محمد بن احمد قرطبیؒ ۶۶۸ھ	دار احیاء التراث الاسلامی بیروت
11	تفسیر جلالین	امام جلال الدین سیوطیؒ ۹۱۱ھ	قدیمی کتب خانہ کراچی
12	الدر المنثور	امام جلال الدین سیوطیؒ ۹۱۱ھ	قدیمی کتب خانہ کراچی
13	روح المعانی	امام سید محمد آلوسیؒ ۱۲۷۰ھ	دار المعرفہ بیروت
14	فتح القدیر	امام کمال الدین ابن ہمامؒ ۸۶۱ھ	مکتبہ رشیدیہ ۱۹۸۵ء
15	البدایہ والنہایہ	امام اسماعیل بن کثیر القرشی ۷۷۴ھ	مکتبہ المعارف بیروت ۱۹۷۷ھ
16	قصص الانبیاء	امام اسماعیل بن کثیر القرشیؒ ۷۷۴ھ	دار الخیر بیروت ۱۹۹۲ء
17	مقدمہ ابن خلدون	عبدالرحمن بن خلدونؒ ۸۰۸ھ	المطبع البہیہ مصر ۱۹۶۶ء
18	دائرہ معارف اسلامیہ		دانش گاہ پنجاب لاہور ۱۹۹۳
19	المعارف لابن قتیبہ	عبداللہ بن مسلم (ابن قتیبہؒ) ۲۷۶ھ	
20	الکامل فی التاریخ	امام ابو الحسن بن اثیرؒ ۶۳۰ھ	دار صادر بیروت ۱۳۹۹ھ
21	مروج الذھب	علی بن حسین بن علی المسعودی ۳۴۶ھ	دار الہجرت ایران ۱۹۸۴
22	مسلم ثقافت	سالک	
23	مصابیح الاسلام	شری گنگا پرشاد اپادھیائے	
24	تاریخ تہذیب	ٹیس ٹس	
25	اگر اب بھی نہ جاگے تو	شمس نوید عثمانی	بھارت
26	رگ وید		
27	یجروید		
28	اتھروید		

نمبر شمار	کتاب	مصنف / متوفی	مطبع / سن طباعت
29	Encyclopaedia Britannica	U.S.A 1979	
30	Hundu Marmars Customs and Ceremonies	Dubois	
31	Gospelsof Buddha	Carus	
32	Recoveryof Faith	Dr.Rodha Karishnon	
33	The Prophet and the age of the caliphate	Hugh Kennedy	London1996
34	Life of Muhammad	Washington Irvings	U.S.A1989
35	Lifeof Muhammad	Tahia Al Ismail	Londan1995
36	Muhammadat Mecca	W.M.Watt	Karachi1974
37	Muhammadat medina	W.M.Watt	Karachi1988